عَام فہم اُردو تفسیر

اَنوارُ البَیان

فی کشف اَسرار القرآن

سَلیس اور عام فہم زبان میں اُردو کی سب سے پہلی مُفصّل اور جامع تفسیر، تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالحدیث کا خصوصی اہتمام، دلنشین انداز میں احکام و مسائل اور مواعظِ و نصائح کی تشریح، اسباب نُزول کا مُفصّل بیان، تفسیر و حدیث اور کتبِ فقہ کے حوالوں کیساتھ

محقق العصر
حضرۃ مولانا مفتی محمد عاشقِ الٰہی مہاجر مدنی مدظلہ العالی

جدید کمپیوٹر ایڈیشن

عام فہم اُردو تفسیر

انوار البیان

فی کشف اسرار القرآن

جلد اوّل

سلیس اور عام فہم زبان میں اُردو کی سب سے پہلی مفصل اور جامع تفسیر
تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالحدیث کا خصوصی اہتمام
دلنشیں انداز میں احکام و مسائل اور مواعظ و نصائح کی تشریح
اسباب نزول کا مفصل بیان، تفسیر و حدیث اور کتب فقہ کے حوالوں کیساتھ

محقق العصر
حضرۃ مولانا مفتی **محمد عاشق الٰہی** مہاجر مدنی قدس سرہٗ

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

نام کتاب

انوار البیان

تاریخ اشاعت............شوال المکرم ۱۴۳۴ھ
ناشر........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت..............سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

اس کتاب کی کاپی رائٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں
کسی بھی طریقہ سے اس کی اشاعت غیر قانونی ہے

قانونی مشیر
محمد اکبر ساجد
(ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ملتان)

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ....ملتان
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار......لاہور   دارالاشاعت.......اُردو بازار.........کراچی
مکتبہ علمیہ...........اکوڑہ خٹک.......پشاور   مکتبہ رشیدیہ......سرکی روڈ.......کوئٹہ
اسلامی کتاب گھر.....خیابان سرسید.....راولپنڈی   مکتبہ دارالاخلاص....قصہ خوانی بازار......پشاور
ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K   119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE   BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

عرضِ ناشر

الحمدللہ ''انوار البیان'' کی پہلی جلد جدید طباعت کے بعد یہ آپ کے سامنے ہے۔
حضرت مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ کی مدینہ منورہ میں لکھی گئی وہ مقبول عام تفسیر ہے جس کی اوّل مکمل اشاعت کی توفیق سے اللہ پاک نے ادارہ تالیفات اشرفیہ کو نوازا۔ فالحمدللہ علی ذلک۔

اس کے گذشتہ ایڈیشن میں عربی عبارات کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ جس کے بارہ میں علماء کرام کی مشاورت سے یہ طے پایا کہ ان عربی عبارات کے تراجم کو حذف کر دیا جائے جس کی پہلی وجہ یہ کہ یہ عبارات محض حوالہ جات کے طور پر لکھی گئی ہیں جن کا ماحصل خود تفسیر میں آچکا ہے اور دوسری وجہ کہ جب خود حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے ان کا ترجمہ نہیں کیا تو بہتر یہی ہے کہ ان تراجم کو حذف ہی کر دیا جائے۔ ان وجوہات کی بنا پر اس جدید ایڈیشن میں ایسے تراجم حذف کر دیئے گئے ہیں۔

اللہ پاک ادارہ کی اس سعی کو شرف قبولیت سے نوازیں اور ہم سب کو قرآن وحدیث کی خدمت اور اس پر عمل کی توفیق سے نوازیں۔ (آمین)

والسلام

محمد اسحاق عفی عنہ

(شوال المکرم ۱۴۳۴ھ اگست 2013)

مختصر حالات

حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی بلند شہری ثم مہاجر مدنی رحمہ اللہ ان علماء ربانیین میں سے تھے جن سے دین کی صحیح رہنمائی ملتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے بڑے عالم ہونے کے باوجود آپ میں تعلّی تو کیا خودنمائی کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ اور اسی کی برکت ہے کہ آپ کی تصانیف مقبول عام ہیں۔

زندگی کے آخری دور کی تصنیف تفسیر انوار البیان (نو جلد) جو آپ کی زندگی ہی میں ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان سے چھپ کر مقبول عام ہو چکی ہے جس کو آپ نے مدینہ منورہ کی مبارک فضاؤں میں رہ کر لکھا۔ آپ کے صاحبزادہ مولانا عبدالرحمٰن کوثر بتلاتے ہیں کہ جب تفسیر کا کام ہو رہا تھا تو میں نے خواب میں اس طرح دیکھا کہ جیسے جیسے تفسیر کا کام مکمل ہوتا جا رہا ہے ویسے ویسے مسجد نبوی کی تعمیر مکمل ہو رہی ہے۔

آپ کی عربی، اردو تصانیف کی تعداد تقریباً سو ہے۔ ایک پرانے بزرگ سے سنا ہے کہ مولانا کا جن دنوں دہلی میں قیام تھا تو مولانا کی بے سروسامانی کا یہ حال تھا کہ ائمہ مساجد (احباب) کے پاس تشریف لے جاتے تو خاموشی سے خشک روٹیوں کے ٹکڑے اکٹھے کر لاتے اور پھر ان کو بھگو کر انہیں پر گزارہ کرتے۔ ان حالات میں بھی استغناء برقرار رکھا اور کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد الفقر فخری کا نمونہ تھے۔

آپ نے اپنی زندگی کے آخری چھبیس برس مدینہ منورہ میں گزارے آپ کو جنت البقیع میں دفن ہونے کا بہت ہی شوق تھا اسی لئے آپ حجاز سے باہر نہیں جاتے تھے اور اپنی علالت کے بعد تو وہ اس میں بہت ہی احتیاط فرماتے تھے۔

آپ کا انتقال پُر ملال ۱۳ر رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ کو ہوا روزہ کے ساتھ، قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے مسنون طریقہ پر سوئے اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عالمِ راحت و امن میں چلے گئے۔ نماز تراویح کے بعد مسجد نبوی میں آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور آپ کی خواہش بھی اللہ تعالیٰ نے پوری فرمادی کہ آپ کو جنت البقیع میں حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی مدفن ملا رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔

یا اللہ! ہم سب کو بھی ایمان کے ساتھ جنت البقیع کا مدفن نصیب فرما۔ آمین

میرے چھوٹے بھائی عزیز القدر حافظ محمد عثمان سلمہٗ کو آپ کی نماز جنازہ میں شرکت نصیب ہوئی۔ دوسرے روز اس کو خواب میں حضرت مولانا کی زیارت ہوئی تو عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو گئے؟ آپ نے سر ہلا کر جواب دیا کہ ہاں راضی ہو گئے ہیں اور مجھے آرام کرنے کا حکم ہوا ہے، علماء نے اس کی تعبیر یہ بتلائی کہ یہ راحت سے کنایہ ہے۔

اللہ پاک حضرت مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے، اعلیٰ مقامات نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

احقر محمد اسحٰق عفی عنہ

اظہار تشکر

مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ

مبسملاً ومحمداً ومصلیاً ومسلماً

تفسیر انوار البیان جب احقر نے لکھنی شروع کی تھی بظاہر کوئی انتظام اس کے شائع ہونے کا نہ تھا۔ بعض ناشرین سے اس کی اشاعت کے لئے درخواست کی تو عذر پیش کر دیا۔ احقر کی کوشش جاری رہی حتیٰ کہ حافظ محمد اسحٰق صاحب دام مجدھم مالک ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان کی خدمت میں معروض پیش کی تو وہ بشاشت قلب کے ساتھ پوری طرح اس کی اشاعت کے لئے راضی ہو گئے احقر نے مسودہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جس کی انہوں نے کتابت شروع کرادی اور کتابت، تصحیح اور طباعت کے مراحل سے گزر کر جلد دوم جلد ہی شائع ہو گئی جو ناظرین کے سامنے ہے، یہ حافظ صاحب موصوف کی مسلسل محنت اور جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ جل شانہٗ ان کی مساعی کو قبول فرمائے اور انہیں دنیا اور آخرت کی خیر نصیب فرمائے اور ان کے ادارہ کو بھی بھرپور ترقی عطا فرمائے۔

افریقہ کے بعض احباب نے تفسیر کی کتابت کے لئے بھرپور رقم[1] عطا فرمائی (جو اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے) اللہ جل شانہٗ ان سے راضی ہو جائے اور ان کے اموال میں برکت عطا فرمائے۔ اور انہیں اور ان کی اولاد کو اعمالِ صالحہ کی توفیق دے اور رزق حلال وسیع نصیب فرمائے۔ ان کے علاوہ اور جس کسی نے بھی اس تفسیر کی اشاعت میں دامے درمے قدمے کسی قسم کی شرکت فرمائی خصوصاً وہ احباب جنہوں نے اس تالیف میں میری مدد کی اور تسوید وتبییض کے مراحل سے گزارنے میں میرے معاون بنے اور مراجعت کتب میں میرا ساتھ دیا۔ میں سب کا شکر گزار ہوں اور سب کے لئے دعا گو ہوں۔ اللہ جل شانہٗ ان سب کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

محتاج رحمت لامتناھی

محمد عاشق الٰہی بلند شہری

عفا اللہ عنہ و عافاہ وجعل آخرتہ خیرامن اولاہ

---

[1] اس رقم کی مولانا کے مشورہ سے جلد اوّل تقسیم کردی گئی تھی۔ (ادارہ)

تکمیل تفسیر پر
حضرت مؤلف رحمہ اللہ کا مکتوب گرامی

محترمی جناب حافظ محمد اسحاق صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بالعافیۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

انوار البیان کی آخری جلد پہنچی جو آپ نے بڑی ہمت اور محنت سے اس کی طباعت اور اشاعت پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام تک پہنچائی۔ حسنِ خط، حسنِ طباعت، حسنِ تجلید سب دیکھ کر بہت زیادہ دل خوش ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اشاعتیں اور زیادہ حسن و جمال کا پیکر ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ شانہ آپ کی محنت کو قبول فرمائے اور انوار البیان کو امت مسلمہ میں قبولیت عامہ نصیب فرمائے۔ بعد کی اشاعتوں میں تصحیح کا اور زیادہ خصوصی اہتمام فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا و آخرت میں خیر سے نوازے اور علوم نافعہ و اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آئندہ ہمیشہ انوار البیان کو شائع فرماتے رہیں اور امت مسلمہ تک پہنچاتے رہیں۔ آمین! (والسلام)

محمد عاشق الٰہی عفا اللہ عنہ

المدینۃ المنورہ (یکم محرم الحرام ۱۴۲۱ھ)

فہرست مضامین

(سورة الفاتحة و سورة البقرة)

تمت فهرس المجلّد الاوّل

لتفسير انوار البيان والله الموفق وهو المستعان

سورة الفاتحة

و

سورة البقرة

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعُ اٰيَاتٍ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ

سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں جو پروردگار ہے سارے جہانوں کا' جو سب سے بڑا مہربان بہت

الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ

زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ مالک ہے روزِ جزا کا' ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں'

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں' چلا ہم کو سیدھے راستہ پر'

الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ

جو اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے انعام فرمایا'

الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

جن پر غصہ نہیں کیا گیا اور جو گمراہ نہیں ہیں

سورۂ فاتحہ کے اسماء اور فضائل

سورۂ فاتحہ مکی ہے، بعض علماء نے اسے مدنی بھی کہا ہے اور بعض علمائے تفسیر نے فرمایا ہے کہ یہ سورت دوبار نازل ہوئی ہے ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں' اس سورت کے بہت سے نام ہیں سب سے زیادہ مشہور نام الفاتحہ ہے۔

تفسیر اتقان میں پچیس نام ذکر کیے ہیں جن میں سے چند نام یہ ہیں۔

(۱) فاتحۃ الکتاب (۲) فاتحۃ القرآن (۳) ام الکتاب (۴) ام القرآن (۵) السبع المثانی (۶) سورۃ المناجاۃ (۷) سورۃ السّوال (۸) سورۃ الحمد (۹) سورۃ الشکر

سورۂ حجر میں فرمایا ہے: وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ○

(اور ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں۔ جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا)

السبع (سات) اس لئے فرمایا کہ اس میں سات آیات ہیں اور مثانی اس لئے فرمایا کہ یہ سورت بار بار پڑھی جاتی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ص ۶۴۲ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ سُورہ فاتحہ کا نام ام الکتاب اس لئے رکھا گیا کہ یہ مصاحف میں بالکل شروع میں لکھی جاتی ہے اور نماز میں بھی اس سے قراءت شروع کی جاتی ہے اور سورۂ فاتحہ کی یہ بھی بہت بڑی فضیلت ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

احادیث شریفہ میں سورۂ فاتحہ کی بہت سی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں صحیح بخاری ص ۶۴۲ ج ۲ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سورۂ فاتحہ کو اعظم سُورۃ فی القرآن (یعنی قرآن کی عظیم ترین سورت) فرمایا سُنن ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سورۂ فاتحہ کے بارے میں فرمایا کہ اللہ کی قسم اس جیسی سورت نہ توریت میں اُتاری گئی نہ انجیل میں نہ زبور میں نہ قرآن میں (باب ماجاء فی فضل فاتحۃ الکتاب) حاکم نے متدرک میں روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سورۂ فاتحہ کو افضل القرآن بتایا۔ (درمنثور) بعض احادیث میں سورۂ فاتحہ کو دو تہائی قرآن کے برابر فرمایا ہے۔ (درمنثور ص ۵ ج ۱)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چار چیزیں اُس خزانہ سے اُتاری گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے ان چار کے علاوہ اس میں سے کوئی چیز نہیں اُتاری گئی (۱) اُم الکتاب (۲) آیۃ الکرسی (۳) سورۂ بقرہ کی آخری آیات (۴) سورۂ کوثر (درمنثور ص ۵ ج ۱ عن الطبرانی والضیاء المقدسی فی المختارۃ)

حضرت مجاہد تابعیؒ نے فرمایا کہ ابلیس ملعون چار مرتبہ رویا' ایک تو اس وقت رویا جب سورۂ فاتحہ نازل ہوئی' دوسرے اُس وقت جب وہ ملعون قرار دیا گیا' تیسرے جب زمین پر اُتارا گیا' چوتھے جب سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ (درمنثور)

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام فخر عالم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی' حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی نظر آسمان کی طرف اُٹھائی اور کہا کہ یہ آسمان کا ایک دروازہ کھولا گیا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا تھا' ایک فرشتہ نازل ہوا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ یہ ایک فرشتہ ہے جو آج

سے پہلے کبھی زمین پر نہیں اُترا۔ اس فرشتہ نے آنحضرت ﷺ کو سلام کیا اور عرض کیا کہ آپ خوش خبری سن لیجئے' دو نور آپ کو ایسے ملے ہیں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملے (۱) فاتحۃ الکتاب (۲) سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں (ان میں دعاء ہے اور چونکہ یہ دعا اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی ہے اس لئے مقبول ہے) ان دونوں میں سے جو کچھ بھی آپ تلاوت کریں گے اللہ تعالیٰ ضرور آپ کا سوال پورا فرمائیں گے تفسیر اتقان میں ہے کہ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ میں (اجمالی طور پر) قرآن شریف کے تمام مقاصد اور مضامین جمع کر دیئے ہیں یہ سورت مطلع القرآن ہے اور یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ سورت پورے قرآن شریف کیلئے براعت استہلال کا حکم رکھتی ہے۔ تفصیل اسکی یہ ہے کہ قرآن شریف اور تمام آسمانی ادیان چار علوم پر مشتمل ہیں اوّل علم الاصول جس میں تین چیزیں ہیں (۱) اللہ پاک کی ذات وصفات کو جاننا' اسکی طرف سورۂ فاتحہ میں شروع کی دو آیتوں میں اشارہ ہے۔ (۲) نبوت ورسالت' اس کی طرف اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں اشارہ ہے (۳) قیامت' اس کی طرف مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں اشارہ ہے۔ دوم علم العبادات' اس کی طرف اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں اشارہ ہے۔ سوم علم السلوک یعنی نفس کو آدابِ شرع کا پابند بنانا اور احکام خداوندی کی فرماں برداری پر آمادہ کرنا اس کی طرف وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں اشارہ ہے۔ چہارم علم القصص یعنی گزشتہ اُمتوں کے واقعات' ان واقعات سے یہ غرض ہے کہ فرماں برداروں کی سعادت وکامیابی اور نافرمانوں کی بدبختی وبربادی معلوم کر کے عبرت حاصل کی جائے' اس مقصد کی طرف صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں ارشاد ہے۔

مسلم شریف ص ۱۷۰ ج ۱ میں ہے کہ آنحضرت فخر عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے نماز کو (یعنی نماز کے اہم ترین حصہ کو) اپنے اور بندہ کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے اور بندہ جو سوال کرے اس کے لئے وہی ہے (اس کے بعد اس تقسیم کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ) جب بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں حَمِدَنِىْ عَبْدِىْ (یعنی میرے بندہ نے میری تعریف کی) پھر جب وہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَثْنٰى عَلَىَّ عَبْدِىْ (یعنی میرے بندہ نے میری بڑائی بیان کی) پھر جب وہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مَجَّدَنِىْ عَبْدِىْ (یعنی بندہ نے میری بزرگی بیان کی) پھر جب وہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور میرا بندہ جو سوال کرے اس کے لئے وہی ہے (یہ آیت اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جہاں بندہ نے اپنی بندگی کا اعلان اور اقرار کیا اور مدد مانگنے کے لئے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو خاص کر لیا اور مان لیا اور اس طرح خود کو رحمت ونعمت کی نوازش کے قابل بنا لیا وہاں اس نے بلاشرکت غیرے اللہ پاک کی معبودیت کا بھی اعلان کیا اور یہ بھی مانا اور جانا اور دوسروں کو بتایا کہ جس سے مدد مانگی جائے وہ صرف اللہ پاک رؤف ورحیم احد وصمد ہے جو سب کچھ دے سکتا ہے اور جس کے سب محتاج ہیں اور جس کے قبضہ میں ہر چیز ہے اور جس کسی کے پاس قلیل وکثیر جو کچھ بھی ہے سب اسی کا دیا ہوا ہے) پھر جب بندہ کہتا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ تو اللہ

تعالیٰ فرماتے ہیں یہ میرے بندہ کے لئے ہے اور میرا بندہ جو سوال کرے اس کے لئے وہی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

تعوذ اور تسمیہ کا بیان:

جب قرآن مجید کی تلاوت شروع کی جائے تو اوّل اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ پڑھا جائے سورۂ نحل میں ارشاد ہے فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ (سو جب تو قرآن پڑھنا شروع کرے تو اللہ کی پناہ مانگ شیطان مردود سے) اور اس کے بعد بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ پڑھا جائے۔

جب کسی مکان میں رہنے کا ارادہ کیا جاتا ہے تو اس کو تکلیف دینے والی چیزوں سے صاف ستھرا کرتے ہیں پھر اس کو زینت دیتے ہیں یعنی رنگ و روغن کرتے ہیں۔ اسی طرح سے جب تلاوت شروع کریں تو پہلے اپنے دل کو شیطان مردود کے وسوسوں سے پاک کریں۔ اس کے لئے اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ (آخر تک) پڑھی جائے پھر اللہ کا نام لے کر دل کو مزین کریں۔ نماز میں سب سے پہلے سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور اس کو شروع کرنے سے پہلے دل کو شیطانی وسوسوں سے صاف کیا جاتا ہے اور اللہ کے نام سے دل کو مزین کیا جاتا ہے۔ جب آدمی نماز شروع کرے تو اُن چیزوں سے ذہن فارغ کرلے جن میں شیطان لگائے رہتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل بنانے والی ہیں۔

سورۂ فاتحہ کے علاوہ بھی جب بھی کوئی سورت شروع کرے۔ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ پڑھے' البتہ سورۂ انفال ختم کر کے سورۂ براءت شروع کرے تو بسم اللہ نہ پڑھے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ قرآن شریف کی ایک آیت ہے جو سورتوں کے درمیان فصل کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے۔ لیکن سورۂ فاتحہ یا اس کے علاوہ کسی دوسری سورت کا جزو نہیں ہے' البتہ سورۂ نمل کے دوسرے رکوع میں جو ایک جگہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ہے وہ سورۂ نمل کا جزو ہے۔ ساری اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ سورۂ فاتحہ میں سات آیات ہیں جو حضرات بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کو سورۂ فاتحہ کا جزو مانتے ہیں وہ اس کو ایک آیت شمار کرتے ہیں اور اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ سے لے کر ختم سورت تک چھ آیات شمار کرتے ہیں (حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہی مذہب ہے) اور جن ائمہ اور قراء کے نزدیک بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں ہے ان کے نزدیک غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ساتویں آیت ہے۔ (معالم التنزیل)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کو سورت ختم ہونے کا علم نہ ہوتا تھا جب تک بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ نازل نہ ہو جاتی تھی جب بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کا نزول ہوتا تو آپ سمجھ لیتے تھے کہ

سورت ختم ہوگئی اور اب نئی سُورت شروع ہو رہی ہے۔ (در منثور)

تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ بِسم اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ہر سورت کے شروع میں ہونا اللہ پاک کی طرف سے بندوں کو تعلیم ہے کہ قرأت سے پہلے اس کو پڑھیں اور قراءت شروع کرنے کا اَدب جان لیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱﴾
سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے خاص ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے

سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں:

اوّل کی تین آیات میں اللہ پاک کی تعریف اور اسم ذات اور اللہ پاک کی بڑی بڑی صفات ذکر کی گئی ہیں جو دیگر صفات کمالیہ کو بھی شامل ہیں۔

سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہیں۔ اس دعویٰ کو واضح اور ثابت کرنے میں مذکورہ صفات کو بڑا دخل ہے یعنی جو ذاتِ پاک ایسی ایسی صفات سے متصّف ہے ظاہر ہے کہ ہر تعریف کی مستحق ہے۔ جتنی تعریفیں آج تک ہوئی ہیں یا آئندہ دنیا و آخرت میں ہوں گی در حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تعریف کسی نے کی ہے یا آئندہ کوئی کرے گا اس کا اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہونا تو ظاہر ہے اور جو تعریفیں اسکی مخلوق کی کی جاتی ہیں یا آئندہ کی جائیں گی یا گزشتہ تمام زمانوں میں ہو چکی ہیں وہ بھی در حقیقت اللہ پاک کی ہی تعریفیں ہیں کیونکہ ہر صاحب کمال کو اُس نے وُجود بخشا ہے اور کمال سے نوازا ہے اور کمال اور صاحب کمال کی پرورش فرمائی ہے اور اپنی رحمت سے ان کمالات کو باقی رکھا ہے لِلّٰہ میں لام اختصاص اور استحقاق کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ محمود حقیقی اور مستحق حمد اللہ تعالیٰ ہی ہے اگر کوئی اللہ کی حمد نہ کرے تو اس کی محمودیت حقیقیہ میں ذرا فرق نہیں آتا۔

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا معنی اور مطلب:

رَب عربی زبان میں بمعنی مالک بھی آتا ہے اور بمعنی پروردگار (پالنے والا) بھی آتا ہے (معالم التنزیل) یہاں دونوں معنی درست ہیں۔ اللہ پاک تمام جہانوں کے مالک ہیں اور پالنے والے بھی۔ اَلْعٰلَمِيْنَ عالم کی جمع ہے۔ عالم (بروزن فاعل بفتح العین) علم سے لیا گیا ہے۔ عربی قاعدہ کی رو سے فاعَل کا وزن مادۂ اشتقاق کے آلہ کے لئے آتا ہے عالم کا مادۂ اشتقاق علم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق عالَم ہے اس لئے کہ اپنے خالق (پیدا کرنے والے) کے معلوم ہونے کا ذریعہ ہے یُوں تو ساری مخلوق بہ حیثیت مخلوق کے ایک عالَم ہے لیکن مخلوق کی بے شمار قسمیں ہیں۔ ہر قسم کو علیحدہ علیحدہ عالم قرار دیکر جمع (عالمین) لائی گئی تو گویا اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ خدائے پاک کے جاننے اور پہچاننے کے لئے ایک عالم (بلکہ اس کا ایک ذرّہ بھی) کافی ہے لیکن عالَم اتنے زیادہ اور بیشمار ہیں کہ ان کو دیکھ کر اگر کوئی کوڑھ

مغز بد باطن خدائے پاک کو نہ پہچانے تو اس کی محرومی، بد نصیبی، جہالت اور حماقت کے سوا اور کیا ہے۔ ہر ہر جنس کو ایک عالم بتا کر اللہ پاک کو سب عالموں کا رب بتانے میں ان مشرکوں اور جاہلوں کی بھی تردید ہے جو بعض مخلوقات کو معبود مانتے ہیں اور خالق کو چھوڑ کر مخلوق و مملوک کے سامنے جبین نیاز رکھتے ہیں۔ مقاتل بن حبان نے فرمایا کہ عالم اسی ہزار ہیں، چالیس ہزار خشکی میں اور چالیس ہزار سمندر میں۔

حضرت وہب بن منبہ نے فرمایا کہ عالموں کی تعداد اٹھارہ ہزار ہے لیکن صحیح بات وہ ہے جو جناب کعب الاحبار نے فرمائی کہ عالموں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا انہوں نے اپنے استدلال میں یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ (معالم التنزیل)

اللہ جل شانہٗ سارے جہانوں کا خالق بھی ہے اور مالک بھی۔ اور پرورش کرنے والا بھی اس نے صرف وجود ہی نہیں دیا بلکہ مخلوق کو زندہ رکھنے کے اسباب بھی پیدا فرمائے۔ وہ رزق بھی دیتا ہے کھلاتا پلاتا بھی ہے ہر فرد تک رزق پہنچاتا ہے۔ جب کھانے والا رزق کھالیتا ہے تو وہ اس رزق کو پچاتا ہے جس سے جسم بڑھتا ہے خون پیدا ہوتا ہے رگوں میں دوڑتا ہے اور یہ سب بقائے حیات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جتنے بھی اسباب معاش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائے ہیں، ان سب سے شان ربوبیت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ نئی نئی تحقیقات سے اجسام کے پلنے بڑھنے کے جو راز منکشف ہوئے ہیں انسانی عقل و شعور کے لئے بہت حیرت ناک ہیں۔ زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں کو دیکھا جائے۔ طرح طرح کے غلے پھل اور میوے مختلف سبزیاں ترکاریاں وجود میں آرہی ہیں انسان اور جانوران کو کھاتے ہیں اور پرورش پاتے ہیں۔ جس کا جو رزق مقرر ہے وہ اس کو ضرور پہنچ کر رہتا ہے ایک براعظم کی پیداشدہ چیزیں دوسرے براعظم کے لوگ کھا کر اور استعمال کر کے جی رہے ہیں۔

پالنے کے مفہوم میں صرف جسمانی غذائیں ہی نہیں آتیں بلکہ ہر وہ چیز آجاتی ہے جو زندگی اور بقا کا ذریعہ ہو۔ اجسام کی پرورش کے ساتھ رُوح کی پرورش بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو زندگی کے لئے اصل چیز ہے اور جو معیشت کے آلات اور اسباب ہیں اور جو جسم کے اعضاء اور جوارح ہیں یہ سب پرورش کا ذریعہ ہیں۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳
بہت بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ روزِ جزا کا مالک ہے

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ:

یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں رحم سے مشتق ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ دونوں کا ایک معنی ہے اور اکثر علماء یہ فرماتے ہیں کہ رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے چونکہ دونوں ہی مبالغہ کے صیغے ہیں اس لئے ہر ایک کے ترجمہ میں معنی مبالغہ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ رَحْمٰن اللہ پاک کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے رحیم اللہ تعالیٰ کے علاوہ اسکی مخلوق کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے کما قال تبارک وتعالیٰ فی شان نبیه علیه الصلوٰة والسلام بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ کا برابر مظاہرہ ہوتا رہتا ہے وہ ساری مخلوق پر رحم فرماتا ہے' سب کا وجود اور بقا آرام و سکون سب اسی کی رحمت سے ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

دین جزا اور بدلہ کو کہتے ہیں یَوْمِ الدِّیْنِ بدلہ کا دن۔ اس سے قیامت کا روز مُراد ہے۔ اس روز خیر و شر کے بدلوں کا فیصلہ ہوگا۔ ہر شخص اپنے اپنے عمل کا نتیجہ پائے گا۔ اللہ پاک کے رحم و کرم کے سوا کوئی راستہ جان چھوٹنے کا نہ ہوگا اگر کوئی سفارش کرنا چاہے گا تو بغیر اجازت مالک یوم الدین جل مجدہٗ سفارش نہیں کر سکے گا، اس روز کسی کی مجازی حکومت و حاکمیت بھی نہ ہوگی۔ قال اللہ تعالیٰ شانہٗ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وقال جل جلالہ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ وقال عزاسمہ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ. اللہ تعالیٰ شانہ صرف قاضی یوم الدین ہی نہیں بلکہ مالک یوم الدین بھی ہے بعض مرتبہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ قاضی (جج) فیصلہ تو کرتا ہے مگر ملک اور قانون کا مالک نہیں ہوتا۔ بادشاہ ملک یا مجلس قانون ساز کے مرتب کردہ دستور کا پابند ہوتا ہے اور اسی کے دائرہ قانون میں فیصلہ کرتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ مالک الملک ہے قاضی روزِ جزا ہے اور مالک روزِ جزا بھی۔ اس پر کسی کا کوئی قانون اور کوئی حکم لاگو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ رَد نہیں ہوسکتا۔ اس کے خلاف اپیل نہیں ہوسکتی۔ وہاں دنیا کے حاکموں اور فیصلے کرنے والوں کے فیصلے بھی ہوں گے اور جانوروں تک نے جو ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کی ہوگی اس کا بھی فیصلہ ہوگا۔ دنیا کے بادشاہ اور بڑے بڑے تسلط اور دبدبہ والے مجرموں کی صف میں کھڑے ہوں گے اور اپنے اپنے عمل اور کردار کا فیصلہ سُنیں گے اور اس فیصلے کے مطابق عمل ہوگا۔ لا معقب لحکمہ وھو سریع الحساب۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں

معبود اور مستعان صرف اللہ کی ذات ہے:

شروع سورت سے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کا بیان تھا۔ اس بیان میں اگرچہ غیب کا عنوان تھا لیکن جب بندہ نے مستحق حمد کی حمد بیان کرنے میں صفات کمال اور مظاہر جلال و جمال کا یقینی طور پر تصور کرلیا تو اس مستحق حمد سے خطاب کرنے اور مُراد مانگنے کے لئے جذبہ میں آکر خطاب کرنے لگا' اوّل مخاطب ہوکر یہ اعلان کیا کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں' اور پھر اپنی سب سے بڑی ضرورت کا سوال کیا کہ ہم کو صراط مستقیم دکھا دے اور بتا دے' کاف ضمیر خطاب نَعْبُدُ اور نَسْتَعِيْنُ کا مفعول ہے اس کو ضمیر منفصل بنا کر فعل سے مقدم لانے سے معنی میں حصر پیدا ہوگیا۔ اہل بلاغت نے بتایا ہے کہ تقدیم ماحقہ التاخیر مفید حصر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ترجمہ یہ ہوگیا کہ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ پڑھنے والا گو واحد شخص ہوتا ہے۔ لیکن صیغہ جمع متکلم لاکر دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیتا ہے۔ اور اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ ساری مخلوق کا تو ہی معبود

ہے اور ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ جو لوگ مشرک ہیں وہ گمراہ ہیں اور غلطی پر ہیں اُنکا معبودِ حقیقی بھی تو ہے ہم ساری بنی نوع انسان کی طرف سے اور سارے جنات اور فرشتوں کی طرف سے بلکہ ساری مخلوق کی طرف سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ صرف تو ہی عبادت کے لائق ہے۔ اس کے بعد یوں عرض کیا کہ ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ جب خداوند قدوس جل مجدہ ہر چیز کا خالق بھی ہے مالک بھی ہے معبودِ حقیقی بھی ہے قادرِ مطلق بھی ہے تو اس کے سوا کوئی نہیں جس سے مدد مانگی جائے۔ عبادت بھی صرف اُسی کی کرتے ہیں اور مدد بھی صرف اسی سے لیتے ہیں اس میں بھی صیغہ خطاب کا استعمال کیا اور یہ اعلان کیا کہ اے اللہ ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تو ہی مدد کرنے والا ہے تیرے سوا کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معبود اور مددگار ماننے کے بعد کسی دوسرے کو عبادت اور استعانت (مدد مانگنے) کے لئے پکارنا اعلان اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس آیت میں شرک فی العبادۃ اور شرک فی الاستعانت دونوں کی نفی علے وجہ الکمال کر دی گئی ہے۔ دیوی دیوتا مزار قبر ولی پیر تعزیہ یا اور کسی چیز کو حاجت روا مشکل کُشا سمجھنا اور اسکے سامنے سجدہ کرنا شرک ہے۔

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝۵
ہم کو سیدھا راستہ دکھا

صراطِ مستقیم کی دعا:

راہِ حق کا دِکھانا اور مطلوب حق تک پہنچانا یہ سب کچھ ہدایت کے مفہوم میں داخل ہے۔ مدد مانگنے کے ذیل میں جہاں اور باتیں ہیں وہاں ہدایت کی طلب بھی ہے اور درحقیقت ہدایت ہی مخلوق کے لئے سب سے بڑی نعمت ہے اگر سب کچھ موجود ہو اور بندہ ہدایت پر نہ ہو عقیدہ اور عمل سے گمراہ ہو تو دنیاوی چیزوں سے تھوڑا بہت فائدہ اُٹھا کر عذاب دوزخ میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ اس اعتبار سے حقیقی نعمت ہدایت ہی ہوئی۔ لہٰذا یہ کہہ کر کہ ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں فوراً ہدایت کا سوال کرلیا گیا۔ یعنی صحیح راستہ پر چلانے کی دعا کرلی گئی۔ صحیح راستہ کون سا ہے اسکی تعیین کے لئے صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ لایا گیا جس کی تفسیر ابھی آتی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جو لوگ مؤمن ہیں قرآن کو مانتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں وہ تو ہدایت پر ہیں ہی ان لوگوں سے بار بار ہدایت کا سوال کیوں کرایا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہدایت یافتہ ہوتے ہوئے ہدایت کی دعا کرنا موت تک ہدایت پر جمے رہنے اور ثابت قدم رہنے کا سوال ہے جیسا کہ دوسری آیت میں اہل ایمان کی دعا کا اس طرح تذکرہ فرمایا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡھَدَیۡتَنَا وَھَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَھَّابُ (اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو حق سے نہ ہٹا دیجئے بعد اس کے کہ آپ نے ہمیں ہدایت دی اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا فرما دیجئے بے شک آپ بہت زیادہ دینے والے ہیں) قال النسفی ای ثبتنا علی المنهاج الواضح کقولک للقائم قم حتی اعود الیک ای اثبت علی ما انت علیه أو اهدنا فی الاستقبال کما هدیتنا فی الحال (مدارک التنزیل)

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ

راستہ ان حضرات کا جن پر آپ نے انعام فرمایا

صراطِ مستقیم والے کون حضرات ہیں:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ ان الفاظ میں صراطِ مستقیم کی تعیین کردی گئی۔ صراط مستقیم (سیدھا راستہ) کیا ہے جتنی جماعتیں اور قومیں دنیا میں بسی ہیں وہ اپنے آپ کو ہدایت پر ہی سمجھتی ہیں۔ لیکن وہ کون سا راستہ ہے جسے سیدھا راستہ مانا جائے اور جس پر چلنے سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی اور آخرت میں نجات ہوگی۔ اس کے بتانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کا راستہ صراط مستقیم ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ یہ حضرات کون ہیں ان کا ذکر سورۂ نساء کی اس آیت میں ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے یہ اشخاص اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء' صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں) اس سے واضح ہوگیا کہ ان حضرات پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں ان ہی حضرات کے راستہ کو صراطِ مستقیم یعنی صحیح اور سیدھا راستہ بتایا ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

جن پر غصہ نہیں کیا گیا اور جو گمراہ نہیں ہیں

مغضوب علیہم اور ضالین کے راستہ سے بچنے کی دعاء:

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ (جن پر غصہ نہیں کیا گیا اور جو گمراہ نہیں ہیں) یہ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی صفت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ جن حضرات پر آپ نے انعام فرمایا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن پر آپ کا غصہ نہیں اور جو گمراہ نہیں ہیں۔ مفسر ابن کثیر نے بعض روایات ایسی نقل کی ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے یہود اور اَلضَّآلِّيْنَ سے نصاریٰ مراد ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ یہودیوں کے بارے میں سورۂ بقرہ میں فرمایا فَبَآءُوْا بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ کہ وہ غصہ پر غصہ کے مستحق ہوئے اور نصاریٰ کے بارے میں سورۂ مائدہ میں فرمایا۔

وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو پہلے گمراہ ہو چکے ہیں اور انہوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور سیدھے راستہ سے بھٹک گئے) یہودیوں نے علم ہوتے ہوئے عمل کو کھو دیا اور حق کو ٹھکرا دیا' نصاریٰ علم کے مدعی نہ تھے اور علم سے خالی بھی تھے لیکن اپنے

آپ کو عبادت گزار سمجھتے تھے۔ اُن کے راہب پہاڑوں میں رہتے تھے اور عبادت میں طرح طرح کی مشقتیں جھیلتے تھے اور عبادت کے طریقے اُنہوں نے خود نکالے تھے۔ یہ لوگ راہِ حق سے ہٹے اور گمراہ ہوئے' جو شخص علم ہوتے ہوئے عمل چھوڑ دے وہ زیادہ مستحق غضب ہوتا ہے اس لئے صفت مغضوبیت یہودیوں کے لئے خاص طور سے ذکر کی گئی اور نصارٰی نے عمل کا ارادہ تو کیا لیکن بے علمی کی وجہ سے طریقہ غلط اختیار کر گئے اور اتباع حق کو چھوڑ کر بے راہ ہو گئے۔

مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اہل ایمان کا طریقہ یہ ہے کہ حق کا علم بھی ہو اور اس پر عمل بھی ہو' پھر لکھتے ہیں۔ **و كل من اليهود و النصارى ضال مغضوب عليه لكن اخص اوصاف اليهود الغضب واخص اوصاف النصارى الضلال** (ج ۱ص ۲۹) یعنی ہیں تو دونوں ہی فریق (یہود و نصارٰی) گمراہ اور مغضوب علیہ' لیکن مغضوبیت کی شان یہودیوں میں زیادہ ہے (اس لئے خصوصیت کے ساتھ اُن کی طرف مغضوبیت کی نسبت کی گئی) اور نصارٰی کے اوصاف میں خاص طور پر ضلال زیادہ واضح ہے (اس لئے ان کو ضَالِّينَ فرمایا)

یہودیوں کی شرارت' عناد اور مکاریاں اور دسیسہ کاریاں جو سورۂ بقرہ میں اور دُوسری سورتوں میں بیان کی گئی ہیں اُن کے جاننے کے بعد ہر صاحب عقل یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ لوگ قصداً و ارادۃً ایسی حرکتیں کرتے تھے جن سے اللہ تعالیٰ کے غصہ کے زیادہ سے زیادہ مستحق ہوتے چلے گئے۔

سورۂ فاتحہ کے ختم پر اہل ایمان سے یہ دُعاء کرائی گئی ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں دونوں جماعتوں کے طریقوں سے علیحدہ اور بیزار رہیں۔ نماز میں بار بار سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں اور یہود و نصارٰی کے طریقوں سے بچنے کی دعا مانگتے ہیں۔ اب مسلمان غور کر لیں کہ وہ ان دونوں جماعتوں کے طور طریق سے کس قدر دور ہیں اور جن حضرات پر انعام ہوا یعنی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور صدیقین اور صالحین ان کے طریقوں سے کتنے قریب ہیں۔ حکومت' سیاست' معاشرت' شکل وصورت' لباس' کسب مال' تجارت' معیشت و معاشرت غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں غور کر لیں۔ اُمت محمدیہ میں یہود و نصارٰی کی مُشابہت اور انکا اتباع پایا جاتا ہے عوام میں بھی اور خواص میں بھی' جو لوگ نماز پڑھتے ہیں اور نماز میں دُعا کرتے ہیں کہ ہمیں مغضوب علیہم اور ضالین کے راستہ سے بچا وہ لوگ بھی ان کے اتباع سے پرہیز نہیں کرتے۔ بعض اکابر نے فرمایا ہے کہ اس اُمت میں سے جو عالم بگڑے گا اس کے اندر یہود کی صفات سے مشابہت ہوگی اور جو عابد بگڑے گا اس کے اندر نصارٰی کی مشابہت ہوگی در حقیقت صحیح فرمایا اُمت کا حال نظروں کے سامنے ہے جو مغضوب ہیں اور ضالین ہیں عام لوگوں کو انہیں کے طریقے محبوب ہیں (اعاذنا اللہ من ذٰلک)

جن حضرات پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ان کے راستہ کے علاوہ جتنے بھی دین' مذہب' فرقے' جماعتیں' پارٹیاں' قوانین ہیں سب ہی صراطِ مستقیم سے خارج ہیں اور مومن موحد کے لئے ان سب سے بچنا فرض و واجب ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ یہود و نصارٰی کے راستہ سے بچنے کی دعاء مانگنے کی اس لئے تلقین کی گئی کہ ایک مسلمان بُت پرست دہری منکرِ خدا ہونا گوارا نہیں کر سکتا اور اہل کتاب کے راستوں کو اختیار کر سکتا ہے' اہل کتاب کے دونوں فرقوں کا نام نہیں لیا گیا بلکہ ان کے انجام کار ہی کو ان کا لقب بنا کر ذکر فرما دیا' جس میں دو امر کی طرف اشارہ ہے' اوّل یہ کہ انبیاء صلحاء صدیقین

وشہداء کے راستہ سے ہٹنے کا انجام راہ سے بھٹک جانا اور خدائے پاک کے غصہ میں آ جانا ہے۔ دوسرے یہ کہ صراطِ مستقیم کے خلاف صرف یہود و نصاریٰ ہی کا راستہ نہیں ہے بلکہ جو بھی یہود و نصاریٰ کے عقائد و کردار اوصاف واخلاق اختیار کرے گا اس کے نتیجہ میں مغضوب علیہ اور ضالّ ہوگا (خواہ فرد ہو خواہ جماعت) لہٰذا اسکے راستہ سے بچنا بھی فرض ہوگا۔

آمین: سورۂ فاتحہ کے ختم پر نماز میں اور خارج نماز آمین کہنا مسنون ہے اور اس کے علاوہ بھی جو دعاء کی جائے اس کے آخر میں آمین کہا جائے۔ احادیث شریفہ میں اس کی فضیلت اور ترغیب وارد ہوئی ہے۔ آمین کا معنی ہے کہ اے اللہ قبول فرما۔ ایک مرتبہ دعا کی پھر دعا کی قبولیت کی دعا کی یہ مل کر گویا دو مرتبہ دعا ہو جاتی ہے۔

معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے بعد ذرا ٹھہر کر آمین کہے (تا کہ سورۃ فاتحہ کا جزو ہونے کا ایہام نہ ہو) چونکہ آمین قرآن مجید کا جز و نہیں ہے اس لئے قرآن مجید میں لکھا نہیں جاتا لیکن پڑھا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہودیوں نے تمہاری کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کیا جتنا آمین کہنے پر حسد کیا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہودیوں نے تم سے تین چیزوں پر حسد کیا ہے۔ ۱ سلام کو پھیلانا ۲ نماز میں صفیں قائم کرنا ۳ آمین کہنا۔ (یہ روایات درمنثور سے نقل کی گئی ہیں)

فائدہ: بعض غیر مسلموں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اپنی تعریف خود کرنا ٹھیک نہیں ہے پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی تعریف خود کیوں کی؟ اس کا یہ جواب مفسرین کے اس قول سے نکل سکتا ہے کہ یہ مضمون بندوں کی زبانی ادا کرایا گیا ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے پہلے قُوْلُوْا (صیغہ امر) مقدر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کو حکم فرمایا ہے کہ یوں کہو اور چونکہ بندہ کی زبانی اول کی تین آیات ادا کرائی گئی ہیں اس لئے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ بھی اوّل کی تین آیات کے ساتھ اس صورت میں مضمون واحد ہو کر مسلسل ہو جائے گا۔ لیکن یہ جواب جزوی طور پر سورۂ فاتحہ کے بارے میں ہو سکتا ہے' قرآن شریف میں جگہ جگہ اللہ پاک کی حمد بیان کی گئی ہے اور حدیث شریف میں صاف اس طرح آیا ہے کہ لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک۔ (اے اللہ میں ایسی تعریف تیری بیان نہیں کر سکتا ہوں جیسی تو نے اپنی تعریف بیان کی ہے) اس سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی تعریف بیان کرتے ہیں' پس غیر مسلموں کے سوال مذکور کا ایسا ٹھیک کلی جواب جو ہر موقعہ پر جواب بن سکے یہ ہے کہ خالق کو مخلوق پر قیاس کرنا ہی غلط ہے۔ بلاشبہ مخلوق کے لئے خود ستائی بُری بات ہے لیکن خالق اگر اپنی تعریف کرے تو یہ کوئی بے جا نہیں ہے' بلکہ صحیح اور دُرست ہے۔ اوّل اس پر غور کرنا چاہئے کہ خود ستائی بُری چیز کیوں ہے؟ اسکی وجہ غور کرنے اور اہل عقل و دانش کے بتانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خود ستائی سے عُجب (خود پسندی) اور تکبر پیدا ہوتا ہے اور خالق کمالات رب العالمین جل مجدہٗ سے غفلت ہو جاتی ہے اور انسان کا ذہن خالق کی حمد اور خالق کے کمالات سے ہٹ کر خود اپنی ذات میں اُلجھ جاتا ہے' اور رب العٰلمین' خالق کل شی اپنی خود تعریف کرے تو یہ کسی خرابی کا باعث نہیں ہے اللہ پاک سے اُوپر کوئی نہیں ہے اور وہ ایسا بڑا ہے کہ سب کی بڑائیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں اور ہر بڑے کو اس نے بڑائی دی ہے۔ لفظ تکبر میں تکلّف کے معنی پوشیدہ ہیں یعنی جو بڑا نہیں وہ بڑا بنے اس

کو تکبر کہتے ہیں۔ اللہ پاک کی بڑائی کامل ہے تکلف سے نہیں ہے وہ سب کا خالق ہے اس کا کوئی خالق نہیں ہے لہٰذا اس کو اپنی تعریف کا پورا پورا حق ہے۔ اگر وہ اپنی تعریف کرے تو یہ لازم نہیں آتا کہ جو بڑا نہیں اس نے بڑائی کا دعویٰ کیا اور یہ بھی لازم نہیں آتا کہ اپنے خالق کو چھوڑ کر اپنی تعریف میں مشغول ہوا۔ **فللّٰہ الحمد اولا و آخرا وظاھراً و باطِناً اللّٰھم لک الحمد لا احصٰی ثناء علیک انت کما اثنیت علٰی نفسک۔**

سُورۂ فاتحہ شفا ہے:

سورہ فاتحہ کا ایک نام شافیہ (یعنی شفا دینے والی ہے) بھی ہے اس کے مضامین جس طرح مومن موّحد کے لئے باطنی اور روحانی شفاء کا باعث ہیں اسی طرح اس کے الفاظ جسمانی امراض و تکالیف اور دُکھ درد کے لئے شفا بن جاتے ہیں حضرت سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے مرض سے نجات دلانے کے لئے سورہ فاتحہ پڑھ کر مجھ پر دم کرتے ہوئے تھتکار دیا' حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب زہر کے لئے شفا ہے حضرت عبدالملک بن عمیر نے (مرسلاً) روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب ہر مرض کے لئے شفاء ہے (یہ سب روایات درمنثور میں ہیں)

حصن حصین میں (ابوداؤد اور نسائی سے نقل کیا) ہے کہ جس کی عقل ٹھکانے نہ ہو تین روز صبح شام سورۃ فاتحہ کے ذریعہ جھاڑا جاوے (جھاڑنے والا) سورہ فاتحہ کو پوری پڑھ کر اپنا تھوک (منہ) میں جمع کرے تھتکار دے اور ترمذی شریف سے نقل کیا ہے کہ جس کو سانپ' بچھو ڈس لیوے سات مرتبہ سُورہ فاتحہ پڑھ کر جھاڑا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے چند صحابہ (سفر میں) ایک تالاب پر گزرے' وہاں ایک آدمی کو بچھو نے ڈس لیا تھا۔ وہاں جو قبیلہ مقیم تھا اُن میں سے ایک آدمی ان حضرات کے پاس آیا اور اُس نے کہا کیا تم میں کوئی شخص جھاڑ پھونک کرنے والا ہے۔ یہ سُن کر اُن حضرات میں سے ایک صاحب چلے گئے اور انہوں نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کر دیا اور کچھ بکریاں لینے کی شرط لگالی۔ وہ شخص اچھا ہو گیا' اور یہ بکریاں لے کر اپنے رفقاء کے پاس آ گئے۔ انہوں نے ان بکریوں کا لینا اچھا نہ جانا اور کہنے لگے کہ تم نے اللہ کی کتاب پر اُجرت لے لی۔ جب کہ مدینہ منورہ میں واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اُنہوں نے کتاب اللہ پر اُجرت لی ہے آپ نے فرمایا بلا شبہ کتاب اللہ ان سب چیزوں میں اُجرت لینے کے لئے زیادہ احق ہے۔ جن پر تم اُجرت لیتے ہو۔ (صحیح بخاری)۔

اس حدیث کی وجہ سے جھاڑ پھونک کی اُجرت لینا جائز ہے۔ بشرطیکہ کلام صحیح ہو شرکیہ کلام نہ ہو۔

رات کو حفاظت کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تو نے بستر پر اپنا پہلو رکھا اور فاتحۃ الکتاب اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (ختم سورت تک) پڑھ لی تو موت کے سوا ہر چیز سے تجھے امان مل گئی۔ (درمنثور)

ولقد تم تفسیر فاتحۃ الکتاب بحمد اللہ تعالٰی وحسن توفیقہ فلہ الحمد حمد اکثیرا طیبا مبارکا فیہ

3

سورۂ بقرہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی دو سو چھیاسی آیات اور چالیس رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ

الٓمّٓ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس میں ہدایت ہے متقیوں کے لئے۔ جو ایمان لاتے ہیں

وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ۝ وَالَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ

غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز کو اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں

وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ وَبِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّھِمۡ

اُس پر جو اُتارا گیا آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔ یہ لوگ

وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝

بڑی ہدایت پر ہیں اپنے رب کی طرف سے اور یہ لوگ ہی کامیاب ہیں

سورۃ البقرہ

مصحفِ عثمانی کی ترتیب کے لحاظ سے یہ دُوسری سورت ہے۔ اس سورت میں بقرہ کا تذکرہ ہے اس لئے سورۃ البقرہ کے نام سے موسوم ہوئی روایت حدیث میں اس کا یہ نام آیا ہے۔

فضائل سورہ بقرہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ (یعنی ذکر و تلاوت سے گھروں کو خالی نہ رکھو جیسا کہ قبریں خالی ہوتی ہیں) بے شک شیطان اُس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے (سنن ترمذی)

اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قرآن پڑھو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے لوگوں کے لئے سفارش کرنیوالا بن کر آئے گا۔ دو روشن چیزوں کو پڑھو (یعنی سورہ بقرہ اور سورۃ آلِ عمران کو) کیونکہ وہ دونوں قیامت کے دن اسی طرح آئیں گی جیسے بادل ہوں یا جیسے پرندوں کی دو جماعتیں صف بنائے ہوئے ہوں۔ اپنے لوگوں کے لئے خوب زوردار سفارش کریں گی۔ سورہ بقرہ کو پڑھو کیونکہ اس کا حاصل کر لینا برکت ہے اور اس کا چھوڑ دینا حسرت ہے اور وہ اہل باطل کے بس کی نہیں۔ (صحیح مسلم)

اہل باطل کے بس کی نہیں۔ یعنی وہ اسے حفظ نہیں کر سکتے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اہل باطل سے جادوگر مراد ہیں' مطلب یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے پڑھنے والے پر جادو کا اثر نہیں ہوسکتا۔ (ابن کثیر)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر چیز کا ایک بلند حصہ ہوتا ہے اور قرآن کا بلند حصہ سورۃ بقرہ ہے' اس میں ایک آیت ہے جو قرآن کی سب آیتوں کی سردار ہے۔ وہ آیت الکرسی ہے' جس گھر میں پڑھی جائے گی اس میں سے شیطان ضرور بھاگ جائے گا۔ (الترمذی فی السنن' والحاکم وصحہ کمافی الدرالمنثور) سورۂ بقرہ کو سب سے بڑی سورت ہونے کے اعتبار سے قرآن کا بلند حصہ فرمایا نیز اس اعتبار سے بھی کہ اسمیں احکام کثیر تعداد میں مذکورہ ہیں۔ اور یُوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس میں جہاد کا حکم ہے جس سے رفعت اور بلندی حاصل ہوتی ہے۔ واللہ اعلم (مرقات شرح مشکوٰۃ)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ سورۃ بقرہ اور سورۃ نساء' سورہ حج' سورہ نور کو سیکھو کیونکہ ان میں فرائض ہیں۔ (درمنثور)

حروف مقطعات کی بحث

تفسیر: الٓمّٓ یہ حروف مقطعات میں سے ہے اور حروفِ مقطعات انتیس سورتوں کے شروع میں آئے ہیں اور وہ یہ ہیں۔ الٓمّٓ . الٓرٰ . الٓمّٓصٓ . الٓمّٓرٰ . حٰمٓ . حٰمٓ عٓسٓقٓ . کٓھٰیٰعٓصٓ . طٰسٓ . طٰسٓمّٓ . طٰہٰ . یٰسٓ . صٓ . قٓ . نٓ .

ان میں الٓمّٓ چھ جگہ ہے۔ اور الٓمّٓرٰ پانچ جگہ ہے اور حٰمٓ چھ جگہ ہے اور طٰسٓمّٓ دو جگہ ہے۔ اور ان کے علاوہ باقی سب ایک ایک جگہ ہیں۔ کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہیں اس لئے مفسرین ان کے سامنے یوں لکھ دیتے ہیں اللہ اعلم بمرادہ بذٰلک۔ (اللہ کو اس کا معنی معلوم ہے)۔

بہت سے اکابر جن میں خلفاء اربعہ اور ابن مسعودؓ بھی ہیں ان کا مؤقف یہی ہے جیسا کہ ابن کثیر نے نقل کیا ہے۔ بعض حضرات نے ان کے کچھ معانی بھی بتائے ہیں کسی نے کہا ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں جن کے شروع میں آئے ہیں۔ حضرت مجاہد کا قول ہے کہ الٓمّٓ قرآن کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ حضرت شعبی نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ الٓمّٓ لفظ اللہ کا پہلا حرف ہے اور لام اللہ کے نام لطیف کا پہلا حرف ہے اور میم مجید کا پہلا حرف ہے اور ایک قول یہ ہے الف سے الآء اللہ یعنی اللہ کی نعمتیں اور لام سے لطف اللہ یعنی اللہ کی مہربانی اور میم سے مجد اللہ یعنی اللہ کی بزرگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس میں سے کوئی بات رسول اللہ ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ مفسرین نے حروف مقطعات کے ذریعہ سورتیں شروع کرنے کی یہ حکمت بھی لکھی ہے کہ اہل عرب کو بتانا تھا کہ یہ کتاب جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی ہے اس کے کلمات انہیں حروف سے مرکب ہیں جو تمہاری گفتگو اور محاورات میں استعمال ہوتے ہیں۔ تم فصیح بلیغ ہو اس جیسی کتاب بنا کر لاؤ۔ جب ماہرین اس جیسی کتاب بنا کر نہیں لا سکتے تو ایک اُمی جس نے کسی سے کچھ نہیں پڑھا اس کے بارے میں کیسے کہتے ہو کہ اس نے اپنے پاس سے بنالیا۔ اگر یہ کلام کسی غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو تم لوگ اس جیسا کلام بنانے سے کیوں عاجز رہ جاتے۔ اس کے علاوہ اور بھی حکمتیں بیان کی ہیں جو مفسر بیضاوی نے لکھی ہیں۔ ان حروف کو اسی طرح الگ الگ پڑھا جاتا ہے ان میں تجوید کے قواعد کے مطابق مد بھی ہیں جو مد حرفی مثقل اور مد حرفی مخفف کے نام سے کتب تجوید میں

بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اللہ کی کتاب کا ایک حرف پڑھا تو اسکی وجہ سے اُسے ایک نیکی ملے گی اور وہ ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے (بلکہ) الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

قرآن مجید بلا ریب اللہ کی کتاب ہے

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (یہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں) مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی۔ اس کا وحی الٰہی ہونا اور خداوند قدوس کی طرف سے نازل ہونا یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں نظر صحیح کی جائے تو کسی عاقل کے لئے کسی طرح کے کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں اگر کسی کو کوئی شک ہے تو اس کی کج فہمی کی وجہ سے ہے اس کے شک کا اعتبار نہیں۔ اور جو شخص فکر صحیح کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ واقعی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے لیکن پھر بھی منکر ہے۔ اور کہتا ہے کہ مجھے شک ہے تو اسے حقیقت میں شک نہیں ہے۔ ضد اور عناد نے اُسے اس پر آمادہ کیا ہے کہ حق اور حقیقت کا انکار کرے۔

قرآن مجید متقیوں کے لئے ہدایت ہے

ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (یہ کتاب ہدایت ہے متقیوں کیلئے) سورۂ بقرہ میں دوسری جگہ (رکوع ۲۳) میں قرآن مجید کو ھُدًی لِّلنَّاسِ فرمایا اور یہاں ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ فرمایا ہے۔ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ قرآن کی دعوت عام ہے ہر انسان کو قرآن نے حق کی دعوت دی ہے اور بار بار سمجھایا ہے اور دلائل پیش کئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر تھوڑی سی سمجھ رکھنے والا بھی ہدایت پر آسکتا ہے لیکن چونکہ اس سے وہی لوگ نفع حاصل کرتے ہیں جو اپنی عقل وفکر کو استعمال کر کے حق قبول کرتے ہیں اور یہ طے کر چکے ہیں کہ ہمیں گمراہی میں نہیں رہنا اور شرک وکفر سے بچنا ہے اس لئے یہاں ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ فرمایا، لفظ اِتِّقاء (جس سے متقی کا لفظ ماخوذ ہے اور اسکی جمع متقین ہے) اس کا معنی بچنے کا ہے اور ڈرنے کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے۔ لفظ تقویٰ اور اِتِّقاء دونوں کا مادہ ایک ہی ہے شرک اور کفر سے بچنا اور ایمان قبول کر کے چھوٹے بڑے گناہوں سے بچنا اور مزید ترقی کر کے مشتبہات سے بچنا اور اپنے باطن کو صرف ذات حق تعالیٰ شانہٗ ہی میں مشغول رکھنا اور اُسی کی طرف متوجہ رہنا یہ سب تقویٰ میں آتا ہے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں جو یہ بات بتائی گئی تھی کہ اس میں ہدایت پر ثابت رہنے کی دُعا ہے یہاں بھی وہ بات کہی جاسکتی ہے۔ جو لوگ متقی ہیں۔ قرآن مجید پڑھ کر اور سن کر ان کی صفت تقویٰ میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور ایمان بڑھ جاتا ہے۔ (فَزَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّھُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ)

متقین کی صفات: اس کے بعد متقین کی صفات بیان فرمائیں اول یہ کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جن باتوں کی خبر دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے جو باتیں بتائی ہیں ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے اُن سب کو مانتے ہیں اور اُن پر ایمان لاتے ہیں، بغیر دیکھے صرف خبر پر ایمان لے آنا یہ ایمان بالغیب ہے اور ایمان بالغیب ہی معتبر ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو وہاں کے حالات سب ہی دیکھ لیں گے اور مان لیں گے لیکن دیکھنے کے بعد مان لینا اور ایمان لانا معتبر نہیں۔

متقیوں کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ یعنی وہ نماز قائم کرتے ہیں یُصَلُّوْنَ نہیں فرمایا بلکہ

یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ فرمایا۔ نماز قائم کرنا یہ ہے کہ نماز کے فرائض وواجبات وسُنن ومستحبات سب کو خوب دھیان اور خشوع خضوع کے ساتھ ادا کیا جائے۔ تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد نقل کیا ہے۔ اقامة الصلوة اتمام الركوع والسجود والتلاوة والخشوع والاقبال عليها فيها۔ یعنی نماز کا قائم کرنا یہ ہے کہ رکوع سجدہ پورا پورا ادا کیا جائے اور تلاوت بھی صحیح ہو اور نماز میں خشوع بھی ہو اور نماز پڑھتے وقت نماز کا دھیان بھی ہو۔

پھر فرمایا: وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں) متقیوں کی صفت اقامت الصلوٰۃ بیان کرنے کے بعد (جو عبادت بدنیہ میں سے سب سے اہم اور سب سے بڑی عبادت ہے) مالی عبادت کا ذکر فرمایا۔ یعنی متقیوں کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُنکو عطا فرمایا ہے۔ اُس میں سے اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اس میں مالی فرائض (زکوٰۃ اور عشر) اور واجبات (صدقہ فطر وغیرہ) نفلی صدقات سب داخل ہیں۔

پھر فرمایا: وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ (جو لوگ متقی ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپکی طرف نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا) ایمان وہ معتبر ہے جس میں اللہ تعالیٰ پر اور اُس کے تمام رسولوں پر اور اسکی تمام کتابوں پر ایمان ہو۔ اللہ کے کسی ایک نبی یا اسکی کسی ایک کتاب کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ میں اسی بات کا اعلان کیا گیا ہے وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ کے عموم میں قرآن کریم سے پہلی تمام کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانا شامل ہے۔ بعض صحیفوں کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے (صحف ابراہیم وموسیٰ) اللہ کی جن کتابوں اور صحیفوں کا علم ہے اور جن کا علم نہیں ان سب پر ایمان لانا اور اللہ کی کتاب ماننا فرض ہے۔

پھر فرمایا: وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ (اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں) ایمان کے تین اہم جزو ہیں۔ توحید، رسالت اور موت کے بعد زندہ ہونے پر ایمان لانا' یہاں ان تینوں چیزوں کو بتا دیا ہے۔ اور ساتھ ہی نماز اور زکوٰۃ کا بھی ذکر فرما دیا۔ کیونکہ ایمان قلبی کے بعد دوسرا درجہ نماز کا ہے اور اس کے بعد زکوٰۃ ہے۔ ایک فریضہ بدنیہ اور دوسرا فریضہ مالیہ بیان فرما دیا۔

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ (آخر تک) اس آیت میں اُن لوگوں کے لئے ہدایت پر ہونے اور کامیاب ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔ جن کی صفات پہلے بیان ہوئیں۔ ان کو اس بات کی سند دی گئی کہ یہ ہدایت پر ہیں اور حقیقی اور واقعی کامیابی انہیں کو حاصل ہونے والی ہے جو آخرت میں اللہ کی رضا اور دُخولِ جنت کی صورت میں حاصل ہوگی۔ اللہ کی رضا سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ

بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے برابر ہے کہ آپ اُن کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اُن کے دلوں پر

وَعَلٰی سَمْعِھِمْ ؕ وَعَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ ؗ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۷﴾

اور اُن کے سُننے کی قوت پر' اور اُن کی آنکھوں پر بڑا پردہ ہے' اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے

کافروں کی گمراہی اور آخرت میں بدحالی

تفسیر: اہل ایمان کے اوصاف بیان فرمانے کے بعد ان آیات میں اُن کافروں کا ذکر فرمایا ہے جن کا اللہ کے علم

میں خاتمہ کفر پر ہونا ہے اور جو لوگ حق واضح ہوتے ہوئے اور حق و باطل کو سمجھتے ہوئے کفر پر جمے ہوئے ہیں۔ اور اُنہوں نے طے کر رکھا ہے کہ ہمیں ہرگز کسی حالت میں اسلام قبول نہیں کرنا اللہ جل شانہٗ نے ہر شخص کو فطرتِ ایمانیہ پر پیدا فرمایا پھر اس کے ماں باپ اسکو کفر پر ڈال دیتے ہیں اور وہ اپنے ماحول اور معاشرہ کی وجہ سے ایمانی استعداد کھو بیٹھتا ہے اور اپنے کو اس درجہ میں پہنچا دیتا ہے کہ کسی قیمت پر اسلام قبول کرنے کو تیار نہیں۔ جب انہوں نے اپنی شرارت اور عناد کی وجہ سے اپنی استعداد خود برباد کر دی تو اپنی تباہی کا سبب وہ خود ہی بن گئے لیکن چونکہ اللہ بندوں کے تمام افعال کا خالق ہے اس لئے اس خلق افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی جسے مُہر لگانے سے تعبیر کیا گیا۔ یہ مسئلہ قدرے باریک ہے اسی لئے اسی اجمال پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ جو لوگ کافر ہیں خواہ یہود و نصاریٰ ہوں خواہ ہندو مشرک ہوں خواہ دوسری کسی قوم کے افراد ہوں اہل اسلام اُن سے ملتے رہتے ہیں۔ اور دلیل سے اُن کو عاجز اور خاموش کر دیتے ہیں اور اُن میں لاکھوں افراد ایسے ہیں جو قرآن اور اسلام کو حق جانتے ہیں پھر بھی نہ صرف یہ کہ خود اسلام قبول نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو بھی اسلام قبول کرنے سے روکتے ہیں اور جو کوئی اسلام قبول کر لیتا ہے اُس کو کفر میں واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اسلام کو حق جانتے ہوئے قومی یا مذہبی عصبیت کے باعث اسلام کیخلاف کتابیں لکھتے ہیں ان کے احوال اور اقوال پر نظر کرو تو اُن کا عناد اور ان کا حال معلوم کرنے کے بعد آیۃ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کا مطلب بالکل واضح طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝٩ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ
اور بعضے لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخری دن پر ایمان لائے۔ حالانکہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ وہ دھوکہ دیتے ہیں اللہ کو
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝٩ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ
اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنی جانوں کو۔ اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں بڑا روگ ہے سو اللہ نے اُن
اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝١٠
کا روگ بڑھا دیا اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے

منافقین کی تاریخ اور نفاق کے اسباب

تفسیر: جب سرور عالم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے اور دین اسلام خوب پھیلنے لگا تو یہودیوں اور خاص کر ان کے علماء اور احبار کو یہ بات زیادہ کھلی اور یہ لوگ دشمنی پر اُتر آئے کچھ لوگ اوس اور خزرج میں سے بھی اسلام کے مخالف ہو گئے۔ اسلام کی اشاعت عام ہو جانے کے بعد کھل کر یہ لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور دشمنی کے اظہار سے بھی عاجز تھے اس لئے انہوں نے یہ چال چلی کہ ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا' اندر سے کافر تھے اور ظاہر میں مسلمان تھے۔

ان کا سردار عبداللہ ابن اُبی تھا حضور اقدس ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے اوس اور خزرج نے عبداللہ بن اُبی کو اپنا بادشاہ بنانے اور اُس کو تاج پہنانے کا مشورہ کیا تھا سید العالمین ﷺ کے ہوتے ہوئے کسی کی سرداری نہیں چل سکتی تھی اُس نے اور اس کے ساتھیوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر کے اپنے کو مسلمانوں میں شمار کر دیا اور اندر سے اسلام کی

کاٹ میں لگے رہے۔ ان کے اس طریقۂ کار میں یہ راز پوشیدہ تھا کہ اسلام قبول کرنے پر جو منافع ہیں وہ بھی ملتے رہیں اور کنبے اور قبیلے سے باہر بھی نہ ہوں اور اہل کفر سے بھی گٹھ جوڑ رہے۔ اور اُن سے بھی فائدہ ملتا رہے۔

اور یہ بھی پیش نظر تھا کہ اگر العیاذ باللہ اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام اور بقا زیادہ دیر تک نہ رہے تو حسب سابق پھر سرداری مل جائے گی لہٰذا یہ اُوپر سے مسلمان اور اندر سے کافر رہے اور اسلام اور داعی اسلام کی ناکامی کے انتظار میں رہنے لگے مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم مومن ہیں اور اس طرح سے اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے تھے۔ اور خالص کافروں سے تنہائیوں میں ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ لوگ اپنے کو مسلمان ظاہر کرنے کے لئے نمازیں بھی پڑھتے تھے لیکن چونکہ دل میں نمازی نہ تھے اس لئے جماعتوں کو حاضری میں سستی کرتے تھے۔ اور اکساتے ہوئے اُوپر کے دل سے نماز پڑھتے تھے جہادوں میں بھی شریک ہونے کے لئے ساتھ لگ جاتے تھے لیکن کبھی تو درمیان سے واپس آ گئے اور کبھی ساتھ رہتے ہوئے ہی مکر و فریب کو کام میں لاتے رہے۔ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تکلیفیں پہنچانے اور دل دکھانے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے جھوٹی قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ہم مُسلمان ہیں اور اسلام کے خلاف منصوبے بنا کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے والی باتیں کر کے صاف انکار کر جاتے تھے۔ اور قسم کھا جاتے تھے کہ ہم نے تو نہیں کہا۔ ان لوگوں کے حالات سُورۃ بقرہ کے دُوسرے رکوع میں اور سورۃ نساء کے رکوع ۲۱ میں اور سورۃ منافقون میں اور سورۃ حشر میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور سورۃ برأت میں خوب زیادہ انکی قلعی کھولی گئی ہے۔

سیرت کی کتابوں میں ان لوگوں کے نام بھی لکھے ہیں کہ یہ کون کون تھے اور کس قبیلہ سے تھے۔ البدایہ والنہایہ اوائل کتاب المغازی میں یہودی علماء اور احبار جنہوں نے اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی کھل کر مخالفت اختیار کی اور خوب زیادہ دشمنی میں لگ گئے اُن کے نام اور اُن لوگوں کے نام جو یہودیوں اور اوس و خزرج میں سے منافق بنے ہوئے تھے واضح طور پر ذکر کئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مروّت کا برتاؤ فرماتے رہے اور انکی ایذاؤں کو سہتے رہے۔ آپ احسن اسلوب سے اپنی دعوت کو لے کر آگے بڑھتے رہے اور دین اسلام کو برابر ترقی ہوتی رہی۔ اس میں جہاں یہ حکمت تھی کہ شاید یہ لوگ مخلص مسلمان ہو جائیں وہاں یہ مصلحت بھی تھی کہ اگر ان کے ساتھ سختی کریں گے تو عرب کے دوسرے قبائل جو مسلمان نہیں ہوئے ہیں اور صحیح صورت حال انہیں معلوم نہیں وہ اسلام کے قریب آنے کے بجائے اور دور ہو جائیں گے۔ اور شیطان ان کو یہ سمجھائے گا کہ دیکھو محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنے ماننے والوں کے ساتھ کیسا برتاؤ ہے۔ بالآخر ایک دن وہ آیا کہ یہ لوگ سختی اور ذلت کے ساتھ مسجد نبوی سے نکال دیئے گئے جس کی تفصیل سیرۃ ابن ہشام (جلد ثانی کے اوائل) میں مذکور ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں اور ان کے بعد والی چند آیتوں میں منافقین کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اوّل تو یہ فرمایا کہ یہ لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور یوم آخرت پر بھی ایمان لائے۔ پھر فرمایا کہ ان لوگوں کا یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے۔ یہ اہل ایمان نہیں ہیں۔ ایمان فعل قلب ہے صرف زبانی دعوٰی سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوگا۔ جب تک دل سے اُن چیزوں کی تصدیق نہ کرے جو اللہ نے اپنے نبیوں کے ذریعہ بتائی ہیں اور جن پر ایمان لانے کا حکم فرمایا ہے اس وقت تک کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا۔ منافقین کے اسی دوغلے پن کو کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں۔ حالانکہ مومن نہیں۔ سورۃ مائدہ میں اس طرح بیان فرمایا۔ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ۔ (یعنی اُن لوگوں میں سے ہیں جنہوں

نے اپنے مونہوں سے کہا کہ ہم ایمان لائے اور حال یہ کہ ان کے دل ایمان نہیں لائے) اِس دورنگی اور دوغلے پن کو قرآن وحدیث میں نفاق اور منافقت سے تعبیر کیا گیا ہے اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں۔ ان کو منافق فرمایا گیا ہے۔

یہ کلمہ لفظ'' نَفَقْ '' سے ماخوذ ہے۔ نفق اُس سُرنگ کو کہتے ہیں۔ جس میں دونوں طرف سے راستہ ہو چونکہ مُنافقین اسلام میں ایک دروازہ سے داخل ہوتے ہیں اور دوسرے دروازے سے نکل جاتے ہیں اس لئے ان کے اس عمل کا نام نفاق رکھا گیا۔ مفردات امام راغب میں ہے ومنه النفاق وهو الدخول فی الشرع من باب والخروج عنه من باب وعلی ذلک نبه تعالیٰ بقوله ان المنافقين هم الفاسقون ای الخارجون من الشرع منافقت کُفر کی بدترین اور خبیث ترین قسم ہے۔ اس میں کفر بھی ہے، جھوٹ بھی ہے۔ دھوکہ دہی بھی ہے ایسے لوگ صرف بندوں ہی کو دھوکہ نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور ایمان اور اہل ایمان کا مذاق بناتے ہیں اور جو کھلے کافر ہیں اُن کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اُن سے کہتے ہیں کہ ہم تم میں سے ہیں۔ اور حال یہ ہے کہ وہ کسی میں سے نہیں جس کو سورۃ نساء میں یوں بیان فرمایا ہے۔ يُرَآءُ وْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (یعنی وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو بس ذرا بہت یاد کرتے ہیں ایمان اور کفر کے درمیان مذبذب ہیں نہ ان کی طرف ہیں اور نہ اُنکی طرف) وجہ اسکی یہ ہے کہ منافق کسی کا نہیں ہوتا وہ صرف اپنا ہوتا ہے۔ جہاں دنیا اور دُنیاوی منافع دیکھتا ہے موقعہ دیکھ کر اُسی طرف ہو جاتا ہے۔ اور اتنے ہی وقت کے لئے ہوتا ہے جتنے وقت تک ضرورت محسوس کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ منافق کی مثال ایسی ہے جیسے بکریوں کے دو ریوڑوں کے درمیان ایک بکری ہے وہ گابھن ہونے کے لئے کبھی اس ریوڑ کی طرف جاتی ہے کبھی اُس ریوڑ کی طرف جاتی ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۱۷)

منافقین اپنے اس عمل کو چالبازی اور ہوشیاری سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اللہ تعالیٰ اور مومنین کو دھوکہ دیا اور اپنا کام نکالا۔ حالانکہ اس دھوکہ دہی اور چالبازی کا بُرا انجام خود انہی کے سامنے آئے گا۔ اور یہ چالبازی انہیں کے لئے وبال جان بنے گی وہ سمجھتے ہیں کہ ہم خوب سمجھتے ہیں حالانکہ اپنے اصل نفع اور نقصان تک کو نہیں سمجھتے۔

نِفاق کا مرض بہت پرانا ہے اور اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ زمانہ نبوت کے منافقین اس مرض میں مُبتلا تھے۔ جیسے جیسے اسلام آگے بڑھتا گیا منافقوں کا نفاق بھی بڑھتا رہا۔ مرض نفاق حسد اور حُب دنیا کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں ایسا شخص ذلیل ہوتا ہے اور آخرت میں منافق کے لئے سخت سزا ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نفاق رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھا۔ آج تو یا اسلام ہے یا کفر ہے۔ اُن کا یہ ارشاد امام بخاری نے نقل کیا ہے۔ شراح حدیث نے فرمایا ہے کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ ہم دلوں کا حال نہیں جانتے اس لئے ہم کسی مدعی اسلام کو یوں نہیں کہیں گے کہ یہ منافق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو اللہ پاک کی طرف سے اِس زمانہ کے منافقوں کے نفاق کا علم تھا اس لئے متعین طریقے پر اُن کو منافق قرار دیا گیا ہم ظاہر کے مکلف ہیں جو شخص کہے گا میں مُسلمان ہوں اس کو مسلمان سمجھیں گے۔ جب تک کہ اس سے کفر کا کوئی کلمہ یا کفر کا کوئی کام صادر نہ ہو اگر کسی کے بارے میں اندازہ ہو کہ یہ ظاہر میں مسلمان بنتا ہے۔ اندر سے مسلمان نہیں ہے اُسے مُنافق کہے بغیر اپنی حفاظت کریں گے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فَسادمت کرو تو کہتے ہیں۔ کہ ہم تو صرف اصلاح ہی کرنیوالے ہیں۔ خبردار بلاشبہ یہی لوگ مُفسد ہیں۔

وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا أَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ

لیکن نہیں سمجھتے ہیں۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ اور لوگ ایمان لائے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں جیسے یہ بیوقوف ایمان لے آئے۔

السُّفَهَآءُ ۗ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَوْا

خبردار بلاشبہ یہی بیوقوف ہیں لیکن نہیں جانتے۔ اور جب یہ لوگ اُن سے ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اور جب تنہائیوں میں

إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا إِنَّا مَعَكُمْ ۙ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ

اپنے شیطانوں کے پاس ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو صرف مذاق بنانے والے ہیں۔ اللہ اُن کا مذاق بناتا ہے اور اُن کو ڈھیل دے رہا ہے وہ اپنی

طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

سرکشی میں اندھے ہو کر بھٹک رہے ہیں۔

منافقوں کے دعوے اور اُن کا طریقِ کار

تفسیر: ان آیات میں منافقین کے بعض دعوے نقل فرمائے ہیں۔ اور اُن کا طریقۂ کار ذکر فرمایا ہے اور وہ یہ کہ جب اُن سے کہا جاتا تھا کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے تھے کہ اجی ہم کہاں فساد کہاں؟ ہمارا کام تو اصلاح کرنا ہی ہے۔ اُن کی تردید میں فرمایا کہ خبردار بلاشبہ یہ لوگ فسادی ہی ہیں لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے' جس فساد میں یہ لوگ مُبتلا تھے اُس میں کئی طرح سے حصہ لیتے تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فتنے کھڑے کرتے تھے۔ اور دُشمنانِ اسلام کو لڑائیوں پر آمادہ کرتے تھے اور مسلمانوں کے بھید دشمنوں تک پہنچاتے تھے۔ اور جو لوگ مسلمان ہونے کا ارادہ کرتے اُن کو اسلام سے روکنے کا سبب بنتے تھے۔ اور مسلمانوں کا مذاق بناتے تھے فساد کے کاموں میں مبتلا ہوتے ہوئے اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم تو اصلاح ہی کرنیوالے ہیں مفسر ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم دونوں فریق یعنی مُسلمین اور کافرین کی مدارات کرتے ہیں۔ دونوں میں جوڑ لگانے اور دونوں کے تعلقات استوار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ (وکذانقلہ السیوطی عن ابن عباس فی الدر) اُنہوں نے اپنے نفاق کو اصلاح سے تعبیر کیا' اُن کا دعویٰ جھوٹ تھا دونوں فریق میں سے ہر فریق اُن کو اپنی جماعت سے علیحدہ سمجھتا تھا (لا إلٰى هؤلاء ولا إلٰى هؤلاء) جس شخص سے دونوں جانب میں سے کوئی بھی مطمئن نہ ہو وہ کیا جوڑ بٹھا سکتا ہے۔ پھر ایمان اور کفر میں جوڑ بٹھانے کا ارادہ کرنا بھی مزید کفر ہے۔ ایمان اور کفر کا جوڑ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اُن کا دعویٰ اصلاح صرف دھوکہ ہے اور وہ اس کے نتیجہ سے ناواقف ہیں۔ اُن کے عمل سے جو فساد پھیلتا ہے اس کو نہیں سمجھتے اور آخرت میں جو اس کا وبال ان پر پڑے گا اس کو نہیں جانتے۔ اور جب اُن سے کہا جاتا تھا کہ ایمان لے آؤ یعنی دین اسلام کو سچے دل سے قبول کرو تو وہ کہتے تھے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ تو بے وقوف ہیں ہم بیوقوفی کا کام کیوں کریں۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور خاص کر انصار کے دونوں قبیلے اُوس اور خزرج جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کو انہوں نے بیوقوف بنایا۔ اور گویا اپنے سمجھدار اور ہوشیار ہونے کا دعویٰ کیا۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ بلاشبہ یہ خود بیوقوف ہیں۔ لیکن جانتے نہیں ہیں۔ جس نے ایمان کھویا کفر اختیار کیا اسلام کو نقصان پہنچایا اپنی

آخرت برباد کی اور دُنیا میں مومنین اور کافرین دونوں کے نزدیک مطعون اور قابل ملامت ہوا اسکی بیوقوفی میں کیا شک ہے؟

منافقین کا یہ طریقہ تھا کہ مومنین سے کہتے تھے کہ ہم تو ایمان لا چکے ہیں اور جب تنہائیوں میں اپنے شیطانوں یعنی کفر کے سرغنوں کے پاس جاتے تھے جو کھلے کافر تھے تو اُن سے کہتے تھے کہ بلا شبہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ جو ہم مسلمانوں سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں یہ تو ہمارا مذاق ہے۔ اُن کا مذاق بنانے کے لئے بطورِ دل لگی ہم اُن کے سامنے اُن کی جماعت میں ہونے کا اقرار کر لیتے ہیں لیکن اندر سے اور دل سے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ (قال ابن عباسؓ کان رجال من الیھود اذا لقوا اصحاب النبی ﷺ او بعضھم قالوا انّا علی دینکم واذاخلواإلی شیاطینھم وھم اخوانھم قالوا انّا معکم ای علی مثل ما انتم علیه انما نحن مُسْتَهْزِءُوْنَ ساخرون. (در منثور)

انہوں نے یہ جو کہا کہ ہم مسلمانوں کا مذاق بناتے ہیں اس کے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن کا مذاق بناتا ہے یعنی وہ ان کے اس استہزاء اور مذاق بنانے کا بدلہ دے گا انہوں نے استہزاء کر کے مُسلمانوں کے ساتھ جو حقارت کا معاملہ کیا اسکی پاداش میں آخرت میں ذلیل اور رُسوا ہوں گے۔ اور ان کے استہزاء کا وبال انہیں پر پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ اُن کو ڈھیل دے رہا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت فائدہ میں ہیں حالانکہ وہ دوزخ کی طرف جا رہے ہیں یہاں دُنیا میں مسلمانوں کی طرف اشارے کرتے ہیں زبانوں سے کنکھیوں سے اُن کا مذاق بناتے ہیں۔ آخرت میں مومنین اِن پر ہنسیں گے۔ (فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ) سورۂ حدید کے دوسرے رکوع میں منافقین کے پیش آنیوالے ایک استہزاء کا ذکر ہے۔ (فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ) جس کی تفسیر ان شاء اللہ اپنی جگہ پر بیان ہوگی۔

دنیا میں منافقین اپنے مال اور جائیداد وغیرہ میں مشغول ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہیں ان کا سمجھنا غلط ہے ان کا مال اور جائیداد اُن کو گمراہی اور سرکشی میں لگائے ہوئے ہیں اور وہ اسی گمراہی میں حیران اور سرگرداں ہو کر بھٹک رہے ہیں۔ دُنیاوی مال اور جائیداد سے دھوکہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ کفر کے ہوتے ہوئے یہ ہمارے لئے مفید اور نافع ہے۔ بہت بڑا دھوکہ ہے سورہ مومنون میں فرمایا۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (کیا یہ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو جو کچھ مال اور بیٹے دیئے چلے جاتے ہیں (اس طرح) ہم ان کو جلدی جلدی فائدے پہنچا رہے ہیں (بات یوں نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ جانتے نہیں ہیں)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی خرید لی۔ سو اُن کی تجارت نفع مند نہ ہوئی۔ اور نہ وہ ہدایت پر چلنے والے ہیں

منافقین نے ہدایت کے بدلہ گمراہی خرید لی

تفسیر: اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ہر شخص کو فطرت ایمان پر پیدا فرمایا پھر عقل اور ہوش بھی دیا۔ اور انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ کتابیں نازل فرمائیں اس سب کے باوجود اگر کوئی شخص ہدایت کو اختیار نہ کرے اور گمراہی کو اختیار کرے تو

یہ ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنے والا بن گیا اس نے اپنی عقل و بصیرت کی پونجی کو جس کے ذریعہ ہدایت پر چل سکتا تھا، ضائع کر دیا اور گمراہی اختیار کر لی۔ یعنی اپنی پونجی گمراہی حاصل کرنے میں لگا دی ایسے لوگوں کی یہ تجارت نفع مند نہیں، بلکہ سراسر نقصان اور خسران کا باعث ہے۔ حقیر دنیا کے لئے گمراہی لی ہدایت سے منہ موڑا آخرت کی بربادی کو خریدا فطرتِ سلیمہ جو اُن کی پونجی تھی اس کو برباد کیا ایسی تجارت میں نفع کہاں؟ نقصان کو نفع سمجھنا بہت بڑی حماقت اور خود فریبی ہے۔ اہل ایمان کو دھوکہ دیا اُن کو بیوقوف بتایا اور خود ہی دھوکہ میں پڑے اور برباد ہوئے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ
ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے آگ جلائی پھر جب اُس آگ نے اس شخص کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اُنکی روشنی کو ختم کر دیا، اور انکو اندھیروں میں چھوڑ دیا
فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۱۸﴾
کہ وہ دیکھ نہیں رہے ہیں۔ یہ لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں اندھے ہیں پس یہ لوگ رجوع نہ ہوں گے

منافقوں کے بارے میں دو اہم مثالیں

تفسیر: منافقوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا اور دل میں اُن کے ایمان نہ تھا ظاہری ایمان قبول کرنے سے جو کچھ انہیں دنیاوی فائدہ پہنچ گیا مثلاً جان و مال محفوظ کر لیا کہ مسلمان ان سے تعرض نہ کریں اس کو اولاً ایسے شخص سے تشبیہ دی جو اندھیری رات میں آگ جلائے اور اُس روشنی سے راستہ دیکھنے کا فائدہ حاصل کرنا چاہے۔ اور اُن لوگوں کا جو انجام ہونے والا ہے کہ مرتے ہی سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے اس کو اس آگ کے بجھانے سے تشبیہ دی جس کو انہوں نے روشنی کے لئے جلایا تھا۔ دنیا میں جھوٹے منہ سے ایمان ظاہر کر کے ذرا سا فائدہ اُٹھا لیا اور ہمیشہ کے لئے عذاب الیم میں گرفتار ہوئے جیسے کوئی شخص اندھیری رات میں آگ جلائے اور روشنی ہو جائے تو وہ روشنی اللہ تعالیٰ شانہٗ ختم فرما دے اور یہ آگ جلانے والا اندھیروں میں حیران کھڑا رہ جائے نہ کچھ دیکھ سکے نہ بوجھ سکے، منافقوں نے اپنے طور پر بڑی ہوشیاری کی کہ ایمان ظاہر کر کے دُنیا کا کچھ فائدہ اُٹھا لیا لیکن دل میں جو کُفر گھسا ہوا ہے اسکی وجہ سے موت کے بعد جن مصیبتوں میں گرفتار ہوں گے اس کو نہ سوچا اور کفر میں بڑھتے بڑھتے اس درجے پر پہنچ گئے۔ کہ بہرے بھی ہیں حق سننے کے قابل نہ رہے اور گونگے بھی ہیں جن کے منہ سے کلمہ حق ادا نہیں ہو سکتا اور اندھے بھی ہیں جو راہِ حق نہیں دیکھ سکتے۔ اپنا نفع نقصان جاننے اور سمجھنے سے غافل ہیں۔ اُن کے بارے میں اب نہ سوچا جائے کہ وہ حق کی طرف رجوع کریں گے اور دل سے مسلمان ہوں گے۔ ذکر ابن کثیر فی شرح المثل عدة اقوال وقد اخترنا ما نقله عن ابن عباس رضی اللہ عنهما قال هذا مثل ضربه الله للمنافقين انهم كانوا يعتزون بالاسلام فيناكحهم المسلمون ويوارثونهم ويقاسمونهم الفيء فلما ماتوا سلبهم الله ذلك العز كما سلب صاحب النار ضوءه.

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ
یا ان کی ایسی مثال ہے جیسے آسمان سے تیز بارش ہو رہی ہو اُس میں اندھیریاں ہوں اور گرج ہو اور بجلی ہو

الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ

یہ لوگ موت کے اندیشے کے سبب اپنے کانوں میں انگلیاں دے رہے ہیں کڑک کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ احاطہ کئے ہوئے ہیں ہے کافروں کا، قریب ہے کہ بجلی

كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڰ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَھَبَ

اُن کی بینائی کو اُچک لے جب کبھی اُن کے لئے روشنی ہوئی تو اس میں چلنا شروع کر دیا اور جب اندھیرا ہو گیا تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور اللہ تعالیٰ چاہے

بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝

تو ان کے سُننے اور دیکھنے کی قوتوں کو ختم فرما دے بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے

تفسیر: ان دو آیتوں میں منافقین کی دوسری مثال پیش فرمائی جیسے تیز بارش ہو اندھیریاں چھائی ہوئی ہوں گرج بھی ہو اور بجلی کی چمک بھی ہو موت کا سامنا ہو۔ جو لوگ وہاں موجود ہوں۔ کڑک کی آواز سے خوف زدہ ہو رہے ہیں اور ڈر رہے ہیں کہ ابھی موت آ جائے گی۔ کڑک کی آواز کی وجہ سے کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے ہیں۔ سخت بجلی اُنکی آنکھوں کی روشنی سلب کرنے کو ہے اِسی حیرانی اور پریشانی میں کھڑے کھڑے جب ذرا بجلی چمکتی ہے تو اسکی روشنی میں ایک دو قدم چل لیتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو حیران سرگردان کھڑے رہ جاتے ہیں۔ منافقوں کی یہی حالت ہے جب غلبہ اسلام کو دیکھتے ہیں اور اس کا نور پھیلتا ہوا نظر آتا ہے تو اسکی طرف بڑھنے لگتے ہیں پھر جب دنیا کی محبت زور پکڑتی ہے اور دُنیاوی فائدے کفر اختیار کئے رہنے میں نظر آتے ہیں تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں یعنی ایمان کی طرف بڑھنے سے رُک جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم و قُدرت سے سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے اسکی طرف بڑھنا اور اس کا دین قبول کرنا لازم ہے۔ وہ چاہے تو سُننے اور دیکھنے کی ساری قوتیں ختم فرمائے اور بلاشبہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مفسّر بیضاوی لکھتے ہیں کہ منافقین کو اَصحاب صیب (بارش والوں) سے تشبیہ دی اور اُن کے (ظاہری) ایمان کو جو کفر اور دھوکے بازی کے ساتھ ملا ہوا تھا ایسی بارش سے تشبیہ دی جس میں اندھیریاں ہوں اور گرج ہو اور بجلی ہو یہ تشبیہ اس اعتبار سے ہے کہ بارش اگرچہ فی نفسہ نافع ہے لیکن جب مذکورہ صورت میں بارش نازل ہوئی تو اس کا نفع ضرر سے بدل گیا اور منافقین نے جو نفاق اسلئے اختیار کیا کہ مومنین کی طرف سے جو تکالیف پہنچنے والی ہوں اور کھلے کافروں کی طرف سے جو تکالیف پہنچتی ہوں ان سے بچاؤ ہو جائے ان کی اس منافقت کو کانوں میں انگلیاں دینے سے تشبیہ دی جیسے کوئی شخص بجلیوں کی کڑک سے اپنے کانوں میں انگلیاں دے رہا ہو اور موت سے ڈر رہا ہو تو جس طرح کانوں میں انگلیاں دینے سے اللہ تعالیٰ کے قضا و قدر کے فیصلوں کو نہیں ٹالا جا سکتا اسی طرح سے منافقت اختیار کرنے سے مصائب و آلام سے حفاظت نہیں ہو سکتی اور شدت الامر کی وجہ سے جو ان کو حیرانی اور یہ پریشانی تھی کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں اسے بجلی سے تشبیہ دی کہ کوئی موقع پاتے ہیں تو ذرا اپنے مقاصد میں آگے بڑھ جاتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ خوف لگا ہوا ہے۔ کہ بجلی ان کی آنکھیں نہ اُچک لے۔ لہٰذا چند قدم چلتے ہیں پھر جب بجلی کی چمک ختم ہو جاتی ہے تو بلا حس و حرکت کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔

پھر دوسری طرح سے بھی اس تشبیہ کی تقریر کی ہے (راجع البیضاوی) بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ پہلی مثال اُن منافقوں کے بارے میں پیش فرمائی ہے جو بہت مضبوطی کے ساتھ کفر پر جمے ہوئے تھے اُن کے بارے میں فرمایا وَتَرَكَهُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُوْنَ۔

اور دوسری مثال اُن منافقوں کے بارے میں ہے جن کو اسلام کے بارے میں تردّد تھا کبھی اسکی حقانیت دل میں آتی تو اسکی طرف مائل ہونے لگتے اور جب دُنیاوی اغراض سامنے آتیں اور دُنیا کی محبت زور پکڑ لیتی تو وہ میلان ختم ہو جاتا تھا اور کفر ہی پر جمے رہ جاتے تھے۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾
اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو پیدا فرمایا اور اُن لوگوں کو بھی پیدا فرمایا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ'
الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ
جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت' اور اُتارا آسمان سے پانی' پھر نکال دیا اس کے ذریعہ
بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾
پھلوں سے تمہارے لئے رزق' لہٰذا مت بناؤ اللہ کے لئے مُقابل' حالانکہ تم جانتے ہو

دعوت توحید اور دلائل توحید

تفسیر: مومنین مخلصین اور کافرین اور منافقین کا ذکر کرنے کے بعد اب دلائل کے ساتھ توحید کی دعوت دی گئی۔ اور اللہ جل شانہٗ کی شان خالقیت اور شان ربوبیت بیان فرمائی اور اللہ تعالیٰ کی قُدرت اور نعمت کا تذکرہ فرمایا جس کا مظاہرہ سب کے سامنے ہے اور ایک کم سمجھ آدمی بھی اس کو دیکھتا ہے۔

اوّل: تو یہ فرمایا کہ تم اپنے رب کی عبادت کرو جو تمہاری پرورش فرماتا ہے اور یہی نہیں کہ صرف پرورش فرماتا ہے بلکہ اس نے تم کو وجود بھی بخشا ہے' ممکن ہے کوئی ناسمجھ یہ کہنے لگتا کہ مجھے تو میرے ماں باپ نے پیدا کیا اس وہم کو دفع فرمانے کے لئے فوراً ہی یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ تم سے پہلے ہیں ان سب کو اُسی نے پیدا فرمایا ہے اس نے وجود بھی دیا اور وہ وجود کو باقی رکھے ہوئے بھی ہے اور وجود کے باقی رہنے کے جو اسباب ہیں وہ بھی اُسی نے پیدا فرمائے ہیں۔ پھر یہ فرمایا کہ جب اسی ذات پاک کی عبادت کو اختیار کرو گے اسی میں لگو گے تو تم کو صفت تقویٰ حاصل ہوگی۔ تقویٰ عربی زبان میں بچنے اور پرہیز کرنے کو کہتے ہیں اور اس کے بہت سے درجات ہیں۔ سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک کا مراقبہ رکھے اور ہر وقت اسی کی طرف دل و دماغ کو متوجہ رکھے اُسی کے لئے جیئے اور اُسی کے لئے مرے' چھوٹے بڑے گناہوں سے بچنا بھی تقویٰ کے مفہوم میں داخل ہے۔ جب کسی کو خلوت اور جلوت میں اللہ تعالیٰ شانہٗ کی ذات پاک کا استحضار رہے گا تو کہاں گناہ کر سکے گا اور جب گناہوں سے بچے گا تو ظاہر ہے دوزخ سے بھی محفوظ رہے گا۔ اسی لئے بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ یوں لکھا ہے تاکہ تم دوزخ سے بچو۔ سب سے بڑا گناہ شرک ہے۔ شرک سے بھی بچے اور توحید کو اختیار کرے جو سب سے بڑی عبادت ہے اور چھوٹے بڑے گناہوں سے بھی پرہیز کرے' ایسا کرے گا تو ظاہر ہے کہ دوزخ سے ضرور اسکی حفاظت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی قُدرت اور شان خالقیت کا مظاہرہ تو ہر چھوٹی بڑی چیز میں ہوتا ہے لیکن بہت واضح چیزیں جو سب کے سامنے ہیں اور کم سمجھ بھی جن کو سمجھتا اور جانتا ہے اُن میں سے تین چیزیں بیان فرمائیں۔ جن میں سے اوّل یہ ہے کہ اُس

نے زمین کو پیدا فرمایا۔ یہ زمین سب کے سامنے ہے اس پر بستے ہیں اور رہتے سہتے ہیں اگر کوئی نابینا ہو تو وہ بھی یہ تو جانتا ہی ہے کہ میں کسی چیز پر آباد ہوں کسی چیز پر چل پھر رہا ہوں' جو زمین ہے اس کا وجود ہی بتاتا ہے کہ اس کا پیدا کرنیوالا بڑی قدرت والا ہے پھر زمین کا وجود محض وجود ہی نہیں بلکہ انسانوں کے لئے اس کا وجود بہت بڑی نعمت ہے ساری زمین انسانوں کے لئے بچھونا ہے جس پر رہتے سہتے ہیں چلتے پھرتے ہیں اس کے اتنے بڑے پھیلاؤ میں انسانوں کے رہنے کے مکانات بنانے چلنے پھرنے سفر کرنے حاجتیں پوری کرنے کے مواقع ہیں اگر زمین پر پہاڑ ہی پہاڑ ہوتے یا پانی ہی پانی ہوتا تو اس پر رہنا دُشوار ہو جاتا۔ زمین کے ساتھ ہی آسمان کا ذکر فرمایا اور وہ یہ کہ آسمان کو تمہارے لئے چھت بنایا۔ یہ چھت ستاروں سے مُزیّن ہے۔ دیکھنے میں بھلی معلوم ہوتی ہے اس کی طرف نظر کرنے سے فرحت اور بشاشت محسوس ہوتی ہے۔ صاحب بیان القرآن نے اپنے رسالہ رفع البناء کے آخر میں لکھا ہے کہ بعض حکماء کا قول ہے کہ آسمان کی طرف دیکھنے سے دس فائدے ہیں (۱) غم کا کم ہونا (۲) وسواس کی تقلیل (۳) وہم اور خوف کا ازالہ (۴) اللہ کی یاد (۵) قلب میں اللہ کی عظمت کا پھیل جانا (۶) افکار ردّیہ کا جاتا رہنا (۷) سوداوی مرض کے لئے نافع ہے (۸) مشتاق کی تسلی (۹) محبین کا مونس ہونا (۱۰) دعا کرنیوالوں کا قبلہ ہے اھ نقلہ عن کتاب الحکمۃ للغزالی۔

پھر بارش کے پانی کا تذکرہ کیا اور یہ فرمایا کہ اللہ جل شانہ' نے آسمان سے پانی اُتارا اور اس کے ذریعہ طرح طرح کے پھل پیدا فرمائے جو بنی نوع انسان کے لئے رزق ہیں اور غذا ہیں ان کے ذریعہ انسانوں کی پرورش اور بقا ہے اس میں دلائل قُدرت بھی ہیں اور شان ربوبیت کا اظہار بھی ہے۔ ایک ہی زمین ہے اس میں طرح طرح کے پھل ہیں جن کے رنگ بھی مختلف ہیں مزے بھی مختلف ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ جب اپنے رب اور خالق کو تم نے اس کے دلائل قدرت کے ذریعہ اور اسکی نعمتوں کے واسطہ سے پہچان لیا تو عقل اور سمجھ کا تقاضا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اسکو ایک جانو اور ایک مانو اسکی الوہیت اور ربوبیت کا اقرار کرو۔ اور اس کے مقابل شریک مت ٹھہراؤ۔ اُس کے علاوہ نہ کوئی رب ہے نہ کوئی خالق ہے نہ نعمتیں دینے والا ہے نہ زندگی کے اسباب پیدا کرنیوالا ہے۔ ان سب باتوں کو جانتے اور سمجھتے ہوئے اس کے لئے شریک تجویز کرنا اور کسی کو اس کے علاوہ عبادت کا مستحق سمجھنا علم و فہم اور عقل و دانش کے خلاف ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ
اور اگر تم اس کتاب کی طرف سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کی تو لے آؤ کوئی سورت جو اس جیسی ہو اور بلا لو اپنے مددگاروں کو
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾
اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تم سچے ہو

رسالت محمدیہ ﷺ کی دلیل اور قرآن پاک کا اعجاز

تفسیر: توحید کے ثابت کرنے کے بعد رسالت کے ماننے اور تسلیم کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے' کوئی شخص خالق

و مالک کو مان لے تو اسکی معرفت کی بھی ضرورت رہتی ہے اسکی ذات وصفات کو جاننا اور ماننا لازم ہے اوران کا علم خود بخود نہیں ہوسکتا اور خالق و مالک جل مجدہ کی عبادت کے طریقے اپنے پاس سے ایجاد نہیں کئے جاسکتے۔ لہٰذا ان سب چیزوں کے سمجھانے اور بتانے کے لئے اللہ جل شانہٗ نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا جو انسان تھے اور انسانوں سے انسان کی زبان میں بات کرتے تھے۔ جتنے بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے ان کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ہر ایک زمانہ کے ماحول کے اعتبار سے معجزات دیئے گئے۔ آخر الانبیاء سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ خطہ عرب میں پیدا ہوئے مکہ معظمہ آپ کا وطن تھا جو جزیرہ عرب میں واقع ہے اس زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا بڑا چرچا تھا' اہل عرب جب مختلف مواقع میں جمع ہوتے تھے تو مقابلے کے طور پر مختلف قبائل اپنے اپنے قصیدے سُنایا کرتے تھے۔

جس کا قصیدہ بہت زیادہ فصیح بلیغ سمجھا جاتا اُس کو کعبہ شریف پر لٹکا دیتے تھے اور یہ گویا ایک قسم کا چیلنج ہوتا تھا کہ کوئی شخص اس کا مقابلہ میں قصیدہ لکھ کر پیش کرے۔ حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ خاتم النبیین ﷺ کی بعثت عامہ سارے عالم کے انسانوں کے لئے ہے' قیامت آنے تک آپ ہی رسول ہیں۔ آپ ہی کے لائے ہوئے دین کو قبول کرنے میں سب کی نجات ہے آپ سے بے شمار معجزات کا ظہور ہوا جو حدیث سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اور ان معجزات پر مُستقل کتابیں لکھی گئی ہیں ان معجزات میں بہت بڑا معجزہ اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہے جو آپ پر نازل ہوئی جس کا نام قرآن مجید ہے اس زمانہ میں چونکہ فصاحت و بلاغت کا بہت چرچا تھا اور مخاطبین اوّلین چونکہ اہل عرب ہی تھے۔ اس لئے یہ ایک ایسا معجزہ دے دیا گیا جس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے تمام شعراء عرب عاجز رہ گئے۔ اور اُسکو دیکھ کر بہت سے شعراء نے کلام کہنا ہی چھوڑ دیا جن میں حضرت لبید بن ربیعہؓ بھی تھے۔ ان کا قصیدہ بھی اُن قصائد میں شامل ہے جن کو مقابلہ کے لئے کعبہ شریف پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اُن سے دریافت کرایا کہ زمانہ اسلام میں آپ نے کیا اشعار کہے ہیں انہوں نے جواب دیا۔ ابدلنی اللّٰہ بالشعر سورۃ البقرۃ و سورۃ آلِ عمران (الاصابہ)

مذکورہ بالا آیت میں اہل عرب کو قرآن جیسی کوئی سورت بنا کر پیش کرنے کے لئے تحدّی کی گئی ہے یعنی مقابلہ میں کوئی سورت لانے کا چیلنج کیا گیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ تم سب اپنے حامیوں اور مددگاروں کو بُلا لو اور اللہ تعالیٰ کے سوا سارے حمایتوں کو جمع کرو پھر قرآن کریم جیسی کوئی سورت بنا کر پیش کرو۔ پہلے دس سورتیں بنا کر لانے کا چیلنج کیا گیا تھا پھر ایک سورت لانے کے لئے فرمایا گیا تمام فصحاء بلغاء ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی بنا کر نہ لاسکے اور یکسر عاجز رہ گئے۔

سورۃ یونس میں ارشاد فرمایا: قُلْ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (آپ فرما دیجئے کہ لے آؤ تم کوئی سورۃ اس جیسی' اور بُلا لو جس کو بھی بُلا سکتے ہو اللہ کے سوا' اگر تم سچے ہو)

قرآن کریم کا معجزہ ہونا ایسی ظاہر بات ہے جو سب کے سامنے ہے اور سب کو اس کا اقرار ہے دُشمن بھی اس کو جانتے اور مانتے رہے ہیں۔ زمانہ نزول قرآن میں بعضے جاہلوں نے تو یہ کہہ کر اپنی خفت مٹانے کی کوشش کی کہ: لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (اگر ہم چاہیں تو اس جیسا کہہ دیں) لیکن کر کچھ نہ سکے اور کچھ لوگوں نے قرآن کے مقابلہ میں کچھ عبارتیں بنائیں پھر خود ہی آپس میں مل کر بیٹھے تو تسلیم کر لیا کہ یہ قرآن جیسی نہ بنی اور آج تک بھی کوئی بنا کر نہ لاسکا اور نہ لاسکے گا۔ جیسا کہ اگلی آیت میں ارشاد ہے اور سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (آپ فرما دیجئے کہ یہ بات ضروری ہے کہ اگر جمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جنات کہ وہ لے آئیں اس قرآن جیسا تو نہیں لائیں گے اس جیسا اگرچہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں)

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ
سو اگر تم نہ کرو اور ہرگز نہیں کر سکو گے، سو ڈرو آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ وہ تیار کی گئی ہے
لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾
کافروں کے لئے

قرآن کے مقابلہ سے ہمیشہ عاجز رہیں گے

تفسیر: اس آیت میں فرمایا ہے کہ تم ہرگز قرآن کے مقابلہ میں اس جیسی کوئی سورت بنا کر نہیں لا سکتے ہو اور کبھی بھی نہ لا سکو گے اس میں رہتی دنیا تک کے لئے قرآن کے دنیا میں باقی رہنے کی پیشین گوئی کے ساتھ یہ پیشین گوئی بھی ہے کہ اس جیسا کوئی بھی جماعت یا کوئی فرد نہیں بنا سکتا۔ یہ دونوں پیشین گوئیاں صادق ہیں سچی ہیں سب کے سامنے ہیں چونکہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت عام ہے تمام افراد انسانی جب تک بھی دنیا میں رہیں ان پر فرض ہے کہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کا دین قبول کریں۔ چونکہ سارے انسانوں کے لئے سارے زمانوں اور سارے مکانوں میں آپ کی دعوت قیامت آنے تک ہے اس لئے کسی ایسے معجزہ کی بھی ضرورت تھی جو ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہے یہ معجزہ قرآن مجید ہے جو اللہ کا کلام ہے اور اس کا مقابلہ کرنے سے ہمیشہ کے لئے تمام انسان اور جنات افراد اور جماعتیں عاجز ہیں اور عاجز رہیں گے۔

قرآن موجود ہے اسکی دعوت عام ہے اسکی حقانیت اور سچائی واضح ہے پھر بھی کفر میں اور شرک میں بے شمار قومیں کروڑوں افراد مبتلا ہیں قرآن سنتے ہیں اور اس کو حق جانتے ہیں لیکن مانتے نہیں۔ عناد اور ضد اور تعصب قومی اور مذہبی نے انکو دعوت قرآن کے ماننے سے اور اسلام قبول کرنے سے روک رکھا ہے سب کچھ جانتے ہوئے پھر اسلام قبول نہ کرنا اپنے لئے عذاب آخرت مول لینا ہے اسی لئے ارشاد فرمایا کہ اگر تم قرآن کے مقابلہ میں کوئی سورت نہیں لا سکتے اور ہرگز نہیں لا سکو گے تو دوزخ کی آگ سے اپنے کو بچاؤ یعنی قرآن لانے والے کی رسالت اور دعوت کے منکر ہو کر عذاب دائمی کے مستحق نہ بنو اور دیکھتے بھالتے دہکتی ہوئی آگ کا ایندھن نہ بنو اس آگ کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر ہیں۔ انسان تو وہی ہیں جو اس کے منکر ہیں اور ایمان لانے کو تیار نہیں اور پتھروں کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ پتھر جن کی دنیا میں مشرکین عبادت کیا کرتے تھے دوزخ میں ہوں گے۔ سورۃ انبیاء میں فرمایا۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ (بے شک تم اور وہ جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔ تم اس پر وارد ہونے والے ہو)

تفسیر درِ منثور میں بحوالہ طبرانی، حاکم اور بیہقی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ پتھر جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ میں فرمایا ہے۔ کبریت (گندھک) کے پتھر ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے جیسے چاہا پیدا فرما دیا۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا

اور بشارت دیجئے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ بلاشبہ ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جب کبھی بھی

رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ

انکو ان باغوں میں سے کوئی پھل بطور غذا کے دیا جائے گا تو کہیں کہ یہ وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا' اور انکو ہم شکل پھل دیئے جائیں گے

وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور ان کے لئے ان باغوں میں بیویاں ہوں گی جو پاکیزہ بنائی ہوئی ہیں۔ اور وہ اُن باغوں میں ہمیشہ رہیں گے

اہل ایمان کو جنت کی بشارت

تفسیر: کافروں کی سزا بتانے کے بعد (جو اُوپر کی آیت میں مذکور ہوئی) اس آیت میں اہل ایمان اور اعمالِ صالحہ والے بندوں کی جزا ذکر فرمائی ہے جو طرح طرح کی نعمتوں کی صورتوں میں ظاہر ہوگی۔

اوّل: تو یہ فرمایا کہ یہ لوگ باغوں میں رہیں گے یہ باغات دار النعیم میں ہونگے جسے جنت کہا جاتا ہے ان باغوں میں رہنے کے لئے مکان بھی ہونگے جیسا کہ سورہ صف میں وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ فرمایا ہے ان باغات میں نہریں جاری ہوں گی جو صاف ستھرے پانی کی ہوں گی جس میں کسی طرح کا تغیر نہ ہوا ہوگا۔ اور دودھ کی نہریں ہوں گی جن کا مزہ تبدیل نہ ہوا ہوگا۔ اور شراب کی نہریں ہوں گی جو پینے والوں کے لئے لذت کا ذریعہ ہوں گی۔ اور صاف ستھرے شہد کی نہریں ہوں گی جیسا کہ سورۃ محمد ﷺ میں ان نہروں کا ذکر فرمایا ہے۔

اور جو شراب وہاں پی جائے گی وہ لذت کے لئے ہوگی۔ اس سے نہ نشہ آئے گا اور نہ سر میں درد ہوگا۔ سورۃ الصافات میں فرمایا ہے لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ (یہ اس میں درد سر ہوگا نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا)

دوم: یہ فرمایا کہ ان باغوں کے درختوں میں جو پھل ہوں گے وہ ان کو کھانے کے لئے پیش کئے جائیں گے اور جب کبھی بھی کوئی پھل لایا جائے گا تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا تھا اور وجہ اسکی یہ ہوگی کہ وہ پھل آپس میں ہم شکل ہوں گے اگرچہ لذت اور مزے میں مختلف ہوں گے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ من قبل سے یہ مراد ہے کہ دنیا میں جو پھل ہمیں دیئے گئے تھے یہ اُسی جیسا ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ وہیں جنت میں جو پھل دیئے جائیں گے اُن کے بارے میں کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ابھی پہلے کھایا تھا۔ مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ پہلے معنی لینا زیادہ ظاہر ہے تاکہ لفظ كُلَّمَا کا عموم باقی رہے (کیونکہ جنت میں سب سے پہلے جب پھل ملے گا اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے دیا گیا تھا اُسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب من قبل سے دنیا والے پھل مُراد لئے جائیں) لیکن صاحب تفسیر نسفی لکھتے ہیں۔

والضمير فى به يرجع الى المرزوق فى الدنيا والاخرة لان قوله هذا الذى رزقنا من قبل انطوى تحته ذكر ما رزقوه فى الدارين

جس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کا یہ کہنا کہ "یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے مل چکا ہے"۔ دونوں پھلوں کے بارے میں ہے دنیا والے پھل اور جو پھل وہاں دیئے جاتے رہیں گے دونوں مراد ہیں جو پھل اُن کو دیئے جائیں گے دیکھنے میں بظاہر دُنیاوی پھلوں سے مشابہ ہوں گے، جس چیز کو پہلے دیکھا ہو اس سے اُنس اور اُلفت زیادہ ہوتی ہے اور اُسکی طرف طبعی میلان زیادہ ہوتا ہے اس لئے ظاہری صورت میں وہ پھل دنیا والے پھلوں کی طرح ہوں گے اور حقیقت میں اُن کا مزہ اور کیف دوسرا ہی ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جنت کے پھلوں سے دنیا میں کوئی پھل نہیں بس ناموں کی مشابہت ہے یعنی پھلوں کو دیکھ کر اہل جنت کہیں گے کہ یہ سیب ہیں۔ یہ انار ہیں ہم نے اُن کو دُنیا میں کھایا تھا۔ لیکن وہ مزے میں دُنیاوی پھل کی طرح نہ ہونگے بلکہ اُن کا مزہ اور کیف جنت کے اعتبار سے ہوگا جیسا کہ سورۃ الٓمٓ سجدہ میں فرمایا ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ۔ بعض حضرات نے یہ اشکال کیا ہے کہ دنیا والے پھل مراد لئے جائیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جنتی پھل صرف انہی پھلوں کے مشابہ دیئے جائیں اور پھر اُن پھلوں کے انواع و اقسام پیش کئے جاتے رہیں جو دُنیاوی پھلوں کے مشابہ نہ ہوں اور ان میں آپس میں مُشابہت ہو تو اس میں کوئی بات عقل وفہم سے بعید نہیں ہے۔ اہل جنت کو بار بار اور ہمیشہ ایسے پھل دیئے جانا کہ جن میں ظاہری مُشابہت ہو اور حقیقت میں مزہ اور کیف الگ الگ ہو اس سے بہت زیادہ استغراب واستعجاب ہوگا۔ اور اس سے خوشی دوبالا ہوگی۔

سوم: یہ فرمایا کہ اُن لوگوں کے لئے بیویاں ہوں گی جو پاکیزہ بنائی ہوئی ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ **مطھرۃ من القذی والاذی** کہ وہ گندگی اور تکلیف دینے والی چیز سے پاک ہوں گی۔ اور حضرت مجاہدؒ نے فرمایا: **من الحیض والغائط والبول والنخام والبصاق والمنی والولد۔**

یعنی وہ بیویاں حیض سے، اور پیشاب پاخانہ سے، ناک سے نکلنے والے بلغم سے، تھوک سے، اور منی سے پاک وصاف ہوں گی اور اولاد بھی نہ ہوگی جس کے باعث نفاس آتا ہے۔ حضرت قتادہؓ نے فرمایا: **مطھرۃ من الاذی والمائم** یعنی وہ بیویاں ہر تکلیف والی چیز سے اور نافرمانی سے پاک ہوں گی۔ ان سب اقوال کا خلاصہ یہ نکلا کہ اُن عورتوں میں کسی قسم کی کوئی چیز گھن والی اور تکلیف دینے والی نہ ہوگی۔ اُن کا ظاہر اور باطن سب کچھ عمدہ اور بہترین ہوگا۔ شوہروں کی بات مانیں گی نافرمانی نام کو بھی نہ ہوگی۔ (مذکورہ اقوال تفسیر ابن کثیر میں نقل کئے گئے ہیں) مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ مُطَهَّرَةٌ (باب تفعیل سے) فرمایا اور طَاهِرَاتٌ نہیں فرمایا اس سے ان کی طہارت اور پاکیزگی کو نہایت اعلیٰ طریقے پر بیان فرمانا مقصود ہے کہ ان کو ایک پاک کرنیوالے نے پاک بنایا ہے اور وہ پاک بنانیوالا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اِن بیویوں کا حسن وجمال دوسری آیت میں بیان فرمایا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں ارشاد فرمایا: كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ (گویا کہ وہ یاقوت اور مرجان ہیں) اور سورۃ واقعہ میں فرمایا: وَحُوْرٌ عِيْنٌ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ (وہ سفید رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی ہوں گی گویا کہ وہ چھپے ہوئے موتیوں کی طرح ہیں)

چہارم: یہ فرمایا هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ یعنی اہل جنت ہمیشہ اُن باغوں میں رہیں گے۔ نہ وہاں سے نکلیں گے اور نہ نکالے جائیں گے نہ نکلنا چاہیں گے۔ کما فی سورۃ الکھف (لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا) صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل جنت کو خوشخبری سُنانے کے لئے) ایک ندا دینے والا پکار کر ندا دے گا تمہارے لئے یہ بات طے کردی گئی ہے کہ تندرست رہو گے لہٰذا کبھی بھی بیمار نہ ہوگے اور یہ کہ زندہ رہو گے۔ کبھی تمہیں موت نہ آئے گی۔

اور جوان رہو گے کبھی بُوڑھے نہ ہو گے اور یہ کہ نعمتوں میں رہو گے۔ پس تم کو کبھی محتاجگی نہ ہو گی۔ (صحیح مسلم ج ۲)

دنیا کی نعمتوں میں کدورت ملی ہوئی ہے۔ خوشی کے ساتھ رنج ہے تندرستی کے ساتھ بیماری ہے۔ پھولوں کے ساتھ کانٹے ہیں۔ مال اور عہدوں کے ساتھ دوسروں کا حسد اور دشمنی ہے اور سب سے آخر بات یہ ہے کہ سب نعمتیں فانی ہیں صاحب نعمت بھی فانی ہے نعمتوں کا دوام اور ہمیشگی کسی کے لئے نہیں۔ آخرت کی نعمتیں ابدی ہیں دائمی ہیں ہمیشہ کے لئے ہیں۔ ان کے زوال اور چھن جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہو گا۔ زندگی بھی دائمی ہو گی۔ خالدین فیھا ابدا ان کی شان میں فرمادیا ہے۔ (جعلنا اللہ تعالٰی منھم)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

بے شک اللہ تعالٰی اس بات سے نہیں شرماتا کہ کوئی بھی مثال بیان فرمائے۔ مچھر ہو یا اس سے بھی بڑھی ہوئی کوئی چیز ہو سو جو لوگ ایمان لائے

فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ

وہ جانتے ہیں کہ بلا شبہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے اور رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا سو وہ کہتے ہیں کیا ارادہ کیا اللہ نے اس کے ذریعہ مثال دینے کا

قرآنی مثالوں سے مومنین کا ایمان پختہ ہونا اور منکرین کا بے جا اعتراض کرنا

تفسیر: کتاب اللہ کے منکرین کی سزا اور اہل ایمان کی جزا بتانے کے بعد کتاب اللہ کے منکروں کے ایک اشکال اور اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔ مخالفین اور معاندین سے یہ تو نہ ہو سکا کہ کتاب اللہ کے مقابلہ میں کوئی سورت بنا کر لاتے لیکن انہوں نے ایک اعتراض کر دیا اور اس اعتراض میں قرآن کے کتاب اللہ ہونے کا انکار مضمر ہے حضرت قتادہ سے منقول ہے کہ جب اللہ تعالٰی نے عنکبوت (مکڑی) اور ذباب (مکھی) کا قرآن مجید میں تذکرہ فرمایا تو مشرکین کہنے لگے کہ اس میں تو مکڑی اور مکھی کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالٰی نے اس حقیر مثال سے کیا ارادہ کیا ہو گا۔ (ابن کثیر) اور یہ استفہام انکاری ہے مطلب یہ تھا کہ یہ مثال اللہ تعالٰی کی شان کے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اللہ تعالٰی کا کلام نہیں ہو سکتا۔ تفسیر نسفی میں ہے کہ جب مکھی اور مکڑی کا ذکر کتاب اللہ میں سُنا تو یہود ہنسے اور کہنے لگے کہ یہ تو اللہ تعالٰی کے کلام سے ملتی جلتی باتیں نہیں مقصد ان کا بھی کتاب اللہ کا انکار کرنا ہی تھا۔ ان لوگوں نے یہ نہ دیکھا کہ مثال ممثل لہ کے مطابق ہونی چاہئے۔ مثال دینے والے کی عظمت کو اور جس چیز کی مثال دی گئی اسکی حقارت کو سامنے رکھ کر قیاس دوڑانے لگے اور یہ نتیجہ نکالا کہ اللہ تعالٰی کے کلام میں ان چیزوں کا ذکر نہیں ہو سکتا۔

اللہ جل شانہٗ نے ان معاندین اور معترضین کی تردید فرمائی اور ان کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بلا شبہ اللہ تعالٰی اس سے نہیں شرماتا کہ کوئی چیز مثال میں پیش فرما دے خواہ مچھر ہی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہو (بڑھ کر ہونے میں دونوں صورتیں آجاتی ہیں حقارت اور چھوٹا ہونے میں بڑھ کر ہو یا جسامت میں بڑھ کر ہو) اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اہل ایمان کو اس میں کوئی تردد نہیں ہوتا کہ یہ مثال اللہ تعالٰی کی طرف سے ہے۔ (کیونکہ مثال اپنی جگہ ٹھیک ہے ممثل لہ کے مطابق ہے) وہ یقین رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مثال واقعی صحیح ہے۔ موقع کے مطابق ہے۔ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور کافر لوگ عناد کرتے ہیں اور ماننے سے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس حقیر چیز سے اللہ تعالٰی نے کیا ارادہ فرمایا ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ

اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بہت سوں کو گمراہ کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ بہت سوں کو ہدایت دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ نہیں گمراہ کرتے مگر فرمانبرداری سے نکل جانے والوں کو جو

عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ

اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں اسکی مضبوطی کے بعد اور کاٹتے ہیں اُن چیزوں کو جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا

فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور فساد کرتے ہیں زمین میں یہ لوگ پورے خسارہ والے ہیں

قرآنی مثالیں فاسقوں کے لئے گمراہی کا سبب ہیں

تفسیر: اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو طرح طرح کی مثالیں پیش فرمائی ہیں' سمجھانے کے لئے اور معاندین کو راہِ حق پر لانے کے لئے ہیں لیکن ان لوگوں میں بہت سے لوگ ان مثالوں پر اعتراض کرتے ہیں اور اُن کا یہ انکار اور عناد ضلال اور اضلال کا سبب ہو جاتا ہے اور جو اہل ایمان ہیں وہ مزید اپنے ایمان پر ثابت قدم ہو جاتے ہیں اور یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے صحیح اور درست ہے اور موقع کے مطابق ہے۔ جو لوگ اس مثال کو اپنے لئے ذریعہ کفر بنا لیتے ہیں یعنی مثال پر اعتراض کر کے اپنے کفر میں مزید اضافہ کر لیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو حکم عدولی پر کمر باندھے ہوئے ہیں ان کو غور کرنے اور حق تلاش کرنے کی عادت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کلام فصاحت التیام ہی کو انہوں نے اپنے لئے ذریعہ ضلال بنا لیا۔ ان میں مُنافقین بھی ہیں اور عام کافرین بھی۔

قال ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہ یضل بہ کثیرا یعنی بہ المنافقین ویھدی بہ کثیرا یعنی بہ المومنین' فیزید ھؤلآء ضلالۃ إلی ضلالتھم لتکذیبھم بما قد علموہ حقاً یقیناً من المثل الذی ضربہ اللّٰہ بما ضرب لھم وانہ لما ضرب لہ موافق فذلک اضلال اللّٰہ ایاھم بہ ویھدی بہ یعنی بالمثل کثیرا من اھل الایمان والتصدیق فسیزیدھم ھدی إلی ھداھم وایمانا الی ایمانھم لتصدیقھم بما قد علموہ حقا یقینا انہ موافق لما ضربہ اللّٰہ لہ مثلا واقرارھم بہ وذلک ھدایۃ من اللّٰہ لھم بہ (من ابن کثیر) والا ضلال خلق فعل الضلال فی العبد والھدایۃ خلق فعل الاھتداء ھذا ھو الحقیقۃ عند اھل السنۃ. (تفسیر نسفی)

فاسقوں کے اوصاف

پھر ان فاسقوں[۱] یعنی حکم عدولی کرنے والوں اور ہدایت ربانی کے خلاف چلنے والوں کے کچھ اوصاف ذکر فرمائے۔

اور (۱) وہ یہ کہ یہ لوگ اللہ کے عہد کو اس کی مضبوطی کے بعد توڑتے ہیں۔ اس عہد سے یا تو عقل انسانی مُراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے اور یہ عقل دُنیا میں انسان پر حجت ہے اور ایک طرح کا عہد ہے کہ انسان اپنی عقل سے اپنے

---

[۱] فاسقین فاسق کی جمع ہے یہ لفظ فسق سے مشتق ہے جس کا معنی ہے حکم عدولی کرنا اور فرمانبرداری سے باہر ہو جانا' یہ لفظ کافروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور گناہ کبیرہ کے مرتکب کے لئے بھی ہر ایک کی حکم عدولی اپنے اپنے عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے ہے۔

خالق اور مالک کو پہچانے اور اپنے خالق اور مالک کو واحد جانے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ یا عہد الست بربکم مُراد ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ جل شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی ساری ذریت کو (جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی) ان کی پشت سے نکالا جو بہت چھوٹی چھوٹی شکلوں میں چیونٹیوں کی طرح سے تھے۔ اور اُن سے عہد لیا اور سوال فرمایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب نے کہا "بلیٰ" کہ ہاں آپ ہمارے رَبّ ہیں۔ وادی نعمان میں (عرفات کے قریب) یہ عہد لیا گیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح از مسند احمد)

سورۂ اعراف کی آیت وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی میں اسی عہد کا ذکر ہے۔ یہ عہد سب نے کیا پھر اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں اس عہد کے یاد دلانے کے لئے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا۔ جن حدیثوں میں اس عہد کا ذکر ہے ان میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اقرار کے بعد فرمایا کہ میں ساتوں آسمانوں کو اور ساتوں زمینوں کو تمہارے اُوپر گواہ بناتا ہوں اور تمہارے باپ آدم کو بھی تم پر گواہ بناتا ہوں۔ قیامت کے دن تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہمیں اس بات کا پتہ نہ تھا۔ تم جان لو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میرے سوا کوئی رب نہیں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا' میں تمہاری طرف رسول بھیجوں گا جو تم کو میرا یہ عہد اور میثاق یاد دلائیں گے' اور تم پر اپنی کتابیں نازل کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس بات کے گواہ ہوگئے کہ آپ ہمارے رب ہیں اور ہمارے معبود ہیں اور ہمارے لئے آپ کے سوا کوئی رب نہیں اور آپ کے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں چنانچہ سب نے اسکا اقرار کرلیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

جو عہد سب نے کرلیا تھا اسکے یاد دلانے کے لئے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہے۔ اس عہد کو توڑنا سراسر نا انصافی ہے اور عہد سے مکر جانا ہے۔ اور اپنی جان پر ظلم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے بھی عہد لیا تھا کہ جو کتاب تمہارے اوپر نازل کی گئی اسکو تم لوگوں کے سامنے بیان کروگے اور چھپاؤ گے نہیں۔

کما قال تعالیٰ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ (سورۃ آل عمران ع ۱۹)

یہ عہد بھی یہاں اس آیت سے مراد ہوسکتا ہے کیونکہ علماء اہل کتاب بھی قرآن کی لغت میں لگے ہوئے تھے۔ منافقین اور مُشرکین عرب کی طرح یہ لوگ بھی اسلام کے پھیلنے اور قرآن کی دعوت عام ہونے میں پوری طرح رُکاوٹیں کھڑی کرتے رہتے تھے۔

(۲) ان فاسقوں کا دوسرا وصف یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ اُن چیزوں کو کاٹتے ہیں جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا' ان میں وہ احکام بھی ہیں جو فیما بین العبد و بین اللہ ہیں۔ (اللہ تعالیٰ سے بندے کا تعلق ہے کہ وہ اپنے خالق اور مالک کا فرمانبردار رہے) اور وہ احکام بھی ہیں جو فیما بین العباد ہیں جن میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں میں تفریق نہ کریں کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں بلکہ سب پر ایمان لائیں' اور "لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ" کا مصداق بنیں۔

اور ان احکام میں صلہ رحمی بھی ہے اور اہل ایمان سے دوستی کرنا بھی ہے۔ غرض ایمان باللہ کا جو تقاضا ہے اس کے مطابق عمل کرنا عہد کو جوڑے رکھنا اور ہر وہ عمل جس میں خیر کا چھوڑنا اور شر کا اختیار کرنا ہو یہ سب اُس چیز کے قطع میں آتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑے رکھنے کا حکم فرمایا ہے سورۂ رعد میں ایفاء عہد اور عدم نقض میثاق اور وصل ما امر اللہ بہ کی مدح کی گئی ہے۔ اور جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے اُن کے توڑنے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔ (سورۂ رعد رکوع ۳ کا ترجمہ اور تفسیر پڑھیے)

(۳) ان فاسقوں کا تیسرا وصف یہ بیان فرمایا کہ یہ زمین میں فساد کرتے ہیں' فساد بگاڑ کو کہتے ہیں اور یہ بہت جامع لفظ

ہے۔ کفر اختیار کرنا، منافق بننا، مُشرک ہونا، اللہ کی وحدانیت کا منکر ہونا، دوسروں کو ایمان سے روکنا، حق اور اہل حق کا مذاق بنانا، حقوق کا غصب کرنا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا قتل وخون کرنا جس کی شریعت میں اجازت نہیں دی گئی۔ یہ سب فساد فی الارض میں داخل ہے۔ آخر میں فرمایا اُولٰٓئِکَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ کہ یہ لوگ پورے خسارے میں ہیں۔ یہ لوگ اپنے خیال میں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم بہت کامیاب ہیں ایمان نہ قبول کر کے اور منافقت اختیار کر کے دنیا کے فائدوں کو ہاتھ سے جانے نہ دیا انہوں نے دنیا کے حقیر فائدوں پر نظر کی اور آخرت کے دائمی عذاب کے مستحق بنے جس سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

کیسے کفر کرتے ہو اللہ کے ساتھ حالانکہ تم بے جان تھے سو اس نے تم کو زندگی دی۔ پھر تم کو موت دے گا پھر زندہ فرمائے گا پھر اُس کی طرف لوٹائے جاؤ گے

مکرر دعوت توحید

تفسیر: اس آیت میں پھر توحید کی دعوت دی گئی جو یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا۔ میں دی گئی تھی اور ارشاد ہو رہا ہے کہ تم اپنے خالق و مالک کے کیسے منکر ہو رہے ہو اور اس کی توحید سے کیسے انحراف کر رہے ہو حالانکہ اُس نے تم کو وجود بخشا ہے۔ تم نطفے کی حالت میں بے جان تھے۔ سو اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی دی تمہارا جسم بنایا اور اُس میں روح پھونکی۔ عقل کا تقاضا ہے کہ ایسی ذات پاک پر ایمان لائیں اور کفر اختیار نہ کریں اور بات اتنی ہی نہیں ہے کہ مردہ تھے اُس کے بعد اُس نے زندگی بخشی بلکہ اس کے بعد یہ بھی ہے کہ جب تمہاری اجل مقررہ ختم ہوگی وہ تمہیں موت دے گا اس کے بعد پھر زندگی بخشے گا اُس زندگی کے بعد اُسی کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔ اُس وقت اس دنیا میں کئے ہوئے اعمال کا حساب ہوگا۔ کفر کا اور بُرے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ ایمان اور عمل صالح کی بھی جزا ملے گی۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ

اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے پیدا فرمایا جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔ پھر قصد فرمایا آسمان کی طرف سو ٹھیک طرح بنا دیا اُن کو سات

سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

آسمان اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے

ارض وسماء کی تخلیق کا بیان

تفسیر: اس آیت میں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اپنی شان خالقیت بیان فرمائی ہے کہ اُس نے آسمان و زمین پیدا فرمائے جو مخلوقات میں بڑی چیزیں ہیں اور نظروں کے سامنے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا بھی تذکرہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں صرف پیدا کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ تمہاری حاجت کی چیزیں زمین میں پیدا فرمائیں زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے لئے ہے شرعی قواعد اور قوانین کے مطابق اُس سے نفع حاصل کر سکتے ہو۔ خود زمین انسانوں کے لئے بہت بڑی نعمت اور رحمت ہے اور اس کی سطح پر اور اس کے اندر ان گنت چیزیں ہیں۔ انسان ان سب سے منتفع ہوتے ہیں۔ سورۃ رحمٰن میں ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ اور سورۂ ملک میں ہے هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا

وَ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ۔ (اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین کو تمہارے قابو کی چیز بنادی لہٰذا اس کے راستوں میں چلو پھرو اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور تمہیں اُسی کی طرف موت کے بعد اُٹھ کر جانا ہے)

زمین سے نکلنے والے چھوٹے بڑے درخت، پھل، میوے، معدنیات اور طرح طرح کی چیزیں جن کی گنتی بیان سے باہر ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں انسان ان کو استعمال کرے اور ان کے پیدا کرنے والے کا شکر گزار ہو۔ بعض وہ چیزیں جن میں بظاہر ضرر نظر آتا ہے وہ بھی بعض حالات میں نافع اور مفید ہیں۔ سانپ، بچھو اور سنکھیا تک سے دوائیں بنائی جاتی ہیں۔ البتہ نفع مند بنانے کی تدبیریں ہیں وہ بھی اللہ جل شانہٗ نے ذہنوں میں ڈالی ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے اِلّا یہ کہ دلیل حُرمت اور استعمال کی ممانعت کسی شرعی دلیل سے ثابت ہو جائے اور یہ بھی سمجھ لیں کہ جس طرح استعمال کے طریقے سیکھتے ہیں اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ شرعی قوانین کے مطابق استعمال کیا جائے مثلاً کوئی شخص کسی کی ملکیت غصب نہ کرے۔ اور نافع چیز کو اپنے لئے ضرر کی چیز نہ بنا لے۔ حرام چیزیں استعمال نہ کرے۔ جس کے فروع اور مسائل جزئیہ بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت سے اور سورۃ حٰمٓ سَجْدَةُ کی آیت: قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ. الآیة سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پہلے پیدا فرمائی اور اس کے بعد آسمان کی طرف توجہ فرمائی۔ جو دُھواں تھا اُس کے سات آسمان بنادیئے اور سورۃ النازعات میں فرمایا ہے۔

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا وَاَغْطَشَ لَیْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا۔ (یعنی آسمان کی چھت کو بلند فرمایا اور اسکو ٹھیک بنایا اور اُسکی رات کو تاریک بنایا اور اُس کے دن کو ظاہر فرمایا اور اُس کے بعد زمین کو پھیلایا)

ان سب آیات کے ملانے سے معلوم ہوا کہ اوّل زمین کا مادّہ بنایا اور اس کے اُوپر بھاری بھرکم پہاڑ پیدا فرمائے پھر سات آسمان بنادیئے جو بنانے سے پہلے دھوئیں کی صورت میں تھے اس کے بعد زمین کو موجودہ صورت میں پھیلا دیا۔

قال النسفی فی المدارک ولا یناقض ھذا قولہ والارض بعد ذلک دحٰها لان جرم الارض تقدم خلقُه خلقَ السماءِ واما دحوھا فتأخر.

فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ یعنی آسمان کا مادہ جو دھویں کی صورت میں تھا جس کا ذکر سورۃ حٰمٓ سَجْدَةُ میں ہے (وَهِیَ دُخَانٌ) اِس کے سات آسمان بنادیئے اور خوب اچھی طرح بنائے، ٹھیک بنائے، دُرست بنائے، اُن میں نہ کجی ہے نہ پھٹن ہے نہ شگاف ہے نہ کسی قسم کا کوئی نقص ہے۔ ساتوں آسمان جو اُوپر نیچے تہ بتہ بنے ہوئے ہیں ان میں کسی قسم کا کوئی خلل نہیں۔ سورۂ ملک میں فرمایا: وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ (اور وہ زبردست ہے بخشنے والا ہے جس نے تہ بتہ سات آسمان پیدا فرمائے تو خدا کی خالقیت میں کوئی فرق نہیں دیکھے گا سو تو نگاہ ڈال کر دیکھ لے کیا تو اس میں کوئی خلل دیکھ رہا ہے)

سورۃ قٓ میں فرمایا: اَفَلَمْ یَنْظُرُوْا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ۔ (کیا انہوں نے نہیں دیکھا آسمان کی طرف اپنے اُوپر ہم نے اسکو کیسا بنایا اور اس کو زینت دے دی اور اُس میں کوئی شگاف نہیں ہے)

سورۂ بقرہ کی آیت بالا کے آخر میں فرمایا: وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے) اتنے بڑے آسمان اتنی بڑی زمینیں اور اُن میں جو کچھ اب ہے جو کچھ آئندہ ہوگا جو کچھ پہلے تھا اور اُن کے سوا بھی جو کچھ ہے اُن سب کا اسکو پورا پورا علم ہے۔ جو انسان اور جنات دنیا میں آئے اُن کے لئے ہدایت بھیجی اُن میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی،

فرمانبردار بھی ہیں اور نافرمان بھی ' ہدایت قبول کرنے والے بھی اور اُس سے منہ موڑنے والے بھی اللہ تعالیٰ کو ہر ایک کے عقیدہ اور عمل کا علم ہے۔ ہر ایک کے عقیدہ اور عمل کے مطابق جزا اور سزا دے گا۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ بے شک میں پیدا کرنے والا ہوں زمین میں خلیفہ فرشتوں نے عرض کیا۔ آپ پیدا فرمائیں گے زمین میں جو اُس میں

يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ

فساد کریگا اور خونوں کو بہائے گا اور ہم آپ کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو حمد کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے اور آپکی پاکی بیان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک میں جانتا ہوں

مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾

جو تم نہیں جانتے

حضرت آدم کی خلافت کا اعلان اور فرشتوں کی معروض

تفسیر: انسان کی تخلیق سے پہلے اس زمین میں جنات رہتے تھے۔ وہ آگ سے پیدا کئے گئے تھے ان کے مزاج میں شر ہے ' زمین میں بہت فساد کرتے رہے اور خون بہاتے رہے اللہ جل شانہٗ نے زمین میں اپنا خلیفہ پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں خلیفہ پیدا کرنیوالا ہوں۔ فرشتوں نے جنات کا حال دیکھ رکھا تھا انہوں نے سمجھا کہ زمین کا مزاج ایسا ہی ہے کہ جو اس میں رہے گا فساد کریگا اور خون بہائے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ گویا فرشتوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہونے والے خلیفہ میں تین قوتیں ہوں گی۔ (جن کا وجود خلافت کے لئے ضروری ہے) یعنی قوتِ شہوانیہ اور قوتِ غضبیہ ' جو فساد اور خون خرابے پر آمادہ کرنیوالی ہیں اور قوتِ عقلیہ جو معرفت باللہ اور طاعت اور فرمانبرداری پر آمادہ کرنیوالی ہے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ پہلی دو قوتوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایسا خلیفہ پیدا نہ کیا جائے جس میں یہ دونوں موجود ہوں اور قوۃ عقلیہ کے جو تقاضے ہیں یعنی فرمانبرداری اور اطاعت اور تسبیح و تقدیس و تحمید ہم اس میں لگے ہوئے ہیں انہوں نے اس سے پہلے ایسی کوئی مخلوق نہیں دیکھی تھی جس میں متضاد قوتیں جمع ہوں اور اُن کے مجموعہ سے ایسی طبیعت پیدا ہو جائے جس سے خیر کا مظاہرہ ہو۔ عفت بھی ہو' شجاعت بھی ہو۔ عدل و انصاف بھی ہو۔ اہل شر کی سرکوبی پر قدرت بھی ہو اور پہلی دو قوتیں مہذب ہو کر قوت عقلیہ کے تابع ہو جائیں۔ لہٰذا وہ سوال کر بیٹھے انہوں نے پہلی دو قوتوں کے بارے میں الگ الگ غور کیا۔ اور یہ نہ غور کیا کہ قوۃِ عقلیہ کے ساتھ ان دونوں کے ملنے سے کیا کچھ کمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ فرشتوں نے لفظ خلیفہ سے یہ بات نکال لی کہ اس دُنیا میں فسادی لوگ ہونگے کیونکہ خلیفہ کی ضرورت ہی اسی لئے ہے کہ اصلاح کی جائے اور اصلاح جبھی ہوگی جب فساد ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے بطور تعجب یہ عرض کیا کہ کیا آپ اپنی زمین میں ایسا خلیفہ بنائیں گے جو نافرمانی کرے گا' لفظ خلیفہ سے جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ زمین میں فساد کرنیوالے ہوں گے۔ وہاں یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اصلاح کرنیوالے بھی ہوں گے لیکن اُنہوں نے معصیت کا حکم سب پر لگا دیا۔ جو صحیح نہیں تھا۔ قتادہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بتا دیا تھا کہ زمین میں ایسی مخلوق ہوگی جو فساد کرے گی اور خون بہائے گی

اس لئے انہوں نے وہ بات کہی جو اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَاءَ میں ذکر فرمائی۔ فرشتوں نے جو کچھ کہا وہ بطور اعتراض نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا کفر ہے اور فرشتے کفر سے اور ہر طرح کی معصیت سے بری اور معصوم ہیں کما قال تعالیٰ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ (سورۃ الانبیاء) اور فرمایا لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ (سورۃ تحریم) راجع فی ذلک کلہ القرطبی والبیضاوی

فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ ہم آپ کی تسبیح کرتے ہیں اور ہر عیب اور ہر نقص سے آپکی تنزیہ کرتے ہیں اور یہ تسبیح حمد کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ یعنی تسبیح کے ساتھ آپ کی حمد بھی کرتے ہیں۔ اور ہر کمال سے آپ کو متصف جانتے ہیں اور اس کو بیان کرتے ہیں۔ نُسَبِّحُ کے ساتھ وَنُقَدِّسُ لَکَ بھی مذکور ہے۔ یہ لفظ تقدیس سے مشتق ہے۔ تسبیح اور تقدیس کا معنی تقریباً ایک ہی ہے۔ اور تفسیر قرطبی میں حضرت مجاہد تابعی سے نُقَدِّسُ کا معنی یوں نقل کیا ہے۔

ای نعظمک ونمجدک ونطھر ذکرک عما لا یلیق بک مما نسبک الیه الملحدون

(یعنی ہم تیری عظمت اور بزرگی بیان کرتے ہیں اور تیرے ذکر کو ہر اُس چیز سے پاک کرتے ہیں جس کی نسبت ملحدوں نے تیری طرف کی ہے)

نُقَدِّسُ لَکَ کا ایک معنی مفسر بیضاوی نے یوں لکھا ہے۔ نطھر نفوسنا عن الذنوب لا جلک (یعنی ہم اپنی جانوں کو آپ کی رضا کے لئے پاک وصاف رکھتے ہیں گناہوں میں ملوث نہیں ہیں)

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِکَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ
اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھا دیئے سارے نام پھر ان کو فرشتوں پر پیش فرمایا۔ پھر فرمایا کہ مجھے بتا دو ان چیزوں کے نام اگر
کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾
تم سچے ہو

حضرت آدم کو اشیاء کے نام بتا کر فرشتوں سے سوال فرمانا

تفسیر: جس نئی مخلوق کے پیدا فرمانے اور زمین میں خلیفہ بنانے کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا تھا وہ حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی ذریت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا اوّل تو پتلا بنایا گیا پھر اس میں روح پھونکی گئی۔ اور جب یہ جاندار چیز بن گئی اور جاننے اور پہچاننے کے قابل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ساری چیزوں کے نام بتا دیئے پھر اُن چیزوں کو فرشتوں پر پیش فرمایا جن کے نام حضرت آدم علیہ السلام کو بتا دیئے تھے اور فرمایا تم مجھے ان کے نام بتا دو اگر تم سچے ہو۔ مفسر بیضاوی لکھتے ہیں: فی زعمکم انکم احقاء بالخلافة لعصمتکم وان خلقھم واستخلافھم وھذہ صفتھم لا یلیق بالحکیم وھو وان لم یصرحوا به لکنه لازم مقالھم مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے خیال میں اور اس بات میں سچے ہو کہ خلافت کے زیادہ حقدار تم ہو کیونکہ تم معصوم ہو اور یہ کہ ایسی مخلوق کا پیدا کرنا اور خلیفہ بنانا جس کی صفت فساد فی الارض اور سفک دماء ہو

شانِ حکیم کے لائق نہیں ہے تو تم ان چیزوں کے نام بتادو۔ یہ بات کہ ہم بہ نسبت نئی مخلوق کے خلافت کے زیادہ مستحق ہیں صاف طور پر انہوں نے نہیں کہی تھی لیکن ان کے قول سے یہ بات بطور لزوم کے نکلتی ہے۔

لفظ آدم کے بارے میں بعض مفسرین نے فرمایا کہ وہ عجمی لفظ ہے۔ جیسے آزر اور شالخ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ عربی لفظ ہے جو اُدْمَۃٌ سے مشتق ہے۔ عربی میں یہ مادہ گندم گونی رنگ کے معنی دیتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام بتادیئے تھے حتیٰ کہ چھوٹے بڑے پیالے کا نام بھی بتادیا تھا۔ جب فرشتوں کے سامنے پیش فرما کر ان کے نام پوچھے تو وہ عاجز رہ گئے۔ (اور سوال ہی ان کا عجز ظاہر کرنے کیلئے کیا گیا تھا) اور اس طرح سے اللہ جل شانہٗ نے نئی مخلوق کی فضیلت ثابت فرمادی اور بتادیا کہ اس نئی مخلوق میں صفت علم ایک ایسی بڑی چیز ہے۔ جس کی وجہ سے زمین میں خلافت قائم کی جاسکتی ہے اور باقی رکھی جاسکتی ہے۔ بغیر علم کے خلافت نہیں چل سکتی بلکہ کوئی بھی کام علم کے بغیر صحیح طریقے سے نہیں ہوسکتا۔ صحیح عمل کے لئے صحیح علم کی ضرورت ہے۔ اور صفت علم میں یہ نئی مخلوق تم سے بڑھ کر ہے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

فرشتوں نے عرض کیا کہ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں ہمیں اُس کے سوا کچھ علم نہیں جو آپ نے ہمیں سکھایا، بے شک آپ جاننے والے ہیں حکمت والے ہیں

فرشتوں کا عجز اور اقرار

تفسیر: جب فرشتوں نے دیکھ لیا کہ اس نئی مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت سے نواز دیا اور جو علوم اُسکو دیئے ہیں وہ ہم میں نہیں ہیں تو اُنہوں نے اپنی عاجزی کا اقرار کرلیا اور بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ ہم ان چیزوں کے نام نہیں بتا سکتے۔ ہمیں جو کچھ علم ہے اسی قدر ہے جو کچھ آپ نے عطا فرمایا ہے۔ اور ساتھ ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی کہ آپ نے جو اس مخلوق کو خلیفہ بنانے کا ارادہ فرمایا ہے بالکل صحیح ہے آپ ہر عیب اور نقص سے پاک ہیں آپ نے جو اس مخلوق کو خلیفہ بنانے کا ارادہ فرمایا اُس کے متعلق کسی قسم کا کوئی سوال اُٹھانا درست نہیں اور آپ علیم ہیں سبھی کچھ جانتے ہیں اور حکیم بھی ہیں آپ کا کوئی ارادہ اور فعل حکمت سے خالی نہیں۔

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! ان کو ان چیزوں کے نام بتادو سو جب اُنہوں نے اُن کو ان چیزوں کے نام بتادیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ بے شک میں جانتا ہوں

غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

آسمانوں اور زمین کی غیب کی چیزوں کو اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو

حضرت آدم علیہ السلام کا علم و فضل ظاہر ہونا

تفسیر: جب فرشتوں نے اُن چیزوں کے نام بتانے سے اپنے عاجز ہونے کا اظہار کردیا جو اُن پر پیش کی گئی تھیں تو اللہ تعالیٰ شانہٗ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ تم ان کے نام بتادو چنانچہ انہوں نے اُن چیزوں کے نام بتادیئے۔ فرشتوں کی

عاجزی کا اور حضرت آدم علیہ السلام کے علم کا خوب اچھی طرح مظاہرہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا۔ کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔ مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تم سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ پیدا کرنیوالا ہوں تو تمہیں توقف کرنا چاہئے تھا اور اس انتظار میں رہنا مناسب تھا۔ کہ اس نئی مخلوق کے بارے میں ایسی معلومات حاصل ہو جائیں جو اس کے فضل و کمال پر اور اس کے مستحق خلافت ہونے پر دلالت کریں۔ خلیفہ پیدا فرمانے کا اعلان سنتے ہی اشکال کرنا درست نہ تھا۔

اور یہ جو فرمایا کہ میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو اس کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ جو ظاہر کیا وہ یہ بات تھی جو بطور سوال عرض کی تھی کیا آپ پیدا فرمائیں گے جو زمین میں فساد اور خون خرابہ کریں گے اور جو چھپایا اس سے مراد یہ ہے کہ ہم خلافت کے زیادہ مستحق ہیں۔ انہوں نے یہ بات چھپائی کہ اللہ تعالیٰ ہم سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہ فرمائے گا۔ واللہ اعلم۔

ان آیات سے علم کی فضیلت معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ خلافت کے لئے علم ضروری ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل تھے کیونکہ ان کو اُن سے زیادہ علم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے۔ قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (کیا برابر ہیں جو جاننے والے ہیں اور جو جاننے والے نہیں ہیں)

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓـئِکَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝
اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ سجدہ کرو آدم کو سو انہوں نے سجدہ کر لیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہ کیا اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا

فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا اور ابلیس کا انکاری ہونا

تفسیر: جب آدم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم فرمایا کہ ان کو سجدہ کرو۔ حکم تو پہلے سے دیا جا چکا تھا جیسا کہ سورۂ حجر اور سورۂ صٓ میں ہے۔ فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ (کہ جب میں اس کو بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا)

لیکن جب اُن کا علم و فضل ظاہر ہو گیا اور سجدہ کرنے کا سبب یعنی آدم علیہ السلام کا افضل ہونا معلوم ہو گیا تو حکم سابق کا اعادہ فرمایا تا کہ فرشتے اپنے علم سے انکی فضیلت کا اقرار کریں اور حکم کے مطابق سجدہ میں گر پڑیں۔ لہٰذا وہ سب آدم کے لئے سجدہ ریز ہوئے اور آدم کی تخلیق سے پہلے ہی جو انہوں نے مُفسد اور خون خرابہ کرنے والا کہہ دیا تھا اس کی بھی تلافی ہو گئی۔

سجدہ تعظیمی کی بحث اور اس کا حکم

یہ تو یقینی طور سے ہر مسلمان جانتا ہے کہ یہ سجدہ عبادت کا نہ تھا کیونکہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔ پھر یہ سجدہ کون سا تھا؟ اس کے بارے میں مفسرین نے دو باتیں لکھی ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو تھا اور آدم علیہ السلام کو قبلہ بنایا گیا تھا۔ اُن کو قبلہ بنانے سے بھی اُن کا مرتبہ ظاہر ہو گیا جیسا کہ کعبہ شریف قبلہ ہے اور اس سے اسکی فضیلت ظاہر ہے۔ اور لِاٰدَمَ میں جو لام ہے وہ ایسا ہی ہے۔ جیسے حضرت حسان کے اس شعر میں ہے۔ ؎ الیس اوّل من صلّٰی لقبلتکم + واعرف الناس بالقرآن والسنن

اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ سجدہ تو آدم علیہ السلام ہی کو تھا لیکن یہ سجدہ تعظیمی تھا۔ سجدہ عبادت نہ تھا جیسے یوسفؑ

کے بھائیوں نے اُن کو سجدہ کیا تھا۔ (بیضاوی)

شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ میں غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ خواہ کیسا ہی سجدہ ہو، سجدہ تعظیمی جو یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کیا وہ اُن کی شریعت میں جائز تھا۔ یہ شریعت سابقہ کی بات تھی جو منسوخ ہو گئی حضرت قیس بن سعد (صحابی) رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں شہر حیرہ میں آیا میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے علاقے کے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے۔ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو میں نے عرض کیا کہ میں حیرہ شہر گیا تھا وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں تو (میرے نزدیک) آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپ نے فرمایا اگر تم میری قبر پر گزرو گے تو کیا سجدہ کرو گے؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، فرمایا سو (اب بھی) مجھے سجدہ نہ کرو اگر میں حکم دیتا کہ کوئی شخص کسی کو سجدہ کرے تو عورتوں کو حکم دیتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں اس حق کی وجہ سے جو اللہ نے شوہروں کا عورتوں پر رکھا ہے۔ (سُنن ابو داؤد)

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ میں سجدہ تعظیمی کسی کے لئے جائز نہیں، نہ زندہ کو نہ مردہ کو۔ نہ مُرشد کو نہ قبر کو۔ اور حدیث مذکور کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن میں غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی ممانعت وارد ہوئی بعض حضرات نے سجدہ تعظیمی کی حُرمت پر سورۂ جن کی آیت وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَداً سے بھی استدلال کیا ہے۔ کہ مساجد مصدر میمی بمعنی سجدات ہے اور اس کا عموم اور اطلاق ہر طرح کے سجدوں کو شامل ہے (ترجمہ یہ ہے کہ بلاشبہ تمام سجدے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہیں لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو)

ابلیس کی بدتمیزی اور بدبختی:

سورہ حجر میں فرمایا ہے۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ (کہ حکم سن کر فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا اس نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنیوالوں میں شامل ہو)

اللہ جل شانہٗ نے جب اس سے سوال فرمایا کہ تو سجدہ کرنیوالوں کے ساتھ کیوں نہ ہوا اور تو نے سجدہ کیوں نہ کیا۔ تو اس پر اُس نے جواب دیا کہ۔ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۔ (سورۃ اعراف وسورۃ صٓ) (کہ میں اس سے بہتر ہوں، مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو کیچڑ سے پیدا کیا)

ابلیس ملعون نے نہ صرف یہ کہ حکم کی تعمیل نہ کی بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو غلط بتایا اور اعتراض کر بیٹھا کہ آپ نے افضل کو حکم دیا کہ غیر افضل کو سجدہ کرے۔ یہ حکمت کے خلاف ہے۔ اُس نے اپنے خیال میں آگ کو مٹی سے افضل سمجھا اس لئے جو آگ سے پیدا ہوا ہے اس کو بھی مٹی سے پیدا شدہ شخص سے افضل سمجھ لیا۔ آگ کو مٹی سے افضل سمجھنا ہی اول تو غلط ہے۔ آگ میں فساد زیادہ ہے صلاح کم ہے۔ اور مٹی میں سراپا خوبی ہے، جو نافع ہی نافع ہے۔ اور سب سے بڑی جو خوبی کی چیز مٹی میں ہے وہ تواضع اور فروتنی ہے پھر کام کی چیزیں سب زمین ہی سے نکلتی ہیں انسانوں اور جنوں کے رہنے کی جگہ بھی زمین ہی ہے۔ پھل، میوے، غلے، ہرے بھرے باغ، کھیتیاں، سب زمین سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اور بہت سی وجوہ سے مٹی کو آگ پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر مومن بندے کا کام یہ ہے کہ وہ بات مانے حکم کی تعمیل کرے اگرچہ اپنی سمجھ سے خلاف ہی ہو۔

زبان تازہ کردن باقرار تو ؎ نیگخیتن علّت از کارِ تو!

حکم عالی سُن کر اس میں حجت نکالنا کبر اور نافرمانی ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے سورۃ بقرہ میں فرمایا اَبٰی وَ اسْتَکْبَرَ وَ کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ (یعنی ابلیس نے حکم ماننے سے انکار کیا اور تکبر کیا، اور وہ پہلے ہی سے اللہ کے علم میں کافروں میں سے تھا) اور بعض مفسرین نے کان بمعنی صار بھی لیا ہے یعنی وہ اب اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر کے کافر ہو گیا۔ جب ابلیس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ تعالیٰ کا حکم سُن کر حجت بازی کی اور حکم الٰہی کو حکمت کے خلاف بتایا تو اللہ تعالیٰ نے اسکو ملعون قرار دے دیا یعنی اپنی رحمت سے محروم کر دیا۔ اور فرمایا:

فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا یَکُوْنُ لَکَ اَنْ تَتَکَبَّرَ فِیْهَا فَاخْرُجْ اِنَّکَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ۔

(کہ تو اس سے اُتر تجھ کو کوئی حق نہیں کہ اس میں تکبر کرے سو نکل جا بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے) (سورۃ اعراف)

اور فرمایا: فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ وَاِنَّ عَلَیْکَ لَعْنَتِیْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ (کہ تو اس سے نکل جا کیونکہ بے شک تو مردود ہے اور بیشک تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت رہے گی) جو شخص قیامت کے دن تک ملعون رہ گیا اس کے بعد اُس پر رحمت ہو ہی نہیں سکتی پھر تو اس کے لئے دوزخ ہی دوزخ ہے۔ قال تعالیٰ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْکَ وَمِمَّنْ تَبِعَکَ مِنْهُمْ اَجْمَعِیْنَ (سورۃ ص)

غرض کہ شیطان کو تکبر کھا گیا اور ہمیشہ کے لئے ملعون اور مدحور اور ذلیل و خوار ہو گیا۔ اس نے ملعون ہونا گوارہ کیا لیکن حکم ماننا اُسے منظور نہ ہوا۔ تکبر ایسی بُری بلا ہے جو دنیا اور آخرت میں متکبر کا ناس کھو دیتی ہے۔

بعض لوگوں نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ سجدہ کا حکم تو فرشتوں کو ہوا تھا۔ اور ابلیس جن میں سے تھا پھر اس نے سجدہ نہ کیا تو اس کا مواخذہ کیوں ہوا؟ یہ سوال غلط ہے کیونکہ سورۃ اعراف میں اس کی تصریح ہے کہ اس کو بھی سجدہ کرنے کا حکم تھا۔ کما قال تعالیٰ مَا مَنَعَکَ اَنْ لَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُکَ (تجھے کس چیز نے روکا اس بات سے کہ تو سجدہ کرے جبکہ میں نے تجھ کو حکم دیا)

اس تصریح کے بعد اصل سوال تو ختم ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کو بالاستقلال الگ سے حکم تھا یا چونکہ فرشتوں کے ساتھ رہتا سہتا اور اُن کے ساتھ عبادت کرتا تھا اس لئے اس کے عموم میں یہ بھی آ گیا تھا یہ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ والعلم عند اللہ العلیم۔

قرآن مجید سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس عالم بالا میں رہتا تھا جب نافرمانی کی تو وہاں سے اُتر جانے اور نکل جانے کا حکم ہوا۔ وہاں اس کے اعمال و اشغال کیا تھے اس کے بارے میں بعض صحابہ اور تابعین سے کچھ باتیں منقول ہیں، جو در منثور میں ص ۵۰ ج ۱ پر لکھی ہیں۔ بظاہر یہ اسرائیلی روایات ہیں۔ بہر حال جو بھی کچھ ہو اس نے اپنا علم بے جگہ استعمال کیا اور غرور علم میں اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر دیا اور کفر اختیار کر کے مردود ہو گیا۔ اور اس سے پہلے جتنی بھی عبادت کی تھی سب اکارت گئی ؎

ہزاروں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا ۔۔۔ مارا گیا شیطان ایک سجدہ کے نہ کرنے سے

ابلیس کی بنی آدم سے دُشمنی:

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ جب ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: یٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَلِزَوْجِکَ فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی۔ (اے آدم بلاشبہ یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے سو یہ ہرگز تم کو جنت سے نکال نہ دے پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے) اور ابلیس نے قسم کھائی کہ میں آدم کی ذرّیت کا ناس کھو دوں گا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ ابلیس نے کہا: لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا (میں ضرور ضرور اسکی ذرّیت کو اپنے قابو میں کر لوں گا بجز تھوڑے لوگوں کے) اس مضمون کی تکمیل ان شاء اللہ سورۃ اعراف کے دوسرے رکوع کی تفسیر سے کی جائے گی۔

اس کے بعد حضرت آدم و حوا کے جنت میں رہنے اور شیطان کے بہکانے کا ذکر ہے جو ابھی آتا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ

ابلیس کا پرانا نام عزازیل تھا جب ملعون ہو گیا تو اس کا نام ابلیس رکھا گیا' اور شیطان بھی کہا جانے لگا۔ شیطان کا معنی ہے بہت زیادہ شریر۔ یہ سب سے بڑا شیطان ہے اور اسکی ذرّیت بھی شیطان ہے۔ اور بہت سے انسان بھی شیطانوں کا کام کرتے ہیں۔ اسی لئے شیاطین الانس والجن فرمایا گیا ہے۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ

اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہا کرو اور اس میں سے خوب اچھی طرح کھاؤ' جہاں سے چاہو۔ اور نہ قریب جانا اس

الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

درخت کے ورنہ تم دونوں ظلم کرنیوالوں میں سے ہو جاؤ گے

حضرت آدم علیہ السلام اور اُنکی بیوی کو جنت میں رہنے کا حکم اور ایک خاص درخت سے بچنے کی ہدایت

تفسیر: اس آیت شریفہ میں یہ فرمایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور اُنکی بیوی کو جنت میں رہنے کا حکم دیا اور خوب بافراغت اچھی طرح کھانے کا کھلا اختیار دے دیا۔ لیکن خاص ایک درخت کے بارے میں فرمایا کہ اس کے پاس نہ پھٹکنا۔ مقصد تو یہ تھا کہ اس میں سے مت کھانا لیکن بطور مبالغہ اچھی طرح اہتمام کے ساتھ اس سے بچنے کے لئے یہ فرمایا کہ اس کے پاس بھی نہ جانا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر تم نے اس میں سے کھا لیا تو ظالموں میں شمار ہو جاؤ گے۔ اس سے دو طرح کا ظلم مراد ہو سکتا ہے۔ **اوّل** تو یہ کہ اس کے کھانے سے جو ممانعت کی خلاف ورزی ہوگی' یہ گناہ ہوگا اور ہر گناہ' گناہ کرنیوالے کے لئے وبال ہے۔ اور وہ اسکی وجہ سے مستحق سزا ہے۔ **دوم** یہ کہ جب خلاف ورزی کر لو گے تو یہاں جن نعمتوں میں رہ رہے ہو سلب ہو جائیں گی اور یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ اور یہ بھی اپنی جان پر ظلم ہوگا۔

شجرہ (درخت) جس کے کھانے سے منع فرمایا تھا وہ کون سا درخت تھا۔ اس بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ثابت نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ یہ گیہوں کا درخت تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ انگور کا درخت تھا۔ حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ وہ انجیر کا درخت تھا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ کھجور کا درخت تھا۔ (یہ اقوال تفسیر در منثور) پر درج ہیں صحیح علم اللہ ہی کو ہے کہ وہ کون سا درخت تھا، ہمیں معین طریقہ پر اس کا علم یقینی نہیں ہے اور اس میں مضائقہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے جاننے پر کوئی حکم شرعی موقوف نہیں ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ

سو شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کے ذریعہ سے لغزش دی' سو ان دونوں کو اس سے نکال دیا جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ اتر جاؤ تم میں سے بعض' بعض کے دشمن ہوں گے۔ اور تمہارے لئے

فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

زمین میں ٹھہرنا ہے اور ایک زمانہ تک نفع حاصل کرنا ہے

حضرت آدم وحواء علیہما السلام کو شیطان کا بہکانا اور جنت سے نکالا جانا

تفسیر : اللہ جل شانہٗ نے آدم علیہ السلام سے فرمادیا تھا کہ دیکھو یہ ابلیس تمہارا دشمن ہے تم دونوں کو جنت سے نہ نکال دے یعنی جنت سے نکال دیئے جانے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ اُدھر شیطان نے بھی دُشمنی پر کمر باندھ لی تھی اور حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی بیوی اور اُن کی ذرّیت کو تکلیف پہنچانے کا پکا ارادہ کرچکا تھا۔ وہ اس تاک میں رہا کہ ان کو کسی طرح جنت سے نکلواؤں اور یہاں کی نعمتوں سے محروم کروں۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ ان کو ایک درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا ہے اگر کسی طرح ان سے اس ممانعت کی خلاف ورزی کرادوں تو ضرور ان پر عتاب ہوگا۔ جو یہاں سے نکالے جانے کا سبب بنے گا۔ چنانچہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ دیکھو تم کو اس درخت کے کھانے سے اس لئے روکا گیا ہے۔ کہ جو کوئی شخص اس درخت میں سے کھالے گا وہ ہمیشہ یہیں رہے گا۔ اور جو بادشاہی یہاں حاصل ہے اس میں کبھی ضُعف نہ آئے گا' اور اس نے یہ بھی کہا کہ تم دونوں کو تمہارے رب نے اس درخت کے کھانے سے اس لئے روکا ہے کہ اس کو کھا کر فرشتے ہوجاؤ گے اور ہمیشہ زندہ رہو گے۔ (فی سورۃ الاعراف) مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ (وفی سورۃ طٰہٰ) يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۔

اور اُس نے صرف معمولی طور پر ہی ترغیب نہیں دی' بلکہ دونوں میاں بیوی سے قسم کھا کر کہا کہ بے شک میں تمہارے لئے خیر خواہی کا مشورہ دینے والا ہوں۔ (کمافی سورۃ الاعراف) وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ۔

شیطان کے سمجھانے بجھانے اور قسم کھانے سے دونوں میاں بیوی نے اُس درخت میں سے کھالیا جس سے منع فرمایا گیا تھا اور وہ ان کو فریب دے کر نیچے اُتارنے میں کامیاب ہوگیا۔ (فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ) اس درخت کو چکھنا تھا کہ جنت کے کپڑے ان کے تن سے جدا ہوگئے اور دونوں کی شرم کی جگہیں ایک دوسرے کے سامنے ظاہر ہوگئیں اب تو جنت کے پتے اپنے جسموں پر جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے۔ جیسا کہ سورۃ اعراف اور سورۃ طٰہٰ میں مذکور ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے ان کو پکار کر فرمایا کیا میں نے تم کو اس درخت سے منع نہ کیا تھا اور کیا میں نے یہ نہ کہا تھا کہ بلاشبہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ دونوں فوراً گناہ کے اقراری ہوئے اور مغفرت طلب کرنے لگے۔ اس کا ذکر سورۃ اعراف میں ہے۔ اور ابھی فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ۔ کی تفسیر میں بھی انشاء اللہ ان کی توبہ کا ذکر آئے گا۔ یہاں یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ شیطان نے اُن کو کس طرح بہکایا اور وسوسہ کیسے ڈالا۔ جبکہ وہ وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں مُفسر بیضاوی نے یہ احتمال لکھا ہے کہ اعزاز کے طور پر اس کا وہاں رہنا اور داخل ہونا ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ایسی مضبوط ممانعت نہ ہوئی تھی کہ بالکل ہی داخل نہ ہوسکے' چونکہ حضرت آدم وحواء علیہما السلام کا ابتلاء اور امتحان مقصود تھا اس لئے وسوسہ کے لئے داخلہ کا موقعہ دیا گیا۔ اور ایک احتمال میں لکھا ہے کہ دروازہ کے قریب کھڑے ہو کر وسوسہ ڈالا۔ (لیکن یہ دونوں باتیں اس پر مبنی ہیں کہ وہ جنت سے نکالا گیا تھا اور ابھی زمین پر نہیں آیا تھا) ان کے علاوہ دوسرے اقوال بھی ذکر کئے گئے ہیں۔ جو بھی صورت ہو اُس نے وسوسہ ڈالا اور بہکایا اور انہوں نے اسکی بات پر عمل کیا۔ جس کی وجہ سے زمین پر آنا پڑا' تکوینی طور پر جو اُن کو زمین پر بھیجنا اور خلیفہ بنانا پہلے سے طے تھا شیطان کا بہکانا اور اُن کا درخت میں سے کھالینا زمین پر آنے اور رہنے اور بسنے کا سبب بن گیا۔

جب درخت کھانے کا واقعہ پیش آگیا تو اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ تم یہاں سے اُتر جاؤ' زمین میں جا کر رہو وہاں تم

میں بعض بعض کے دُشمن ہوں گے۔ اور زمین میں تم کو ٹھہرنا ہے اور ایک زمانہ تک نفع حاصل کرنا ہے۔ اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ آدم اور حوا اور انکی ذرّیت کو قیامت تک دُنیا میں رہنا ہے جس کا وقت مقرر ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اُن میں سے ہر شخص کو اپنی موت آنے تک زمین پر رہنا ہے اور تھوڑا بہت نفع حاصل کرنا ہے۔

یہاں لفظ اِهْبِطُوْا (تم اُتر جاؤ) جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے جب دو آدمی تھے تو جمع کا صیغہ کیوں لایا گیا؟ اس کے بارے میں بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام اور ابلیس، تینوں کو خطاب ہے (ابلیس ابھی تک آسمانوں میں تھا، زمین پر نہیں آیا تھا) اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ صیغہ جمع اس لئے لایا گیا کہ حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام اور اُن کی ذریت کا مجموعہ مراد ہے۔ یہ دونوں اُتارے گئے تو ساری ذریت اُتاری گئی، گو ابھی موجود نہ تھی۔ یہ دوسری بات زیادہ اولیٰ واقرب ہے کیونکہ سورۂ طٰہٰ میں تثنیہ کا صیغہ اِهْبِطَا لایا گیا ہے۔ اور ابلیس کو مستقل وہاں سے اُترنے اور نکلنے کا حکم پہلے دیا جا چکا تھا جو سورۂ اعراف میں مذکورہ ہے۔

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۔ (تم میں سے بعض، بعض کے دشمن ہوں گے) اس سے بنی آدم کی آپس کی دشمنیاں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ شیطان تمہارا دُشمن رہے گا اور تم اس کے دشمن ہو گے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾
اس کے بعد آدم نے اپنے رب سے چند کلمات حاصل کر لئے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی بے شک وہ خوب زیادہ توبہ قبول فرمانے والا ہے بڑا مہربان ہے

حضرت آدم علیہ السلام کا توبہ کرنا اور توبہ قبول ہونا

تفسیر: حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی بیوی سے جو خطا ہو گئی اس کی وجہ سے انہیں بہت زیادہ ندامت تھی۔ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ان کو چند کلمات بتائے گئے کہ اُن کے ذریعے توبہ کریں، یہ کون سے کلمات تھے بعض مفسروں نے فرمایا کہ سورۂ اعراف میں جو اُن کی توبہ کے الفاظ مذکورہ ہیں وہی مراد ہیں یعنی۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر آپ نے ہماری مغفرت نہ فرمائی اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ضرور ہم خسارے والوں میں سے ہو جائیں گے)

ان الفاظ میں متکلم مع الغیر کا صیغہ استعمال فرمایا جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام دونوں ہی نے مذکورہ الفاظ کے ذریعہ توبہ کی۔ حضرت ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ جو الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوئے تھے وہ یہ الفاظ تھے۔ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْلِىْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ۔ (اے اللہ میں آپکی پاکی بیان کرتا ہوں اور آپ کی حمد بیان کرتا ہوں اور آپ کی شان بلند ہے اور آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، لہٰذا مجھے بخش دیجئے بے شک آپ کے علاوہ کوئی بھی گناہ کو نہیں بخش سکتا)

جو بھی الفاظ ہوں اللہ تعالیٰ نے اُنکو توبہ کے الفاظ بتائے انہوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے توبہ کے الفاظ خود ہی القاء فرمائے اور اُن کی توبہ قبول فرمائی۔ اور ارشاد فرمایا کہ وہ توبہ قبول فرمانے والا اور بہت بڑا مہربان

ہے جب کبھی بھی کوئی شخص ندامت کے ساتھ رجوع کریگا اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہے۔ وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْ عَنِ السَّیِّاٰتِ وَیَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ۔ (اور اللہ وہ ہے کہ جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور گناہوں کو معاف فرماتا ہے اور جانتا ہے جو تم کرتے ہو) معافی اور مغفرت تو ہوگئی لیکن جنت میں واپس نہیں بسایا گیا کیونکہ تکوینی طور پر اُن کو پہلے ہی سے دنیا میں بھیجنا اور خلیفہ بنانا طے تھا اُن کے دنیا میں آنے کی وجہ سے بہت کثیر تعداد میں اُن کی ذرّیت کے افراد مرد اور عورت ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے مستحق جنت ہوئے۔ یہ بنی نوع انسان کا بہت بڑا فائدہ ہوا۔ اگر وہ دونوں جنت ہی میں واپس کردیئے جاتے تو وہاں کی نعمتوں سے وہی منتفع اور متمتع رہتے۔ اور اگر بالفرض وہاں اولاد ہوتی تو وہ اعمالِ صالحہ کی محنت اور گناہوں سے پرہیز کرنے کی مشقت کے بغیر ہی نعمتوں میں رہتی اور نعمتوں کی زیادہ قدر نہ ہوتی اپنی محنت سے جو چیز حاصل ہو اور دکھ تکلیف کے بعد جو نعمتیں ملیں اُن کا مزہ اور کیف اور ہی ہوتا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا

ہم نے کہا تم سب یہاں سے اُتر جاؤ۔ پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے سو جس نے میری ہدایت کا اتباع کیا تو اُن پر کوئی خوف نہ

هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا اور میری آیتوں کو جھٹلایا یہ لوگ دوزخ والے ہیں یہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے

ہدایت قبول کرنیوالوں کیلئے انعام اور کافروں کیلئے دوزخ کا داخلہ

تفسیر: اس سے پہلے حکم اِهْبِطُوْا (اُتر جاؤ) پہلی آیت میں مذکور ہے۔ اسکو دوبارہ لانا یا تو تاکید کے لئے ہے یا پہلا حکم یہ بتانے کیلئے تھا کہ تم یہاں سے جاؤ جہاں جارہے ہو مصیبت کی جگہ ہوگی آپس میں دشمنی ہوگی اور وہاں تھوڑی مدت رہنا ہوگا، ہمیشگی نہ ہوگی اور دوسرا حکم یہ بتانے کے لئے ہے کہ جہاں تم کو بھیجا جارہا ہے وہ دار التکلیف ہے۔ وہاں قیام کرنے کے بارے میں یہ بھی ذہن میں رکھو اور یہیں سے سمجھتے جاؤ کہ تمہارے خالق اور مالک کی طرف سے وہاں ہدایت آئے گی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر آئیں گے اسکی کتابیں نازل ہوں گی۔ اُن پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان لانا ہوگا اور اُنکی تعلیمات اور ہدایات کے مطابق زندگی گزارنی ہوگی جو ہدایت کا اتباع کریں گے ان کے لئے یہاں واپس آکر خیر ہی خیر ہے نہ اُنہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی رنج لاحق ہوگا۔ سورۂ طٰہٰ میں یوں فرمایا ہے فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰى (کہ جو شخص میری ہدایت کا اتباع کرے گا سو نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی ہوگا) اور جو لوگ کفر اختیار کریں گے اور میری آیات کو جھٹلائیں گے یہ نار (آگ) والے ہوں گے یعنی دوزخ میں جائیں گے جس طرح اہل ایمان ہمیشہ جنت میں رہیں گے اسی طرح یہ اہل کفر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

فوائد ضروریہ متعلقہ واقعہ حضرت آدم علیہ السلام

حضرت آدم و حوا علیہما السلام اور اُن کے دشمن ابلیس ملعون کے مذکورہ واقعہ سے بڑے بڑے اہم نتائج اور فوائد معلوم ہوئے۔

انسان کو خلافت ارضی کیلئے پیدا فرمایا: (۱) اللہ جل شانہٗ نے انسان کو خلافت ارضی کے لئے پیدا فرمایا۔ اُس پر لازم ہے کہ اپنے خالق و مالک کا خلیفہ بن کر رہے۔ اس کے احکام پر خود بھی عمل کرے اور اپنے زور و طاقت سے احکام الٰہیہ کو

نافذ کرے۔ اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایسے شخص کو صاحب اقتدار بنانا واجب ہے جو احکام الٰہیہ پر عمل کرا سکتا ہو۔

جو لوگ قرآن کو نہیں مانتے وہ تو اس واجب پر کیا عمل کریں گے جنہیں قرآن کے ماننے کا دعویٰ ہے وہ بھی احکام الٰہیہ کی تنفیذ کے حق میں نہیں ہیں۔ دُنیا کے ایک بڑے حصے پر مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے لیکن قوانین شریعت نافذ کرنے کے لئے تیار نہیں اُس سے جان چراتے ہیں۔ دُشمنانِ اسلام کے ترتیب دیئے ہوئے ظالمانہ قوانین کو کورٹ اور کچہری میں استعمال کرتے ہیں کیونکہ شرعی قوانین سے بہت سے دنیاوی منافع اور نفس کی لذتوں پر زد پڑتی ہے اس لئے اللہ کی خلافت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور خلیفۃ اللہ نہ ہونے کی وجہ سے ساری دُنیا فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ جو ممالک مسلمانوں کے زیر اقتدار ہیں فسادات وہیں زیادہ ہیں۔ قتل و خون کے واقعات بھی انہیں ممالک میں بہت زیادہ پیش آتے رہتے ہیں۔ مسلمان ہی مسلمان کو قتل کرتا ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایسا خلیفہ بنائیں جو احکام الٰہیہ کو نافذ کرے اور اس بارے میں اس کی مدد کریں۔ اور خلافت کے کام انجام دیں۔ اور فاسق بن کر يَقْطَعُونَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ کا مصداق نہ بنیں۔ جو انسان اللہ تعالیٰ کی خلافت کے لئے پیدا کیا گیا اس کے اکثر افراد تو کافر ہی ہیں اور جو اسلام کے مدعی ہیں اُن میں سے بھی اکثر نافرمانی پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ انسان کی حماقت اور شقاوت ہے۔ اپنے بلند مرتبہ کو چھوڑ کر دنیا کی ذلت اور آخرت کے عذاب کے لئے اپنی جان کو تیار کر رکھا ہے یہی انسان جس کے سب سے پہلے فرد کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا وہی انسان اپنے کفر کی وجہ سے دوزخ میں جانے کو تیار ہے یہ تو اہل کفر ہیں اور جو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں وہ بھی صالحین کے پیچھے نہیں لگتے۔ فاسقوں، فاجروں، بدعقیدہ ملحدوں کو اپنا لیڈر اور قائد بنا لیتے ہیں اور انہیں کو اقتدار سونپتے ہیں اور یہ لوگ خود اور صاحب اقتدار سب مل کر فساد برپا کرتے ہیں۔ قتل و خون اور لوٹ مار کی خبریں برابر آتی رہتی ہیں۔ رشوت کی گرم بازاری ہے سودی کاروبار ہیں سودی لین دین ہے۔ شرابیں پی جارہی ہیں۔ زکوٰتیں نہیں دی جاتیں (بہت کم لوگ زکوٰۃ شرعی قاعدہ کے مطابق دیتے ہیں) لوگوں کے حق مارے جارہے ہیں۔ نمازیں برباد ہیں، رمضان میں کھلے عام سب کے سامنے کھایا پیا جاتا ہے۔ جانتے بوجھتے گناہ کرتے ہیں اور گناہوں پر اصرار ہے۔ اپنا مقام بھول گئے اور معصیتوں میں لگ گئے۔ شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ آئے کہ پھر تو فرشتوں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جو نئی مخلوق پیدا ہو رہی ہے وہ فساد کی ہوگی اور خون خرابہ کرنے والی ہوگی۔ اس وسوسہ کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں نے تو تمام افراد انسانی کو ہی فساد اور خون خرابہ سے متصف کر دیا تھا انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور علماء، صلحاء، شہداء، عابدین، ذاکرین، قانتین، مجاہدین، حجاج، حُفاظ قرآن، مفسرین قرآن، محدثین، مصنفین، مصلحین و مرشدین بھی ہوں گے اگر بنی نوع انسان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے اور خاص کر اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انسانوں میں کیسے کیسے اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے اور اصلاح حال کے لئے جانیں وقف کرنے والے اور خلافت الٰہیہ کے فریضہ کو انجام دینے والے گزرے ہیں۔ فرشتوں کے سامنے اہل صلاح و فلاح کے اعمالِ خیر کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے اندر یکے بعد دیگرے رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے آتے رہتے ہیں اور وہ فجر اور عصر کی نماز میں جمع ہوتے ہیں۔ جب وہ فرشتے واپس ہو کر اُوپر جاتے ہیں جنہوں نے تمہارے ساتھ رات گزاری تو اللہ تعالیٰ شانہٗ اُن سے دریافت فرماتے ہیں حالانکہ وہ ان سے زیادہ جاننے والے ہیں کہ میرے بندوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا۔ وہ عرض کرتے ہیں: تر کناھم وھم یصلون واتیناھم وھم یصلون یعنی ہم نے اُن کو اس

حال میں چھوڑا کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ہم اُن کے پاس گئے تھے تو بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ (رواہ البخاری)

اور یوم عرفہ کو جب حجاج عرفات میں جمع ہوتے ہیں تو اللہ جل شانہ اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش فرما کر فخر فرماتے ہیں (فی حدیث جابر مرفوعا اذا کان یوم عرفة ان اللہ ینزل إلی السماء الدنیا فیباھی بھم الملئکة فیقول انظروا الی عبادی اتونی شعثاً غبرا ضاجین من کل فجٍّ عمیق. الحدیث کما فی المشکوۃ عن شرح السنة)

یوم عید میں بھی اسی طرح فرشتوں کے سامنے اپنے بندوں کو پیش فرما کر اللہ تعالیٰ فخر فرماتے ہیں۔ (مشکوۃ المصابیح ص ۱۸۲)

علم بہت بڑی دولت ہے

(۲) علم اللہ جل شانہٗ کی بہت بڑی نعمت ہے اور بہت بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ اسی کے ذریعہ اللہ جل شانہٗ نے فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر فرمائی۔ علم ہر حال میں جہالت سے بہتر ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ علم کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں اور خلافت الٰہیہ کے کاموں میں اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں خرچ کرنے سے صاحب علم کی فضیلت باقی رہتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جن چیزوں کا علم دیا گیا تھا۔ یہ خلافت الٰہیہ کو قائم اور باقی رکھنے کیلئے دیا گیا تھا انسان کو جو بھی علم ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بننے کے لئے استعمال کیا جائے۔ جو علم مجادلہ پر اُبھارے، راہ حق سے ہٹائے وہ علم جہل ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ ان من العلم جھلا (یعنی بعضے علم جہالت ہوتے ہیں) اخرجہ ابوداؤد فی کتاب الادب۔

کتاب وسنت کے علوم تو باعث قرب الٰہی ہیں ہی دوسرے علوم بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ بن سکتے ہیں (قال تعالیٰ وَفِيٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (وقال تعالیٰ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ) لیکن حال یہ ہو رہا ہے کہ آفاق اور انفس اور اشجار و احجار جبال و بحار سے متعلق جو علوم منکشف ہو رہے ہیں انسان ان سے اپنے دُنیاوی امور میں منتفع اور متمتع ہوتا ہے لیکن جس نے یہ علوم دیئے ہیں اور یہ منافع پیدا فرمائے اور انکی طرف لوگوں کا ذہن منتقل کیا ہے اسکی طرف متوجہ نہیں، یہ لوگ عام طور پر ملحد، کافر اور فاسق فاجر ہی ہیں۔

جو علم میں بڑھ کر ہو اس کی برتری تسلیم کرنی چاہئے:

(۳) جب کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے اُس کے عالم ہونے کا اقرار کرے۔ اور بغیر کسی پس و پیش کے اپنا عجز ظاہر کر دے اور اس میں اپنی خفت محسوس نہ کرے۔ جیسا کہ فرشتوں نے حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم ظاہر ہوتے ہی اپنے عجز کا اقرار کر لیا، جاہل ہوتے ہوئے علم کا دعویٰ کرنا اور اہل علم سے بحث کرنا بہت بڑی حماقت ہے اور حق منکشف ہونے کے بعد باطل پر جما رہنا یہ بہت بڑی شقاوت ہے۔

توبہ کی اہمیت اور ضرورت:

(۴) بندے کا کام یہ ہے کہ جب کوئی گناہ ہو جائے فوراً توبہ کرے اور اپنے خالق و مالک کی طرف رجوع ہو، اپنے گناہ کا اقرار کرے۔ اور مغفرت طلب کرے۔ گناہ پر اصرار نہ کرے اور گناہ کو اپنے لئے وبال سمجھے اور گناہ کو اپنی جان پر ظلم جانے۔ حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے گناہ ہو گیا تھا یعنی وہ درخت کھا لیا تھا جس کے کھانے سے منع کیا گیا تھا۔ اور حضرت آدم ممانعت کو اُس وقت بھولے ہوئے تھے۔ (کما فی سورۃ طٰہٰ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا) جب ان کا مواخذہ ہوا تو انہوں نے کوئی حجت نہیں

کی۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور توبہ کی۔ گو بھول پر مؤاخذہ نہیں ہوتا مگر بھول کے اسباب اختیار کرنے پر مؤاخذہ ہو جاتا ہے اور بڑوں کی بڑی بات ہے اُن کی وہ باتیں بھی گرفت میں آ جاتی ہیں جو دوسروں سے درگزر کردی جاتی ہیں حضرت آدم اور اُن کی بیوی نے کوئی کٹ حجتی نہیں کی نہ بھول کا بہانہ بنایا اللہ جل شانہٗ نے اُن پر رحم فرمایا اور خود ہی ایسے کلمات انکو القاء فرمائے جو قبولیت توبہ کا ذریعہ بن گئے۔ قال البیضاوی مجیباً عما یردعلی العصمة انه فعله ناسیاً لقوله تعالیٰ فنسی ولم نجدله عزماً ولکنه عُوتب بترک التحفظ عن اسباب النسیان ولعله (ای النسیان) وان حطّ عن الامة لم یحط عن الانبیاء لعظم قدرهم۔

برخلاف ابلیس شیطان کے اس نے دانستہ طور پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی اور نہ صرف خلاف ورزی کی بلکہ حکم ہی کو غلط بتایا اور ذاتِ خداوندی پر اعتراض کر بیٹھا اور اپنی خطا تسلیم نہیں کی دونوں باتوں سے معلوم ہوا کہ گناہ کا اقرار کرنا اور توبہ کرنا معافی کے لئے رونا دھونا بے چین ہونا ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور تمام صالحین کا جو اپنے باپ آدم کی راہ پر تھے یہی طریقہ رہا ہے اور گناہ کر کے کٹ حجتی کرنا اور اس کو گناہ نہ سمجھنا' گناہ کا اقرار نہ کرنا' ابلیس کا طریقہ ہے جو تمام شیطانوں کا سرغنہ ہے۔ مومن بندے جن کو تعلق مع اللہ حاصل ہے اور انابت الی اللہ کی نعمت سے نوازے گئے ہیں وہ تو نہ صرف یہ کہ گناہ ہو جانے پر توبہ کرتے ہیں بلکہ نیکی کر کے بھی استغفار کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے خالق کا حق ادا نہ ہوا۔ گناہ تو بندوں سے ہو ہی جاتا ہے لیکن مغفرت کی طلب میں جلدی کرتے ہیں اور معافی مانگتے رہتے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ "کل بنی آدم خطاء وخیر الخطائین التوّابون"۔ یعنی تمام بنی آدم خطا کار ہیں اور خطا کاروں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو خوب توبہ کرنیوالے ہیں۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ والدارمی مشکوٰۃ)

پس بنی آدم پر لازم ہے کہ اپنے باپ آدم علیہ السلام کے طریقہ پر چلیں اور ابلیس دُشمن کی راہ اختیار نہ کریں۔

تکبّر بری بلا ہے: (۵) تکبر بہت بُری بلا ہے۔ یہ صفت انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ ابلیس علیہ اللعنۃ نے تکبر کیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہ مانا اور اُس کو خلافِ حکمت قرار دیا۔ تنبیہ کرنے پر بھی اپنے انکار پر اڑا رہا۔ ملعون اور مطرود اور مدحور ہونا گوارا کر لیا لیکن حکم خداوندی کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس نے یہ تو کہا کہ میری زندگی دراز کردی جائے اور مجھے مہلت دی جائے (اور اس میں شر کا پہلو تھا کیونکہ درازیٔ عمر سے کوئی خیر مقصود نہ تھی بلکہ بنی آدم کو بہکانا اور غلانا کفر و شرک پر ڈالنا مقصود تھا) اور توبہ کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ جسے اپنی بڑائی کا خیال ہوا اُس سے بڑے بڑے گناہ صادر ہوتے ہیں وہ حق کو ٹھکراتا ہے۔ لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا' یارسول اللہ! کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اُس کا کپڑا اچھا ہو اور جوتا اچھا ہو (کیا یہ تکبر ہے) آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے (لہٰذا اچھا کپڑا اور اچھا جوتا پہننا تکبر نہیں ہے) پھر فرمایا۔ الکبر بطل الحق وغمط الناس۔ یعنی تکبر یہ ہے کہ حق کو ٹھکرائے اور اس کے ماننے سے انکار کرے اور لوگوں کو ذلیل اور حقیر جانے (رواہ مسلم)

اس آفت میں امیر غریب عالم جاہل سب مبتلا ہوتے ہیں۔ اور مصلحین' واعظین' مرشدین کو بھی یہ مرض گھن کی طرح سے لگ جاتا ہے۔ اپنے اعمال کی ریاکاری دوسروں کی غیبت اور تحقیر اپنے عمل و فضل کا ظاہر کرنا حق سامنے ہوتے ہوئے نہ ماننا گناہ کرنا اور نصیحت و خیر خواہی کرنیوالوں سے کٹ حجتی کرنا۔ مسئلہ غلط بتا کر یا شائع کر کے رجوع نہ کرنا۔ اور غلطی پر اصرار کرتے رہنا۔ اور اسی طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو پیش آتی رہتی ہیں۔ یہ سب تکبر ہے۔

اللہ جل شانہٗ کو تواضع پسند ہے۔ ایمان کا کمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نصیحت عطا فرمائی اسکی قدر دانی اور شکر گزاری

کرتے ہوئے اسکی مخلوق کے ساتھ عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ اے لوگو! تواضع اختیار کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے اللہ کے لئے تواضع اختیار کی اللہ تعالیٰ اُس کو بلند فرمادیں گے جو اپنے نفس میں تو چھوٹا ہوگا اور لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوگا۔ اور جو شخص تکبر اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو گرادیں گے۔ وہ لوگوں کے نزدیک کتے اور خنزیر سے بھی زیادہ ذلیل ہوگا۔ (مشکوٰۃ المصابیح از بیہقی فی شعب الایمان)

گناہوں کی وجہ سے نعمتیں چھین لی جاتی ہیں

(۶) گناہ نعمتیں چھن جانے کا سبب ہیں۔ آخرت کے مؤاخذہ کے علاوہ دنیا میں بھی گناہ کی وجہ سے نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ حضرت آدم و حوا علیہما السلام شجر ممنوعہ کے کھانے کے سبب جنت سے نکال دیئے گئے۔ اور دنیاوی مصیبتوں میں اُن کو اور اُن کی ذریت کو مبتلا ہونا پڑا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ۔ ان الرّجل لیحرم الرزق بالذنب یصیبه یعنی بلاشبہ انسان گناہ کرنے کی وجہ سے رزق سے محروم کردیا جاتا ہے۔ (مستدرک حاکم ج ۶ ص ۴۹۳)

بہت سے لوگ گناہوں میں مبتلا ہیں بلکہ پوری پوری قومیں اور قبیلے گناہوں میں لت پت ہیں وہ چاہتے ہیں کہ مصیبتیں دور ہوں اور تنگدستی سے خلاصی ہو لیکن گناہ چھوڑنے کو تیار نہیں بلکہ سمجھانے والے کو آڑے ہاتھوں لے لیتے ہیں۔ اور اُلٹے سیدھے سوال و جواب کرتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم اُن پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن اُنہوں نے تکذیب کی تو ہم نے انکے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا)

متعدد احادیث میں بعض اعمال پر دنیا میں مل جانے والی سزاؤں کا خصوصی تذکرہ بھی وارد ہوا ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنا کہ جس قوم میں زنا کا رواج ہو جائے گا وہ قحط کے ذریعہ پکڑی جائے گی اور جن لوگوں میں رشوت عام ہو جائے گی وہ لوگ رعب کے ذریعہ پکڑے جائیں گے۔ (یعنی ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا جائے گا دشمن سے ڈریں گے دور سے کانپیں گے) (رواہ احمد کما فی مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۱۳)

اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی حدود میں سے کسی حد کو قائم کرنا اللہ کے شہروں میں چالیس رات بارش برسنے سے بہتر ہے۔ (رواہ ابن ماجہ)

یعنی ایک حد قائم کرنے کا اتنا بڑا نفع ہے جو چالیس دن بارش ہونے کے نفع سے بڑھ کر ہے۔ اب وہ لوگ غور کرلیں جو اللہ کی حدود نافذ نہیں کرتے اور نافذ ہونے نہیں دیتے۔ وہ اللہ کی عام مخلوق پر رحم کھا رہے ہیں یا ظلم کررہے ہیں۔ نیز حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس قوم میں کوئی شخص قطع رحمی کرنے والا ہو اُن پر رحمت نازل نہیں ہوتی۔

(بیہقی فی شعب الایمان کما فی مشکوٰۃ المصابیح)

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام گناہوں میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے مگر ماں باپ کے تکلیف

دینے کو معاف نہیں فرماتا جو شخص ایسا کرے اُس کو اسی دنیا میں موت سے پہلے سزا دے دیتا ہے۔ (رواہ البیہقی کمافی مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس قوم میں خیانت ظاہر ہوگی ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ رُعب ڈالدے گا۔ اور جس قوم میں زنا کاری کا رواج ہو جائے گا اُن لوگوں میں موت کی کثرت ہو جائے گی اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کریں گے اُنکا رزق منقطع ہو جائے گا اور جو لوگ ظالمانہ فیصلے کریں گے اُن میں قتل و خون خوب زیادہ ہوگا اور جو لوگ عہد کی خلاف ورزی کریں گے اُن پر دشمن مسلط کر دیا جائے گا۔ (رواہ مالک فی الموطا وھو فی حکم المرفوع)

شرم اور حیا انسان کا فطری وصف ہے

(۷) شرم اور حیا انسان کی فطری صفت ہے اور اسکی خلقت اور جبلّت میں داخل ہے۔ حضرت آدم و حوا علیہما السلام نے جنت میں شجر ممنوعہ کھالیا تو اُن کے جسموں سے جنت کے کپڑے گر پڑے اور دونوں کی شرم کی جگہ ظاہر ہوگئی لہٰذا جنت سے پتے لے لے کر اپنے جسم پر لگانے لگے تاکہ شرم کی جگہ ڈھک جائے۔ دونوں میاں بیوی تھے پھر بھی آپس میں شرما گئے اور پردہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ انسان دنیا میں آیا تو شرم و حیا کو ساتھ لے کر آیا اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے برابر حیاء کی تعلیم دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چار چیزیں پیغمبروں کی عادتوں اور خصلتوں میں سے ہیں۔ (۱) حیا (۲) خوشبو استعمال کرنا (۳) مسواک کرنا (۴) نکاح کرنا (رواہ الترمذی فی ابواب النکاح)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ **ان الحیاء والایمان قرناء جمیعا واذا رفع احدھما رفع الاخر.** اس میں شک نہیں کہ حیا اور ایمان دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ جب ان میں سے ایک اُٹھالیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اُٹھالیا جاتا ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کمافی مشکوٰۃ المصابیح)

ہدایت قبول کرنے پر انعام:

(۸) حضرت آدم علیہ السلام کے قصے کے آخر میں یہ جو فرمایا۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی. الآیۃ۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اس دنیا میں صرف جینے اور کمانے کھانے اور ماں باپ بننے اور اولاد پالنے کے لئے نہیں آیا اس کو یہاں دار التکلیف میں بھیجا گیا ہے اُسے اللہ تعالیٰ کے حکموں کا پابند کیا گیا ہے اور یہ احکام اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعے پہنچتے رہے ہیں۔ ان احکام پر عمل کرنا اُسے واپس جنت میں لے جائے گا۔ اور وہی مقام بلند اور برتر مل جائے گا۔ جہاں سے اُس کے ماں باپ آدم و حوا علیہما السلام اس دنیا میں آئے تھے جنت اپنے ماں باپ کی جگہ ہے جہاں وہ گئے وہیں انکی وفادار اولاد پہنچ جائے گی اور ہمیشہ وہاں رہے گی۔ اور جو لوگ انکے دین سے علیحدہ ہوئے انہیں وہ جگہ دوبارہ نصیب نہ ہوگی بلکہ وہ دار العذاب یعنی دوزخ میں جائیں گے۔ اختلاف دین کی وجہ سے میراث منقطع ہو جاتی ہے جو کافر ہوں گے وہ اپنے ماں باپ کے دین پر نہیں۔ اس لئے وہ مستحق میراث بھی نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے نبی تھے اُن کا دین اسلام تھا۔ اُن کی ذرّیت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو پسند فرمایا اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام آتے رہے۔ سب ہی دین اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ جو اُن کے دین پر تھا وہ مسلم ہوا اور جو اُن کے دین کا منکر ہوا وہ کافر ہوا۔ بنیادی طور پر دین اسلام کے تین عقیدے ہیں۔

اوّل: توحید (جس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو اس طرح ماننا داخل ہے جیسا کہ وہ اپنے نزدیک ہے اور جیسا کہ اُس نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ اپنی پہچان کرائی ہے)

دوم: رسالت (یعنی اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں پر ایمان لانا اور اسکی کتابوں پر ایمان لانا) اس میں ہر اس بات کی تصدیق آجاتی ہے جو حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں نے بتائی۔ فرشتوں پر ایمان لانا' تقدیر کو ماننا' جنت دوزخ کے احوال پر ایمان لانا بھی ایمان بالرسالت میں شامل ہے۔ اور اُن سب احکام کا ماننا اور عمل پیرا ہونا بھی داخل ہے جو اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچائے۔

سوم: معاد (یعنی مرنے کے بعد زندہ ہونے اور حساب کتاب ہونے اور ایمان و کفر اور اچھے برے اعمال کی جزا ملنے اور جنت یا دوزخ میں داخل کئے جانے کا عقیدہ رکھنا)

ان تین عقائد کی ہر نبی نے تبلیغ کی ہے البتہ فروعی احکام میں حالات کے اعتبار سے فرق رہا ہے۔ اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ: **انا اولی الناس بعیسیٰ بن مریم فی الاولیٰ والاٰخرۃ الانبیاء اخوۃ من علات وامھاتھم شتیٰ ودینھم واحد** (رواہ البخاری)

یعنی میں عیسیٰ بن مریم سے سب سے زیادہ قریب تر ہوں دنیا اور عقبیٰ میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام آپس میں علاتی بھائی ہیں یعنی دین واحد ہونے میں اس طرح ہی جیسے باپ ایک ہو اور مائیں کئی ہوں اُن سب کا دین ایک ہے۔ لوگ اپنی جہالت سے سمجھتے ہیں کہ دین اسلام ڈیڑھ ہزار سال سے دنیا میں آیا ہے' اُن کا خیال اور عقیدہ غلط ہے انسان جب سے دنیا میں آیا ہے دین اسلام کے ساتھ آیا ہے تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اسلام کی دعوت دیتے رہے ہیں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آخری رسول ہیں آپ وہی دعوت لیکر تشریف لائے جو حضرات انبیاء کرام آپ سے پہلے لیکر آئے تھے آپ پر نبوت و رسالت ختم ہوگئی۔ لیکن آپ کی دعوت قیامت تک کیلئے ہے۔ اس دعوت کے پہنچانے اور باقی رکھنے کے لئے قرآن مجید باقی ہے اور باقی رہیگا ہر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام قبول کرنے کا مامور ہے۔ کوئی یہودی ہو یا نصرانی' ہندو یا بدھسٹ پارسی ہو' کسی بھی دین کا ماننے والا ہو سب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت دعوت میں شامل ہیں۔ جو آپ پر ایمان لائیگا آخرت میں نجات پائیگا جو منکر ہوگا دوزخی ہوگا۔ سورۃ آلِ عمران میں ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔ (یعنی جو کوئی شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کو چاہے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا وہ آخرت میں تباہ کار لوگوں میں سے ہوگا) (آل عمران ع ۹)

سورہ سبا (ع ۳) میں ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَّنَذِيْراً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ خوشخبری سنانے والا ڈرانے والا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)

صحیح مسلم (ص ۸۶ ج ۱۱) میں ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یومن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحاب النار

(قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے میرے نبی ہونے کی خبر جس کسی انسان کو بھی پہنچے گی اور وہ اس دین پر ایمان لائے بغیر مرجائے گا جو دین لیکر میں بھیجا گیا ہوں تو وہ ضرور دوزخ والوں میں سے ہوگا۔ یہودی ہو یا نصرانی)

بنی اسرائیل کا تعارف

چونکہ آئندہ آیات میں بنی اسرائیل کا ذکر آ رہا ہے اور کئی رکوعوں میں انکی شرارتیں مذکورہ ہیں اور سُورۃ بقرہ کے علاوہ بھی قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کا تذکرہ ہے۔اس لئے بنی اسرائیل کا تعارف مفصل کرایا جاتا ہے تا کہ ان سے متعلقہ مضامین کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن اور اولاد

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا اصل وطن بابل کا علاقہ تھا جہاں نمرود بادشاہ تھا وہاں بت پرست رہتے تھے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد بھی بُت پرست تھے آپ نے اُن لوگوں کو حق کی تبلیغ کی اور توحید کی دعوت دی اور اس سلسلہ میں بہت تکلیفیں اٹھائیں۔اُن کی پوری قوم دشمن ہوگئی۔یہاں تک کہ اُن کو آگ میں ڈالا گیا۔اُن کے واقعات جگہ جگہ قرآن مجید میں مذکور ہیں۔اُن کی ایک بیوی کا نام سارہ تھا جو اُن کے چچا کی لڑکی تھی اور ایک بیوی کا نام ہاجرہ تھا۔ حضرت سارہ سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے اور حضرت ہاجرہ سے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔حضرت ہاجرہ ہی ہیں جنہیں مکہ معظمہ کے چٹیل میدان میں بحکم الٰہی چھوڑ دیا تھا۔اُن کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی تھے جو اس وقت گود میں تھے مکہ معظمہ کے بالکل ابتداءً آباد کرنے والے یہی دونوں ماں بیٹے تھے۔حضرت اسحٰق اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے علاوہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لڑکے تھے جن کے نام البدایۃ والنہایۃ میں لکھے ہیں۔

حضرت اسحٰق علیہ السلام کے فرزند یعقوب علیہ السلام تھے۔جن کا لقب اسرائیل تھا۔ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔اور اُن کے فرزند حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا تھا' جس کا قصہ سورۂ یوسف میں مذکور ہے۔

بنی اسرائیل مصر میں: حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ اقتدار میں مصر میں جا کر رہنے لگے تھے۔حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات ہوگئی تب بھی یہ لوگ مصر ہی میں رہتے رہے پشتہا پشت وہاں رہنے سے انکی نسل بھی بہت زیادہ ہوگئی اور بارہ بھائیوں کی اولاد جو بارہ قبیلیوں میں منقسم تھی' مجموعی حیثیت سے اُنکی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ گئی تھی ان لوگوں کا اصل وطن کنعان تھا جو فلسطین کا علاقہ ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنا اصلی وطن (بابل) چھوڑ کر اور ہجرت فرما کر اس علاقہ میں آباد ہو گئے تھے۔حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد مکہ معظمہ میں آباد رہی اور بڑھتی رہی اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نسل اوّلاً کنعان میں پھر مصر میں آباد ہوگئی جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد پر مشتمل تھی۔جب حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات ہوگئی تو اُن لوگوں کا اقتدار میں کچھ حصہ بھی نہ رہا۔

چونکہ یہ لوگ مصر کے اصل باشندے نہیں تھے۔اجنبی قوم کے افراد تھے اس لئے مصری قوم (قبط) کے افراد ان لوگوں سے بڑی بڑی بیگاریں لیتے تھے اور اُن کو بُری طرح غلام بنا رکھا تھا۔حد یہ ہے کہ ان کے لڑکوں کو ذبح کر دیتے تھے اور یہ اُن کے سامنے عاجز محض تھے اُن کے سامنے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔غلامی کی ایسی بدترین مثال دنیا کی تاریخ میں کسی قوم کی نہیں ملتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور دعوت:

اللہ جل شانہٗ نے بنی اسرائیل میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔جنہوں نے اس زمانہ کے ظالم اور جابر ترین

بادشاہ فرعون کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اللہ تعالیٰ کا دین قبول کرنے کی دعوت دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے یہ بھی کہا کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔ نہ اُس نے دعوتِ حق کو قبول کیا اور نہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ بھیجنے پر راضی ہوا اور اُس نے اعلان کیا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے زیادہ بلند معبود ہوں)

بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنا

بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے راتوں رات مصر سے نکل کھڑے ہوئے اور سمندر تک پہنچ گئے۔ جب صبح ہو کر ان کے نکلنے کا فرعون کو علم ہوا تو وہ اپنے لشکر لے کر ان کے پیچھے لگا اور سمندر پر پہنچ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا مبارک سمندر پر ماری جس سے سمندر پھٹ گیا اور اس میں راستے بن گئے اور بنی اسرائیل کے قبیلے ان راستوں سے پار ہو گئے۔ ان کو دیکھ کر فرعون نے بھی اپنے لشکروں کو سمندر میں ڈال دیا جب فرعون اور اس کا لشکر بیچ سمندر میں آ گیا تو اللہ جل شانہ نے سمندر کو ملا دیا۔ فرعون کا لشکر تو ڈوب گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو لیکر سمندر پار ہو گئے۔ فرعون بھی اس عظیم حادثہ میں غرق ہوا اور مر گیا مگر اللہ تعالیٰ نے اسکی لاش کو محفوظ رکھا جو اب بھی مصر کے عجائب گھر میں بتائی جاتی ہے۔ عبرت کے لئے اس کی لاش کو محفوظ فرمایا تاکہ لوگ خدائی کے جھوٹے دعویدار کا انجام دیکھ لیں۔ قال تعالیٰ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ اٰیَةً البدایہ والنہایہ ص ۲۷۰ ج ۱ میں لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل فرعون سے نجات پا کر سمندر پار ہوئے تو اسوقت ان کی تعداد چھ لاکھ کے لگ بھگ تھی یہ تعداد بچوں عورتوں کے علاوہ تھی اور یہ بھی لکھا ہے کہ مصر میں ان لوگوں کے رہنے کی مدت چار سو چھبیس سال شمسی تھی۔

مصر سے نکل کر چالیس سال میں وطن پہنچے

بنی اسرائیل سمندر پار تو ہو گئے لیکن اب سوال تھا کہ کہاں جا کر بسیں؟ اپنے ہی علاقہ میں جانا تھا اور وہ علاقہ بہت دور بھی نہیں تھا آخر وہیں سے ان کے باپ دادے مصر میں آئے تھے اور چند دن میں اونٹوں پر پورا سفر قطع کر لیا تھا لیکن یہ چلے تو ان کو اپنے وطن پہنچنے میں چالیس سال لگ گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستاتے رہے میدان تیہ میں چالیس سال سرگرداں پھرتے رہے (صبح کو جہاں سے چلتے شام کو وہیں پہنچ جاتے تھے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت شریف ملی وہ طور پہاڑ پر توریت شریف لینے گئے تو پیچھے ان لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کر لی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم تو تمہاری بات جب مانیں گے جب ہم اللہ کو آمنے سامنے دیکھ لیں۔ ان کی غذا کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے من اور سلویٰ ملتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ ہم کو سبزی۔ پیاز۔ کھیرا وغیرہ چاہئے۔ جو توریت شریف لے کر موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا پہاڑ طور اکھاڑ کر ان پر سائبان کی طرح کھڑا کر دیا گیا۔ یہ واقعات اسی میدان میں پیش آئے جس میں چالیس سال حیران اور سرگردان گزارے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہیں وفات ہوگئی۔ اُن کی وفات کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے زمانہ میں اُن کا علاقہ فتح ہوا اور بیت المقدس میں داخلہ نصیب ہوا۔ ان کو حکم ہوا تھا کہ عاجزی کے ساتھ اور خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے عاجزی کے ساتھ داخل ہوں انہوں نے اسکی خلاف ورزی کی بنی اسرائیل کے یہ واقعات مختلف مواقع میں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ بنی اسرائیل کو یہودی بھی کہا جاتا ہے۔

یہودی مدینہ میں کب آئے؟

یہودی مدینہ منورہ میں کب آئے؟ اس کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ ان کے وطن بیت المقدس کو جب بخت نصر (مشہور کافر بادشاہ) نے منہدم کر دیا اور وہاں کے رہنے والوں کو جلاوطن کر دیا اور بنی اسرائیل (یہود) میں سے بہت لوگوں کو قید کر لیا تو ان میں سے ایک جماعت نے حجاز کی طرف رُخ کیا ان میں بعض وادی القریٰ میں اور بعض تیماء اور بعض مدینہ منورہ میں آ کر مقیم ہو گئے۔ یہاں پہلے سے کچھ لوگ بنی جرہم کے اور کچھ بقایا عمالقہ کے آباد تھے۔ انہوں نے کھجوروں کے باغ لگا رکھے تھے اور کھیتیاں کرتے تھے۔ یہودی اُن کے ساتھ ٹھہر گئے اور گھل مل کر رہنے لگے پھر یہ بڑھتے رہے اور بنی جرہم اور عمالقہ کم ہوتے رہے یہاں تک کہ اُن کو یہودیوں نے مدینہ منورہ سے نکال دیا اور مدینہ منورہ پوری طرح ان کے تسلط میں آ گیا اس کی عمارتیں اور کھیتیاں سب انہیں کی ہو گئیں اور ایک مدت تک جس کا علم اللہ ہی کو ہے اسی حال میں یہ لوگ مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ (فتوح البلدان للبلاذری)

بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہودی علماء توریت شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات پڑھتے تھے ان میں یہ بھی تھا کہ آپ کی ہجرت ایسے شہر کی طرف ہو گی جس میں کھجوریں ہوں گی اور وہ دو پتھریلی زمینوں کے درمیان ہو گا لہٰذا وہ شام سے آئے۔ اور اس صفت کے شہر کی تلاش میں نکلے تاکہ اسی شہر میں جا کر رہیں اور مبعوث ہونے والے نبی پر ایمان لائیں اور اُن کا اتباع کریں۔ جب مدینہ منورہ آئے وہاں کھجوریں دیکھیں تو وہ سمجھ گئے کہ یہی وہ شہر ہے جس کی تلاش میں ہم نکلے ہیں اور پھر وہیں رہنے لگے۔ (عمدۃ الاخبار فی مدینۃ المختار و معجم البلدان للحموی)

اوس وخزرج کا مدینہ میں آ کر آباد ہونا

مدینہ منورہ کی آبادی بہت پُرانی آبادی ہے اس کا پرانا نام یثرب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے کے بعد اس کا نام مدینۃ الرسول اور طابہ اور طیبہ معروف ہو گیا۔ اور المدینۃ نیز المدینۃ المنورۃ کے نام کی زیادہ شہرت ہو گئی۔ یہودیوں کے مدینہ منورہ میں آ کر بسنے کے سالہا سال کے بعد یمن کے دو قبیلے اوس اور خزرج بھی مدینہ منورہ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ جب آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر تشریف لائے تو مدینہ منورہ میں تین قبیلے یہودیوں کے یعنی (۱) بنی نضیر (۲) بنی قریظہ (۳) بنی قینقاع اور دو قبیلے یمن سے آ کر آباد ہونے والوں کے موجود تھے یعنی اوس اور خزرج۔ یہی دونوں قبیلے ہیں جو بعد میں انصار بنے۔

یہود کے قبیلوں اور اوس وخزرج میں لڑائیاں

یہ دونوں قبیلے بُت پرست تھے آپس میں بھی انکی لڑائیاں ہوتی تھیں اور یہودیوں سے بھی جنگ ہوتی رہتی تھی۔ یہودی اہل کتاب تھے اور اہل علم سمجھے جاتے تھے۔ جب یمن کے ان دونوں قبیلوں سے ان کی لڑائی ہوتی تھی تو کہا کرتے تھے کہ ایک نبی مبعوث ہونے والے ہیں ان کا زمانہ آئے گا ہم ان کا اتباع کر کے اور اُن کے ساتھی بن کر تمہارا ناس کھو دیں گے۔

اوس وخزرج کا اسلام قبول کرنا:

حج کے موقعہ پر پہلی ملاقات میں جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوس اور خزرج کے چند افراد پر اپنی دعوت پیش کی تو یہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ یہ تو وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کی تشریف آوری کی خبر یہودی دیا کرتے ہیں اور ہمیں دھمکیاں

دیتے ہیں کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کر تمہیں قتل کر دیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ آگے بڑھ جائیں لہٰذا ہمیں یہ دین قبول کر لینا چاہیے۔ چنانچہ یہ حضرات مسلمان ہو گئے۔ اور مدینہ منورہ آ کر انہوں نے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی اور انصار کے دونوں قبیلوں میں اسلام پھیل گیا۔ پھر دونوں قبیلوں کے بارہ نمائندوں نے اگلے سال موسم حج میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ سے بیعت کی۔ اور عرض کیا آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئیں۔

ہجرت مدینہ: چنانچہ آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے آپ کی آمد سے پہلے بہت سے صحابہ ہجرت کر کے آچکے تھے۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں یہ سب باتیں لکھی ہیں۔ فتوح البلدان بلاذری الروض الانف سیرت ابن ہشام باب عرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفسہ علی القبائل کا مطالعہ کیا جائے۔

یہودیوں کا عناد اور قبولِ حق سے انحراف:

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو یہودی یہ جاننے کے باوجود کہ آپ نبی ہیں (اور علامات پوری اتر رہی ہیں۔ جو نبی آخر الزماں کے بارے میں انہیں معلوم تھیں) منکر ہو گئے اور آپ کو نبی رسول ماننے اور اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کو اوس اور خزرج کے لوگوں نے توجہ دلائی اور کہا کہ اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرو تم ہی تو کہا کرتے تھے کہ ایک نبی آئیں گے اور ہم اُن کے ساتھ مل کر تم سے جنگ کریں گے اور تم اُن کی صفات بیان کرتے تھے۔ اب کیوں منکر ہو رہے ہو۔ لیکن ان لوگوں نے ایک نہ سنی۔ (سیرۃ ابن ہشام اوائل المجلد الثانی) اور بجز چند آدمیوں کے (جن میں حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا نام زیادہ مشہور ہے) یہودیوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور طرح طرح کی باتیں بناتے رہے اور کٹ حجتی پر اتر آئے۔ حسد اور دشمنی پر کمر باندھ لی اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اور عہد توڑتے رہے آج تک اُن کے سارے قبیلوں اور خاندانوں کا یہی حال ہے۔

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡٓ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ
اے بنی اسرائیل تم میرے احسانوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور پورا کرو میرے عہد کو میں پورا کروں گا اپنے عہد کو۔
وَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ ۝
اور صرف مجھ ہی سے ڈرو

بنی اسرائیل کو انعامات کی یاد دہانی

تفسیر: بنی اسرائیل (اسرائیل کی اولاد) اس سے یہودی مراد ہیں۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے جو عبرانی زبان کا لفظ ہے اسرائیل کا معنی ہے صفوۃ اللہ یعنی اللہ کا برگزیدہ بندہ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے عبد اللہ (اللہ کا بندہ) حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جن کی اولاد بارہ قبیلوں پر منقسم ہے اور بنی اسرائیل کا خطاب ان سب کو شامل ہے۔ بنی اسرائیل مدینہ منورہ میں اور خیبر میں اور شام میں اور انکے علاوہ مختلف علاقوں میں آباد تھے۔ سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی تھے آپکی بعثت تو سارے ہی انسانوں کیلئے ہے لیکن

آپ کے اولین مخاطبین مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے اور وہاں سے ہجرت فرمائی تو مدینہ منورہ میں اوس وخزرج اور یہودیوں کے تینوں قبیلے سامنے تھے اوس اور خزرج تو مسلمان ہو گئے لیکن یہودیوں میں سے صرف چند افراد نے اسلام قبول کیا جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے' قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو خصوصی خطاب بھی فرمایا ہے اور ان کو اپنے انعامات اور احسانات یاد دلائے ہیں۔ آیت بالا میں یہی ارشاد فرمایا ہے کہ اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم کو دی ہیں اور میرا عہد پورا کرو میں بھی تمہارا عہد پورا کرونگا۔ اور صرف مجھ سے ڈرو۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بنی اسرائیل پر جو کچھ تھیں وہ اُن کو جانتے تھے اُنہیں اپنی تاریخ کا پتہ تھا۔ قرآن مجید میں ان نعمتوں کا تذکرہ فرمانے میں جہاں یہود کو نصیحت ہے کہ وہ اللہ کے آخری نبی پر ایمان لائیں وہاں سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے دلائل بھی ہیں کیونکہ آپ نے کسی سے نہیں پڑھا تھا اہل کتاب کی صحبت نہیں اُٹھائی تھی۔ یہ واقعات آپ کو کہاں سے معلوم ہوئے ان کا جواب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتائے' آپ کا ان چیزوں کی خبر دینا' یہ سب آپکے معجزات میں شامل ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ
اور ایمان لاؤ اُس کتاب پر جو میں نے نازل کی' حال یہ ہے کہ یہ کتاب اسکی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کتاب کے انکار کرنے والوں میں پہل کرنیوالے مت بنو۔ اور میری آیات کے عوض حقیر معاوضہ مت حاصل کرو۔
وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾
اور صرف مجھ ہی سے ڈرو

بنی اسرائیل کو اسلام قبول کرنے کی دعوت

تفسیر: بنی اسرائیل کو مزید خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم اس کتاب پر ایمان لاؤ' جو میں نے نازل کی ہے یعنی قرآن مجید' اور یہ کتاب اس کتاب کے معارض نہیں ہے جو تم کو دی گئی تھی (یعنی توریت شریف) بلکہ یہ کتاب تو اس کتاب کی تصدیق کرنیوالی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی جس کو تم جانتے ہو اور مانتے ہو۔ جو توریت وانجیل بزمانہ نزولِ قرآن اہل کتاب کے پاس تھیں اگرچہ ان لوگوں نے ان میں تحریفات کردی تھیں پھر بھی ان میں نبی آخر الزماں ﷺ کی صفات موجود تھیں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا۔ اَلَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (الآیۃ)

جب یہودیوں کو خاتم النبیین ﷺ کی بعثت کا علم ہو گیا اور یہ اہل علم تھے' اہل کتاب تھے حضرت خاتم النبیین ﷺ کی علامات اپنی کتاب میں پاتے تھے (اور پہچان بھی گئے کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی بشارت پہلے سے دی گئی ہے اور ہم جن کے انتظار میں برسہابرس سے مدینہ میں رہ رہے ہیں) تو ان کو سب سے پہلے ایمان لانا لازم تھا۔ اہل کتاب کا جو دوسرا فرقہ تھا یعنی نصاریٰ اُن کے پاس سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی خبر بہ نسبت یہودیوں کے بعد میں پہنچی مکہ معظمہ والے بے علم تھے مشرک تھے۔ اپنے کفر اور شرک پر اڑے رہے اور ضد اور عناد پر جمے رہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہود کے لئے انکار کا کیا مقام تھا۔ اُن کو فوراً مان لینا تھا اور تصدیق کرنا تھا اور نصاریٰ سے

آگے بڑھ کر اسلام قبول کرنا تھا لیکن بجائے اسلام میں آگے بڑھنے کے انہوں نے اسلام سے منحرف ہونے اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا انکار کرنے میں پہل کرلی۔ اسی کو فرمایا کہ تم اس کتاب کے انکار کرنیوالوں میں پہل کرنے والے مت بنو یہاں جو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ انکار کرنے والوں میں اہل مکہ پہل کر چکے تھے پھر یہود کو "اول کافر" کیسے فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہل کتاب میں سب سے پہلے منکر یہودی ہی بنے تھے۔ کیونکہ اہل کتاب کی دو جماعتیں تھیں۔ یہود اور نصاریٰ۔ ان دونوں میں سے یہود کو سب سے پہلے مسلمان ہونا لازم تھا۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ دعوت اُن کو پہلے پہنچی دوسرے اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات بخوبی پہچان لی تھیں اور بہ نسبت نصاریٰ کے یہ لوگ اہل العلم تھے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اے یہود مدینہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلے کافر نہ بنو۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلے مخاطب یہود مدینہ ہی تھے۔

قال ابن عباس ولا تکونوا اوّل کافر به وعندکم فیه من العلم ما لیس عند غیرکم' قال ابو العالیة ولا تکونوا اول من کفر بمحمّد ﷺ یعنی من جنسکم اهل الکتاب بعد سماعکم بمبعثه واما قوله اول کافر به فیعنی به اوّل من کفر به من بنی اسرائیل لا نه قد تقدمهم من کفار قریش وغیر هم من العرب بشر کثیر. (تفسیر ابن کثیر ص ۸۳ ج ۱)

پھر فرمایا: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۔ (اور میری آیات کے عوض حقیر معاوضہ مت حاصل کرو) مفسرین نے اس کا ایک مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میری آیات پر ایمان لاؤ اور میرے تمام رسولوں کی تصدیق کرو (جس میں حضرت سیدنا محمد رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کی تصدیق بھی شامل ہے) اور حقیر دنیا کے چلے جانے کی وجہ سے ایمان سے نہ رکو اگر کفر اختیار کیے رہنے میں کچھ منافع نظر آتے ہیں تو ان کو چھوڑو (ابن کثیر)

ساری دنیا آخرت کے مقابلہ میں حقیر ہی ہے خواہ کتنی ہی زیادہ ہو۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ میری آیات میں تبدیل اور تحریف نہ کرو اور کتمان حق نہ کرو۔ جیسا کہ اب تک کرتے رہے ہو اور اپنے عوام سے اس کے ذریعہ دنیاوی منافع حاصل کرتے ہو۔ وقیل کانوا یا کلون الرشی فیحرفون الحق ویکتمونه (من البیضاوی)

پھر فرمایا: وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ (کہ صرف مجھ ہی سے ڈرو) درحقیقت خوف خدا بہت بڑی چیز ہے کفر اور شرک اور ہر طرح معاصی چھڑانے میں اس کو سب سے بڑا دخل ہے۔ اسکی طرف دوبارہ توجہ دلائی اور بطور تاکید اس کا دوبارہ اعادہ فرمایا۔ مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ رہبت سے تقویٰ کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ ایمان کا حکم عوام و علماء سب کو ہے اس لئے پہلی آیت کے ختم پر فَارْهَبُوْنِ فرمایا اور دوسری آیت میں جب علماء کو خصوصی خطاب ہوا تو فَاتَّقُوْنِ فرمایا' کیونکہ تقویٰ خوف وخشیت اور رہبت کا منتہیٰ ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾
اور مت ملاؤ حق کو باطل کے ساتھ اور مت چھپاؤ حق کو حالانکہ تم جانتے ہو

حق کو باطل کے ساتھ مت ملاؤ اور حق کو مت چھپاؤ

تفسیر: اس آیت میں بھی علماء یہود کو خطاب ہے یہ لوگ توریت شریف میں تحریف کر چکے تھے اور اس میں سے جو

کچھ صحیح باتیں اُن کے پاس باقی تھیں اُن میں بھی خلط ملط کرتے تھے۔ اوّل تو تعلیم عام نہیں تھی اپنی قوم کے تمام افراد کو دین اور کتاب نہیں سکھاتے تھے اور توریت شریف کے اوراق منتشر کر کے رکھ رکھے تھے (تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا) جو شخص کوئی بات پوچھتا تو کوئی ایک ورق نکال کر اس کا مطلب جو چاہتے بتا دیتے تھے۔ اور پوچھنے والے کو خوش کرنے اور اس سے رشوت لینے کے لئے اسکی مرضی کے مطابق توریت شریف کے مضامین کی تشریح کر دیتے تھے۔ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی جو علامات توریت شریف میں لکھی تھیں اُن کو چھپاتے تھے۔ اُن کو حکم فرمایا کہ تم حق کو باطل کے ساتھ مت ملاؤ۔ اپنی بنائی ہوئی بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کرو خود تراشیدہ بات کو حکم خداوندی ظاہر نہ کرو، تم جانتے ہو کہ ہم ایسا کر رہے ہیں اور یہ بھی جانتے ہو کہ اس کا کیا وبال ہے۔ پھر بھی ایسی حرکت کرتے ہو۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾
اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ

نماز اور زکوٰۃ کا حکم

تفسیر: اس آیت میں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز قائم کرنے کا مطلب سورۃ البقرہ کے شروع میں بیان ہو چکا ہے۔ نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے۔ نماز میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اللہ کا ذکر کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ نفس میں رجوع الی اللہ اور تواضع پیدا ہوتی ہے۔ اور نماز کی برکات اور ثمرات بہت ہیں جو علماء اسلام نے اپنی کتابوں میں بیان کئے ہیں۔ زکوٰۃ سے نفس کی کنجوسی دور ہوتی ہے اور مال کا خبث بھی دور ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ رکوع کرنیوالوں کے ساتھ رکوع کرو۔ یعنی نماز باجماعت پڑھو۔ جماعت کی نماز میں بہت سی حکمتیں اور فوائد ہیں۔ ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ باجماعت نماز پڑھنے سے اس کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔ اور ایک نماز کا ثواب ستائیس نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کا حکم تو سبھی کو ہے۔ لیکن یہودیوں کو خصوصی خطاب اس لئے فرمایا کہ ان لوگوں میں حب جاہ اور حب مال کا مرض تھا۔ نماز اور زکوٰۃ میں ان دونوں کا علاج ہے۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ اس لئے فرمایا کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ اب تک جو نماز پڑھتے رہے اب اُس کو چھوڑو اور اب وہ نماز پڑھو جو حضرت خاتم الانبیاء ﷺ نے بتائی ہے جو رکوع اور سجدہ دونوں پر مشتمل ہے۔ بعض علماء نے اس آیت سے فرض نماز باجماعت کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ اور جو حضرات واجب نہیں کہتے اُن کے نزدیک بھی نماز باجماعت بہت زیادہ مؤکدہ ہے۔ اس آیت شریفہ سے نماز باجماعت کی اہمیت معلوم ہوئی۔ احادیث شریفہ میں بھی اس کی بہت زیادہ تاکید آئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے بلاشک میں نے ارادہ کیا کہ لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں جو جمع کر لی جائیں پھر نماز کا حکم دوں، تاکہ اذان دی جائے پھر کسی شخص کو حکم دوں جو لوگوں کا امام بنے اور میں ان لوگوں کے گھروں کی طرف چلا جاؤں جو جماعت میں حاضر نہ ہوئے۔ پھر ان کے گھروں کو ان پر جلا دوں۔ (صحیح بخاری)

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں عشاء کی جماعت قائم کرتا اور اپنے جوانوں کو حکم دیتا کہ (ان لوگوں کے گھروں میں جو کچھ ہے) آگ سے جلادیں (جو جماعت میں نہیں آئے) (رواہ احمد کمافی المشکوٰۃ)

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر پڑھائی اور سلام پھیر کر فرمایا کیا فلاں شخص حاضر ہے حاضرین نے عرض کیا نہیں، فرمایا۔ کیا فلاں شخص حاضر ہے۔ عرض کیا نہیں فرمایا۔ بے شک یہ دونوں نمازیں (عشاء اور فجر) منافقوں پر سب نمازوں سے زیادہ بھاری ہیں اور اگر تم کو معلوم ہوجاتا کہ ان دونوں میں کیا اجر وثواب ہے تو ان دونوں میں حاضر ہوتے اگرچہ گھٹنوں کے بل چلنا پڑتا۔ اور (فرمایا) کہ بلاشبہ پہلی صف فرشتوں کی صف کی طرح سے ہے اور اگر تم جان لو کہ اسکی کیا فضیلت ہے تو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اور بلاشبہ ایک شخص کی نماز دوسرے شخص کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے سے زیادہ پاکیزہ ہے بہ نسبت تنہا نماز پڑھنے کے، اور دو آدمیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا ایک آدمی کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے سے زیادہ پاکیزہ ہے اور جتنی بھی زیادہ تعداد ہوگی اُسی قدر اللہ کو محبوب ہے۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی کمافی المشکوٰۃ ص ۹۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بلاشبہ میں نے اپنا وہ زمانہ دیکھا ہے کہ نماز جماعت سے صرف وہی شخص پیچھے رہ جاتا تھا جو منافق ہوتا اور اس کا نفاق کھلا ہوا سب کو معلوم ہوتا تھا یا کوئی مریض ہوتا (بلکہ) مریض کا بھی یہ حال تھا کہ دو آدمیوں کے درمیان چل کر آتا تھا۔ یہاں تک کہ نماز میں حاضر ہوجاتا تھا۔ اور فرمایا کہ بلاشبہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کے طریقے بتائے ہیں اور ہدایت کے طریقوں میں سے یہ بھی ہے کہ مسجد میں نماز پڑھی جائے جس میں اذان دی جاتی ہو۔ (صحیح مسلم)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی تین مرد کسی جنگل یا بستی میں ہوں جن میں نماز باجماعت قائم نہ کی جاتی ہو تو ضرور شیطان ان پر غلبہ پالے گا۔ لہٰذا جماعت کی حاضری کو لازم کرلو کیونکہ بھیڑیا اُسی بکری کو کھاتا ہے جو گلہ سے دور ہوجائے۔ (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی کمافی المشکوٰۃ ص ۹۶)

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾
کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور اپنی جانوں کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تم سمجھ نہیں رکھتے

مبلغ اور داعی اپنے نفس کو نہ بھولے

تفسیر: اسی آیت میں بھی یہودیوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ قرآن کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق جانتے تھے اس لئے پوشیدہ طور پر کبھی کبھی اپنے عوام اور رشتہ داروں کو اسلام قبول کرنے کا مشورہ دیتے تھے اور خود اسلام قبول نہیں کرتے تھے۔ تفسیر ابن کثیر اور درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بات نقل کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی لڑکے کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے جو آپ کی خدمت کیا کرتا تھا آپ تشریف لائے اور اس کے سر کے پاس تشریف فرما ہوگئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی اُس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، جو وہاں موجود تھا اس کے باپ نے کہا کہ ابوالقاسم (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات مان لے چنانچہ اس نے اسلام قبول کرلیا اور آپ وہیں سے یہ کہتے ہوئے باہر تشریف لائے کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے اسے دوزخ سے بچادیا۔ (صحیح بخاری)

اس کے علاوہ بھی علماء یہود میں بے عملی عام تھی لوگوں کو نماز روزے کا حکم کرتے تھے اور خود عمل نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو عار دلائی اور فرمایا کہ جو خیر کا حکم کرے اُسے خیر میں دوسروں سے آگے بڑھنا چاہئے۔ (قالہ ابن جریج کما فی تفسیر ابن کثیر)

یہاں یہ بات اگرچہ یہودیوں کی بے عملی ظاہر کرنے کے لئے بیان کی گئی ہے لیکن اس کا حکم سب کے لئے عام ہے۔ جو بھی کوئی شخص لوگوں کو بھلائی کا حکم کرے گا اور گناہوں سے روکے گا اور خود بے عمل ہوگا اس کا انجام بُرا ہوگا۔ اور اس طریقہ کار کی شناعت اور قباحت اُسے لے ڈوبے گی بعض روایات میں ہے کہ جو عالم لوگوں کو خیر سکھاتا ہے اور خود عمل نہیں کرتا وہ اس چراغ کی طرح سے ہے جس کی بتی چلتی رہتی ہے لوگوں کو روشنی پہنچتی ہے لیکن بتی خود جل جاتی ہے۔ (ابن کثیر عن الطبرانی فی المعجم الکبیر)

بے عمل واعظوں کی سزا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ اُن کے ہونٹ قینچیوں سے کاٹے جا رہے ہیں۔ جب کٹ جاتے ہیں تو پھر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ میں نے جبریلؑ سے کہا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ آپ کی اُمت کے خطیب ہیں جو لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور اپنی جانوں کو بھول جاتے ہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں جس کی اُن کو سمجھ نہیں ہے۔ (درمنثور ص ۶۴ ج ۱ عن البیہقی عن شعب الایمان، وعزاہ صاحب المشکوٰۃ الی شرح السنۃ) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک شخص کو قیامت کے دن لایا جائے گا پھر اُسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا جس میں اس کے پیٹ کی آنتیں نکل پڑیں گی اور وہ اپنی آنتوں کے ساتھ گھومتا پھرے گا جیسے گدھا چکی کو لے کر گھومتا ہے۔ دوزخ والے اس کے پاس جمع ہو جائیں گے اور اس سے کہیں گے کہ اے فلاں تجھے کیا ہوا؟ کیا تو ہمیں اچھی باتیں نہیں بتاتا تھا اور بُرائی سے نہیں روکتا تھا۔ وہ جواب دے گا کہ میں تم کو اچھی باتوں کا حکم کرتا تھا اور خود نہیں کرتا تھا اور تم کو بُرائی سے روکتا تھا اور خود اس بُرائی کو کرتا تھا۔ (صحیح مسلم)

فائدہ: مذکورہ بالا آیات اور احادیث شریفہ کا مقصد یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں (نیکیوں کا حکم دیں، برائیوں سے روکیں) اور خود بھی عمل کریں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ نہ عمل کریں نہ امر بالمعروف کریں نہ نہی عن المنکر کریں۔ مبلّغ اور مصلح کو عمل کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ جو عمل نہ کرے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ بیٹھے اس کو خوب سمجھ لینا چاہئے۔

قال ابن کثیر فکل من الامر بالمعروف وفعلہ واجب ولا یسقط احدھما بترک الاخر علی اصح قولی العلماء من السلف والخلف والصحیح ان العالم یأمر بالمعروف وان لم یفعلہ وینھی عن المنکر وان ارتکبہ.

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ﴿۴۵﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ
اور مدد چاہو صبر اور نماز کے ساتھ، اور بلا شبہ نماز ضرور دشوار ہے۔ مگر خشوع والوں پر، جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک وہ
مُلٰقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ ﴿۴۶﴾
اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اسکی طرف لوٹنے والے ہیں

صبراور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد حاصل کرو

تفسیر: اس آیت شریفہ میں صبراور نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا طریقہ بتایا ہے لفظ صبر تین معنی میں آتا ہے۔ اوّل طاعات پر جمار ہنا خاص کر فرائض اور واجبات کو پابندی سے ادا کرنا۔ دوم گناہوں سے پوری طرح اہتمام کے ساتھ بچنا۔ سوم جو مصائب اور مشکلات در پیش ہوں اُن پر صبر کرنا۔

عام طور پر لوگوں میں یہ تیسرا معنی ہی زیادہ معروف ہے۔ تینوں قسم کا صبر اللہ تعالیٰ کی مدد کو لانے والا ہے۔ زندگی میں عموماً صبر کے مواقع پیش آتے رہتے ہیں۔ عبادات بھی صبر ہی سے ادا ہوتی ہیں۔ نفس عبادت کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اگر تیار ہوتا ہے تو صحیح طریقہ سے ادا کرنے سے بچتا ہے۔ روزہ اور جہاد تو سراپا صبر ہی ہے۔ نماز سب سے بڑی عبادت ہے اس میں بھی صبر کا مظاہرہ ہے۔ نمازی کا ظاہر اور باطن عبادت ہی میں مشغول ہو جاتا ہے جو نفس پر شاق ہوتا ہے۔ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد طلب کرنے کا حکم فرمایا یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی مدد لانے میں بڑا دخل رکھتی ہیں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ لیلۃ الاحزاب میں (غزوہ خندق کے موقعہ پر) میں رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس آیا (اُن کو ایک کام کے لئے بھیجا تھا) تو آپ چادر اوڑھے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کی عادت تھی کہ جب کوئی مشکل درپیش ہوتی تھی تو نماز پڑھنے لگتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے غزوۂ بدر کی رات میں دیکھا کہ سوائے رسول اللہ ﷺ کے سب لوگ سوئے ہوئے تھے آپ برابر نماز میں مشغول رہے اور صبح ہونے تک دعا کرتے رہے۔ (ابن کثیر) اس سلسلہ کا کچھ مضمون ان شاء اللہ آیت کریمہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کے ذیل میں آئے گا۔

مفسر ابن کثیر نے ابن جریر طبری سے نقل کیا ہے کہ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ میں علماء یہود سے خطاب فرمایا ہے (وہ لوگ تحصیل دنیا کے لئے اور ریاست اور جاہ باقی رکھنے کے لئے حق چھپاتے تھے اور اسلام نہ خود قبول کرتے تھے اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے تھے اُن کو حکم ہوا کہ حق قبول کرو اسلام لاؤ' اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لگو' صبر اور صلاۃ کے ذریعہ اللہ کی مدد حاصل کرو جو اللہ سے نزدیک کرے گی اور بُرائیوں سے روکے گی اسلام قبول کرنے پر جو کچھ تکلیف پہنچ جائے' مال اور ریاست میں کمی آجائے اُسے صبر کے ساتھ برداشت کرو)

پھر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت کا خطاب اگرچہ بنی اسرائیل کے انذار اور تحذیر کے سیاق میں وارد ہوا ہے لیکن علی سبیل التخصیص صرف یہود مخاطب نہیں ہیں بلکہ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد حاصل کرنے کا حکم یہود اور غیر یہود سب ہی کے لئے ہے۔

نماز کی اہمیت: نماز میں ظاہر اور باطن سب عبادت میں لگ جاتا ہے۔ یہ ظاہری طہارت اور باطنی تزکیہ دونوں کو شامل ہے کچھ نہ کچھ مال بھی خرچ ہوتا ہے (مثلاً وضو اور غسل کے لئے پانی حاصل کرنا پڑتا ہے اور ستر عورت کے لئے کپڑوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے) اگر صحیح طریقہ پر نماز پڑھی جائے تو دل اور اعضاء نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اس میں شیطان سے مقابلہ ہے اور حق تعالیٰ شانہ' سے مناجات ہے تلاوت قرآن ہے توحید اور رسالت کی گواہی ہے نفس کو اس کے تقاضوں سے روکنا ہے اس میں چلنا پھرنا کھانا پینا اور بات کرنا ممنوع ہے۔ نماز کے بہت سے فضائل اور فوائد ہیں۔ اگر نماز کو ٹھیک طرح سے پڑھا جائے۔ فرائض کی پابندی کی جائے' سنتوں کا اہتمام کیا جائے نوافل کی طرف دھیان دیا جائے تو ضرور اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بندہ کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔

خشوع کی ضرورت: پھر فرمایا کہ نماز ضرور دشوار ہے مگر خشوع والوں پر دشوار نہیں۔ خشوع دل کے جھکاؤ اور عاجزی اور فروتنی کو کہا جاتا ہے۔ جب دل میں خشوع ہوتا ہے تو اعضاء میں بھی اسکی کیفیت ظاہر ہوتی ہے جو لوگ خشوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں انکی نماز واقعی نماز ہوتی ہے نماز میں اُن کا دل لگتا ہے نماز چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ مسجد سے جائیں تو مسجد میں واپسی کے لئے دل اٹکا رہتا ہے۔ جسے نماز کا خشوع حاصل ہو گیا اُسے ساری کامیابیاں حاصل ہو گئیں۔ سورۃ مومنون میں فرمایا کہ: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (بے شک وہ کامیاب ہو گئے جو اپنی نماز میں خشوع کرنیوالے ہیں)

دنیا میں لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ طلب دنیا کے لئے بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں۔ پہاڑ توڑتے ہیں۔ پتھر پھوڑتے ہیں بہت سے لوگ اٹھارہ گھنٹے روزانہ محنت کرتے ہیں لیکن دو رکعت پڑھنا ان کے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ اگر نماز شروع کر دیں تو اس میں بھی اپنے دنیاوی مشاغل کا ہی دھیان رکھتے ہیں خشوع نہیں ہوتا اس لئے دو رکعت پڑھنا بھی بھاری پڑ جاتا ہے۔

خشوع والے کون ہیں؟ پھر فرمایا خشوع والے وہ ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ بیشک اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اسکی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ خشوع اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جنہیں اس بات کا یقین ہے کہ اُن کو موت کے بعد جی اُٹھنا ہے اور میدان قیامت میں حاضر ہونا ہے اور بارگاہ خداوندی میں پیشی ہونی ہے۔ اور اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ جس کو ان باتوں کا یقین ہو گا وہ نماز قضا بھی نہ کرے گا بے وقت بھی نہ پڑھے گا اچھی نماز بھی پڑھے گا اس کو خشوع کی کیفیت بھی حاصل ہوگی۔ رکوع سجدہ بھی ٹھیک کرے گا۔ اس کی تلاوت بھی صحیح ہوگی۔ (قال ابن کثیر ای یعلمون انهم محشورون الیه یوم القیامة معروضون علیه وانهم الیه راجعون ای امورهم راجعة الی مشیئته فلهذا لما ایقنوا بالمعاد والجزاء سهل علیهم فعل الطاعات وترک المنکرات.

در حقیقت جسے یہ یقین ہو کہ یہ نماز آخرت میں نجات کا ذریعہ بنے گی اور نماز قبول ہوئی تو اور نیکیاں بھی قبول ہوں گی یہ ردّ ہوئی تو دوسرے اعمال بھی رد ہو جائیں گے (جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے) اور یہ کہ میری نماز کا ثواب مجھی کو ملنا ہے اور اسکی وجہ سے بڑے بڑے انعامات نصیب ہوتے ہیں تو ایسا شخص بے وقت نماز کیوں پڑھے گا۔ جلدی جلدی کیوں پڑھے گا۔ اور رکوع سجدہ میں کمی کیوں کرے گا؟ درحقیقت آخرت کی پیشی اور وہاں کے عذاب و ثواب کا فکر ہو تو یہ دین کے بڑے بڑے کام کروا سکتا ہے۔ یہ نہ ہو تو صحیح طریقے پر دو رکعت نماز پڑھنا بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک انسان نماز سے فارغ ہوتا ہے اور اُس کے لئے نماز کا دسواں یا نواں یا آٹھواں یا ساتواں یا چھٹا یا پانچواں یا چوتھائی یا تہائی یا آدھا حصہ لکھا جاتا ہے۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن حبان فی صحیح کمافی الترغیب)

یہ ثواب کی کمی اور کٹوتی خود نمازی کے اپنے اخلاص عمل اور خشوع کی کمی اور کوتاہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا

اے بنی اسرائیل تم میرے احسانوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے۔ اور اس بات کو کہ میں نے تم کو فضیلت دی جہانوں پر، اور ڈرو

یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا

اس دن سے جس دن کوئی بھی شخص کسی کی طرف سے بھی کچھ ادائیگی نہیں کریگا۔ اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی۔ اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی

عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

معاوضہ لیا جائے گا اور نہ اُن لوگوں کی مدد کی جائے گی

قیامت کے دن نفسا نفسی

تفسیر: ان دونوں آیتوں میں بھی بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا' اور مکرر اپنی نعمتوں کی یاد دہانی فرمائی۔ اُن میں سے بہت سی نعمتوں کا تذکرہ آئندہ آیات میں آنے والا ہے۔ یہ جو فرمایا: وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ (کہ میں نے تم کو فضیلت دی جہانوں پر) اس سے اُن کے آباؤ اجداد مراد ہیں۔ جن میں انبیاء کرام علیہم السلام بھی تھے اور وہ علماء صُلحاء بھی تھے جنہوں نے اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھاما تھا اور جنہوں نے دین خداوندی میں کسی قسم کی تحریف اور تغییر نہیں کی تھی۔ ایمان اور اعمال صالحہ سے متصف تھے اور جن پر فضیلت دینے کا ذکر ہے ان سے ان کے زمانے کے لوگ مراد ہیں۔ تمام عالم کے انسان اگلی پچھلی' اقوام و افراد مُراد نہیں ہیں۔

حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام سے افضل ہیں اور آپ کی اُمت ساری اُمتوں سے افضل ہے۔ جس کی تصریح کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ میں اور وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ میں فرمائی ہے۔

اپنے زمانہ میں بنی اسرائیل کو دوسری اقوام پر فضیلت اور برتری حاصل تھی۔ کیونکہ ان میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ہوتے تھے اور اُن کے ماننے والے بھی ہوتے تھے اور اعمال صالحہ والے بھی موجود تھے۔ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان جو فترت کا زمانہ ہے (اور یہ زمانہ چھ سو سال کے لگ بھگ تھا) اس میں علماء یہود نے توریت شریف میں تحریف کر دی اور دین خداوندی کو بدل دیا پھر جب حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور علماء یہود نے پہچان بھی لیا کہ آپ وہی نبی ہیں جن کے آنے کا ہمیں انتظار تھا تو آپ کی نبوت اور رسالت کے منکر ہو گئے۔ تحریف و تغییر و انکار نبوت نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اپنی ہر طرح کی فضیلت کھو بیٹھے۔ اور اب نہ صرف یہ کہ کفر اختیار کرنیوالے بن گئے۔ بلکہ دین اسلام کے دشمن بن کر مستقل طریقہ پر مغضوب علیہ کی سند لے لی۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی نسل سے ہیں مگر کفر کے ساتھ نسب کوئی کام نہیں دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ بڑا بے نیاز ہے۔ وہ ہر کافر کو دوزخ میں بھیج دے گا کسی کی بھی اولاد ہو۔

یہودیوں کی دنیا طلبی' حُبِّ مال' حُبِّ جاہ اور اس بات کا حسد کہ نبی ہم میں سے کیوں نہ آیا عربوں میں سے کیوں آیا ان چیزوں نے اُن کو بَرباد کر دیا۔ قرآن مجید نے خطاب کر کے اُن سے فرمایا کہ دنیا کو نہ دیکھو آخرت پر نظر کرو۔ اموال و اولاد اور قوم اور قبیلہ قیامت کے دن بالکل کام نہیں آ سکتا وہاں نہ کوئی جان کسی کی طرف سے کوئی حق ادا کر سکے گی۔ (یہ نہ ہو سکے گا کہ کوئی کسی کی طرف سے عذاب بھگت لے)

جن کو شفاعت کی اجازت ہوگی وہی سفارش کر سکیں گے

کوئی سفارش قبول نہ کی جائے گی' بلکہ کوئی شخص کسی کے لئے سفارش کر ہی نہ سکے گا۔ سوائے اُن لوگوں کے جن حضرات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفارش کرنے کی اجازت ہوگی اور جن کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت ہوگی ان ہی کے بارے میں قبول ہوگی۔ اور کافروں کے لئے کوئی سفارش کرنیوالا نہ ہوگا اور نہ ان کے لئے سفارش کی اجازت ہوگی۔

(قال اللہ تعالٰی شانہ) فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ (وقال اللہ تعالٰی) مَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَّلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ (وقال تعالٰی) يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (وقال تعالٰی) مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ

وہاں عذاب سے جان چھڑانے کے لئے کوئی معاوضہ یا فدیہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ اوّل تو وہاں کسی کے پاس کچھ ہوگا ہی نہیں جو جان کا بدلہ دے کر عذاب سے جان چھڑائے اور بالفرض کوئی دینا بھی چاہے تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور جس کے لئے عذاب کا فیصلہ ہو گیا اُسے عذاب ہی میں رہنا ہوگا۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ أُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَّمَا لَهُمْ مِنْ نَّاصِرِينَ (جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے کافر ہی' تو ہرگز قبول نہ ہوگا کسی ایسے شخص سے زمین بھر سونا۔ اگر چہ فدیہ دے اس قدر سونے کا' اُن کے لئے عذاب دردناک ہے اور کوئی نہیں ہوگا اُن کا مددگار) اور سورۂ مائدہ میں فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَّمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. (جو لوگ کافر ہیں اگر اُن کے پاس جو کچھ زمین میں ہے وہ سب ہو اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تاکہ بدلہ میں دیں قیامت کے عذاب سے بچنے کے لئے تو اُن سے قبول نہ ہوگا اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے) آخر میں فرمایا وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ اور روزِ قیامت اُن لوگوں کی مدد نہ کی جائے گی اوّل اس بات کی نفی کی گئی کہ کوئی کسی کے کام آئے۔ پھر سفارش کی نفی کی گئی پھر جان کا بدلہ قبول کئے جانے کی نفی کی گئی پھر ہر طرح کی مدد کی نفی کر دی گئی۔

وَإِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ

اور جب ہم نے تم کو آل فرعون سے نجات دی وہ تم کو سخت ترین تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری

نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۴۹﴾

عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا امتحان تھا

مصر میں بنی اسرائیل کی مظلومیت

تفسیر: اس آیت میں اللہ تعالٰی نے بنی اسرائیل پر اپنے ایک بہت بڑے انعام کا تذکرہ فرمایا ہے پہلے گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل کے تمام قبیلے مصر میں رہتے تھے۔ غیر ملکی ہونے کی وجہ سے مصر کے لوگ (فرعون اور فرعون کی قوم) ان پر بری طرح مسلط تھے انکی زندگی غلاموں سے بھی بدتر تھی ان سے بڑی بڑی بیگاریں لیتے تھے اور ایسی بدترین غلامی میں بنی اسرائیل مبتلا تھے کہ مصری لوگ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے تو یہ ذرا چوں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالٰی نے بنی اسرائیل میں پیدا فرمایا پھر ان کو اور ان کے بھائی ہارون علیہما السلام کو نبوت عطا فرمائی فرعون سے ان کا مقابلہ اور مناظرہ ہوا' فرعون نے مقابلہ کے لئے جادوگر بلائے معجزہ کے سامنے وہ لوگ نہ ٹھہر سکے اور اپنی ہار مان کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کی وجہ سے بنی اسرائیل پر فرعون اور اس کی قوم کی اور زیادہ سختیاں بڑھ گئیں۔ اللہ جل شانہ' کا موسیٰ علیہ السلام کو

حکم ہوا کہ تم بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے نکل کھڑے ہو اور راتوں رات روانہ ہو جاؤ۔ چنانچہ یہ لوگ ملک مصر سے نکل آئے اور فرعون اور اس کے لشکروں سے نجات پائی۔ اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ یہ لوگ مصر میں چار سو سال سے رہ رہے تھے۔ عرصہ دراز کی بدترین غلامی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ آیت کے اخیر میں جو لفظ بَلَاءٌ ہے اس کے دو معنی مفسرین نے لکھے ہیں۔ عربی زبان میں آزمائش اور امتحان کو بھی بلاء کہتے ہیں۔ اگر یہ معنی لئے جائیں تو ترجمہ اور مطلب یہ ہوگا کہ تم ایسی سخت تکلیفوں میں مبتلاء تھے اس میں تم بڑے امتحان میں تھے' اور بَلَاء کا دوسرا معنی انعام کا ہے اگر یہ معنی لئے جائیں تو ترجمہ اور مطلب یہ ہوگا کہ ایسی تکلیفوں سے اور غلامی سے نجات دینے میں تم پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ فرعون اور اس کا لشکر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو کیوں ذبح کرتے تھے اسکے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون نے خواب میں دیکھا تھا یا اُسے کاہنوں نے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو تیرے ملک کو ختم کرنے کا ذریعہ بنے گا۔ اللہ جل شانہٗ کی قضاوقدر غالب آئی انکی تدبیریں یوں ہی دھری رہ گئی خدا جانے کتنے لڑکوں کو قتل کر دیا۔ اُسی زمانہ قتل میں موسیٰ علیہ السلام پیدا بھی ہوئے پلے بڑھے جوان ہوئے اور فرعون ہی کے محل میں پرورش پائی پھر اسکی اور اسکی حکومت کی تباہی کا ذریعہ بنے۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ۝

اور جب ہم نے تمہاری وجہ سے سمندر کو پھاڑ دیا پھر ہم نے تم کو نجات دے دی' اور آل فرعون کو ہم نے غرق کر دیا اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے

بنی اسرائیل کا سمندر پار کر کے نجات پانا اور آلِ فرعون کا غرق ہونا

تفسیر: اس آیت شریفہ میں اجمالی طور پر مصریوں سے بنی اسرائیل کی نجات اور آل فرعون کی بربادی اور ہلاکت کا ذکر ہے اللہ جل شانہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم راتوں رات بنی اسرائیل کو لیکر مصر کی آبادیوں سے نکل جاؤ اس وقت مصر میں فرعون کی حکومت تھی فرعون مصر کے ہر فرماں روا کو کہا جاتا تھا اور اس فرعون کا نام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھا بعض مفسرین نے ولید بتایا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس کا نام بھی موسیٰ تھا۔ اس کا تعلق قوم عاد سے بتاتے ہیں یہ بڑا سرکش بادشاہ تھا اپنے آپ کو سب سے اونچا معبود منواتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو رات کو لیکر مصر کی آبادی سے نکل گئے اور سمندر کے کنارے پہنچ گئے ان کے نکلنے کی جب فرعون اور آل فرعون کو خبر لگی تو فرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا بنی اسرائیل دریا کے کنارے پہنچ چکے تھے سورج نکل چکا تھا فرعون جو اپنے لشکروں کے ساتھ پیچھے سے پہنچا تو بنی اسرائیل گھبرا گئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (کہ ہم تو دھر لئے گئے) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (ہرگز نہیں بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے وہ ضرور مجھے راہ بتائے گا) اللہ جل شانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ تم اپنی لاٹھی سمندر میں مارو! انہوں نے سمندر میں لاٹھی ماری تو سمندر پھٹ گیا اور پہاڑوں کے برابر اس کے ٹکڑے ہو گئے۔ ان پانی کے پہاڑوں کے درمیان زمین خشک ہو گئی اور بنی اسرائیل کے قبیلے ان پہاڑوں کے درمیان سے گزر گئے۔ فرعون نے بھی اپنی جماعتوں اور لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا اور یہ لوگ بھی سمندر میں داخل ہو گئے بنی اسرائیل کا پار ہونا تھا اور فرعون اور اس کے لشکر کا سمندر میں داخل ہونا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو ملا دیا اور فرعون اپنے لشکروں اور جماعتوں سمیت ڈوب گیا ان کے

ڈوبنے کے اس منظر کو بنی اسرائیل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جس کو اس آیت میں وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ سے تعبیر فرمایا ہے۔ فرعون جب ڈوبنے لگا تو کہنے لگا کہ میں بھی ایمان لاتا ہوں کہ اس ذات کے علاوہ کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے۔ اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ ارشاد ہوا آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَکُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (کیا اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور تو فساد کرنیوالوں میں سے تھا) جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا فرعون غرق ہو کر ہلاک تو ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسکی نعش کو محفوظ رکھا تاکہ بعد میں آنیوالوں کو عبرت ہو جیسا کہ سورۂ یونسؑ میں فرمایا ہے۔ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ اٰیَةً (سو آج ہم تیری لاش کو نجات دیں گے تاکہ تیری ذات ان لوگوں کے لئے عبرت ہو جائے جو تیرے بعد میں آنے والے ہیں) فرعون اور اس کے لشکروں کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے نجات پانے کا واقعہ سورۂ طٰہٰ (رکوع ۴) میں اور سورۂ شعراء (رکوع ۴) میں اور سورۂ دخان (رکوع ۱) میں بھی مذکور ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور جب وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم لوگوں نے اُن کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظلم کرنیوالے تھے

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر ہم نے اس کے بعد تم سے درگزر کر دیا تاکہ تم شکر ادا کرو

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طُور پر جانا اور بنی اسرائیل کا بچھڑے کی عبادت کرنا

تفسیر: جب حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام بنی اسرائیل کو لیکر سمندر پار ہو گئے تو ایک میدان میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ان کو اپنے وطن فلسطین جانا تھا لیکن وہاں چالیس سال کے بعد پہنچ سکے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے علاقے میں ان کو جانا نصیب ہوا اُن کی وفات اُسی میدان میں ہوگئی۔ اور اسی عرصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت شریف عطا ہوئی۔ طور پہاڑ اُسی میدان میں ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہاں بلایا ایک مہینہ اعتکاف کرنے اور روزے رکھنے کا حکم ہوا تھا۔ لیکن تیس راتیں گزرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کر لی جس سے وہ خاص قسم کی رائحہ دُور ہوگئی جو روزہ رکھنے سے منہ میں پیدا ہو جاتی ہے اس کو حدیث میں خَلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ سے تعبیر فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مُشک کی خوشبو سے بھی زیادہ عمدہ ہے۔ (کمافی صحیح البخاری)

جب یہ رائحہ دور ہوگئی تو دس دن مزید روزہ رکھنے کا حکم ہوا۔ لہٰذا چالیس دن کوہ طور پر گزارے مُدت مذکورہ گزر جانے کے بعد توریت شریف عطا ہوئی۔ سورہ بقرہ میں چالیس راتوں کا ذکر ہے۔ اور سورۂ اعراف میں تفصیل بیان فرمائی کہ تیس راتوں میں دس راتیں اور بڑھا دی گئیں۔ لہٰذا چالیس راتیں پوری ہوگئیں۔ (اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً)

سامری سُنار کا زیورات سے بچھڑا بنانا اور بنی اسرائیل کا اس کو معبود بنا لینا

حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے اور وہاں چالیس دن لگ گئے۔ ادھر انکے پیچھے انکی قوم بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی جس کا واقعہ یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلنے والے تھے۔ تو انہوں نے قبطی قوم کے

لوگوں سے (جو مصر کے اصل باشندہ تھے) زیورات مانگ لئے تھے۔ یہ زیورات ان لوگوں کے پاس تھے ان میں ایک آدمی سامری نام کا تھا جو سُنار کا کام کرتا تھا اس نے ان زیوروں کو جمع کر کے گائے کے بچھڑے کی شکل بنادی اور اُس کے منہ میں مٹی ڈال دی۔ یہ وہ مٹی تھی جو اُس نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے اُٹھالی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مٹی میں ایسا اثر ڈالا کہ اس مجسمہ سے گائے کے بچہ کی آواز آنے لگی۔ بنی اسرائیل مصر میں بُت پرستی دیکھ آئے تھے۔ جب اُس کی آواز سنی تو کہنے لگے۔ هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ موسٰى فَنَسِيَ۔ (یعنی یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا بھی معبود ہے سو وہ بھول گئے جو طور پر خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لئے گئے۔ معبود تو العیاذ باللہ یہاں موجود ہے) حضرت ہارون علیہ السلام جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پیچھے چھوڑ گئے تھے انہوں نے بنی اسرائیل کو سمجھایا اور بتایا کہ تم فتنے میں پڑ گئے ہو تمہارا رب رحمٰن ہے میرا اتباع کرو۔ میری اطاعت کرو۔ اس پر بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم برابر اس بچھڑے کے آگے پیچھے لگے رہیں گے۔ یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام واپس آجائیں۔

سامری کو بد دُعا اور بچھڑے کا انجام

جب موسیٰ علیہ السلام توریت شریف کی تختیاں لے کر تشریف لائے تو اُنہوں نے یہ ماجرا دیکھا' بہت غصہ ہوئے اور پوری صورت حال معلوم فرمائی پتہ چلا کہ سامری نے یہ حرکت کی ہے۔ اس سے بھی سوال جواب فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو بد دعا دے دی اور فرمایا: فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ (تو جا تیرے لئے زندگی بھر یہ بات طے کر دی گئی کہ تو جسے دیکھے گا اُس سے کہے گا کہ مجھے نہ چھونا) لہٰذا وہ حیران پریشان جنگل میں پھرتا رہتا تھا جب وہ کسی کو چھو لیتا تھا یا کوئی شخص اُسے چھو لیتا تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا پھر موسیٰ علیہ السلام نے اُس بچھڑے کو جلا دیا اور راکھ کو سمندر میں بہا دیا۔ اور فرمایا: اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا۔ (تمہارا معبود صرف اللہ ہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے)۔ یہ جو فرمایا کہ ہم نے تم سے درگزر کر دیا۔ یہ اُن کی توبہ کرنے کے بعد کی بات ہے۔ اُن کی توبہ کا ذکر ابھی ایک آیت کے بعد آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فیصلہ کرنے والی چیز دے دی تاکہ تم ہدایت پاؤ

توریت شریف عطا فرمانے کا انعام

تفسیر: اس آیت میں توریت شریف عطا فرمانے کا ذکر ہے بنی اسرائیل پر جو اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے انعامات ہوئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اُن کو ایک جامع کتاب دی گئی جو احکام پر مشتمل تھی اس میں احکام دینیہ پوری طرح واضح طور پر بیان فرما دیئے گئے تھے سورۃ انعام میں فرمایا: ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ (پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جس سے اچھی طرح عمل کرنیوالوں پر نعمت پوری ہو جائے اور سب احکام کی تفصیل معلوم ہو جائے۔ اور رہنمائی ہو اور رحمت ہو تاکہ وہ لوگ اپنے

رب کے ملنے پر ایمان لائیں) توریت شریف کو فرقان فرمایا یعنی حق اور باطل کے درمیان فرق کرنیوالی۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا معنی ہے حلال وحرام کے درمیان فرق کرنے والی۔ یہ دونوں باتیں ٹھیک ہیں۔ اللہ کی کتاب کی یہ سب صفات ہیں۔ حق اور باطل کے درمیان فرق کرنیوالی ہے اور حلال وحرام کے درمیان بھی۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ الفرقان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات مُراد ہیں۔ سیاق کلام سے یہ بھی بعید نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو توریت شریف بھی دی اور معجزات بھی دیئے۔ جو اُن کے دعوائے نبوت اور رسالت کو ثابت کرنیوالے تھے۔ جو انعامات موسیٰ علیہ السلام پر ہوئے وہ سب بنی اسرائیل پر بھی ہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل ان کی اُمت میں سے تھے اور خود موسیٰ علیہ السلام بھی بنی اسرائیل میں سے تھے۔ بنی اسرائیل نے اللہ کی ساری نعمتوں کی ناقدری کی اور بجائے شکر گزار ہونے کے ناشکرے ثابت ہوئے اور ہدایت کے بجائے گمراہی اختیار کی جس کا تذکرہ آئندہ آیات میں آرہا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى
اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بے شک تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ لہٰذا تم اپنے پیدا کرنے والے کی بارگاہ میں توبہ کرو۔ سو
بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ
اپنی جانوں کو قتل کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے تمہارے پیدا کرنیوالے کے نزدیک پھر اُس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔ بے شک وہ بہت زیادہ توبہ قبول فرمانے
الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾
والا ہے اور نہایت رحم کرنیوالا ہے

گئوسالہ پرستی کرنیوالوں کی توبہ اور اس بارے میں جانوں کا قتل کرنا

تفسیر: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام توریت شریف لے کر واپس بنی اسرائیل کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ بہت بڑی تعداد میں یہ لوگ گئوسالہ پرستی یعنی بچھڑے کی عبادت میں منہمک ہو چکے ہیں اس پر انہیں بہت زیادہ غصہ آیا اور ان کو بت پرستی سے توبہ کرنے پر متوجہ فرمایا۔ ان لوگوں کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے توجہ دلانے سے اپنی گمراہی کا احساس ہو گیا جیسا کہ سورۂ اعراف میں فرمایا۔ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (اور جب نادم ہوئے اور معلوم ہوا کہ واقعی وہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہمیں معاف نہ کرے تو ہم بالکل نقصان میں پڑ جانیوالے ہونگے) اُن لوگوں کی توبہ کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمایا تھا کہ وہ مقتول ہو جائیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یوں حکم ہوا تھا کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی وہ ان لوگوں کو قتل کر دیں۔ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی۔ مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب قتل کرنا شروع کیا تو قاتلین کے سامنے بچھڑے کی عبادت کرنیوالوں میں سے وہ لوگ بھی سامنے آجاتے تھے جو انکے رشتہ دار اور عزیز قریب تھے۔ لہٰذا وہ قتل کرنے سے ہچکچاتے تھے اللہ تعالیٰ نے سیاہ بادل بھیج دیئے تا کہ ایک دوسرے کو نہ دیکھیں اور صبح سے شام تک قتل کا سلسلہ چلتا رہا حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے دعا کی بادل ہٹا دیا گیا اور توبہ نازل

ہوگئی اس وقت تک ستر ہزار آدمی قتل کئے جاچکے تھے۔ مفسرین کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی وہ سب ہی مقتول نہیں ہوئے بلکہ ستر ہزار کے قتل ہونے پر سب کی توبہ قبول ہوگئی۔ (بیضاوی وابن کثیر)

آیت کریمہ میں یہ جو فرمایا کہ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ (کہ تم اپنے پیدا کرنیوالے کے حضور میں توبہ کرو) اس میں اسطرف اشارہ ہے کہ مستحق عبادت وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اُسے چھوڑ کر تم ایسی چیز کی پرستش میں لگ گئے جن کی شکل و صورت تمہارے آدمی نے خود بنائی۔ شرک کی سزا دوزخ کا دائمی عذاب ہے اُس سے بچنے کے لئے توبہ کرلو۔ اور توبہ کی قبولیت کے لئے یہ شرط لگائی کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ اور فرمایا کہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے یہ ایک وقتی تکلیف ہے جس کا سہہ لینا دوزخ کے دائمی عذاب کے مقابلہ میں بہت زیادہ سہل ہے۔ اور اس عذاب سے بچنا تمہارے لئے بہت بہتر ہے۔

اُمت محمدیہ پر اللہ جل شانہٗ کا بہت بڑا فضل وکرم ہے انکی توبہ ندامت سے اور آئندہ گناہ کے نہ کرنے کا فیصلہ کرلینے پر اور حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے سے قبول ہوجاتی ہے۔ کوئی کیسا ہی کتنا بڑا گناہ کرے۔ کفر اختیار کرے شرک کا کام کرے اس کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ سچے دل سے اسلام قبول کرے توحید و رسالت پر ایمان لائے اُسکی توبہ قبول ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ ٱلصَّٰعِقَةُ وَأَنتُمْ
اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تمہاری تصدیق نہ کریں گے جب تک کہ ہم اللہ کو علانیہ طور پر نہ دیکھ لیں، سو پکڑ لیا تم کو کڑک نے اور حال یہ تھا
تَنظُرُونَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنَٰكُم مِّنۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٦﴾
کہ تم آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، پھر ہم نے تم کو زندہ اٹھا دیا تمہاری موت کے بعد تاکہ تم شکر ادا کرو

بنی اسرائیل کی بیجا جسارت اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا سوال

تفسیر: جب موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام توریت شریف لائے تو بنی اسرائیل کو پایا کہ اُن میں سے بہت سے لوگ بچھڑے کی عبادت کرچکے ہیں بچھڑے اور اُس کی عبادت کرنے والوں کا انجام اوپر بیان ہوچکا ہے۔ بنی اسرائیل نے گئوسالہ پرستی کے علاوہ ایک اور اڑ لگائی، اور انہوں نے کہا کہ آپ جو فرمارہے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ ہمارے پاس اُسکی کیا دلیل ہے۔ ہم تو اس کو جب مانیں گے جب اللہ تعالیٰ ہم سے خود فرمائیں کہ یہ میری کتاب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چلو یہ بھی سہی تم لوگ اپنے نمائندے تیار کرلو اور جو لوگ میرے ساتھ چلیں وہ روزہ رکھیں اور پاک صاف ہوکر چلیں جس دن ان کو خداوند قدوس سے ہم کلامی سے مشرف ہونے کا موقع آیا (جس کے لئے پہلے سے اجازت لی ہوئی تھی اور وقت مقرر فرمادیا تھا) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان ستر آدمیوں کو بھی ساتھ لے گئے اللہ تعالیٰ کا کلام سن کر یہ لوگ مطمئن ہوئے اور دوسری کروٹ بدلی اور کہنے لگے کہ ہم تمہاری بات جب مانیں گے جب ہم اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر اپنے آمنے سامنے دیکھ لیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ان کو بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا اور وہ دیکھتے کے دیکھتے ہی لقمۂ اجل بن گئے۔ جب یہ ماجرا ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فکر لاحق ہوئی کہ پہلے ہی بنی اسرائیل مجھے متہم کرتے تھے اور طرح طرح کی باتیں کرتے تھے اب اتنے آدمی ہلاک ہوگئے تو میں جب یہ بیان کرونگا کہ وہ لوگ بجلی کی کڑک سے مرگئے تو خدا جانے کیا کیا باتیں بنائیں گے اور کیسے اتہام دھریں گے لہٰذا انہوں نے بارگاہ خداوندی میں دعا کی جس کی وجہ سے دوبارہ زندہ کردیئے گئے۔ اس نعمت کا شکر اُن زندہ ہونیوالوں پر اور ساری قوم پر واجب ہوا۔ (ابن کثیر ص ۹۳/۹۴ ج ا والبیضاوی)

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ

اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا، اور ہم نے تمہارے اوپر من اور سلویٰ نازل کیا، جو کچھ ہم نے تم کو دیا اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ،

وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا لیکن اپنی ہی جانوں کا نقصان کیا کرتے تھے

میدان تیہ میں بنی اسرائیل پر بادلوں کا سایہ کرنا اور من وسلویٰ نازل ہونا

تفسیر: جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور دریا پار کر کے ایک بیابان جنگل میں پہنچے جہاں سے اُن کو اپنے وطن کنعان جانا تھا اور وہاں پہنچنے میں چالیس سال لگ گئے صبح کو جہاں سے چلتے تھے شام کو وہیں موجود ہوتے تھے۔ (ذکر البیضاوی فی تفسیر قولہ تعالیٰ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ) دھوپ اور گرمی میں چلنا اور روزانہ چلنا نہایت تکلیف دہ تھا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہمارے لئے کچھ سایہ کا انتظام ہونا چاہیئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں دعاء کی جس کی وجہ سے اُن کے لئے بادل بھیج دیئے گئے دن میں جب وہ سفر کرتے تھے تو بادل اُن پر سایہ کرتے تھے اس سایہ میں انکا سفر طے ہوتا تھا چونکہ روزانہ سفر ہی سفر تھا کسی طرح کی تجارت یا صنعت وحرفت یا زراعت کا موقع نہیں تھا اور کھانے کی ضرورت بدستور جس کا ہر انسان محتاج ہے تو انکی اس حاجت کے پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے من اور سلویٰ نازل فرمائے۔

مَنّ کے بارے میں علماء تفسیر کے بہت سے اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ کوئی ایسی چیز تھی جو درختوں پر نازل ہو جاتی تھی۔ صبح جا کر اس میں سے جس قدر چاہتے کھا لیتے تھے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ یہ ایک قسم کا گوند تھا۔ حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ وہ کوئی چیز تھی جو گاڑھے گودے کے مشابہ تھی۔ حضرت قتادہ کا قول ہے کہ یہ لوگ جہاں مقیم ہوتے وہیں برف کی طرح اُن کی جگہوں میں مَنّ کا نزول ہو جاتا تھا جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوتا تھا۔ اور یہ طلوع فجر سے طلوع شمس تک نازل ہوتا تھا ایک دن کی ضرورت کے بقدر ہر شخص کو لینے کی اجازت تھی اس سے زیادہ کوئی لے لیتا تو خراب ہو جاتا تھا۔ البتہ جمع کے دن جمعہ اور سنیچر دونوں دنوں کے لئے لے لیتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عجوہ (مدینہ منورہ کی کھجوروں کی ایک قسم) جنت سے ہے اور اس میں زہر سے شفا ہے اور کھنبی مَنّ سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے۔ (اخرجہ الترمذی فی ابواب الطب) وھو فی البخاری من غیر ذکر العجوۃ)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جو کھنبی کبھی کبھی زمین پر نظر آ جاتی ہے یہ اُس مَنّ کا بقیہ ہے جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا۔ راوی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میری ایک باندی چُندھی تھی میں نے کھنبی کا پانی لیکر اُس کی آنکھ میں ڈالا تو وہ ٹھیک ہو گئی۔

سلویٰ یہ کیا چیز تھی؟ یہ کوئی پرندہ تھا جو بٹیر سے مُشابہ تھا اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے پاس خوب زیادہ تعداد میں پرندے بھیج دیتا تھا جو ہوا کے ذریعہ آ جاتے تھے وہ لوگ ان کو ذبح کر دیتے تھے اس بارے میں بھی حکم تھا کہ بقدر ضرورت لیں اور ذخیرہ بنا کر نہ رکھیں لیکن انہوں نے اس بات پر عمل نہ کیا مَنّ اور سلویٰ دونوں کا ذخیرہ بنایا اور جب دوسرے دن اُسے دیکھا تا کہ کھائیں تو اس میں بدبو آ چکی تھی اور خراب ہو چکا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت میں تغیر نہ آتا اور وہ بدبودار نہ ہوتا۔ اور اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی

عورت کبھی بھی اپنے شوہر کی خیانت نہ کرتی (صحیح بخاری ص ۴۶۹ ج ۱) مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے اللہ پر بھروسہ نہ کیا ان کے لئے حکم تھا کہ من وسلوٰی اُٹھا کر نہ رکھیں لیکن وہ نہ مانے اُٹھا کر رکھا تو اس میں بدبو آ گئی خراب ہو گیا لہٰذا گوشت کے خراب ہونے کی ابتداء ان لوگوں سے ہوئی اور ان کی حرکت بد کی وجہ سے ہوئی اسی طرح سے حضرت حوا نے حضرت آدم کو جنت کا وہ درخت کھانے پر آمادہ کیا جس کے کھانے سے منع کیا گیا تھا پھر دونوں نے کھا لیا اور دونوں دنیا میں بھیج دیئے گئے۔ شوہر کی خیانت کی ابتداء حضرت حوا سے ہوئی لہٰذا اُن کی نسل میں بھی یہ بات باقی رہ گئی۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء)

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا

اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس بستی میں سو کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو خوب اچھی طرح، اور داخل ہو جاؤ دروازہ میں جھکے ہوئے

وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ

اور یوں کہو کہ ہم گناہوں کی بخشش کا سوال کرتے ہیں، ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے۔ اور نیکوکاروں کو اور زیادہ دیں گے۔ سو بدل دیا اُن لوگوں نے جنہوں نے

الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

ظلم کیا بات کو اس بات کے علاوہ جو اُن سے کہی گئی تھی سو ہم نے نازل کر دیا اُن لوگوں پر آسمان سے عذاب جنہوں نے ظلم کیا اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے

ایک بستی میں خشوع کے ساتھ داخل ہونے کا حکم اور بنی اسرائیل کی شرارت اور اس پر عذاب آنا

تفسیر: یہ کون سی بستی ہے جس میں داخل ہونے کا یہاں اس آیت شریفہ میں ذکر فرمایا ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے بیت المقدس مراد ہے اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ اَریحا بستی تھی جس میں داخل ہونے کا حکم ہوا تھا۔ مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ پہلا قول ہی صحیح ہے کیونکہ یہ مصر سے آ کر اپنے علاقہ ارض مقدسہ میں جا رہے تھے اور اَریحا اُن کے راستہ میں نہیں پڑتا تھا اور پھر لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا نہیں ہے بلکہ جب بنی اسرائیل چالیس سال میدان میں حیران و سرگرداں پھرتے رہے تو حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی معیت میں ان کو بیت المقدس میں داخل ہونا نصیب ہوا ان کے علاقہ میں (جسے یہ چھوڑ کر مصر چلے گئے تھے) قوم عمالقہ آباد تھی۔ وہ بڑے قد آور اور قوت و شوکت والے لوگ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل سے فرمایا کہ چلو اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے تو ان لوگوں نے کہا کہ اس میں تو بڑے جابر قسم کے لوگ آباد ہیں۔ ہمارے بس کا نہیں جو اُن سے مقابلہ کریں تم جاؤ اور تمہارا رب جائے دونوں وہاں جا کر قتال کر لیں۔ ان کی اس حرکت پر چالیس سال کے لئے بیت المقدس کی سرزمین ان پر حرام کر دی گئی پھر یوشع علیہ السلام کی سرکردگی میں بیت المقدس فتح ہوا جب بیت المقدس میں داخل ہونے لگے تو حکم ہوا کہ اللہ جل شانہٗ کا شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوں کہ اس نے ان کا علاقہ ان کو واپس فرمایا اور اس میں فتح یابی نصیب فرمائی اور ان کو میدان تیہ کی حیرانی اور پریشانی سے نجات دی۔ اور اس شکر کے اظہار کے لئے عملی طور پر یہ تجویز فرمایا کہ جھکے ہوئے داخل ہوں تواضع کا طریقہ اختیار کریں غرور اور تکبر کو پاس نہ آنے دیں اور ایسی کوئی صورت اختیار نہ کریں جس سے استہزاء کی کیفیت ظاہر ہو۔ اور ان کو یہ بھی حکم دیا

تھا کہ حِطَّةٌ کہتے ہوئے داخل ہوں جس کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ ہم گناہوں کی بخشش کا سوال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ ایسا کرو گے تو ہم تمہاری خطائیں معاف کردیں گے اور جو لوگ اچھے کام کرنے والے ہیں ان کے ثواب میں اور اضافہ کردیں گے۔ حکم کیا ہوا تھا اور حرکت کیا کی؟ اسی کو فرمایا کہ ظالموں نے اس کو بدل دیا جس کا حکم دیا تھا' عمل کو تو اس طرح بدلا کہ جھکے ہوئے داخل ہونے کی بجائے بچوں کی طرح اپنے دھڑوں پر گھسٹتے ہوئے جس میں ایک طرح کا استہزاء ہے۔ اور جو معافی مانگنے کا حکم ہوا تھا اس میں اس طرح ادل بدل کیا کہ حَبَّةٌ فِي شَعِيْرَةٍ کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ (کمافی صحیح البخاری)

جب انہوں نے ایسی حرکت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے فاسقانہ کرتوتوں کی وجہ سے اُن پر عذاب نازل فرما دیا۔ یہ عذاب جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا اسکو رجز سے تعبیر فرمایا ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ان لوگوں پر طاعون بھیج دیا گیا تھا جس کی وجہ سے کثیر تعداد میں بنی اسرائیل کی موتیں ہوئیں۔ علماء تفسیر نے یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ۔ اَلطَّاعُوْنُ رِجْزٌ عَذَابٌ عُذِّبَ بِهٖ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ (یعنی طاعون رجز ہے جو عذاب ہے جس کے ذریعہ تم سے پہلی اُمتوں کو عذاب دیا گیا) (ذکرہ ابن کثیر عن ابن ابی حاتم)

معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ طاعون کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ستر ہزار آدمی ایک ہی ساعت میں ہلاک ہوگئے۔ مومن بندوں کو ہر حال میں اپنے خالق و مالک ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہئے جب اللہ تعالیٰ فتح اور کامرانی دے تو خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف متوجہ ہوں عاجزی اور فروتنی کو اختیار کریں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن مکہ معظمہ میں خشوع خضوع کے ساتھ داخل ہوئے فتح مکہ کے بعد حضرت اُم ھانی کے گھر میں آٹھ رکعات نماز پڑھی یہ چاشت کا وقت تھا' مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے اسکو صلاۃ الضحیٰ اور بعض حضرات نے صلاۃ الفتح سے تعبیر کیا ہے جب امیر لشکر کسی شہر کو فتح کرے تو اس کے لئے مستحب ہے کہ اول مرتبہ جب داخل ہو تو آٹھ رکعت نفل پڑھے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جب فارس فتح کیا اور ایوان کسریٰ میں داخل ہوئے تو انہوں نے بھی آٹھ رکعت نماز پڑھی۔ (ابن کثیر ج ۱)

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا
اور جب موسیٰ سے اُن کی قوم نے پانی طلب کیا تو ہم نے کہا کہ اپنی عصا پتھر پر مارو سو اس میں سے
عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي
بارہ چشمے پھوٹ نکلے' ہر جماعت نے اپنے اپنے پینے کی جگہ جان لی' کھاؤ اور پیؤ اللہ کے رزق سے اور مت خرابی کرو
الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾
زمین میں فساد کرتے ہوئے

میدان تیہ میں بنی اسرائیل کیلئے پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹنا

تفسیر: یہ بھی میدان تیہ کا قصہ ہے۔ اس میدان میں جب بنی اسرائیل کو پیاس لگی اور پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اُنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا سوال کیا جب موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں پانی کی درخواست کی تو

اللہ جل شانہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنی لاٹھی کو پتھر پر مارو چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا لاٹھی کا پتھر پر مارنا تھا کہ اُس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے علامہ بغوی نے معالم التنزیل میں حضرت ابن عباس ﷺ سے نقل کیا ہے کہ جس پتھر میں لاٹھی مارنے سے چشمے جاری ہوتے تھے یہ ایک ہلکا سا پتھر تھا جو چوکور تھا۔ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں رہتا تھا۔ جب پانی کی حاجت ہوتی اُسے زمین پر رکھ کر لاٹھی مار دیتے تھے جس سے چشمے جاری ہو جاتے تھے۔

جب بنی اسرائیل پانی سے سیراب ہو جاتے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اُسکو اُٹھا کر تھیلے میں رکھ لیتے تھے اور جب پانی لینا چاہتے تھے تو پھر اس میں لاٹھی مار دیتے تھے جس سے پانی نکلتا' روزانہ چھ لاکھ آدمی اس سے سیراب ہوتے تھے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے ہر قبیلے کے لئے پتھر سے چشمہ پھوٹتا تھا اور ہر قبیلہ اپنے اپنے چشمے سے سیراب ہوتا تھا۔

لق دق میدان میں اللہ جل شانہٗ نے بنی اسرائیل کے کھانے کے لئے من وسلویٰ عطا فرمایا اور اُن کے پینے کے لئے پتھر سے چشمے جاری فرمائے یہ اللہ تعالیٰ کا بنی اسرائیل پر بہت بڑا انعام تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بہت بڑا معجزہ بھی تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (کہ اللہ تعالیٰ کے رزق سے کھاؤ اور پیو اور زمین میں فساد کرنے والے نہ بنو) لَا تَعْثَوْا عثی سے مشتق ہے جو خوب زیادہ بڑا فساد کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی آپس کا قتل وقتال اور ایک دوسرے پر ظلم کرنا بہت بڑا فساد ہے۔ نعمتوں کی ناشکری کرنے سے نعمتوں سے محرومی ہو جاتی ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ نعمتوں کے مقابلہ میں ناشکری اور نافرمانی شرعاً وعقلاً بہت بڑی جہالت اور باعث ہلاکت ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنبِتُ

اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک کھانے پر لہٰذا ہمارے لئے اپنے رب سے دعاء کیجئے وہ ہمارے لئے اُن چیزوں میں سے نکال دے

الْأَرْضُ مِن بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي

جن کو زمین اُگاتی ہے۔ اس کی سبزی اور کھیرا گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے کہا کہ تم بدلتے ہو اُس چیز کو جو گھٹیا ہے

هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ۚ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ ۗ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ

اُس چیز کے بدلہ میں جو خیر ہے؟ اُتر جاؤ کسی شہر میں سو بے شک تمہارے لئے وہ ہے۔ جو تم نے سوال کیا۔ اور ماردی گئی اُن لوگوں پر ذلت

وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ

اور مسکنت' اور مستحق ہو گئے غصہ کے جو اللہ کی طرف سے تھا' یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور

النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے' یہ اس لئے کہ اُنہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھتے تھے

بنی اسرائیل کا کہنا کہ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے ہمیں پیاز' لہسن چاہیے

تفسیر: میدان تیہ میں بنی اسرائیل کو دونوں وقت کھانے کے لئے من وسلویٰ ملتا تھا۔ انسان کا کچھ ایسا مزاج ہے

کہ وہ ایک قسم کا کھانا کھاتے کھاتے بددل ہو جاتا ہے۔ اور اسکی طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے کھانے کھائے بنی اسرائیل من وسلوٰی کھاتے کھاتے اُکتا گئے لیکن اُنہوں نے طبعی اُکتاہٹ کو دیکھا اور اس بات کو نہ دیکھا کہ ہم ایسی بدترین غلامی سے نکل کر آئے ہیں جہاں ہمارے بچے ذبح کر دیئے جاتے تھے اور اُف نہ کر سکتے تھے ایسے بڑے دشمن کا ہلاک اور برباد ہونا اور اس سے نجات پانا یہ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کے سامنے کھانے کی طبعی اکتاہٹ پر صبر کر لینا معمولی بات ہے لیکن اُنہوں نے صبر کرنے سے انکار کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے زمین سے نکلنے والی چیزیں پیدا فرمائے ہمیں سبزیاں چاہئیں' کھیرا چاہئے' گیہوں چاہئے' مسور کی دال چاہئے اور پیاز چاہئے۔ اور طرز سوال بھی عجیب ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ رہے ہیں آپ اپنے رب سے دعا کریں۔ یہ نہیں کہتے کہ ہم سب مل کر اپنے رب سے مانگیں' گویا اپنا کوئی تعلق ہی اپنے رب سے نہیں ہے اور گویا موسیٰ علیہ السلام نے انکو مصر سے لاکر ایک طرح کے کھانے کی مصیبت میں ڈالا ہے لہٰذا وہ دعا کریں اور وہی مصیبت حل کریں۔ اُن کا شکریہ تو کجا کہ اُن کی محنتوں کوششوں اور قربانیوں سے بدترین غلامی سے نجات پائی۔ شکریہ کی بجائے اُن کو مطعون کر رہے ہیں کہ تم نے ہم کو مصیبت میں ڈالا۔ جب مذاق بگڑ جاتا ہے تو انسان عزت اور رفعت کی قدر نہیں کرتا وہ اپنے پست ذہن کی وجہ سے پستی کو ہی پسند کرتا ہے۔ اور ذلت کا خوگر ہو جاتا ہے اسکی طبیعت ذلیل ہو کر رہنے ہی کو پسند کرتی ہے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ طبیعت کی خواہشوں کے مطابق جیتا رہوں۔ چاہے جوتے ہی پڑتے رہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ناراضگی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی یہ ادا پسند نہ آئی اور فرمایا کہ تمہارے پاس عمدہ کھانا بغیر کسب معاش اور بغیر محنت مشقت کے پہنچ جاتا ہے۔ تم اس عمدہ چیز کو چھوڑ کر گھٹیا چیزیں طلب کر رہے ہو' یہ طریقہ صحیح نہیں ہے اگر تم کو سبزیاں ترکاریاں دال اور پیاز چاہئے۔ تو کسی شہر میں چلے جاؤ۔ یہ چیزیں وہاں ملیں گی۔

لفظ "فوم" کا معنی تفسیر کی کتابوں میں گیہوں بھی لکھا ہے۔ اور لہسن بھی' دونوں ہی معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ بنی ہاشم کی زبان میں "فوم" گیہوں کو کہا جاتا تھا حضرت مجاہد نے اس کا ترجمہ لہسن کیا اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک قول یہ بھی منقول ہے۔ حضرت امام بخاری نے بعض حضرات کا قول نقل کیا ہے کہ "الحبوب التی تو کل کلھا فوم" یعنی تمام غلّے جو کھائے جاتے ہیں وہ سب فوم کا مصداق ہیں۔ (راجع ابن کثیر)

یہودیوں پر ذلت اور مسکنت ماردی گئی

پھر فرمایا کہ یہود پر ذلت اور مسکنت ماردی گئی یعنی ان کے ساتھ لازم کر دی گئی۔ وہ برابر ذلیل رہیں گے' جس میں دوسری قوموں کا ماتحت ہونا' جزیہ دینا' مال کا حریص ہونا' بہت زیادہ مال ہوتے ہوئے بھی مال کی طلب میں لگنا اور جان کھپانا یہ سب ذلت میں داخل ہے۔ صاحب معالم التنزیل لکھتے ہیں۔

فتری الیھود وان کانوا میاسیر کأنھم فقراءٌ وقیل الذلة ھی فقر القلب فلا تری فی أھل الملل اذل واحرص علی المال من الیھود.

یہود پر چونکہ ذلت اور مسکنت ماردی گئی اور انکی جانوں کے ساتھ لگادی گئی اس لئے تم ان کو دیکھو گے کہ مالدار ہوتے ہوئے بھی فقیر ہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ذلت سے دل کا فقیر ہونا مراد ہے۔ اسی لئے تمام اہل مذاہب میں یہودیوں سے بڑھ کر کوئی قوم زیادہ ذلیل اور مال کی حریص نہیں ہے۔ صاحب معالم التنزیل نے سچ فرمایا کہ مالدار ہوتے ہوئے لیچڑ ہونا اور پیسے کے لئے جان دینا اور تھوڑا سا نقصان ہوجانے پر بیمار پڑجانا یا دل کا دورہ پڑجانا یا اچانک مرجانا' یہ باتیں قلبی فقر کو ظاہر کرتی ہیں اور اس کے نمونے اگر دیکھنے ہوں تو ہندوستان کے بنیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہود نے انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کیا اس لئے غضب الٰہی کے مستحق ہوگئے

پھر فرمایا کہ وہ غضب الٰہی کے مستحق ہوگئے اور ذلت اور مسکنت کا ان کے ساتھ لازم ہوجانا اور غضب الٰہی کا مستحق ہوجانا اس وجہ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے اور اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا قتل تو ناحق ہی ہوتا ہے لیکن بغیر الحق کی تصریح اس لئے فرمائی کہ ان کے نزدیک بھی ان کو قتل کرنا ناحق تھا پھر یہ کہ ان حضرات کے قتل کرنے پر کوئی ندامت نہیں ہوتی تھی۔ مفسر ابن کثیر نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے شروع دن میں تین سونبیوں کو قتل کردیا (علیہم الصلوٰۃ والسلام) پھر شام کو اپنے بازاروں میں سبزیوں کا کاروبار شروع کردیا۔ بنی اسرائیل نے جن انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کو قتل کیا اُن میں حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے اسماء گرامی زیادہ مشہور ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ارشاد فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے زیادہ سخت عذاب والا وہ شخص ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا یا جسے کسی نبی نے قتل کیا یا جس نے اپنے والدین میں سے کسی کو قتل کیا۔ اور تصویر بنانے والوں کو بھی سب سے زیادہ سخت عذاب ہوگا اور اُس عالم کو بھی جس نے اپنے علم سے نفع حاصل نہ کیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح از بیہقی فی شعب الایمان)

یہودیوں کی حکومت سے متعلق ایک سوال

جب سے یہودیوں کی حکومت قائم ہوئی ہے تو کم علم یہ اشکال پیش کرنے لگے ہیں کہ قرآن مجید میں پیشین گوئی تھی کہ اُن کی حکومت کبھی قائم نہ ہوگی اس پیشین گوئی کے خلاف کیسے ہوگیا؟ یہ سوال کوئی وزنی نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے بلکہ سورۂ آل عمران میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو ذلت ان پر ماردی گئی ہے بعض حالات میں وہ نہ رہے گی چنانچہ ارشاد ہے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوْا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (یعنی اُن پر ذلت جمادی گئی وہ جہاں کہیں پائے جائیں مگر اللہ کے کسی قانون کے ذریعے سے یا آدمیوں کے ذریعہ سے) اللہ کے قانون کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی یہودی بوڑھا ہو عبادت میں لگا ہو مسلمانوں سے جنگ نہ کرتا ہو تو وہ قتل نہ کیا جائے گا۔ اگرچہ اسکی عبادت آخرت میں نفع دینے والی نہیں ہے۔ اور آدمیوں کے ذریعہ اس کی ذلت رُک جانے کا ذریعہ یہ ہے کہ کسی قوم سے انکی صلح ہوجائے یا کوئی قوم ان کو قوت پہنچانے لگے یا اُن کی مدد کرنے لگے جس سے اُن کو تھوڑی سی عارضی عزت مل جائے۔ ظاہر ہے کہ یہودیوں کی جواب حکومت قائم ہے وہ بعض دوسری حکومتوں کی وجہ سے ہے اگر وہ انکی مدد اور معاونت چھوڑ دیں تو ایک دن بھی انکی حکومت باقی نہیں رہ سکتی۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٔيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے یہودیت اختیار کی' اور نصاریٰ' اور صابئین' ان میں سے جو بھی اللہ پر اور یوم

الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے سو اُن کے لئے اجر ہے اُن کے رب کے پاس اور ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے

صرف ایمان اور عمل صالح ہی مدار نجات ہے

تفسیر: گذشتہ آیت میں ارشاد فرمایا تھا' کہ یہودیوں پر ذلت اور مسکنت لازم کر دی گئی اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہوئے اور اُس کا سبب یہ بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں لگتے اور حدود سے آگے بڑھتے تھے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے مطرود اور مَردود ہونا کوئی یہودی قوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہونا اور مستحق اجر و ثواب ہونا اور قیامت میں بے خوف اور بے غم ہونا کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جو بھی کوئی شخص ایمان کی صفت سے متصف ہوگا وہ اپنے رب کے نزدیک مستحق اجر و ثواب اور بے خوف و بے غم ہوگا۔ یہ ایمان کی صفت ہر قوم کے اپنے اپنے زمانہ کے اعتبار سے تھی۔ یہودیوں کا ایمان یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور توریت شریف پر ایمان لائیں اور ہر اُس عقیدہ کو مانیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بتایا۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور انجیل شریف پر ایمان لانا اور اُن کی شریعت کو پوری طرح سے ماننا اور جو کچھ انہوں نے بتایا اُس کو تسلیم کرنا یہ اُن کے زمانہ کے لوگوں کا ایمان تھا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول تھا جو لوگ اُن پر ایمان نہ لائے یا ایمان تو لائے لیکن بعد میں اُن کی شریعت کو بدل دیا اور ان کے دین میں شرک داخل کر دیا' وہ لوگ مومن نہ رہے۔ یہودیوں نے جب اُن کی نبوت اور رسالت سے انکار کیا تو اُن میں جو اب تک مومن تھے وہ بھی کافر ہو گئے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ

پھر جب خاتم النبیین سرورِ عالم حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی جن کی آمد کی خبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی (مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ) اور جن کا تذکرہ توریت اور انجیل میں پاتے تھے (يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ) تو اب ایمان یہ ہوگا کہ حضرت سرورِ عالم ﷺ پر ایمان لائیں اور آپ کی ہر بات تسلیم کریں۔ اسی لئے سورۃ آلِ عمران میں فرمایا (وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ) (یعنی جو شخص بھی اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا) جتنی قومیں بھی دنیا میں بستی ہیں اور جتنے اہل مذاہب آنحضرت سرورِ عالم محمد ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا میں موجود تھے یا اب موجود ہیں خواہ وہ کسی نبی کے ماننے اور پیرو ہونے کے مدعی ہوں اور خواہ کسی بھی دین پر ہوں اُن سب پر فرض ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم محمد ﷺ پر ایمان لائیں اور ہر وہ عقیدہ تسلیم کریں اور مانیں جو آپ نے بتایا۔ قیامت تک کے لئے ہر قوم ہر جماعت ہر فرد ہر علاقہ کے انسان آپ کی اُمت دعوت میں شامل ہیں۔

سورۂ اعراف میں فرمایا: قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (آپ فرما دیجئے اے لوگو! بے شک میں اللہ کا پیغمبر ہوں تم سب کی طرف)

سورۃ سبا میں ارشاد فرمایا: وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے)

لہٰذا جب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے یہودی نصرانی فرقہ صائبین اور ہر قوم اور ہر اہل مذہب کے لئے معیار نجات صرف سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اور کسی قسم کا کوئی ایمان معتبر نہیں صرف یہی ایمان معتبر ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ نے جو کچھ بتایا ہے اس کو دل سے مانے اور تسلیم کرے۔

ان سب تصریحات کو سمجھ لینے کے بعد اب آیت کا ترجمہ اور مطلب سمجھ لیں کہ جو لوگ ایمان لائے یعنی سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کے اقراری ہوتے ہوئے آپ کو دل سے نبی اور رسول مانا اور یہودی اور نصرانی اور صائبین میں سے جو کوئی اللہ پر ایمان لائیگا۔ اور یوم آخرت کو مانے گا۔ اور عمل صالح کرے گا۔ اور یہ ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر اور عمل صالح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے ایمان کے مطابق اور عمل صالح آپ کے بتائے ہوئے طریقے کے موافق ہوگا۔ تو ایسے لوگ قیامت کے دن بے خوف اور بے غم ہوں گے۔

وحدتِ ادیان کا فتنہ اور اسکی تردید

اتنی بڑی تفصیل ہم نے دور حاضر کے ملحدین اور زنادقہ کی تردید کرنے کے لئے لکھی ہے۔ دورِ حاضر کے فتنوں میں وحدت ادیان کا فتنہ بھی ہے۔ بہت سے اہل باطل یہ کہتے ہیں کہ نجات اخروی کے لئے اللہ پر اور آخرت پر ایمان لانا کافی ہے۔ دین اسلام میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں (العیاذ باللہ) یہ لوگ اپنی گمراہی کو پھیلانے کے لئے آیت بالا کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں صرف من آمن باللہ والیوم الآخر مذکور ہے۔ ایمان بالرسول کا ذکر نہیں ہے۔ یہ لوگ جاہلوں کو دھوکہ دینے کے لئے اُن آیات کو سامنے نہیں رکھتے جو ہم نے اُوپر ذکر کی ہیں۔ ایمان باللہ کا مطلب صرف اتنا سا نہیں ہے کہ اللہ کے وجود کا اقرار کرے اور انسانوں کے خود ساختہ طریقوں سے عبادت کر لیا کرے۔ اللہ پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے اس کے جاننے کا ذریعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

یہ کیسا ایمان باللہ ہے کہ بتوں کی پوجا کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کریں۔ اور یہ کیسا یوم آخرت پر ایمان ہے کہ تناسخ یعنی آواگون کے قائل ہوں اور جنت دوزخ کے منکر ہوں۔ آیت شریفہ میں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے صرف اہل اسلام مراد ہیں۔

یہود کی وجہ تسمیہ: اور اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا سے یہود مراد ہیں ھاد یھود توبہ کرنے کے معنی میں آتا ہے چونکہ ان لوگوں نے گائے کے بچھڑے کی عبادت سے توبہ کی تھی اس لئے ان کو ان لفظوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ انکا مشہور نام یہود ہے۔ جماعت کو یہود اور ایک شخص کو یہودی کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے یہودا کی طرف منسوب ہیں۔ اس لئے انکو یہودی کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ یہ لفظ تھود سے مشتق ہے جو تحرک یعنی حرکت کرنے کے معنی میں ہے۔ چونکہ یہ لوگ توریت شریف پڑھتے ہوئے حرکت کرتے تھے اسی طرح ان کا یہ لقب پڑ گیا۔ (قالہ ابو عمرو بن العلاء)

النصاریٰ: سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو ماننے کے مُدعی ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ لفظ نصرت سے مشتق ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ فرمایا تو اُن کے حواریین نے

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ کہا جیسا کہ سورۃ صف میں مذکور ہے۔لفظ نصاریٰ کی جمع نصران بھی بتایا گیا ہے' جیسا کہ سکران کی جمع سکاریٰ ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے ایک بستی میں سکونت اختیار کی تھی جس کو ناصرہ کہا جاتا تھا اسکی وجہ سے ان کو نصاریٰ کہا گیا۔بہر حال وجہ تسمیہ جو بھی ہو نصاریٰ سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کے مدعی ہیں۔ ان دعوے داروں میں وہ بھی تھے جو اُن کے واقعی اصلی دین پر تھے اور اُن کے دین میں کسی طرح کی تغییر و تبدیل نہیں کی اور وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اُنکا دین بدل دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا بنا دیا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُنکی والدہ کو بھی معبود ماننے لگے۔قرآن مجید نے ان کو کسی جگہ عیسائی نہیں فرمایا یعنی حضرت عیسیٰ کی طرف نسبت نہیں کی۔ مشرک اُنکی طرف منسوب نہیں ہوسکتا۔قرآن نے ان کے لئے لفظ نصاریٰ استعمال فرمایا ہے۔

اَلصَّابِئِیْنَ: یہ صَبَاَ' یَصْبَؤُ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔زمانہ نزول قرآن میں اس فرقہ کا وجود تھا۔ان لوگوں کا دین کیا تھا' اس کے بارے میں حضرات مفسرین نے بہت سے اقوال نقل فرمائے ہیں۔حضرت مجاہد نے فرمایا کہ یہ لوگ مجوسیت' یہودیت اور نصرانیت کے درمیان تھے۔ان کا مستقل کوئی دین نہ تھا۔حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ یہ لوگ فرشتوں کی عبادت کرتے تھے ابن ابی الزناد نے اپنے والد سے نقل کیا کہ یہ وہ لوگ تھے جو عراق کے قریب رہتے تھے اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لاتے تھے اور سال بھر میں تیس روزے رکھ لیتے تھے اور یمن کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھتے تھے۔عبدالرحمٰن بن زید نے کہا کہ یہ لوگ موصل کے جزیرہ میں تھے صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے تھے۔خلیل کا قول ہے کہ ان کا دین نصاریٰ کے دین سے ملتا جلتا تھا۔ان کا قبیلہ جنوبی ہوا کی طرف تھا۔یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ہم نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔وہب بن منبہ کا قول ہے کہ یہ لوگ نہ دین یہودیت پر تھے نہ نصرانیت پر نہ مجوسیت پر اور مشرک بھی نہ تھے۔یہ فطرت پر باقی تھے۔اُس کا کوئی مقرر دین نہ تھا جس کا اتباع کرتے اور بعض علماء کا قول ہے کہ صابئین وہ لوگ ہیں کہ جن کو کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔(آیت کی تفسیر اور توضیح کے لئے ہم نے تفسیر ابن کثیر کو سامنے رکھا ہے اہل علم اسکی مراجعت فرمالیں)

فائدہ: صاحب بیان القرآن لکھتے ہیں کہ حاصل قانون کا یہ ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور اعمال میں اختیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے یہاں مقبول اور اسکی خدمت مشکور ہے اور ظاہر ہے کہ بعد نزول قرآن کے پوری اطاعت مسلمان ہونے میں منحصر ہے مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا مستحق اجر و نجات اخروی ہوگا۔

اور اس قانون میں مسلمانوں کے ذکر کی ظاہر میں ضرورت نہیں۔کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی لیکن اس سے کلام میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہو گئی اسکی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے خواہ کوئی موافق ہو یا مخالف جو شخص اطاعت کریگا وہ موردِ عنایت ہوگا اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے۔سنانا ہے اصل میں مخالف کو' لیکن اس میں نکتہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہے سو اسکی علّت اُن سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں بلکہ اُن کی صفت موافقت مدار ہے ہماری عنایت کا سو مُخالف بھی اگر اختیار کر لے وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا اس لئے مخالف کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کر دیا گیا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ

اور جب ہم نے لے لیا تمہارا عہد اور اُٹھا دیا تمہارے اُوپر طور کو لے لو قوت کے ساتھ جو کچھ ہم نے تم کو دیا اور یاد کرو جو کچھ اس میں ہے

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ پھر اس کے بعد تم نے روگردانی کی، سو اگر نہ ہوتا تم پر اللہ کا فضل

وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

اور اس کی رحمت تو ضرور تم تباہ کاروں میں سے ہو جاتے

بنی اسرائیل سے پختہ عہد لینا پھر ان کا منحرف ہو جانا

تفسیر: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام توریت شریف لے کر آئے اور مستقل شریعت بنی اسرائیل کو دی گئی تو بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی کتاب پر ایمان لائیں اور اس کے رسول کا اتباع کریں اور اسکی شریعت پر عمل کریں گے۔ جب انہوں نے سخت احکام دیکھے تو عمل کرنے سے انکاری ہو گئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے پہاڑ طور کو اسکی جگہ سے اُکھاڑ کر ان کے اُوپر کھڑا کر دیا اور فرمایا کہ ہم نے جو کچھ دیا ہے اس قوت کے ساتھ لے لو اور جو کچھ اس میں ہے اُسے یاد کرو۔ سورۂ اعراف میں اور زیادہ واضح طریقے پر اس کو یوں بیان فرمایا۔ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اُٹھا کر سائبان کی طرح اُن کے اُوپر معلّق کر دیا۔ اور اُن کو یقین ہو گیا کہ اب ان پر گرا اور ہم نے کہا کہ لے لو قوت کے ساتھ جو ہم نے تم کو دیا ہے اور یاد کرو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم متقی ہو جاؤ) جب انہوں نے دیکھا کہ واقعی پہاڑ گرنے کو ہے تو اسوقت مان لیا لیکن بعد میں اس میثاق عظیم کو توڑ دیا اور اقرار سے پھر گئے اللہ تعالیٰ نے انکو توبہ کرنے کی توفیق دی اور اُن کو باقی رکھا اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام انکی طرف آتے رہے اور اُن کو ہدایت دیتے رہے اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اسکی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو دنیا و آخرت میں برباد ہو جاتے۔ (من ابن کثیر)

شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ آئے کہ دین میں تو زبردستی نہیں ہے جیسا کہ **لا اکراہ فی الدین** میں بتایا ہے پھر پہاڑ سروں پر اُٹھا کر بنی اسرائیل سے کیوں قول و قرار لیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اسلام قبول کرانے کے لئے زبردستی نہیں ہے، اگر کوئی قوم مسلمان نہ ہو جزیہ دیکر رہنا چاہے اس سے جزیہ قبول کر لیا جائیگا۔ جس نے اسلام قبول کر لیا اس سے احکام پر زبردستی عمل کرانے کی نفی لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ میں نہیں ہے اسی لئے ذمی کو قتل نہیں کیا جاتا اور جو شخص اسلام کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لے اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی اگر تین دن کے بعد اسلام میں واپس نہ آئے تو قتل کر دیا جائے گا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾ ۚ

اور البتہ تحقیق تم نے ان لوگوں کو جان لیا جنہوں نے سنیچر کے دن میں زیادتی کی، سو ہم نے کہا ہو جاؤ بندر ذلیل!

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

پھر ہم نے اسکو عبرت بنا دیا اُن لوگوں کے لئے جو اسوقت موجود تھے اور جو بعد میں آنیوالے تھے۔ اور نصیحت بنا دیا ڈرنے والوں کے لئے

یہودیوں کا سنیچر کے دن میں زیادتی کرنا اور بندر بنا دیا جانا

تفسیر: جیسے مسلمانوں کے لئے جمعہ کا دن معظم قرار دیا گیا ہے اسی طرح سے یہود کے لئے سنیچر کے دن کو معظم قرار دیا گیا تھا۔ اور اسکی تعظیم کیلئے یہ حکم بھی تھا کہ اس دن مچھلی کا شکار نہ کریں۔ ایک طرف تو یہ حکم تھا اور دوسری طرف ان کا امتحان تھا اور وہ امتحان اسطرح سے تھا کہ دوسرے دنوں میں مچھلیاں عام حالات کے مطابق پانی میں اندر ہی رہتی تھیں اور سنیچر کے دن خوب اُبھر اُبھر کر پانی پر آ جاتی تھیں جس کا تذکرہ سورۂ اعراف کی آیت وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ میں فرمایا ہے چونکہ سنیچر کے دن مچھلیاں خوب اُبھر کر سامنے آ جاتی تھیں اس لئے ان لوگوں نے انکے پکڑنے کے لئے حیلے نکالے اور یہ کہا کہ سنیچر کا دن آنے سے پہلے جال اور مچھلی پکڑنے کے کانٹے پہلے سے پانی میں ڈال دیتے تھے۔ چنانچہ وہ ان میں پھنس کر رہ جاتی تھیں جب سنیچر کا دن گزر جاتا تھا تو اُن کو پکڑ لیتے تھے۔ اور اپنے نفسوں کو سمجھا لیتے تھے کہ ہم نے سنیچر کے دن ایک مچھلی بھی نہیں پکڑی وہ تو خود سے جالوں میں اور کانٹوں میں آ گئیں اور یہ جال اور کانٹے ہم نے جمعہ کے دن ڈالے تھے انکو منع کرنیوالوں نے منع کیا تو نہ مانے لہٰذا اللہ پاک کی طرف سے ان پر یہ عذاب آیا کہ ان کو بندر بنا دیا گیا۔ جب یہ لوگ بندر بنا دیئے گئے تو بندروں کی طرح آوازیں نکالتے تھے اُنکی دمیں بھی پیدا ہو گئیں جو لوگ انکو منع کرتے تھے وہ ان کے پاس گئے اور کہا کہ کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا تو وہ سر ہلا کر جواب دیتے تھے۔

سورۂ مائدہ میں فرمایا۔ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ اس میں بتایا ہے کہ بندر اور خنزیر بنا دیئے گئے یہ خنزیر بنا دینے کا واقعہ اس موقع سے متعلق ہے جبکہ سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنے کے جرم میں بندر بنا دیئے گئے تھے یا اور کسی موقع سے متعلق ہے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں ملی۔ البتہ تفسیر ابن کثیر میں آیت بالا وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ کے ذیل میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ سنیچر کے دن زیادتی کرنیوالے بندر بنا دیئے گئے اور خنزیر بھی اُن میں جو جوان تھے وہ بندر ہو گئے اور جو بوڑھے تھے وہ خنزیر بنا دیئے گئے۔

حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ جو قوم مسخ ہوئی ہے وہ مسخ شدہ حالت میں تین دن سے زیادہ نہیں رہی ان تین دنوں میں انہوں نے کچھ کھایا پیا نہیں اور اُنکی نسل بھی نہیں چلی۔ یہ جو بندروں اور خنزیروں کی نسلیں ہیں مسخ شدہ قوموں کی نسلیں نہیں ہیں بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہے۔ الجامع الصغیر میں بروایت حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے۔ **مَا مسخ الله تعالىٰ من شئ فكان له عقب ولا نسل رمزله السيوطي بالحسن قال الهيثمي فيه ليث بن سليم مدلس وبقية رجاله رجال الصحيح** (کمافی فیض القدیر)

اس واقعہ کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ اعراف میں بیان ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاصی کی وجہ سے کئی طرح سے عذاب آتا رہا ہے ان میں سے ایک طریقہ صورتیں مسخ کر کے ہلاک کرنے کا بھی تھا اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ اب تک مسخ کے عذاب سے محفوظ چلی آ رہی ہے لیکن قرب قیامت میں مسخ ہوگا۔ جیسا کہ سنن الترمذی کتاب الفتن میں حدیث **اذا اتخذ الفئى دولا** کے آخر میں تصریح ہے اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں بھی مسخ کیے جانے کا ذکر ہے۔ (مشکوٰۃ)

جتنے بھی عذاب آئے سب میں عبرت ہے اُن لوگوں کے لئے بھی جو عذاب کے وقت موجود تھے اور اُن کے لئے بھی

جو بعد میں آنے والے ہیں اور اُن عذابوں میں نصیحت بھی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے خاص کر یہ مسخ کا عذاب تو بہت ہی زیادہ عبرت ناک ہے ہلاک تو ہو ہی گئے لیکن ہلاکت سے پہلے تین دن جو بندر رہے اس میں سب کے لئے بہت بڑی عبرت اور نصیحت ہے اسی لئے فرمایا کہ ہم نے اس کو عبرت بنادیا اُن لوگوں کے لئے جو اُس وقت موجود تھے اور جو بعد میں آنیوالے ہیں اور نصیحت بنادیا ڈرنے والوں کے لئے فَجَعَلْنٰهَا کی ضمیر عقوبت کی طرف یا قری کی طرف راجع ہے جس سے اہل قری مراد ہیں لِمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا کی تفسیر کرتے ہوئے مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں اُن کو مسخ کرنے کی سزا دی گئی اُس زمانہ کے لوگوں کے لئے اور اُن کے بعد آنیوالوں کے لئے عبرت ہوجائے اور ایک معنی یہ لکھا ہے کہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا وہاں کی قریب کی بستیوں اور دور کی بستیوں کے لئے عبرت ہوجائے۔ حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہ دوسرا معنی منقول ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔ عن ابن عباس لما بین یدیها من القری وماخلفها من القری اس کے بعد حضرت ابوالعالیہ کا قول نقل کیا ہے۔ وما خلفها لمابقی ما بعدهم من الناس من بنی اسرائیل ان یعملوا مثل عملهم یعنی ماخلفها سے وہ بنی اسرائیل مراد ہیں جو اس عبرت ناک واقعہ کے بعد باقی رہے یہ واقعہ ان کے لئے عبرت ہے تاکہ اپنے اسلاف جیسا عمل نہ کریں۔

حضرت حسن اور قتادہ نے موعظةً للمتقین کے بارے میں فرمایا کہ اُن لوگوں کے بعد میں جو آنیوالے ہیں ان کے لئے نصیحت ہے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈریں گے اور خوف کھائیں گے' اور عطیہ عوفی نے کہا ہے کہ المتقین سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمت مراد ہے۔ مفسر ابن کثیر نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اُن چیزوں کا ارتکاب نہ کرو جن کا یہودیوں نے ارتکاب کیا حیلوں کے ذریعہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال مت کرلو۔ (وہذا اسناد جید)

یہود نے ایک اور بھی حیلہ کیا اور وہ یہ کہ ان پر چربی حرام کردی گئی تھی۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اس کو اُنہوں نے اچھی صورت میں بنا کر بیچ دیا۔ (بخاری ومسلم کمافی مشکوٰۃ)

شراح حدیث نے اچھی صورت میں بنانے کا مطلب یہ لکھا ہے کہ چربی کو انہوں نے پگھلا دیا اور اس میں کچھ ملا کر دوسرا کوئی نام رکھ کر اسکو بیچ دیا۔ اور اس کی قیمت کھا گئے۔ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ میں اس طرح کے حیلے رواج پا گئے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لوگ شراب کو حلال کرلیں گے عرض کیا یہ کیسے ہوگا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسکی حرمت واضح طور پر نازل فرمائی ہے آپ نے فرمایا کہ یسمونها بغیر اسمها فیستحلونها یعنی وہ شراب کا دوسرا نام رکھ لیں گے۔ اور اس طرح اس کو حلال کرلیں گے۔ (رواہ الدارمی مشکوٰۃ ص ۴۶۱)

چنانچہ آجکل ایسی باتیں سننے میں آرہی ہیں' شراب پیتے ہیں' نام دوسرا رکھ لیا ہے۔ سود لیتے ہیں اس کا نام نفع رکھ لیا ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لئے تدبیریں کرلیتے ہیں۔ تصویریں اور مورتیاں حلال کرنے کے لئے حیلے تراشتے ہیں۔ ڈاڑھی مونڈنے کے جواز کے لئے حجتیں نکالتے ہیں۔ ایسے حیلوں اور بہانوں کی تفصیلات بہت ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے بیشک اللہ تم کو حکم فرماتا ہے کہ تم ایک بیل ذبح کرو وہ کہنے لگے کیا تو ہمارا مذاق بناتا ہے؟

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ

موسیٰ نے کہا کہ میں اس بات سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں وہ کہنے لگے کہ تو اپنے رب سے دعا کر ہمارے لئے بیان کردے کہ وہ بیل کیسا ہو

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا

موسیٰ نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایسا بیل ہو جو بوڑھا نہ ہو اور بالکل جوان بھی نہ ہو ان دونوں کے درمیان ہو سو تم اس پر عمل کرلو جس کا

تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ

تم کو حکم دیا جارہا ہے وہ کہنے لگے کہ تو اپنے رب سے دعا کر ہمارے لئے بیان فرمادے کہ اس بیل کا رنگ کیسا ہو موسیٰ نے کہا کہ بیشک وہ فرماتا ہے کہ وہ تیز رنگ کا

صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ

پیلا بیل ہو جو دیکھنے والوں کو خوش کرتا ہو وہ کہنے لگے کہ تو اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کر ہمارے لئے بیان فرمادے کہ اس بیل کی پوری کیا حقیقت ہے؟

اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا

بیشک بیلوں کے بارے میں ہم کو اشتباہ ہو رہا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پالیں گے موسیٰ نے کہا بیشک وہ فرماتا ہے کہ وہ

بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ

ایسا بیل ہو جو صحیح سالم نکما نہ ہو گیا ہو۔ وہ نہ زمین کو پھاڑتا ہو اور نہ کھیتی کو سیراب کرتا ہو اس میں ذرا کوئی دھبہ نہ ہو وہ کہنے لگے کہ اب تم نے ٹھیک طرح بیان کیا ہے۔

بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

لہٰذا اُنہوں نے وہ بیل ذبح کردیا اور حال یہ ہے کہ وہ ایسا کرنیوالے نہ تھے

ذبح بقرہ کا قصہ یہود کی کج بحثی

تفسیر: ان آیات میں ذبح بقرہ کا واقعہ ذکر فرمایا ہے۔ بقرہ عربی زبان میں گائے اور بیل دونوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے بعض حضرات نے اس کا ترجمہ بیل کیا ہے اور اُن کا فرمانا ہے کہ قصہ کے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ وہ بقرہ ایسا ہو جو ہل جوتنے میں استعمال نہ کیا ہو اور کھیتی کی آبپاشی میں اسکو نہ لگایا گیا ہو۔ یہ کام چونکہ بیل ہی سے ہوتا ہے اس لئے بقرہ سے بیل مراد ہے دوسرے حضرات نے اس کا ترجمہ گائے سے کیا ہے۔ چونکہ بقرہ اسم جنس ہے اس لئے گائے کا ترجمہ کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ وزن دار ہے۔ کیونکہ قرآن کے الفاظ سے اسکی تائید ہوتی ہے۔

یہ واقعہ کیوں پیش آیا؟ اس کے بارے میں قرآن مجید کی اگلی آیات سے معلوم ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص مقتول ہو گیا تھا اور قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا لہٰذا قاتل کا پتہ چلانے کے لئے اللہ جل شانہٗ کی طرف سے یہ ارشاد ہوا کہ ایک بیل

ذبح کرو اور اس بیل کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم میں مارو چنانچہ بڑی حجتوں کے بعد بنی اسرائیل نے ایک بیل ذبح کیا اور ذبیح شدہ بیل کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم میں مار دیا۔ چنانچہ وہ مقتول زندہ ہوگیا۔ (اور اپنا قاتل بتا کر اُسی وقت دوبارہ مر گیا)

واقعہ کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں کئی طرح سے لکھی ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل میں ایک بوڑھا آدمی تھا۔ جس کی کوئی اولاد نہ تھی اور مالدار بہت تھا اور اس کے بھائی کے لڑکے تنگدست تھے۔ اور اُن کو چچا کی میراث بھی پہنچتی تھی۔ یہ لوگ چچا کی موت کا انتظار کرتے تھے لیکن اسکی زندگی لمبی ہوتی چلی گئی۔ لہٰذا شیطان نے ان کو یہ سمجھایا کہ تم اپنے چچا کو قتل کردو تم اس کے مال کے وارث بھی ہو جاؤ گے اور اسکی دیت (خون بہا) بھی حاصل کرلو گے جس جگہ کا یہ واقعہ ہے وہاں دو بستیاں تھیں۔ جب کوئی مقتول دونوں بستیوں کے درمیان پڑا ہوا ملتا تھا تو جس بستی سے قریب تر ہوتا اس پر دیت ڈال دی جاتی تھی شیطان نے اُن لوگوں کو سمجھایا کہ تم قتل کر کے دوسری بستی کے قریب ڈال دینا۔ جس میں تمہاری سکونت نہیں ہے۔ چنانچہ اُن لوگوں نے چچا کو رات میں قتل کر کے دوسری بستی کے قریب ڈال دیا پھر جب صبح ہوئی تو یہی قاتلین دعویدار ہو گئے اور اس بستی والوں پر دعویٰ کر دیا جس کے قریب نعش کو ڈال دیا تھا۔ اور اُن سے کہا کہ تمہاری بستی کے دروازے پر ہمارا چچا مقتول ملا ہے۔ ہم تم سے اسکی دیت ضرور لیکر چھوڑیں گے اس بستی کے لوگ قسم کھانے لگے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے نہیں قتل کیا اور نہ ہی ہمیں اس کے قاتل کا علم ہے۔ ہم نے شام سے لیکر صبح تک اپنی بستی کا دروازہ ہی نہیں کھولا' لہٰذا ہمارے ذمہ اس کے قتل کا الزام لگا دینا صحیح نہیں اور کوئی دیت لازم نہیں۔ مفسر سدّی نے واقعہ اس طرح بیان کیا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص بہت مالدار تھا۔ اس کی ایک لڑکی تھی اور اُس کے بھائی کا بیٹا تھا جو غریب تھا۔ اس نے اپنے چچا کو پیغام دیا کہ اپنی لڑکی سے میرا نکاح کردو' چچا نے انکار کیا تو وہ غصہ ہو گیا اور اس نے چچا کے قتل کا خیال دل میں جما لیا اور اپنے دل میں کہا کہ چچا کو قتل بھی کرونگا اور اس کا مال بھی لونگا اور اسکی بیٹی سے نکاح بھی کروں گا اور اسکی دیت بھی کھا جاؤں گا۔ لہٰذا وہ چچا کے پاس آیا اور رات کو اپنے چچا کو ایک کاروباری ضرورت بتا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اور کسی جگہ جا کر قتل کر دیا۔ جب صبح ہوئی تو اس انداز میں باتیں کر رہا ہے کہ خدا جانے میرے چچا کہاں گئے؟ جس جگہ قتل کیا تھا وہاں پہنچا دیکھا کہ وہاں کے لوگ اُس کی نعش کے قریب جمع ہو رہے ہیں۔ ان لوگوں کو اس نے پکڑ لیا اور کہا کہ تم نے میرے چچا کا قتل کیا ہے لہٰذا اسکی دیت ادا کرو۔ وہ دیت کا مطالبہ کر رہا تھا اور رو رہا تھا اور سر پر مٹی ڈال رہا تھا اور رو رہا تھا اور ہائے ہائے چچا کی آوازیں لگا رہا تھا۔

واقعہ کی صورت جو بھی ہو قاتل کا پتہ چلانے کے لئے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف رجوع کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قاتل کا پتہ چلانے کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو اور اس کا گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر مار دو۔ بات سننے کے ساتھ ہی اُن کو چاہئے تھا کہ کوئی بھی ایک بیل ذبح کر کے مقتول پر مار دیتے۔ لیکن اوّل تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو مذاق اور مخول بتایا' کہنے لگے کہ کہاں بیل کا گوشت کا ٹکڑا مقتول کے جسم کو مارنا اور کہاں مقتول کا زندہ ہو کر نام بتانا یہ بے جوڑ بات ہے آپ تو ہم لوگوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں ان جاہلوں نے یہ نہ سوچا کہ ہمیں اللہ کا نبی ایک بات بتا رہا ہے جو اللہ کی طرف سے ہے اس میں مذاق اور مخول کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ اپنی جہالت اور حماقت سے ایسی بات کہہ بیٹھے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت ناگوار ہوا اور انہوں نے

فرمایا کہ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ. (کہ میں اس بات سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں) ایک ادنیٰ مسلمان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اللہ کے حکم کو مخول اور ٹھٹھا مذاق بنائے۔ یہ تو جہالت کی بات ہے پھر اللہ کا نبی کیسے اللہ کی طرف کسی ایسے حکم کی طرف نسبت کر سکتا ہے جو مذاق اور مخول ہو۔ پھر جب بیل ذبح کرنے پر راضی ہو گئے تو طرح طرح کے سوالات کرتے گئے اور اُن سوالات کے ذریعہ بندشوں اور قیدوں میں بندھتے چلے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر وہ کوئی بھی بقرہ ذبح کر دیتے تو ان کا کام چل جاتا لیکن اُنہوں نے سختی کا راستہ اختیار کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بے تکے سوالات کرتے رہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر حکم میں سختی فرما دی۔ وہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کریں جو ہمیں یہ بتا دے کہ وہ بیل کیسا ہے یعنی اس کی عمر کتنی ہو۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے کہ وہ بوڑھا جانور بھی نہ ہو اور بالکل کم عمر بچھڑا بھی نہ ہو۔ ان دونوں کا درمیانی عمر کا ہو اور فرمایا کہ جو تم کو حکم ہو رہا ہے اس کو کر گزرو۔ لیکن ان لوگوں کو اُلٹی چڑھی ہوئی تھی' پھر سوال اُٹھایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ اپنے رب سے ہمارے لئے یہ دعا کر دیجئے کہ وہ ہمیں اس کا رنگ بتا دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ایسا بیل ہو جس کا رنگ پیلا خالص گہرا تیز ہو جس سے دیکھنے والوں کی طبیعت خوش ہوتی ہو۔ اُن لوگوں نے پھر سوال اُٹھایا کہ ہماری سمجھ میں تو پوری طرح بات نہیں آئی اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں خوب واضح طور پر بتا دے کہ وہ بیل کیسا ہو بیل بہت سارے ہیں طرح طرح کے ہیں ہمیں اشکال ہو رہا ہے کہ کونسا بیل ذبح کریں اب کی مرتبہ بیان ہو جانے پر انشاء اللہ ہم ضرور راہ پا جائیں گے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ انشاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی انکو پوری طرح اُس بیل کا حال بیان نہ کیا جاتا جس کے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا۔ (در منثور میں اس کو حدیث مرفوع بتایا ہے) لیکن مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ بظاہر حضرت ابی ہریرہؓ کا کلام ہے۔

بہر حال تیسری بار جب انہوں نے سوال کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ وہ ایسا بیل نہ ہو جسے کام کاج میں استعمال کر کے نکما کر دیا گیا ہو یعنی اس نے نہ کھیتیوں میں ہل چلایا ہو اور نہ آبپاشی کے لئے اُسے کنویں سے پانی نکالنے میں استعمال کیا گیا ہو۔ اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اس کا جو رنگ بتایا گیا ہے پورا بیل اُسی رنگ کا ہو۔ اُس میں کسی قسم کے دوسرے رنگ کا نشان داغ دھبہ نہ ہو۔ اور وہ جانور جسمانی طور پر صحیح سالم ہو اُس کے اعضاء میں کمی اور خرابی نہ ہو مثلاً لنگڑا۔ کانا۔ اندھا نہ ہو جب بیل کے حالات بیان ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہاں اب آپ نے پوری طرح ٹھیک اور واضح بات کی ہے۔ لہٰذا اب اُس قسم کا جانور تلاش کرنے لگے جیسا بیان کیا گیا تھا اور جو اُن کے سوالات کے جوابات کے بعد اپنی خاص صفات کے اعتبار سے متعین ہو چکا تھا۔ تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے (جو اسرائیلی روایت سے منقول ہے) کہ وہ جانور ان کو بہت زیادہ مہنگا ملا۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ لوگ انہیں مخصوص صفات کا بیل تلاش کر رہے تھے اسی اثنا میں ایک شخص کے پاس سے گزرے جس کے پاس مذکورہ صفات کا بیل تھا اس سے کہا یہ ہمیں بیچ دے۔ یہ لوگ قیمت لگاتے رہے اور وہ قیمت بڑھاتا رہا حتیٰ کہ اس بیل کے وزن کا دس گنا سونا دینے پر معاملہ ہوا۔ چنانچہ وہ سونا اُس نے قیمت کے طور پر لے لیا یہ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے۔ در منثور میں حضرت ابن عباسؓ سے یوں نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے اس بیل کی کھال دیناروں سے بھر کر دینے پر سودا کیا۔ اور اس بیل کے مالک نے اسی قدر دینار لیکر وہ بیل اُن کے حوالے کیا۔ بہر حال خدا خدا کر کے وہ لوگ ذبح کرنے پر

آمادہ ہوئے اور اُس بیل کو اُنہوں نے ذبح کر دیا حالانکہ ان کا ڈھنگ ایسا تھا کہ وہ یہ کام کرنے والے نہیں تھے۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا

اور جب تم نے ایک جان کو قتل کر دیا پھر اس کے بارے میں ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ اسکو ظاہر فرمائے جس کو تم چھپا رہے ہو' پس ہم نے حکم دیا

اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

کہ اس کا ایک حصہ اس میں مارو' ایسے ہی اللہ تعالیٰ زندہ فرماتا ہے مردوں کو' اور دکھاتا ہے تم کو اپنی نشانیاں تاکہ تم عقل سے کام لو

مردہ زندہ ہونے کا ایک واقعہ' اور قصہ سابقہ کا تکملہ

تفسیر: ان آیات میں سابقہ قصہ کا تتمہ بیان فرمایا ہے اور یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ذبح بقرہ کا حکم کیوں ہوا تھا۔ ارشاد فرمایا کہ تم نے ایک خون کر دیا تھا اور اس خون کو ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے' قاتل اقراری نہیں تھا اور ہمیں منظور تھا کہ اس کے قاتل کا لوگوں کو علم ہو جائے لہٰذا ہم نے یہ طریقہ بتایا کہ یہ جو بیل ذبح کیا ہے اس کا کوئی ٹکڑا مقتول کی لاش سے لگا دو۔ تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اُن لوگوں نے اُس بیل کا ایک ٹکڑا لیکر مقتول کے مونڈھوں کے درمیان لگا دیا چنانچہ وہ زندہ ہو گیا اس سے پوچھا کہ تجھے کس نے قتل کیا ہے تو اُس نے کہا کہ مجھے میرے بھائی کے بیٹے نے قتل کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میرا مال لے لے اور میری بیٹی سے نکاح کرلے۔ یہ بات بیان کر کے وہ شخص دوبارہ مر گیا۔ اور قصاص میں قاتل کو قتل کر دیا گیا۔

یہاں پر یہ سوال اُٹھانا بے جا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یوں بھی قدرت ہے کہ جس مردہ کو چاہے زندہ فرمائے پھر اس کے لئے بیل کا ذبح ہونا اور مقتول کو اس کے گوشت کا ٹکڑا مارا جانا کیوں مشروط کیا گیا؟ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو سمجھنا مخلوق کے بس کا کام نہیں۔ اور نہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تکوین اور تشریع میں جو حکمتیں ہیں اُن میں سے کوئی سمجھ میں آجاتی ہے کبھی سمجھ میں نہیں آتی۔ مومن بندہ کا کام ماننا اور عمل کرنا ہے۔ ذبح بقرہ سے متعلق ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل کی حجت بازی اور کج روی کا حال عام لوگوں کو اور انکے بعد میں آنیوالی نسلوں کو معلوم ہو جائے تاکہ وہ ایسا نہ کریں۔ اس کے بعد اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا: كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (ایسے ہی اللہ تعالیٰ زندہ فرماتا ہے مردوں کو اور دکھاتا ہے تم کو اپنی نشانیاں تاکہ تم عقل سے کام لو) موت کے بعد زندہ کرنا اور حساب و کتاب کے لئے قبروں سے اٹھایا جانا قرآن و حدیث میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ اس بات کے تسلیم کرنے سے بہت سے لوگوں کو انکار رہا ہے کہ موت کے بعد زندہ ہوں گے اُن کے اشکالات قرآن مجید میں دور کئے گئے ہیں اور بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو زندہ کر کے دکھایا ہے اُن مواقع میں سے ایک موقع یہ بھی تھا کہ مقتول نے بحکم خدا زندہ ہو کر قاتل کا نام بتا دیا اور یہ واقعہ حاضرین کے سامنے ہوا' سب نے دیکھ لیا کہ مردہ زندہ ہوا۔ اور تواتر کے ساتھ یہ قصہ لوگوں تک پہنچ گیا۔ تو اب موت کے بعد زندہ ہونے کا انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ عقلاً بھی یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مردوں کے زندہ کرنے پر قدرت ہے اور بعض مواقع میں حاضرین نے اپنی آنکھوں سے مردوں کو زندہ ہوتا دیکھا ہے۔ عقل کو کام میں لائیں تو انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہوئے، سو وہ ایسے ہو گئے جیسے پتھر ہوں یا اُن سے بھی زیادہ سخت، اور بلاشبہ بعض پتھر ایسے ہیں

لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ

جن سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بلاشبہ اُن میں بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں پھر اُن سے پانی نکلتا ہے اور بلاشبہ اُن میں بعض ایسے ہیں

مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے بے خبر نہیں ہیں جن کو تم کرتے ہو

یہودیوں کی قلبی قساوت کا تذکرہ

تفسیر: اس آیت کریمہ میں یہودیوں کے قلوب کی قساوت اور سختی بیان فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ تمہارے دل پتھروں کی طرح سخت ہو گئے بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ اُن میں سختی آ گئی۔ دلائل قدرت بھی دیکھتے ہیں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل نبوت بھی دیکھتے ہیں ان کے دلوں میں ذرا خدا کا خوف نہیں ہے اور حق قبول کرنے کے لئے ذرا بھی آمادہ نہیں۔ پتھروں میں تو یہ بات ہے کہ اُن میں سے بعض ایسے ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور بعض پھٹ پڑتے ہیں تو اُن میں پانی نکل آتا ہے اور بعض اُن میں ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔

پہلے ان کے دلوں کو سختی میں پتھروں سے تشبیہ دی جو اس اعتبار سے لوہے سے بھی سخت ہیں کہ لوہے کو بھٹی میں ڈالا جائے تو پگھل جاتا ہے لیکن کیسی ہی آگ ہو اس سے پتھر پگھلتا نہیں پھر فرمایا کہ تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں کیونکہ بعض پتھروں سے تو نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور جب پھٹتے ہیں تو ان میں سے پانی نکل آتا ہے اگر تمہارے دل نرم ہوتے تو نافرمانیوں کی وجہ سے خوب زیادہ روتے (یہ مثال ہے نہریں جاری ہونے کی) اور کچھ بھی نہیں تو تھوڑا بہت ہی روتے (یہ مثال ہے فیخرج منه الماء کی) اور آنکھوں سے آنسو نہ نکلتے تو کم سے کم دل ہی روتا (یہ مثال ہے یهبط من خشية الله کی) (من ابن کثیر)

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں جو کچھ کرتے ہو وہ سب کچھ جانتا ہے اس سب کی سزا پاؤ گے دنیا کی کچھ دن کی زندگی کے دھوکے میں نہ آؤ۔

اہل کتاب کے دلوں کی سختی کا قرآن مجید میں اور جگہ بھی تذکرہ فرمایا ہے۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا: فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً (پھر ان کے میثاق توڑنے کے باعث ہم نے ان کو ملعون قرار دے دیا اور ہم نے اُن کے دلوں کو سخت کر دیا)

اُمت محمدیہ کو حکم کہ قاسی القلب نہ بنیں

اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کو حکم ہے کہ تم اہل کتاب کی طرح سخت دل مت بن جاؤ۔ سورۂ حدید میں ارشاد ہے

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا

اُنکے دل اللہ کے لئے اور جو دین حق نازل ہوا ہے اُس کے لئے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے قبل کتاب ملی تھی پھر اُن پر ایک زمانہ دراز گزر گیا پھر اُن کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے آدمی اُن میں سے فاسق ہیں)

اپنے گناہوں کو یاد کرنا اور اللہ سے مغفرت چاہنا اور اللہ کے خوف سے رونا' یہ کسی کو حاصل ہو جائے تو بہت بڑی نعمت ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کے ڈر سے رویا وہ دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس ہو جائے (جس طرح دودھ تھنوں میں واپس نہیں جاتا اسی طرح یہ شخص دوزخ میں داخل نہ ہوگا) (الترغیب والترہیب) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ نجات کس چیز میں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھ تجھے نقصان نہ پہنچادے اور تیرے گھر میں تیری گنجائش رہے (یعنی بلا ضرورت گھر سے باہر نہ جا) اور اپنے گناہوں پر رویا کر۔ (أخرجہ الترمذی فی ابواب الزہد)

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ چار چیزیں بدبختی کی ہیں (۱) آنکھوں کا جامد ہونا (یعنی ان سے آنسو نہ نکلنا) اور (۲) دل کا سخت ہونا (۳) لمبی لمبی آرزوئیں رکھنا (۴) اور دنیا کی حرص رکھنا۔ (الترغیب عن البزار)

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ اے لوگو! روؤ اور رونا نہ آئے تو بتکلف رونے کی کوشش کرو کیونکہ دوزخ والے دوزخ میں اتنا روئیں گے کہ ان کے آنسوں ان کے چہروں پر اس طرح جاری ہوں گے جیسے چھوٹی چھوٹی نہروں میں پانی جاری ہوتا ہے روتے روتے آنسو ختم ہو جائیں گے تو خون بہنے لگیں گے جس سے آنکھوں میں زخم ہو جائیں گے اور اس قدر کثرت سے خون اور آنسو جمع ہو جائیں گے کہ اگر ان میں کشتیاں چلائی جائیں تو جاری ہو جائیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح عن شرح السنۃ) اگر کوئی شخص قبر، دوزخ اور حشر کے حالات کا مراقبہ کیا کرے تو آسانی سے سخت دلی دور ہو سکتی ہے۔ اور رونے کی شان پیدا ہو سکتی ہے۔ ایک آدمی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میرا دل سخت ہے آپ نے فرمایا کہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کر اور مسکین کو کھانا کھلایا کر۔ (مشکوٰۃ)

کثرت ذکر سے دل نرم ہوتا ہے اور زیادہ بولنے سے سختی آتی ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے علاوہ زیادہ بات نہ کیا کرو کیونکہ ذکر اللہ کے علاوہ بات کرنا دل کی سختی کا سبب ہے اور بلاشبہ لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ سے دور وہ شخص ہے جس کا دل سخت ہو۔ (رواہ الترمذی)

غیر ذی روح میں حیات ہے سب چیزیں اللہ کی تسبیح میں مشغول رہتی ہیں

اس کی آیت میں پتھروں سے پانی نکلنا اور اُن سے نہریں جاری ہونا مذکور ہیں اور یہ ایسی بات ہے جو نظروں کے سامنے ہے دنیا میں چشمے ہیں جھرنے ہیں پہاڑوں سے پانی نکل رہے ہیں عموماً لوگ اسکو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ بعض پتھر اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اس بارے میں کسی کوتاہ عقل کو شبہ ہو سکتا ہے کہ اُن میں عقل و ادراک نہیں ہے پھر وہ کیسے ڈرتے ہیں اور ڈر کر گر پڑتے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ پتھروں میں اور دوسری جمادات میں ہمارے خیال میں ادراک اور شعور نہیں ہے کیونکہ وہ ہم سے بات نہیں کرتے اور ہمیں وہ احوال معلوم نہیں جو اُن پر گزرتے ہیں۔ اور ان کا اپنے خالق سے مخلوق اور مملوک اور عبادت گزار ہونے کا جو تعلق ہے انسان اس سے واقف نہیں ہے۔ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں میں ادراک ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (تمام ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں اُسکی پاکی بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اسکی پاکی بیان نہ کرتی ہو۔ لیکن تم لوگ اُنکے پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں بلاشبہ وہ حلیم ہے غفور ہے) اور سورۂ نور میں فرمایا اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ط كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ٥ (کیا تجھ کو معلوم نہیں اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور پرندے جو پر پھیلائے ہوئے ہیں سب کو اپنی اپنی دُعا اور اپنی اپنی تسبیح معلوم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے)

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ احد ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اُس سے محبت کرتے ہیں۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ مکہ مکرمہ میں ایک پتھر ہے میں اُسے پہچانتا ہوں جن دنوں میں میری بعثت ہوئی وہ مجھے سلام کیا کرتا تھا۔ (صحیح مسلم)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں مکہ مکرمہ میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھا ہم ایک دن بعض اطراف مکہ کی طرف نکلے جو بھی درخت یا پہاڑ آنحضرت ﷺ کے سامنے آتا تھا وہ السلام علیکم یا رسول اللہ کہتا تھا۔ (رواہ الترمذی فی ابواب المناقب وقال حسن غریب)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے سات یا نو کنکریاں لیں ان کنکریوں نے آپ کے ہاتھ میں تسبیح پڑھی یہاں تک کہ میں نے اُن کی ایسی آواز سنی جیسی شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے پھر آپ ﷺ نے اُن کو رکھ دیا تو ان کی گویائی ختم ہوگئی۔ پھر آپ نے ان کنکریوں کو حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں رکھ دیا تو ان کے ہاتھ میں بھی اُن کنکریوں نے تسبیح پڑھی پھر حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں رکھ دیا تو اُن کے ہاتھ میں بھی اُن کنکریوں نے تسبیح پڑھی پھر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ میں رکھ دیا تو اُن کے ہاتھ میں بھی اُن کنکریوں نے تسبیح پڑھی اور ہر مرتبہ میں نے شہد کی مکھیوں کی جیسی بھنبھناہٹ سُنی۔ (جمع الفوائد فی ذکر کلام الحیوانات والجمادات)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا کہ جب جنات بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر قرآن سننے لگے تو آنحضرت ﷺ کو کس نے بتایا کہ جنات حاضر ہیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ وہاں جو ایک درخت تھا اس نے آپ کو بتایا۔ (للشیخین کما فی جمع الفوائد)

اسطوانہ حنانہ کا قصہ تو مشہور و معروف ہی ہے کہ جب مسجد نبوی کے لئے منبر تیار کر دیا گیا تو آنحضرت سرور عالم ﷺ اس پر خطبہ دینے کے لئے تشریف فرما ہوئے اس سے پہلے مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے یہ ستون کھجور کا تنا تھا۔ جب آپ منبر پر تشریف لے گئے تو کھجور کا یہ تنا چیخنے لگا جیسے بچہ چیختا ہے آپ منبر سے اُترے اور اس تنے کو چمٹا لیا اور اس سے ایسی آواز نکلنے لگی جیسے بچہ کی آواز ہوتی ہے جب اُسے چُپ کیا جاتا ہے۔ یہ تنا جو اللہ کا ذکر سنا کرتا تھا اس سے محروم ہو جانے کے باعث بچہ کی طرح چیخنے لگا۔ (رواہ البخاری ص ۵۰۶ ج ۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے لئے خیبر تشریف لے گئے تھے وہاں ایک یہودی عورت نے بکری کا ایک ہاتھ بھون کر پیش کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے تناول فرمایا اور آپ کے بعض صحابہ نے بھی اس میں سے کھایا پھر آپ نے فرمایا آپ لوگ ہاتھ اٹھالیں اور اُس یہودی عورت کو بلا کر فرمایا کہ تو نے بکری میں زہر ملایا ہے۔ وہ کہنے لگی آپ کو کس نے بتایا آپ نے فرمایا مجھے بکری کے اس ہاتھ نے بتایا جو میرے ہاتھ میں ہے۔ کہنے لگی ہاں واقعی میں نے زہر ملایا ہے۔ (جمع الفوائد عن ابی داؤد)

حصن حصین میں بحوالہ طبرانی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کا نام لیکر آواز دیتا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ اے فلاں کیا تجھ پر کوئی ایسا شخص گزرا ہے جس نے اللہ کا ذکر کیا ہو۔ وہ دوسرا پہاڑ جب جواب دیتا ہے کہ ہاں ایک شخص اللہ کا ذکر کرنے والا میرے اُوپر گزرا ہے تو وہ سوال کرنے والا پہاڑ خوش ہوتا ہے۔

اِن سب روایات اور واقعات سے معلوم ہوا کہ ہم جن چیزوں کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں ادراک اور احساس وشعور نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں ان کے اس احساس وادراک کا پتہ نہیں ورنہ اُن میں احساس اور شعور ہے۔ وہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہتی ہیں اور اللہ کا ذکر سُن کر خوش ہوتی ہیں۔ اور جب اللہ کی مشیت ہوتی ہے تو ان کو بولنے کی قوت دے دی جاتی ہے۔ قال العارف الرومی ؎

آب و باد و خاک و آتش بندہ اند   بامن و تو مُردہ با حق زندہ اند

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ

کیا تم لوگ یہ امید رکھتے ہو کہ یہودی تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور حال یہ ہے کہ اُن میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو اللہ کا کلام سنتے رہے ہیں۔ پھر

یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

اس میں تحریف کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد کہ وہ اس کو سمجھتے تھے اور جانتے تھے

یہودیوں میں عناد ہے ان سے ایمان قبول کرنے کی امید نہ رکھی جائے

تفسیر: اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کی یہ اُمید اور آرزو ختم فرمادی کہ یہودی ایمان لائیں گے۔ اور فرمایا کہ ان کے اسلاف کا یہ حال تھا کہ اللہ کا کلام سنتے تھے پھر جانتے بوجھتے اور سمجھتے ہوئے اس میں تحریف کر دیتے تھے اور یہ لوگ اُن پر اب تک کوئی نکیر نہیں کرتے اور طریقہ کار کو غلط نہیں بتاتے بلکہ اُن سے محبت اور تعلق میں بہت آگے ہیں۔ اور جس طرح اُن لوگوں نے اپنے اپنے زمانہ میں آیات بینات کا کھلا مشاہدہ کیا پھر بھی اپنے نبیوں کی تکذیب کی اور اللہ کے کلام کی تکذیب کی اسی طرح یہ لوگ بھی معجزات اور دلائل اور شواہد دیکھتے ہیں لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے۔

اس آیت شریفہ میں جو اللہ تعالیٰ کا کلام سُن کر اس میں تحریف کرنے کا ذکر ہے اس کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس میں اس واقعہ کا ذکر ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سن لیا تھا لیکن جب قوم کے پاس واپس آئے تو انہوں نے اس کے خلاف بیان دیا جو وہاں سن کر آئے تھے۔ دوسرے حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے توریت شریف کی تحریف کرنا مراد ہے۔ علماء یہود رشوت لیکر

حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیتے تھے اگر کوئی شخص رشوت لے آیا تو اس کے مطابق مسئلہ بتا دیا۔ اور جو شخص کچھ بھی نہ لایا اس کو صحیح اور حق بات بتا دی۔ یہ لوگ جو ایسی حرکت کرتے تھے جانتے بوجھتے ہوئے کرتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہم گناہ کر رہے ہیں۔ پھر بھی اسکو کرتے چلے جاتے تھے۔ اس تحریف میں یہ بات بھی تھی کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی صفات اور علامات جو توریت شریف میں بیان کی گئی تھیں' اُن کو بدل دیا۔ اس میں وہ لوگ بھی مبتلا تھے جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تھے جو لوگ خود مبتلائے تحریف ہوں اور دوسروں کو ایمان لانے سے روک رہے ہوں وہ خود کیا ایمان لائیں گے؟

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا
اور جب ملاقات کرتے ہیں اُن لوگوں سے جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے کے پاس تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کیا تم ان کو وہ چیزیں بتاتے ہو جو
فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ
اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ یہ لوگ ان کے ذریعے اللہ کے پاس حجت میں تم کو مغلوب کر دیں۔ کیا تم سمجھ نہیں رکھتے ہو؟ کیا یہ لوگ نہیں جانتے
اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾
کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں

یہودیوں کی منافقت

تفسیر: جو عام منافقین کا طریقہ تھا کہ مسلمانوں کے سامنے کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور تنہائیوں میں اپنے سرغنوں سے کہتے تھے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ اسی طرح یہودی منافق بھی مسلمانوں کے سامنے یہ ظاہر کر دیتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے اور اسی ظاہر کرنے میں یہ بھی کہہ جاتے تھے کہ توراۃ شریف میں ایسا ایسا لکھا ہے اور اس میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی بشارت اور آپ کی علامت اور صفات موجود ہیں اور ان علامات اور صفات سے صاف ظاہر ہے کہ آپ واقعی اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب اہل مدینہ (اوس اور خزرج) نے یہود مدینہ سے مشورہ کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے ہماری ملاقات ہوئی ہے اور ہم لوگ اُن پر ایمان لائے ہیں اور وہ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لا رہے ہیں' ان کے بارے میں تم لوگوں کا کیا خیال ہے تو سادہ دل یہودیوں نے کہہ دیا کہ ہاں اُن پر ایمان لاؤ وہ نبی ہیں۔ پھر جب تنہائیوں میں ایک دوسرے سے ملتے تو آپس میں کہتے کہ تم لوگ عجیب ہو مسلمانوں کے سامنے حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا اقرار کرتے ہو اور اُنکو یہ بھی بتاتے ہو کہ ان کا ذکر اور نعت وصفت توراۃ شریف میں موجود ہے یہ تو تم اپنے اُوپر حجت قائم کر رہے ہو۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ پاک کے حضور میں تم پر حجت قائم کر دیں گے اور خود تم اپنے اقرار سے پکڑے جاؤ گے تم نے اُن سے تو کہا کہ واقعی نبی ہیں اور خود انکی نبوت کو نہ مانا تمہارا اقرار خود تم پر حجت ہوگا لہٰذا ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جو تمہارے خلاف حجت بنیں تم اتنی بھی سمجھ نہیں رکھتے خود اپنے اقرار کی چھری سے خود اپنے ذبح کا انتظام کر رہے ہو۔ (در منثور و معالم التنزیل)

یہ کیسی بیوقوفی کی بات ہے کہ مسلمانوں پر حق ظاہر کر کے خود اس کے خلاف کرو گے تو قیامت کے دن مسلمان تم پر حجت قائم کریں گے اور دلیل سے مغلوب کر دیں گے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ مواخذہ کرنیوالا تو اللہ تعالیٰ ہے وہ سب کچھ جانتا ہے

جو دلوں میں ہے اُسے اس کا بھی پتہ ہے اور جو کچھ ظاہر کر رہے ہیں وہ اس سے بھی باخبر ہے۔ اگر مسلمانوں سے حق کو چھپایا تو اللہ پاک کے حضور میں اس وجہ سے کفر کے عذاب سے کیونکر خلاصی ہوگی کہ ہم نے مسلمانوں کو صحیح بات نہ بتائی تھی جب شقاوت کسی کو گھیر لیتی ہے تو وہ جان بوجھ کر اُسی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾
اور اُن میں ایسے لوگ ہیں جو اَن پڑھ ہیں کتاب کا علم نہیں رکھتے۔ سوائے آرزوؤں کے اور وہ لوگ صرف گمانوں میں پڑے ہوئے ہیں

یہودیوں کی جھوٹی آرزوئیں

تفسیر: اس آیت میں یہودی جاہل اَن پڑھ عوام کا تذکرہ فرمایا ہے یہ لوگ نہ توریت شریف پڑھ سکتے ہیں نہ اور کسی طرح کا علم رکھتے تھے البتہ جھوٹی آرزوؤں میں اُلجھے ہوئے تھے یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ہمیں جنت میں ضرور جانا ہے اگر عذاب بھی ہوا تو تھوڑے سے دن دوزخ میں رہیں گے اور ہم انبیاء کرام علیہم السلام کی نسل سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقرب ہیں اسکی اولاد ہیں اور نبوت صرف ہمارے ہی اندر رہ سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور بہت سی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا تھے خیالات کی دنیا میں پڑے ہوئے تھے اور اپنی نجات اور اللہ کے ہاں محبوب ہونے کے خیالی پلاؤ پکا رکھے تھے۔ ان کے خیال میں نہ اللہ کے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کے جھٹلانے سے ان کے محبوب عند اللہ ہونے میں فرق آتا تھا اور نہ سود کھانے سے اُنکی دینداری کو بٹہ لگتا تھا نہ کسی طرح کے کسی بھی بُرے عمل سے ان کو آخرت کا فکر لاحق ہوتا تھا۔ اپنے بارے میں جو جھوٹی آرزوئیں لئے بیٹھے تھے اور جو خوش کن گمانوں کی دنیا بسائے ہوئے تھے اُسی میں مست تھے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ
سو بڑی خرابی ہے اُن لوگوں کے لئے جو کتاب کو لکھتے ہیں اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں کہ یہ
اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ
اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ خرید لیں تھوڑی سی قیمت، سو بڑی ہلاکت ہے اُن کے لئے بوجہ اس کے جو اُن کے ہاتھوں نے لکھا ہے اور بڑی ہلاکت ہے اُن کے لئے
مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿۷۹﴾
اُسکی وجہ سے جسے وہ کسب کرتے ہیں

علمائے یہود کا غلط مسائل بتانا اور رشوت لینا

تفسیر: اس آیت شریفہ میں یہودی علماء کی بدعملی اور دھاندلی اور حب دنیا کی وجہ سے ان کی بربادی کا تذکرہ فرمایا ہے عوام جب علماء کے پاس جاتے تھے اور اُن سے مسائل معلوم کرتے تھے اور ساتھ ہی رشوت بھی دیتے تھے تو وہ لوگ سائل کی رضا جوئی کے لئے اُسکی مرضی کے مطابق مسئلہ بتا دیتے تھے خود اپنے ہاتھ سے مسئلہ لکھ دیتے تھے اور عوام کو باور کراتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور توریت شریف میں یوں ہی نازل ہوا ہے جو شخص رشوت نہ لاتا اُس کے لئے مسئلہ میں

ادل بدل نہیں کرتے تھے۔ اُن کے علماء تحریف کتاب اللہ کے مجرم بھی تھے اور رشوت خوری کے گناہ میں بھی مبتلا تھے۔ اللہ جل شانہٗ نے اُن کا حال بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اُن کے لئے دونوں وجہ سے ہلاکت اور بربادی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف کرنے کی وجہ سے بھی اور اس وجہ سے بھی کہ وہ حرام مال کماتے ہیں اور باقی رہنے والی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں حقیر دنیا کی کچھ نقدی لینے پر راضی ہیں۔ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اپنے عوام کو بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور صفت جو توریت شریف میں موجود پاتے تھے اُسے واضح طور پر بتاتے تو اس میں ممکن تھا کہ ظاہری دنیا میں کمی ہو جاتی لیکن آخرت کے ثواب سے مالا مال ہو جاتے لیکن اُنہوں نے حقیر دنیا کو ترجیح دی۔ اور تھوڑے سے فانی کے مقابلہ میں آخرت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور مستحق عذاب ہوئے۔ ان کے عوام میں اگرچہ بے پڑھے لوگ بھی تھے لیکن اتنا تو ہر عقلمند سمجھتا ہے کہ جو شخص پیسہ لے کر ایک بات بتاتا ہے اور جو پیسہ نہ دے اسے دوسری بات بتاتا ہے ایسا شخص کیسے اہل حق ہو سکتا ہے ایسے شخص پر دین میں اعتماد کرنا سراسر حماقت ہے۔ جس میں سراسر ہلاکت ہے۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا

اور انہوں نے کہا کہ ہم کو ہرگز آگ نہ چھوئے گی مگر چند دن گنتی کے' آپ فرمائیے کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لے لیا ہے

فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُۥٓ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾

سو اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے خلاف نہ کرے گا یا اللہ کے ذمہ ایسی بات لگا رہے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے

یہود کی جھوٹی خوش گمانی کہ دوزخ میں صرف چند دن کیلئے جائینگے

تفسیر: اس آیت شریفہ میں یہودیوں کا ایک اور دعویٰ اور اسکی تردید مذکور ہے۔ یہودیوں کا یہ جھوٹا دعویٰ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ نہیں ہوگی۔ اور اپنے بارے میں سمجھتے تھے کہ ہم اُسی شریعت پر قائم ہیں اور قائم رہیں گے لہٰذا ہمیں عذاب کیوں ہونے لگا۔ اور عذاب ہوگا تو صرف چالیس دن عذاب ہوگا یعنی جتنے دن ہمارے آباؤ اجداد نے بچھڑے کی عبادت کی ہے اُتنے ہی دن عذاب میں گرفتار ہوں گے اس کے بعد دوزخ سے نکل جائیں گے اور حضرت ابن عباسؓ سے یوں منقول ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اور ہر ہزار سال کے بدلہ ہم کو ایک دن دوزخ بھگتنا ہوگا۔ اور گنے چنے سات دن ہوں گے جو زیادہ نہیں ہیں۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ ہم کچھ دن دوزخ میں رہیں گے پھر ہم تو دوزخ سے نکل آئیں گے اور ہماری جگہ مسلمان دوزخ میں چلے جائیں گے۔ غزوہ خیبر کے موقعہ پر جب ایک یہودی عورت نے زہر ملا کر بکری کا گوشت حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا تھا اس وقت آپ نے ان سے جو سوال و جواب کئے تھے ان میں یہ بھی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ دوزخی کون ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم دوزخ میں تھوڑا وقت گزاریں گے پھر آپ لوگ اس میں ہمارے بعد داخل ہو جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دور ہو جاؤ اللہ کی قسم ایسا کبھی نہ ہوگا کہ تم اس میں سے نکل جاؤ اور تمہارے بعد ہم اس میں چلے جائیں۔ مفسر ابن کثیر نے یہ روایات لکھی ہیں اور آخری بات جس میں خیبر کی گفتگو مذکور ہے اس کو بحوالہ مسند احمد و صحیح بخاری نقل کیا ہے۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث ص ۸۶۰ ج ۲ پر مذکور ہے۔

پہلی آیت میں یہودیوں کی آرزوؤں اور خوش گمانیوں کا جو ذکر تھا ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم دوزخ میں چند دن ہی جائیں گے۔ وہ یہ جانتے ہوئے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں آپ پر ایمان نہ لائے اور یہ جانتے ہوئے کہ کسی نبی کو نہ ماننا کفر ہے اور کفر کی سزا دائمی ہے طرح طرح کے جھوٹے دعوے کرتے تھے اور اُن کے دعوے اور آرزوئیں سب خود ساختہ تھے جن کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں تھی، بے سند باتیں کرتے تھے اور انہیں باتوں میں مست تھے۔ اسی لئے اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا۔ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (الآیۃ)

کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اُن سے فرمادیں کہ یہ جو کچھ تمہارا دعویٰ ہے کہ ہم صرف چند دن دوزخ میں رہیں گے اسکی تمہارے پاس کیا دلیل ہے کیا اللہ تعالیٰ سے تم نے کوئی عہد لیا ہے۔ جس کی بنیاد پر تم ایسی باتیں کررہے ہو؟ اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے عہد کے خلاف نہیں فرماتا لیکن تم سے اس کا کوئی عہد نہیں ہے خود اپنے پاس سے اللہ کی طرف ان باتوں کی نسبت کرتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں۔ اپنی طرف سے اپنے بارے میں کوئی شخص کوئی بھی خیال اور گمان کرکے بیٹھ جائے اور اُسی پر بھروسہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکی کوئی سند اور دلیل نہ ہو تو اس کا گمان اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کفر کی سزا بہر حال ملے گی خواہ کیسی خوش فہمی میں مبتلا ہو یہودیوں کی حماقت تو دیکھو کہ خود اپنے اقرار سے دوزخ میں جانے کو تیار ہیں (اگرچہ چند دن دوزخ میں رہنے کا اقرار ہے) لیکن حضرت خاتم النبیین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں جبکہ یہ جانتے ہیں کہ دوزخ میں ایک سیکنڈ کا عذاب بھی بہت بڑا ہوگا جس کی برداشت کسی کو نہیں ہوسکتی۔ دنیا کی اس آگ کی ایک چنگاری تھوڑی سی دیر کے لئے ہاتھ پر لینے کو کوئی بھی شخص تیار نہیں اور دوزخ میں جانے کو بڑی ہمت اور حوصلے کیساتھ تیار ہیں۔ جبکہ دوزخ کی آگ کی گرمی دنیا کی آگ سے اُنہتر درجے زیادہ گرم ہے۔ (کمافی روایۃ الصحیحین)

جس طرح یہود جھوٹی آرزوؤں اور خود تراشیدہ اوہام وخیالات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اسی طرح آج کل بہت سے فرقے ایسے ہیں جو اسلام کے دعویدار ہیں۔ لیکن کفریہ عقائد کے حامل ہیں مثلاً قرآن کی تحریف کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے (العیاذ باللہ) ہمارے امام کے اندر حلول کیا ہے اور بہت سے لوگ جھوٹے نبی کی اُمت بنے ہوئے ہیں اور ان سب کو اپنی نجات کی خوش گمانی ہے حالانکہ یہ لوگ قرآنی تصریحات کے مطابق دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ بہت سے پیر فقیر جو بالکل بے عمل بلکہ بدعمل ہیں وہ صرف اس بنیاد پر اپنی نجات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ کسی بزرگ کی اولاد میں ہیں اپنی خوش گمان اور جھوٹی آرزو سے کچھ نہیں ہوتا نجات کے لئے عقیدہ اور عمل صحیح ہونا ضروری ہے جو قرآن وحدیث کے مطابق ہو۔ بے سند آرزو اور بے سند خوش گمانی آخرت کی بربادی کا ذریعہ ہے۔ کسی کی نسل میں ہونے سے نجات نہ ہوگی۔ بنی اسرائیل بھی تو انبیاء کی اولاد ہیں پھر بھی دوزخی ہیں خوب سمجھ لیا جائے۔

دورِ حاضر کے کافروں کی خوش گمانی

جس طرح یہودی اپنے بارے میں خیالی دُنیا اور خوش گمانی میں مبتلا ہیں اسی طرح دورِ حاضر کے مذاہب والے جو یہودیوں کے علاوہ ہیں وہ بھی اپنے بارے میں خوش گمانیوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اُن کے خود ساختہ عقائد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس کوئی سند نہیں کہ وہ جس دین پر ہیں وہ ذریعہ نجات بنے گا۔ مشرکین اور بُت پرست اپنی

8

مکتی اور نجات کا عقیدہ لئے پھرتے ہیں اور الٹا موحدین مسلمین کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انکی نجات نہ ہوگی۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

ہاں جس نے گناہ کیا اور اس کے گناہ نے اس کو گھیر لیا تو ایسے لوگ دوزخ والے ہیں وہ

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے یہ لوگ جنت والے ہیں

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

اصحابُ الجنۃ کون ہیں؟ اور اصحابُ النار کون ہیں؟

تفسیر: ان دو آیتوں میں جنتی اور دوزخی ہونے کا ضابطہ بتایا ہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے طریقہ سے یہودیوں کے اس دعوے کی تردیدی بھی ہے جو اُوپر کی آیت میں مذکور تھا۔ پہلی آیت میں یوں فرمایا کہ تمہارے پاس اپنے دعوے کی دلیل نہیں اور اللہ کی طرف سے تمہارے پاس کوئی سند نہیں ہے۔ اور ان دو آیتوں میں جو ضابطہ جنت اور دوزخ کے داخلے کا ذکر فرمایا ہے اس میں یہ بتادیا کہ تم لوگ ضابطہ کے مطابق اُن لوگوں کے زمرہ میں آتے ہو جن کو ہمیشہ دائمی عذاب ہوگا۔

ارشاد فرمایا کہ تم یہ جو کہتے ہو کہ ہم دوزخ میں ہمیشہ نہ رہیں گے صرف چند دن عذاب ہوگا۔ تمہاری بات غلط ہے۔ تم ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہو۔ ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص برائی کرے اور اُسکی برائی ہر طرف سے اُس کو گھیر لے کہ وہ کفر اختیار کرے جو سب سے بڑی برائی ہے۔ تو وہ دوزخ والا ہے اس میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ تم لوگ خاتم النبیین ﷺ کی نبوت اور رسالت کے منکر ہونے کی وجہ سے کافر ہو لہٰذا ضابطہ کے مطابق ہمیشہ دوزخ میں رہو گے۔ اور اہل جنت وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے جنہوں نے اللہ کے سب نبیوں کو مانا خاتم النبیین ﷺ پر ایمان لائے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کو مانا اور اعمالِ صالحہ انجام دیئے۔ یہ حضرات ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۟ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے مضبوط عہد لیا کہ تم صرف اللہ کی عبادت کرو گے اور والدین کے ساتھ

وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

اور قرابت داروں اور یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو گے اور عام لوگوں سے اچھی بات کہنا اور نماز قائم کرنا

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور زکوٰۃ دینا' پھر تم نے روگردانی کی مگر تم میں سے تھوڑے سے لوگوں نے' اور تم اعراض کرنے والے ہو

بنی اسرائیل سے عہد و پیمان اور اُنکا انحراف

تفسیر: اس آیت شریفہ میں توریت شریف کے چند اُحکام مذکور ہیں بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے پختہ عہد لیا تھا کہ تم ان سب کاموں کو کرنا انہوں نے عہد کر لیا۔ لیکن ان میں سے تھوڑے سے آدمیوں کے علاوہ سب اس عہد سے پھر گئے اور عہد کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ اُن کے عہد سے پھر جانے کا ذکر فرمانے کے بعد یہ بھی فرمایا کہ **وانتم معرضون** کہ اے یہودیو! تمہاری عادت اور مزاج ہی یہ ہے کہ حق سے اور قول و قرار سے اور اطاعت سے اعراض کیا کرتے ہو۔ اور خاص طور سے زمانہ نزول قرآن کے یہودیوں کو مخاطب فرمایا کہ تم بھی اپنے آباؤ اجداد کے طریقے پر ہو اور قبول حق سے اعراض کئے ہوئے ہو۔ آیت شریفہ میں اول تو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے۔ اور پھر والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اچھا سلوک کرنے کا حکم فرمایا اور لوگوں سے اچھی باتیں کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا۔ ان چیزوں کا سابقہ اُمتوں کو بھی حکم تھا اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر نسخ وارد نہیں ہوا۔ اُمت محمدیہ بھی ان سب چیزوں کی مامور ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا کہ: (وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) (اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہل قرابت کے ساتھ بھی۔ اور یتیموں کے ساتھ بھی اور مسکینوں کے ساتھ بھی اور قریب والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور کے پڑوسی کے ساتھ بھی اور برابر میں ساتھ بیٹھنے والے کے ساتھ بھی اور اُن کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں)

نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم قرآن مجید میں جگہ جگہ مذکورہ ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں متقیوں کی صفات میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ پھر سورۂ بقرہ کے پانچویں رکوع میں اقامت الصلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم مذکورہ ہے اور اسی سورۂ بقرہ کے تیرھویں رکوع میں بھی ان دونوں کا حکم فرمایا ہے اور بھی جگہ جگہ نماز اور زکوٰۃ کی اہمیت اور تاکید قرآن مجید میں مذکور ہے۔ یہ جو فرمایا وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا اِس میں بہت عموم ہے اور یہ بہت سے احکام پر مشتمل ہے اوّل تو یہ فرمایا کہ لوگوں سے اچھی باتیں کہو اس عموم میں مومن کافر نیک و بد سب قسم کے انسان آ گئے۔ پھر اچھی بات میں سب کچھ آ گیا نیکیوں کی راہ بتانا برائی سے روکنا نصیحت میں نرمی اختیار کرنا گفتگو میں بڑوں کا ادب ملحوظ رکھنا اور مسئلہ صحیح بتانا اور سچ بات کہنا کسی کو دھوکہ نہ دینا۔ حقوق کی وصولیابی میں نرم کلمات استعمال کرنا اور اس طرح کے بہت سارے احکام پر یہ کلمہ مشتمل ہے۔ اس میں یہودیوں سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ حضرت خاتم النبیین ﷺ کی نعت اور صفت جو توریت میں مذکور ہے اُسے واضح طور پر ظاہر کریں۔ اور حق اور حقیقت کو نہ چھپائیں۔ مسلمانوں پر بھی لازم ہے کہ مذکورہ احکام کی پاسداری کریں۔ اور ان سے اعراض کر کے رُوگردانی نہ کریں اور وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ کا مصداق نہ بنیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ

اور جب ہم نے تم سے عہد کیا کہ تم آپس میں خونریزی نہ کرو گے اور ایک دوسرے کو اپنے گھروں سے نہ نکالو گے

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ

پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم اسکی گواہی بھی دیتے ہو پھر تم وہ لوگ ہو جو قتل کرتے ہو اپنی جانوں کو اور نکالتے ہو

فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى

اپنوں میں سے ایک جماعت کو ان کے گھروں سے اُن کے مقابلہ میں مدد کرتے ہو گناہ اور زیادتی کے ساتھ اور اگر وہ آ جائیں تمہارے پاس قیدی ہونے کی حالت میں

تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ

تو تم انکی جان کا بدلہ دیکر چھڑا لیتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا۔ کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے منکر ہوتے ہو۔

بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ

سو کیا جزا ہے اسکی جو تم میں سے ایسا کام کرے سوائے اس کے کہ دنیاوی زندگی میں رسوا ہو اور قیامت کے دن

الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا

سخت ترین عذاب میں پہنچا دیئے جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

جنہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے بدلہ مول لے لیا سو نہ ہلکا کیا جائے گا اُن سے عذاب اور نہ اُنکی مدد کی جائے گی

یہودیوں کی ایک خاص خلاف ورزی کا تذکرہ

تفسیر: ان دونوں آیتوں میں یہودیوں کے ایک اور عہد اور قول و قرار کا اور پھر اُن کی عہد شکنی کا تذکرہ فرمایا۔ زمانہ نزول قرآن کے وقت جو یہودی تھے ان کو اس قول و قرار اور اقرار کا بھی پتہ تھا جو یہودیوں سے لیا گیا تھا اور اُن سے جو عہد شکنی اور خلاف ورزی سرزد ہوتی رہی تھی وہ بھی اُن کے علم میں تھی ان سے اللہ تعالیٰ نے خطاب فرمایا اور ان کو عہد شکنی یاد دلائی۔ اور ان کی دنیا و آخرت کی سزا بھی بتائی اور ساتھ ہی ساتھ اس میں حضرت خاتم النبیین ﷺ کی نبوت اور رسالت پر بھی دلیل قائم ہوگئی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہمارے اس قول و قرار اور عہد اور اسکی خلاف ورزی کا علم آپ کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود آنحضرت ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے تھے۔

پہلے گزر چکا ہے کہ مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ آباد تھے اور دو قومیں یمن سے آ کر آباد ہو گئی تھیں ان میں سے ایک قبیلہ کا نام اَوس تھا اور دوسرے کا نام خزرج تھا' یہ دونوں قبیلے بُت پرست تھے اور یہودیوں کے دونوں قبیلے اپنے کو دین سماوی پر سمجھتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی پابندی کا دم بھرتے تھے۔ اس زمانے میں عرب کا کچھ ایسا مزاج تھا کہ لڑائی کے بغیر گزارہ ہی نہ ہوتا تھا۔ جب اَوس اور خزرج میں لڑائی ہوتی تھی تو بنو قریظہ اَوس کی مدد کرتے تھے اور بنو نضیر خزرج کے حمایتی بن جاتے تھے اس میں جہاں اوس اور خزرج کے افراد مارے جاتے اور گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوتے وہاں یہودیوں کے دونوں قبیلوں کے افراد بھی مارے جاتے تھے اور بہت سے افراد ترکِ وطن پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔

اور جب بنی نضیر اور بنی قریظہ کے کسی فرد کو دشمن قید کر لیتا تو اُس کے چھڑانے کے لئے ان کی دونوں جماعتیں پیسے خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جاتی تھیں جب اُن سے کوئی پوچھتا کہ تم اس کو کیوں چھڑا رہے ہو تمہاری حرکت سے تو وہ دشمن کے قبضے میں گیا ہے اور ترکِ وطن پر مجبور ہوا ہے۔ تو جواب دیتے تھے کہ ہم کو شریعت موسوی میں یہ حکم دیا گیا کہ جب کسی کو قیدی

دیکھو تو اُسے رہائی دلا دو۔ لہٰذا ہم اس حکم کی پابندی کرتے ہیں اس حکم پر عمل کرنے کو تو تیار تھے کہ قیدی کو رہائی دلا دیں۔ لیکن جس وجہ سے وہ گھر سے بے گھر ہوا اور دشمن کے چنگل میں پڑ کر قیدی ہوا اس کے اختیار کرنے یعنی اپنوں کے مقابلہ میں جنگ کرنے والوں کی مدد سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ اُن سے کہا جاتا تھا کہ تم یہ کیا کرتے ہو تم خود ہی اپنوں کے مقابلہ میں مددگار بنے اور اُس قتال کی وجہ سے تمہارا آدمی گرفتار ہو کر قیدی ہوا اب اس کے چھڑانے کو تیار ہو؟ اس کا جواب یہ دیتے تھے کہ چونکہ اُوس اور خزرج ہمارے حلیف ہیں اس لئے ان کی مدد کرنے پر مجبور ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے اس کو بیان فرمایا کہ: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (کیا تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے)

کیا توریت شریف میں قیدی کے چھڑانے ہی کا حکم ہے اور کیا آپس کا قتل قتال اور ایک دوسرے کو جلا وطن کرنا توریت شریف میں ممنوع نہیں ہے؟ یعنی قتل وقتال کی ممانعت پر تو عمل نہ کیا اور قیدی چھڑانے کے لئے پیسے خرچ کرنے کو تیار ہو گئے۔ حالانکہ اس کا قیدی ہونا قتل وقتال کی بنیاد پر ہے۔ نہ قتل وقتال کرتے نہ یہ قیدی ہو کر آتا۔ لہٰذا معاملہ شریعت موسوی کا نہ رہا بلکہ اپنی طبیعت کا رہا۔ جس حکم کو چاہا مانا اور جس حکم کو چاہا نہ مانا' جس حکم کو مانا اسے ایمان سے اور جس حکم کو نہ مانا اسے کفر سے تعبیر فرمایا اگر دل سے کسی حکم قطعی کا منکر ہو جائے تب تو کافر ہو ہی جاتا ہے اور اگر دل سے منکر نہ ہو لیکن عمل حکم کے خلاف ہو تو اس عمل کا کرنے والا گناہ کا مرتکب تو ہو ہی جاتا ہے جو منکروں اور کافروں کا طریقہ ہے۔

یہودیوں کی مذکورہ بالا بے عملی کا ذکر کر کے ارشاد فرمایا کہ ایسے لوگوں کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا میں رسوا اور ذلیل ہوں اور آخرت میں اُن کے لئے سخت عذاب ہے ہی۔ چنانچہ بنو نضیر مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل ہوئے مدینہ منورہ سے خیبر کو نکال دیئے گئے اور پھر خیبر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو نکال دیا' اور در بدر مارے پھرتے رہے۔ اور بنی قریظہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

آخر میں فرمایا کہ ان لوگوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے بدلہ مول لے لیا' سو آخرت میں ان کے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی۔ اور نہ اُن کی کسی طرح کی کوئی مدد ہوگی۔ کوئی حامی مددگار طرف دار وکیل مختار موجود نہ ہوگا جو انکی کچھ مدد کر سکے۔

مسلمانوں کو تنبیہ جو پورے دین پر عمل کرنے کو تیار نہیں

جو حال یہودیوں کا تھا وہی آج مسلمانوں کا ہے۔ وہ بھی کتاب اللہ کے بعض حصے پر عمل کرتے ہیں اور بعض پر عمل نہیں کرتے' جو لوگ بے عمل ہیں وہ تو در کنار جو لوگ بظاہر دین دار ہیں اُن کی دینداری بھی نماز روزہ اور دو چار کاموں تک محدود ہے۔ حرام ذریعہ سے مال کمانا اور حرام محکموں میں ملازمت کرنا' رشوتیں دینا' بیاہ شادی اور مرنے جینے میں غیر اسلامی طور پر طریق اختیار کرنا اس طرح کے اُمور میں دینداری کے دعوٰی دار بھی مبتلا ہیں۔ بہت سے لوگ زکوٰۃ بھی دیتے ہیں۔ حج بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کے سامنے اسلامی تعزیرات حدود اور قصاص نافذ کرنے کی بات آتی ہے تو ٹھٹھک کر رہ جاتے ہیں اور اس کے نفاذ کے لئے ہاں کرنے کو تیار نہیں۔ حاکم اور محکوم دونوں ہی انکاری ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ

اور یہ بات واقعی ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اُن کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور دیئے ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح دلائل

وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ

اور اُن کی تائید کی ہم نے روح القدس کے ذریعہ کیا جب کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے اَحکام لایا جو تمہارے نفسوں کو گوارا نہ تھے تو تم نے تکبر کیا۔

فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿۸۷﴾

سو ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کرتے رہے ہو

یہودی بعض نبیوں کی صرف تکذیب کرتے تھے اور بعض کو قتل کر دیتے تھے

تفسیر: اس آیت شریفہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی (یعنی توریت شریف) اور اُن کے بعد بھی رسول بھیجتے رہے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلے کھلے معجزات دیئے جو انکی نبوت اور رسالت پر واضح دلائل تھے۔ مُردوں کو زندہ کرنا، مٹی سے پرندہ کی صورت بنا کر اس میں پھونک دینا جس سے پرندہ ہو کر اُڑ جانا، مادرزاد اندھے اور برص والے کو اچھا کر دینا اور غیب کی باتیں بتا دینا، اور روح القدس یعنی حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ انکی تائید کرنا۔ یہ سب امور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور رسالت کے لئے واضح دلائل تھے۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ (یعنی میں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں حلال کرتا ہوں جو تم پر (توریت شریف میں) حرام کر دی گئی تھیں اور تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے معجزہ لیکر آیا ہوں سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) بعض احکام انہوں نے ایسے بتائے جن سے توریت شریف کے بعض احکام منسوخ ہو گئے تو اس پر یہودی ان کے دشمن ہو گئے، اُن سے حسد بھی کیا اور عناد پر بھی تل گئے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہت ہی تکلیف دی اور اُن کے قتل کے درپے ہو گئے قتل تو نہ کر سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اوپر اٹھا لیا لیکن ان سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام کو قتل کر چکے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور تکذیب پر اس لئے آمادہ ہو گئے کہ جو احکام انہوں نے بتائے ان کے نفسوں کی خواہشوں کے خلاف تھے۔ اور انہوں نے نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی بلکہ بہت سے نبیوں کو انہوں نے جھٹلایا۔ اور بہت سے نبیوں کو قتل بھی کیا۔ خدا جانے انہوں نے کتنے نبیوں کو قتل کیا اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے قتل اور تکذیب کے درپے یہودی اس لئے ہو جاتے تھے کہ جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتاتے تھے وہ ان کے نفسوں کو نہیں بھاتے تھے اور انکی طبیعت کے خلاف ہوتے تھے۔ لہٰذا وہ اُن کی تکذیب تو کرتے ہی تھے قتل بھی کر دیتے تھے۔ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ قتل کا تذکرہ فرماتے ہوئے مضارع کا صیغہ تقتلون لایا گیا ہے۔ قتلتم صیغہ ماضی کا نہیں لایا گیا۔ اس میں اس پر دلالت ہے کہ آئندہ بھی تم سے ایسی حرکت سرزد ہو گی چنانچہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا اور خیبر میں بکری کے گوشت میں زہر ملا کر پیش کر دیا جسے آپ نے تناول فرما لیا اور پھر موت کے قریب اس زہر کے اثر سے ایک رگ کٹ گئی جو موت کا سبب بنی جیسا کہ مشکوٰۃ ص ۵۴۸ میں مذکور ہے اس آیت شریفہ میں تصریح ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان بھی انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں ان حضرات میں حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا ذکر تو قرآن مجید میں موجود ہے اور بعض حضرات کے اسماء گرامی قرآن مجید میں نہیں ہیں تفسیر کی بعض کتابوں میں لکھے ہیں۔ لیکن کسی صحیح روایت سے ان اسماء کا

ثبوت نہیں ملتا۔ تفسیر در منثور میں حضرت ابن عباسؓ سے بعض حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اسماء گرامی نقل کئے ہیں۔ مثلاً شمویل حزقیل ہم اللہ کے سب نبیوں پر ایمان لاتے ہیں اگرچہ سب کے نام سب کا زمانہ بعثت ہمیں معلوم نہیں' اس آیت میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم نے روح القدس کے ذریعہ عیسیٰ بن مریم کی تائید کی اس تائید سے کیا مراد ہے اس کے بارے میں علامہ نسفی فرماتے ہیں کہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا حضرت جبریل علیہ السلام نے ان کو اُوپر اُٹھالیا اور تفسیر جلالین میں ہے کہ حضرت جبریلؑ ان کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور حفاظت فرماتے تھے رُوح القدس قرآن وحدیث میں حضرت جبریل علیہ السلام کا لقب ہے سورۃ نحل میں فرمایا: قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّکَ اور حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان کو دعا دی۔ اللّٰھم اَیِّدْہُ بروح القدس (رواہ مسلم)

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں۔ بلکہ اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کو اللہ نے ملعون قرار دے دیا سو بہت کم ایمان لاتے ہیں

یہودیوں کا کہنا کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں' اور اسکی تردید

تفسیر: یہودی اسلام کو قبول نہیں کرتے تھے اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے تھے آپ کی سچائی کی علامات اور معجزات دیکھ کر بھی منحرف تھے اور اس گمراہی کو اپنے لئے کمال اور باعث فخر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم ایمان لانیوالے نہیں ہیں ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اور پردے پڑے ہوئے ہیں کسی کی بات ہمارے دلوں پر اثر نہیں کرسکتی اور اپنے دین کے علاوہ ہم کوئی دوسرا دین قبول نہیں کرسکتے اللہ تعالیٰ شانہ' نے انکی تردید فرمائی' کہ یہ بات سنتے اور سمجھتے ہیں اور حق بھی جانتے ہیں لیکن حق سے انکو تنفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنکو ملعون قرار دیدیا ہے لعنت اور پھٹکار میں گرفتار ہیں دلوں پر پردے اور غلاف کچھ نہیں کفر کی پھٹکار اور لعنت کے سبب ایمان سے محرومی ہے سورۃ مائدہ میں فرمایا کہ: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اُنکے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر ماردی۔ غرض یہ ہے کہ کفر میں انکی پختگی لعنت اور پھٹکار اور دلوں پر مہر لگ جانے کے سبب سے ہے جس پر وہ فخر کررہے ہیں قبحھم اللہ یہ جو فرمایا کہ بہت کم ایمان لاتے ہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی تھا لیکن تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا تھا جن میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بھی ہے اس سے منکر ہوگئے۔ ایک نبی کی تکذیب بھی کفر ہے تھوڑا سا ایمان آخرت میں کام نہیں دیگا۔ بعض مفسرین نے فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ کا یہ معنی بھی بتایا ہے کہ اُن میں سے بہت کم لوگ ہونگے جو ایمان لائینگے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ

اور جب اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب پہنچی وہ اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اُن کے پاس ہے اور حال یہ تھا کہ اس سے پہلے وہ کافروں

عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا

کے مقابلہ میں فتح یابی طلب کرتے تھے پس جب وہ چیز اُن کے پاس آ گئی جس کو پہچان لیا تو اس کے منکر ہوگئے۔ سو اللہ کی لعنت ہے کافروں پر بری چیز ہے وہ جس کو

اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى

اختیار کر کے اپنی جانوں کو خرید لیا یہ کہ کفر کریں اس چیز کے ساتھ جو اللہ نے اُتارا حسد کرتے ہوئے اس بات پر کہ اللہ اپنے فضل سے

مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

اپنے بندوں میں جس پر چاہے نازل فرمائے، سو وہ لوگ غضب پر غضب کے مستحق ہو گئے اور کافروں کے لئے عذاب ہے ذلیل کرنیوالا

یہودیوں نے جانتے بوجھتے ہوئے عناد اور ضد کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کیا

تفسیر: پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مدینہ منورہ میں یہودی اس لئے آ کر آباد ہوئے تھے کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت ہو گی تو ہم اُن کا اتباع کریں گے۔ یہ لوگ اپنے کو موحد سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہم دین سماوی کے حامل ہیں' اوس اور خزرج کے قبیلے بھی یمن سے آ کر مدینہ منورہ میں آباد ہوئے تھے یہ لوگ بت پرست مشرک تھے۔ یہودیوں سے ان لوگوں کی جنگ ہوتی رہتی تھی اور یہودی اُن سے کہا کرتے تھے کہ نبی آخر الزماں ﷺ تشریف لائیں گے انکی بعثت کا زمانہ قریب آ چکا ہے۔ ہم اُن پر ایمان لا کر اُن کے ساتھ ہو کر تم سے جہاد کریں گے اور اس وقت تمہارا ناس کھو دیں گے۔ اور قوم عاد کی طرح تمہارا قتل عام کریں گے۔ بلکہ بعض روایات میں ہے کہ یہودی یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ اس نبی کی بعثت فرما جس کے مبعوث ہونے کا ہماری کتاب میں ذکر ہے تاکہ ہم اس کے ساتھ مل کر عرب کے مشرکوں کو قتل کریں۔ یہ لوگ نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نعت اور صفت جانتے تھے جو توریت شریف میں مذکور تھی آنحضرت ﷺ کی بعثت ہو گئی اور آپ مدینہ منورہ میں بھی تشریف لے آئے اور یہودیوں نے آپ کو اُن علامات اور صفات کے ذریعہ پہچان بھی لیا جو اُن کے علم میں تھیں کہ یہ واقعی نبی آخر الزماں ہیں ہم جن کی انتظار میں تھے انہوں نے آپ کے معجزات بھی دیکھے اور سب کچھ دیکھتے ہوئے آپ کی نبوت اور رسالت کے منکر ہو گئے۔ اُن کو اوس اور خزرج کے بعض افراد نے توجہ بھی دلائی اور کہا کہ اے یہودیو! تم اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرو تم ہی تو کہا کرتے تھے کہ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لا کر اور اُن کے ساتھ مل کر تمہیں مغلوب اور مقہور کر دیں گے۔ لہٰذا اب تم حق کو قبول کرو نبی آخر الزماں پر ایمان لاؤ اور مسلمان ہو جاؤ۔ اس پر انہوں نے کہا کہ یہ وہ نبی نہیں ہیں، ہم جس کے انتظار میں تھے وہ تو ہم ہی میں سے ہو گا۔ عرب میں سے نہیں ہو گا۔ جانتے پہچانتے ہوئے منکر ہو گئے اور یہ حسد اُن کو کھا گیا کہ نبی عرب میں سے کیوں آیا۔ اس آیت میں اُن کے اسی انکار اور حق سے انحراف کرنے کا تذکرہ ہے اور اخیر میں یہ فرمایا ہے کہ کافروں پر اللہ کی لعنت ہے جو حق اور حقیقت کو جانتے ہیں پھر بھی اس کے ماننے سے منکر ہیں۔ (من ابن کثیر)

کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کی صفت بیان کرتے ہوئے یہ جو فرمایا کہ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ کہ یہ کتاب اس کتاب کی تصدیق کرنیوالی ہے جس کو وہ اللہ کی کتاب مانتے ہیں (یعنی توریت شریف) اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ نبی اس نبی کے خلاف ہوتا جس پر توریت نازل ہوئی اور یہ نبی اس کتاب کا کاٹ کرتا جو اللہ تعالیٰ نے اس نبی پر نازل کی تھی جس کو تم مانتے ہو تو انحراف اور مخالفت کی کوئی وجہ بھی ہوتی۔ وہ تو سارے نبیوں پر ایمان لانے اور اللہ تعالیٰ کی ساری کتابوں کو ماننے کی دعوت دیتا ہے اس سے انحراف کرنا اس حسد میں کہ یہ عرب میں سے ہے سراپا حماقت اور بیوقوفی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے کہ اس نے عرب میں سے نبی کیوں بھیجا اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا مستقل کفر ہے۔

اَنْ یَّکْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ بَغْیًا میں یہ بتایا کہ انہوں نے اپنی جانوں کو دوزخ کا مستحق اس لئے بنایا کہ انکو اللہ تعالیٰ کا اختیار فرمانے سے عناد ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے نبوت اور رسالت عطا کرے اور جس بندے پر چاہے اپنی کتاب اُتارے اُسے پورا پورا اختیار ہے اس میں کسی کو اعتراض کرنے کا اور یہ ضد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو کیوں نبی بنایا اور فلاں کو نہیں بنایا؟

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے منکر ہو کر کافر ہوئے پھر اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر کے کافر ہوئے۔ اور اللہ کے رسول محمد رسول اللہ علیہ وسلم اور اللہ کی کتاب قرآن کے منکر ہو کر کفر ہی کفر میں ترقی کرتے چلے گئے اور اللہ تعالیٰ کے غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے۔ لہٰذا آخرت میں ذلت کے عذاب میں گرفتار ہوں گے لفظ اِشْتَرَوْا کے بارے میں مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ بَاعُوْا وشروا بحَسْبِ ظَنِّهِمْ' اور صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں۔ ای باعوا' فالا نفس بمنزلة المثمن' والكفر بمنزلة الثمن لان انفسهم الخبيثة لا تشترىٰ بل تباع' وهو على الا ستعارة أى أنهم اختاروا الكفر على الايمان وبذلوا أنفسهم فيه. (یعنی اُنہوں نے اپنے نفسوں کو بیچ دیا اور اُن کے عوض کفر کو بطور قیمت کے لے لیا اور یہ معنی لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اُن کے خبیث نفس خریداری کے قابل نہیں بیچنے ہی کے لائق ہیں۔ مطلب یہ ہے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا یعنی برباد کر دیا اور کفر کو بطور قیمت کے حاصل کر لیا)

بعض حضرات نے کہا ہے کہ اشتروا اپنے مشہور معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے اعتقاد میں یہ سمجھا کہ جو طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے اس سے اپنی جانوں کو دوزخ کے عذاب سے چھڑا لیں گے اسکی تردید کرتے ہوئے فرمایا۔ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ کہ اُن کا یہ خیال غلط ہے کہ اس سے وہ عذاب سے بچ جائیں گے۔

قال صاحب الروح فهؤلاء اليهود لما اعتقدوا فيما اتوابه أنه يخلصهم من العقاب ظنوا أنهم اشتروا أنفسهم وخلّصوها فذمهم الله تعالىٰ عليه.

اگر یہ لوگ نبی آخر الزمان پر ایمان لاتے تو اپنی جانوں کو دوزخ سے بچا لیتے' منکر اور منحرف ہو کر ہمیشہ کے دائمی عذاب کے مستحق ہو گئے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ
اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو اُتارا گیا ہم پر'
بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ
اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اس کے منکر ہوتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اس کی تصدیق کرنے والا جو اُن کے پاس ہے آپ فرما دیجئے سو تم کیوں اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے قتل کرتے رہے ہو
قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ
اگر تم مومن ہو' اور بلا شبہ موسیٰ تمہارے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے پھر تم نے ان کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا'
مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾
حالانکہ تم ظالم تھے

یہودیوں کا یہ کہنا کہ ہم توریت کے علاوہ کسی کتاب کو نہیں مانتے' اور اس پر اُن سے سوال'

تفسیر: اس آیت شریفہ میں یہودیوں کا یہ قول ذکر فرمایا کہ ہم صرف توریت پر ایمان لاتے ہیں اس کے سوا کسی کتاب کو نہیں مانتے۔ ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ کہ جو کتاب ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کی ہے۔ وہ اس کتاب کی تصدیق کرنیوالی ہے جس پر وہ ایمان رکھنے کے مدعی ہیں۔ قرآن کو نہ ماننا توریت کے نہ ماننے کو مستلزم ہے۔ علامہ بیضاوی لکھتے ہیں۔ لأنهم لما كفروا بما يوافق التوراة فقد كفروا بها۔

توریت شریف میں یہ ہرگز نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علاوہ کسی قوم میں سے اللہ تعالیٰ نبی بھیجے تو اس کو مت ماننا اور توریت کے علاوہ اللہ کی کسی دوسری کتاب پر ایمان نہ لانا۔ یہ سب باتیں انکے ذاتی حسد کی وجہ سے ہیں۔ توریت شریف میں تو نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کی خبر دی ہے۔ جب نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت ہوگئی اور اُن کی علامات اور صفات سے یہود نے پہچان لیا کہ یہ نبی آخر الزماں ہیں پھر ان سب کے باوجود آپ پر ایمان نہ لانا اور قرآن مجید کو نہ ماننا یہ توریت شریف کے ماننے سے انکاری ہونا ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا توریت پر ایمان ہے حالانکہ ان کا اس پر بھی ایمان نہیں۔

یہودیوں کی بری حرکتوں میں سے یہ بھی تھا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کر دیتے تھے۔ آیت بالا میں فرمایا کہ اگر تم توریت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ بتاؤ کہ تم نے اللہ کے نبیوں کو قتل کرنے کا ارتکاب کیوں کیا نبی کا قتل کرنا تو توریت شریف کے قانون سے بھی کفر ہے۔ تمہارے آباؤ اجداد نے اس جرم کا ارتکاب کیا تم اُس سے راضی ہو اور اُن کو اپنا مقتدا مانتے ہو اس سے صاف ظاہر ہے کہ توریت شریف پر نہ تمہارا ایمان ہے اور نہ تمہارے باپ دادوں کا ایمان تھا۔

اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بہت سے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے وہ توریت کے احکام کی تبلیغ کرتے تھے اور انہوں نے توریت کے منسوخ ہونے کا اعلان بھی کیا۔ اے یہودیو! تم ان کو نبوت اور رسالت میں سچا بھی جانتے تھے۔ پھر بھی تم نے ان کو قتل کر دیا۔ حالانکہ وہ تمہاری قوم میں سے تھے۔ معلوم ہوا کہ تمہارا دین و ایمان شریعت موسوی کا اتباع نہیں ہے۔ بلکہ خواہشات نفس کا اتباع ہی تمہارا دین ہے۔

پھر فرمایا: وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ (الآیۃ) یعنی تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام بھی کھلی ہوئی اور واضح دلیلیں لیکر آئے جو تم نے خود دیکھیں جس سے اُن کا رسول اللہ ہونا واضح ہو گیا اور انہوں نے پوری طرح توحید کی دعوت دی اور تم کو جم کر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تبلیغ کی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے لیکن جب وہ کوہ طور پر توریت شریف لینے چلے گئے تو تم لوگوں نے اُن کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تمہارا یہ غیر اللہ کی پرستش کرنا سراسر ظلم صریح تھا۔ راہ حق کے خلاف چلنا دلائل واضحہ اور آیات بینات سامنے ہوتے ہوئے منکر ہو جانا سراسر ظلم ہے جو تمہاری پرانی عادت ہے تمہارے اسلاف کی حرکتیں تمہارے سامنے ہیں جن کا تم کو علم ہے لیکن ابھی تک اُن کو پیشوا بنائے ہوئے ہو اور انہیں کی راہ پر گامزن ہو۔ (من ابن کثیر)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا

اور جب ہم نے تم سے لیا پختہ عہد لیا اور بلند کر دیا تمہارے اُوپر طور کو' لے لو جو کچھ ہم نے تم کو دیا قوت کے ساتھ اور سن لو وہ کہنے لگے

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۚ وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ

ہم نے سن لیا اور مانیں گے نہیں۔ اور پلا دیا گیا اُن کے دلوں میں بچھڑا ان کے کفر کے سبب آپ فرما دیجئے کہ بری ہیں یہ باتیں جن کا تمہیں حکم دیتا ہے

إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۹۳﴾

تمہارا ایمان اگر تم مومن ہو

یہودیوں سے عہد و پیمان اور انکے دلوں میں بچھڑے کی محبت

تفسیر: اس سے پہلے بھی اسی سورت کے آٹھویں رکوع میں یہودیوں سے پختہ عہد لینے اور کوہ طور اُن پر اُٹھانے اور مضبوطی کے ساتھ توریت شریف کو تھامنے اور اس پر عمل کرنے کا عہد لینے کا ذکر گزرا ہے یہاں پھر اسکو دہرایا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ جب اُن کو حکم ہوا کہ توریت شریف کو مضبوطی سے تھام لو اور اس کے احکام کو سن لو تو اُنہوں نے کہا کہ ہم نے سن تو لیا لیکن ہم اس پر عمل نہ کریں گے' حکم تھا کہ دل کے کانوں سے سنو' قبول کرنے کے لئے سنو' عمل کرنے کے لئے سنو لیکن انہوں نے اپنے اوپر پہاڑ گرنے کے ڈر سے اس وقت تو کہہ دیا کہ ہاں ہم نے سنا اور اُوپر کے دل سے اقرار بھی کر لیا جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے لیکن بعد میں اس قول وقرار سے پھر گئے اور نافرمانی پر تل آئے اور کہنے لگے کہ سنا تو ہے لیکن عمل کرنا ہمارے بس کا نہیں پھر فرمایا کہ انہوں نے بچھڑے کی جو عبادت کی تھی وہ ان کے اندر رچ بس گئی تھی اور رگ وپے میں گھس گئی تھی جیسے پینے کی چیز اندر جا کر جہاں جہاں جگہ دیکھتی ہے اپنی جگہ پکڑ لیتی ہے۔ اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کا یہ حال ہوا کہ بچھڑے کی محبت ان کے اندر پوری طرح سرایت کر گئی اور جاگزیں ہوگئی۔

پھر فرمایا کہ آپ ان سے فرما دیں تم ایمان کے دعویدار ہو اگر تم مومن ہو (حالانکہ مومن نہیں) تو سمجھ لو کہ تمہارا ایمان تمہیں بُرے اعمال کی تعلیم دیتا ہے کفر اور شرک پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ کیسا ایمان ہے جو توحید کی تعلیم نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اُبھارتا ہے۔ اور نبی آخر الزماں ﷺ کی تکذیب پر آمادہ کرتا ہے جن کا نبی ہونا تم پر دلائل سے واضح ہے۔

فائدہ: بچھڑے کی عبادت سے اُن لوگوں نے توبہ تو کی تھی جیسا کہ سورۂ بقرۃ کے چھٹے رکوع میں گزرا لیکن اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بہت سوں نے اُوپر اُوپر سے توبہ کر لی' دل کی گہرائی سے توبہ نہ کی اور بچھڑے کی پرستش کا اثر ان میں باقی رہا اور اس اثر کی وجہ سے اللہ کی کتاب توریت شریف کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے جب پہاڑ اُٹھا کر اُن پر کھڑا کر دیا گیا تو اس وقت تو جھوٹ موٹ کو مان گئے لیکن بعد میں نافرمانی پر تلے رہے۔

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

آپ فرما دیجئے اگر آخرت والا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمہارے ہی لئے ہے دوسروں کے لئے نہیں تو موت کی تمنا کرو

إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۹۵﴾

اگر تم سچے ہو اور وہ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہ کریں گے بوجہ اُن اعمال کے جو اُنہوں نے آگے بھیجے ہیں۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ

اور یہ واقعی بات ہے کہ تم ان کو زندہ رہنے پر سب لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے اور ان لوگوں سے بھی زیادہ جنہوں نے شرک کیا ان کا ایک ایک فرد یہ آرزو رکھتا ہے کہ اس کو

اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

ہزار سال کی عمر دے دی جائے اور حال یہ ہے کہ اُسے یہ چیز عذاب سے بچانے والی نہیں ہے کہ اسکی عمر زیادہ ہو جائے اور اللہ دیکھنے والا ہے ان کاموں کو جن کو وہ کرتے ہیں

یہودیوں کو دعوت مباہلہ کہ موت کی تمنا کریں

تفسیر: یہودیوں کے دعوؤں اور آرزوؤں میں یہ بھی تھا کہ عالم آخرت کی خیر اور خوبی اور جنت کا داخلہ اور نعمتوں کا حصول یہ سب کچھ ہمارے لئے ہی خاص ہے۔ دوسرے کسی دین والے اور کسی بھی قوم اور نسل کے لوگ جنت میں نہ جائیں گے انکے اس خیالی جھوٹے دعوے اور جھوٹی آرزو کے پیش نظر اُنکو مباہلہ کی دعوت دی گئی کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو آجاؤ، ہم اور تم مل کر موت کی دعا کریں کہ دونوں فریق میں سے جو بھی جھوٹا ہو وہ ابھی فوراً مر جائے جب یہ بات سامنے آئی تو اس پر آمادہ نہ ہوئے اور راہ فرار اختیار کرلی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہ لوگ موت کی تمنا کرتے تو اُسی وقت مر جاتے۔ مفسر ابن جریر نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر یہودی موت کی تمنا کرتے تو اسی وقت مر جاتے اور دوزخ میں اپنا اپنا ٹھکانہ دیکھ لیتے اور مباہلہ کیلئے نکلتے تو واپس ہو کر نہ جاتے اور مال کچھ بھی نہ پاتے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ انہیں اپنا کفر اور بد اعمالیاں معلوم ہیں وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کرسکتے اور اللہ تعالیٰ سب مجرموں اور ظالموں کو جانتا ہی ہے۔ جو ہر ایک کو اسکا بدلہ دے دیگا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ یہ کیا موت کی آرزو کرسکتے ہیں۔ یہ تو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کی حرص رکھتے ہیں۔ جو لوگ مشرک ہیں اللہ کی کسی کتاب کو نہیں مانتے اُن سے بھی زیادہ دنیا میں رہنے اور جینے کے حریص ہیں۔ انکی خواہش ہے کہ کاش ہزار سال زندہ رہ جاتے اگر ہزار سال بھی زندہ رہ جائیں تو اسکی وجہ سے عذاب سے چھٹکارہ نہیں ہوسکتا کبھی تو موت آ ہی جائے گی اور موت کے بعد وہی عذاب کا سامنا اور دوزخ کا داخلہ ہوگا۔ جو اہل کفر کے لئے طے شدہ ہے، ابلیس کو ہزاروں سال کی زندگی دیدی گئی مگر انجام دوزخ ہی ہے۔ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو تم ضرور اس سے ملاقات کرنیوالے ہو، پھر اس کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے جو غیب اور شہادۃ کو جانتا ہے پھر وہ تمہیں تمہارے کاموں کی خبر دے دے گا)

مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اوپر جو آیت کی تفسیر بیان ہوئی کہ یہود کو مباہلہ کی دعوت دی گئی تھی یہی تفسیر صحیح ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا نجران کے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی گئی تھی جو سورۂ آل عمران میں مذکور ہے۔ (ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ) اس کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے آیت کی تفسیر میں یوں کہا ہے کہ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو کہ دار آخرت تمہارے ہی لئے خاص ہے تو موت کی تمنا کرو تا کہ مرنے کے ساتھ ہی جنت میں چلے جاؤ اور دنیا کی تکلیفوں سے محفوظ و مامون ہو جاؤ۔ اس دوسری تفسیر میں مباہلہ کا ذکر نہیں بلکہ صرف آرزوئے موت کی دعوت

دی گئی۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت کا یہ معنی لیکر اُن لوگوں پر حجت قائم نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ اپنے دعویٰ میں سچا ہونا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ موت کی تمنا بھی کرے کیونکہ وہ الٹ کر یہ کہہ سکتے تھے کہ اے مسلمانو! تم بھی تو اپنے بارے میں جنتی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہو تم بھی حالت صحت اور تندرستی میں موت کی تمنا نہیں کرتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

آپ فرما دیجئے کہ جو شخص دشمن ہو جبریل کا سو اُس نے اُتارا ہے قرآن تمہارے قلب پر اللہ کے حکم سے جو تصدیق کرنیوالا ہے اُس کتاب کی جو اُس

يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ

سے پہلے ہے اور ہدایت ہے اور بشارت ہے ایمان والوں کے لئے۔ جو شخص دشمن ہو اللہ کا اس کے فرشتوں کا اور اُس کے پیغمبروں کا اور جبریل کا

وَمِيْكٰلَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

اور میکائیل کا تو بے شک اللہ دشمن ہے کافروں کا

یہودیوں کا کفریہ قول کہ جبریل ہمارا دشمن ہے

تفسیر: یہودیوں کو جب معلوم ہوا کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر جبریل علیہ السلام وحی لاتے ہیں تو کہنے لگے کہ جبریل تو ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ سخت احکام لاتا ہے۔ اور ہم اس کتاب کو نہیں مانتے جو جبریل کے ذریعہ نازل ہوئی ہے اور وہ عذاب بھی لاتا رہا ہے لہٰذا اگر میکائیل وحی لانیوالے ہوتے تو ہم محمد رسول اللہ ﷺ کا اتباع کر لیتے کیونکہ وہ رحمت اور بارش لانیوالے ہیں۔ ایک مرتبہ یہودی حضور ﷺ سے باتیں پوچھ رہے تھے انہوں نے وعدہ کر لیا تھا کہ آپ نے یہ باتیں بتا دیں تو ہم آپ کا اتباع کر لیں گے جب آپ اُن کا جواب دیتے گئے تو انہوں نے بات نکالی کہ جبریل تو ہمارے دشمن ہیں اگر میکائیل آپ پر وحی لانیوالے ہوتے تو ہم مان لیتے (ابن کثیر ص ۱۲۰ ج ۱) اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہو ہوا کرے (جبریل کا کوئی قصور نہیں وہ مامور من اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ان کو دیا جاتا ہے وہی لیکر آتے ہیں) انہوں نے ہی آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے قرآن نازل کیا ہے اور یہ قرآن سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق بھی کرتا ہے اور اہل ایمان کو بشارت بھی دیتا ہے (جو شخص جبریل سے دشمنی کرتا ہے وہ حقیقۃً اللہ کا دشمن ہے کیونکہ جبریل کو اللہ تعالیٰ نے قاصد بنایا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ کے ذریعہ اپنے نبیوں پر بھیجا جبریلؑ وہی لیکر آئے ان سے دشمنی کرنا اللہ سے دشمنی کرنا ہوا۔ جو شخص اللہ کا اور اسکے فرشتوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور جبریلؑ اور میکائیلؑ کا دشمن ہو گا وہ کافر ہے اور اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے) یہودیوں کی یہ کیسے احمقانہ بات ہے کہ ہم اس کتاب کو نہیں مانتے جس کو جبریلؑ لے کر آئے۔ اوّل تو وہ جو کچھ لیکر آئے اللہ کا کلام ہے سفیر اور قاصد کوئی بھی ہو بھیجنے والے کو دیکھا جاتا ہے احکام بھیجنے والا اللہ جل شانہٗ ہے پھر اللہ کے احکام کو اس لئے نہ ماننا کہ جبریلؑ لائے ہیں جب کہ وہ اللہ کے حکم سے لائے بہت بڑی حماقت اور شقاوت ہے۔

مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ فرشتوں اور رسولوں کے عمومی ذکر کے بعد حضرت جبریلؑ اور میکائیلؑ کا جو خصوصی ذکر فرمایا اس سے یہ بات واضح ہے کہ اللہ کے کسی رسول سے دشمنی رکھنا فرشتوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے یہ اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے

کہ جبریلؑ سے ہماری دشمنی ہے اور میکائیلؑ سے ہماری دشمنی نہیں ہے وہ غلط کہتا ہے۔ وہ درحقیقت میکائیل علیہ السلام کا بھی دشمن ہے کیونکہ ایک فرشتے سے دشمنی سب فرشتوں سے دشمنی کرنے کے درجہ میں ہے اور موجب کفر ہے۔ یہودیوں کا یہ کہنا کہ میکائیلؑ ہمارے دوست ہیں یہ غلط ہے جبریلؑ کا یا کسی بھی فرشتے کا دشمن ہونا سارے فرشتوں کا دشمن ہونا ہے اور اس میں اللہ کی دشمنی پوشیدہ ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۚ وَمَا یَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا

اور یہ واقعی بات ہے کہ ہم نے آپ کی طرف واضح دلیلیں نازل کی ہیں۔ اور اُن کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو حکم عدولی کرنے والے ہیں۔ کیا جب کبھی بھی انہوں نے کوئی عہد

نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

کیا اس عہد کو ان میں سے ایک جماعت نے پھینک دیا بلکہ اُن میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے

آیات بینات کا انکار فاسقوں ہی کا کام ہے

تفسیر: (تفسیر درمنثور میں ص ۹۴ ج ۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ابن صوریا یہودی نے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے محمد کوئی ایسی چیز آپ نہیں لائے جسے ہم پہچانتے ہوں اور نہ آپ کے پاس ایسی کوئی کھلی ہوئی دلیل ہے، جس کی وجہ سے ہم آپ کا اتباع کرلیں۔ اسکی تردید میں اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ہم نے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تمہاری طرف واضح آیات نازل فرمائی ہیں جو آیات بینات ہیں' ان آیات میں یہود کی پوشیدہ باتیں اُن کے بھید اور راز بیان کرنا اُن کے گزرے ہوئے اسلاف کے حالات بتانا اور انکی تحریفات کا پتہ دینا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر فرمایا اور اپنی کتاب میں نازل فرمایا۔ جو شخص انصاف پسند ہو حسد اور جلن کی وجہ سے اپنی جان کو ہلاک کرنے پر تل نہ گیا ہو اُس کے لئے یہ دلائل کافی اور وافی ہیں۔ لیکن اگر کسی کو حق اور حقیقت سے بغض اور عناد ہو اور حکم عدولی ہی جس کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو اور فسق اُسکی طبیعت میں رچ بس گیا ہو وہ ہی ان آیات بینات کا منکر ہو سکتا ہے۔

یہودیوں کی ایک جماعت ہر عہد کی خلاف ورزی کرتی رہی ہے

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حضرت سرور عالم ﷺ نے یہودیوں کو تذکیر فرمائی اور جو ان سے میثاق اور قول و قرار لیا گیا تھا وہ اُن کو یاد دلایا اور خاتم النبیین ﷺ کے بارے میں جو اُن سے عہد لیا گیا تھا اُسکی یاد دہانی فرمائی تو وہ صاف منکر ہو گئے۔ اُن میں ایک آدمی مالک بن سیف تھا اُس نے کہا کہ اللہ کی قسم محمد (ﷺ) کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا (الآیۃ) یعنی یہ لوگ اس عہد سے منکر ہو رہے ہیں۔ اور حال اُن کا یہ رہا ہے کہ جب کبھی بھی انہوں نے کوئی عہد کیا تو اُن میں سے ایک جماعت نے اُس کو پھینک دیا اُن کا یہ مزاج ہے اور نقض عہد کی عادت ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ واؤ کے پہلے معطوف علیہ حذف ہے اور عبارت یوں ہے۔ اکفروا بالآیت و کلما عاهدوا وهو من عطف الفعلية على الفعلية۔ روح المعانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی گئی کہ انکی پرواہ نہ کریں۔ اور انکی مخالفت کو اپنے دل کا بوجھ نہ بنائیں ج ۱ ص ۳۳۵ آخر میں فرمایا بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ یعنی ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے بعض یہودی مسلمان ہو گئے تھے اس لئے یہ فرمایا کہ اُن میں سے اکثر ایمان نہ لائیں گے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ

اور جب اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول آیا جو تصدیق کرنے والا ہے اُس کتاب کی جو اُن کے پاس ہے تو جن کو کتاب دی گئی تھی

اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

اُن میں سے ایک جماعت نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ہیں

اہل کتاب نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا

تفسیر: اس آیت شریفہ میں یہودیوں کی اس بات کا ذکر ہے کہ جب اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم المرتبہ رسول آیا یعنی حضرت محمد مصطفیٰ خاتم النبیین ﷺ اور اس رسول نے اس کتاب کی تصدیق بھی کی جسے یہود مانتے تھے اور اُس کو اللہ کی کتاب جانتے تھے (یعنی توریت شریف) تو ان لوگوں نے دونوں کتابوں میں مطابقت ہوتے ہوئے اللہ کی کتاب توریت شریف کو پس پشت ڈال دیا۔ قرآن کو تو قبول کیا ہی نہیں اور توریت شریف کے بھی منحرف ہو گئے اور اس میں جو نبی اکرم ﷺ کی صفات بیان کی گئی تھیں۔ اُن کے اظہار کے بجائے اُن کو پوشیدہ کر لیا اور اس انداز سے منکر اور منحرف ہوئے کہ گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ توریت اللہ کی کتاب ہے اور انہیں پتہ ہی نہیں ہے۔ کہ اس میں نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے دلائل موجود ہیں (کذافی الروح ص ۳۳۶ ج ۱)

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ

اور انہوں نے اس چیز کا اتباع کیا جسے سلیمان کے عہد حکومت میں شیاطین پڑھتے تھے۔ اور نہیں کفر کیا سلیمان نے لیکن شیاطین نے

كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ

کفر اختیار کیا۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور انہوں نے اس کا بھی اتباع کیا جو نازل ہوا دو فرشتوں پر بابل میں۔ یہ دو فرشتے ھاروت

وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ

اور ماروت تھے اور یہ دونوں نہیں سکھاتے تھے کسی کو جب تک یوں نہ کہہ دیتے کہ ہمارا وجود ایک فتنہ ہے لہٰذا تو کفر اختیار نہ کر پس یہ لوگ

مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ

اُن سے وہ چیز سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ مرد اور اُسکی بیوی کے درمیان جدائی کر دیتے تھے۔ اور وہ لوگ اس کے ذریعہ کسی کو کچھ بھی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر

اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ

اللہ کے حکم سے۔ اور وہ لوگ وہ چیز سیکھتے ہیں جو اُن کو ضرر دینے والی ہے اور نفع دینے والی نہیں۔ اور البتہ تحقیق اُنہوں نے یہ بات جان لی کہ جس نے اس کو خریدا ہے اُس کے لئے آخرت میں

مِنْ خَلَاقٍ ۭ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا

کوئی حصہ نہیں۔ اور بے شک وہ بری چیز ہے جس کے ذریعہ انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ دیا۔ اگر وہ جانتے ہوتے اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے

لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسکا ثواب بہتر تھا اگر وہ جانتے ہوتے۔

بابل میں جادوگروں کا زور، اور یہود کا جادو کے پیچھے لگنا

جادوگری کا سلسلہ پرانا ہے۔ ہوتا تو سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادہ ہی سے ہے۔ اسباب جو بھی ہوں، جادو بھی ایک سبب ہے جس سے احوال میں کچھ تغیر ہو جاتا ہے اور جس پر جادو کیا جائے اس کو تکلیف پہنچ جاتی ہے حضرت ہود علیہ السلام کو انکی امت کے لوگوں نے کہا: اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (کہ تم تو انہیں لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہو) اور یہی بات حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں ان کی اُمت کے افراد نے کہی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ تو مشہور ہی ہے اور یہ جادوگری کا سلسلہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ تک تھا اور اس کے بعد بھی رہا ایک یہودی نے حضرت سرور عالم ﷺ پر جادو کر دیا تھا جس کا ذکر بخاری شریف میں موجود ہے۔ (ص ۸۵۸ ج ۲)، اور اب بھی جادوگر دنیا میں موجود ہیں اور جادوگری دنیا میں رواج پائے ہوئے ہے۔ اوّل تو یہود کی شکایت فرمائی کہ اللہ کی کتاب اُنہوں نے پس پشت ڈالدی پھر فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں شیاطین پڑھتے تھے یعنی جادو کرتے تھے اور اس میں مشغول رہتے تھے انہوں نے اس کا اتباع کیا۔ مفسرین نے اس طرح کے واقعات لکھے ہیں کہ عارضی طور پر چند دن کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت جاتی رہی تھی اس زمانے میں شیاطین نے اُن کی کرسی کے نیچے جادو کی چیزیں دفن کر دی تھیں اور جب اُنکی وفات ہوگئی تو اُن کو کھود کر نکالا اور لوگوں میں مشہور کر دیا کہ سلیمان علیہ السلام نبی نہیں تھے بلکہ جادو کے زور پر حکومت چلاتے تھے علماء بنی اسرائیل نے تو اس بات کو نہیں مانا لیکن ان کے عوام نے اس بات کو مان لیا اور کہنے لگے کہ یہ جادو ہی سلیمان علیہ السلام کا علم ہے اور اس کے سیکھنے سکھانے میں لگ گئے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی کتابوں کو چھوڑ بیٹھے، جب حضور سرور عالم ﷺ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ کے پیغمبروں میں سے تھے تو یہودیوں نے کہا کہ محمد (ﷺ) یہ کہتے ہیں کہ سلیمان ابن داؤد (علیہما السلام) نبی تھے حالانکہ وہ صرف ایک جادوگر تھے۔ اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت نازل کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی سحر سے برأت نازل فرمائی۔ اور صاف فرمایا: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا۔ (یعنی سلیمان نے کفر نہیں کیا لیکن شیاطین نے کفر اختیار کیا) شیاطین کا یہ مشغلہ تھا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ (من القرطبی و ابن کثیر)

ہاروت ماروت کے ذریعہ امتحان

ارشاد ربانی ہے: وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ (یہود نے اس کا بھی اتباع کیا جو دونوں فرشتوں ہاروت و ماروت پر بابل شہر میں اُتارا گیا)

کسی زمانہ میں جادو کا بہت چرچا تھا خاص کر شہر بابل میں جو عراق میں واقع ہے، جادو کے اثرات کو دیکھ کر لوگ اس سے بہت متاثر ہوئے جادوگروں کو مقدس سمجھنے لگے۔ اللہ جل شانہٗ نے جادو کا ضرر اور اسکی مذمت ظاہر فرمانے کے لئے دو

فرشتوں کو بھیجا جن کا نام ھاروت اور ماروت[1] تھا تا کہ وہ سحر کی حقیقت واضح کریں اور معجزہ اور سحر میں فرق ظاہر ہو جائے اس میں لوگوں کا امتحان بھی مقصود تھا کہ دیکھا جائے کہ کون ایمان اور خیر کو اور کون کفر اور شر کو اختیار کرتا ہے۔ جب ان دونوں فرشتوں نے اپنا کام شروع کیا تو لوگ ان کے پاس آنے جانے لگے اور کہنے لگے کہ ہم کو بھی جادو کے اصول و فروع بتا دیں۔ وہ دونوں فرشتے جب اُن کو جادو کی کوئی چیز بتاتے تو پہلے یہ ظاہر کر دیتے تھے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے بندوں کی آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے کہ ان چیزوں کو جان کر کون شخص اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے جو شر سے بچ جائے اور کون شخص اپنے دین کو برباد کرتا ہے اور اپنے لئے شر کو اختیار کرتا ہے۔ وہ فرشتے کہتے تھے کہ ہم تم کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر

[1] ومما يقضى منه العجب ما قله الامام القرطبى إن هاروت و ماروت بدل من الشياطين على قراءة التشديد وما فى (وما أنزل) نا فية' والمراد من الملكين جبرائيل و ميكائيل لأن اليهود زعموا أن الله تعالىٰ أنزلهما بالسحر وفى الكلام تقديم و تاخير' والتقدير (وما كفر سليمان) (وما أنزل على الملكين) (ولكن الشياطين) (هاروت و ماروت) (كفرو ايعلمون الناس السحر) (ببابل)وعليه فالبدل إما بدل بعض من كل ونص عليهما بالذكر لتمردهما' ولكو نها رأسا فى التعليم' أوبدل كل من كل إما بناءً على أن الجمع يطلق على الاثنين او على أنهما عبارتان عن قبيلتين من الشياطين لم يكن غيرهما بهذه الصفة' واعجب من قوله هذا قوله' وهذا أولى ما حملت عليه الأية من التاويل وأصح ما قيل فيها' ولا تلتفت إلى ما سواه' ولا يخفى لدى كل منصف أنه لا ينبغى لمؤمن حمل كلام الله تعالىٰ. وهو فى اعلى مراتب البلاغة والفصاحة على ما هو ادنى من ذلك' وما هو الامسخ لكتاب الله تعالىٰ عزشانهٔ وإهباط له عن شاواه (روح المعانی)

تم حاصل کرنا چاہتے ہو تو اچھی نیت سے حاصل کرو کہ شر سے محفوظ رہو گے' پھر اس نیت پر قائم رہنا' شر کے لئے معلوم نہ کرو اور اس کو شر میں استعمال نہ کرنا ورنہ اس میں لگ کر ایمان برباد کر لو گے جو شخص ان سے اس طرح کا عہد و پیمان کر لیتا تھا وہ اُسے جادو کے اصول و فروع بتا دیتے تھے اس کے بعد جو کوئی اپنے عہد پر قائم نہ رہتا اور اس جادو کو مخلوق کی ایذا رسانی کا ذریعہ بنا لیتا تو وہ اس کا اپنا عمل تھا۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں:

وهذا ن الملكان أنزلا لتعليم (السحر) ابتلاء من الله تعالىٰ للنّاس' فمن تعلم وعمل به كفر. ومن تعلم وتوقى عمله ثبت على الايمان' ولله تعالىٰ أن يمتحن عباده بماشاء كما امتحن قوم طالوت بالنهر و تمييزا بينه وبين المعجزة حيث أنه كثر فى ذلك الزمان' واظهر السحرة امورًا غريبةً وقع الشك بها فى النبوة فبعث الله تعالىٰ الملكين لتعليم أبواب السحر حتى يزيلا الشبه ويميطا الأذى عن الطريق قيل كان ذلك فى زمن أدريس عليه السلام (ومثله فى تفسير ابن كثير)

حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ اسکی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کسی عالم باعمل کے پاس جائے کہ مجھ کو فلسفہ قدیمہ یا جدیدہ پڑھا دیجئے تا کہ خود بھی شبہات سے محفوظ رہوں' اور مخالفین کو جواب دے سکوں اور اس عالم کو یہ احتمال ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ کو مثلاً دھوکہ دے کر پڑھ لے پھر خود بھی تقویت باطل میں اس کا استعمال کرنے لگے

اور اس احتمال کی وجہ سے اُسکو نصیحت کرے کہ ایسا مت کرنا اور وہ وعدہ کرے اور اس لئے اس کو پڑھا دیا جائے۔ لیکن پھر وہ شخص در حقیقت قصداً اُسی سوءِ استعمال محتمل میں مبتلا ہو جائے' سو ظاہر ہے کہ اس کے سوءِ استعمال سے اُس معلم پر کوئی ملامت یا قبح عائد نہیں ہو سکتا اسی طرح اس اطلاع سحر سے اُن فرشتوں پر کسی شبہ و وسوسہ کی گنجائش نہیں۔ (بیان القرآن)

جادو کے بعض اثرات

پھر فرمایا: فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ۔ (یعنی وہ لوگ اُن دونوں فرشتوں سے وہ چیز سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ میاں بیوی میں جدائی کر دیتے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ جادو کے اثر سے دو محبت والوں میں بغض پیدا ہو سکتا ہے اور میل محبت والوں میں جدائی ہو سکتی ہے۔ جادو کے ذریعہ اُس زمانہ کے لوگوں کیا کیا حرکتیں کرتے ہوں گے کیا کیا ایذائیں دیتے ہوں گے اُن میں سے صرف ایک ایسی چیز کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت ہی مبغوض اور شیطان کو بہت محبوب ہے اور وہ ہے میاں بیوی کے درمیان جدائی کر دینا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے پھر اپنی جماعتوں کو بھیجتا ہے اسکی جماعتوں کے افراد لوگوں کو فتنہ میں ڈالتے ہیں ابلیس کا سب سے بڑا مقرب ان میں سے وہ ہوتا ہے جو فتنہ ڈالنے میں سب سے بڑا ہو (فتنوں میں مبتلا کر کے اس کے نمائندے اس کے پاس آتے رہتے ہیں اور اپنا اپنا کمال ظاہر کرتے ہیں) ان میں سے ایک آ کر کہتا ہے کہ میں نے ایسا ایسا کیا تو ابلیس کہتا ہے کہ تو نے کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر اُن میں سے ایک آتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کے پیچھے اتنا لگا کہ اس کے اور اُس کی بیوی کے درمیان میں نے جدائی کر دی اُس کی یہ بات سن کر ابلیس اُسے قریب کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں تو نے کام کیا ہے۔ حضرت اعمش (راوی حدیث) فرماتے ہیں کہ مجھے جہاں تک یاد ہے اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ابلیس اس کو چمٹا لیتا ہے' جس نے میاں بیوی میں جدائی کرا دی۔ (صحیح مسلم)

جادو کا اثر باذن اللہ ہوتا ہے

پھر فرمایا: وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (یہ لوگ جادو کے ذریعہ کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اللہ کے حکم سے) اس میں یہ بات واضح طور پر بتادی کہ جادو کے زور سے جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی اللہ کی مشیت اور ارادہ سے ہی ہوتا ہے جو ظاہری اسباب لوگوں کے سامنے ہیں مثلاً آگ سے جل جانا اور چاقو چھری سے زخم ہو جانا اور بعض مشہور دواؤں کے کھانے سے اسہال ہو جانا اور روٹی سے پیٹ بھر جانا اور پانی سے سیراب ہو جانا اس طرح کی چیزیں چونکہ روزانہ مشاہدہ میں آتی ہیں اس لئے ان کو کچھ عجیب نہیں سمجھا جاتا اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ چاہے تو آگ نہ جلائے (جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ سے کچھ اثر نہیں کیا) اور اللہ تعالیٰ چاہے تو چھری سے کچھ بھی نہ کٹے (جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو چھری ذبح نہ کر سکی) اور اللہ تعالیٰ چاہے تو خوب زیادہ کھانے سے بھی پیٹ نہ بھرے (جیسا کہ جوع البقر کا مریض کھاتا ہی رہتا ہے اور اُس کا پیٹ نہیں بھرتا اور جیسا استسقاء کا مریض پیتا ہی رہتا ہے مگر پیاس نہیں بجھتی) جادو کے ذریعہ جو کچھ ہوتا ہے اس لئے جادو کے اثر سے ظاہر ہونیوالی چیزوں کو لوگ تعجب سے دیکھتے ہیں اور کم علم اور کم فہم جادوگروں کے بہت زیادہ معتقد ہو جاتے ہیں اور بہت سے جاہل پیر تھوڑا بہت جادو یا مسمریزم کا کام سیکھ کر جاہلوں کو

معتقد بنانے کا کاروبار بھی کر لیتے ہیں جادو کا اثر بھی جبھی ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی مشیت ہو پھر جب اللہ چاہتا ہے تو جادو کٹ بھی جاتا ہے۔ جب جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں آئے تو انہوں نے فرمایا۔ مَاجِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ (تم جو کچھ لائے ہو وہ جادو ہے بے شک اللہ تعالیٰ عنقریب اس کو نیست و نابود کر دے گا) بڑے بڑے جادوگروں کا عمل سورۂ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور سورۃ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کے ذریعہ ختم ہو جاتا ہے۔

جادو کے اسباب خفیہ

جادو کے پوشیدہ اسباب کئی طرح کے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ شیاطین سے مدد حاصل کرنے کے لئے انکو خوش کیا جاتا ہے اور اس کے لئے کبھی ایسے الفاظ کلمات پڑھے جاتے ہیں جو کفر و شرک کے کلمات ہوں اور جن میں شیاطین کی تعریف کی گئی ہو اور کبھی ستاروں کی عبادت کی جاتی ہے کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اُن کا خون استعمال کرنا یا جنابت کی حالت میں رہنا اور نجاست میں ملوث رہنا اسی لئے زیادہ کامیاب جادو اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہتے ہیں۔ اور جو طہارت سے اور اللہ تعالیٰ کے نام سے دور بھاگتے ہیں اور ان کو خبیث کاموں کی عادت ہوتی ہے۔ جادوگر عورتیں حیض کے زمانہ میں جادو کرتی ہیں جو زیادہ مؤثر ہوتا ہے عموماً خبیث شیاطین جادوگروں کی مدد طلب کرنے سے کام کر دیتے ہیں دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ جادوگر کے کسی کرتب سے ایسا ہو گیا۔ جس طرح فرشتے ان حضرات کی مدد کرتے ہیں جو متقی ہوں اور طہارت اور پاکیزگی کو اختیار کرتے ہوں اور بدبو اور نجاست سے دُور رہتے ہوں اللہ کے ذکر اور اعمال خیر میں لگے رہتے ہوں اسی طرح شیاطین ان لوگوں کے مددگار ہوتے ہیں جو قول اور فعل اور اعتقاد کے اعتبار سے خباثت اور نجاست میں شیاطین کی طرح ہوں۔ کیونکہ تعاون کے لئے تناسب ضروری ہے۔ (عن روح المعانی)

سحرۂ فرعون کا عمل

مفسر ابن کثیر نے ابو عبداللہ رازی سے سحر کی آٹھ قسمیں نقل کی ہیں۔ ان میں سے قوت خیالیہ کا اثر اور نظر بندی اور شعبدہ اور دواؤں کا استعمال کرنا بھی ذکر کیا گیا ہے ان میں جو شعبدہ اور ہاتھ کی صفائی یا قوت خیالیہ یا دواؤں کا استعمال ہے اس کو مجازاً جادو کہہ دیا گیا ہے نظر بندی کو بطورِ مثال ایسا سمجھ لیا جائے جیسے ریل میں بیٹھے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ زمین بھی ساتھ ساتھ جا رہی ہے جیسے پلیٹ فارم پر وہ گاڑی چل رہی ہو جس میں ہم بیٹھے ہیں تو نظر کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ برابر کی گاڑی چل رہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جو جادوگر آئے تھے اُن کے بارے میں ارشاد ہے۔ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (کہ اُن کے جادو کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یوں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں) یہ سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ اور سورۂ اعراف میں ارشاد ہے۔ فَلَمَّا اَلْقَوْا سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ۔ (کہ جب انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈالیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور اُن پر ہیبت غالب کر دی اور بڑا جادو لے کر آئے) اس سے صاف ظاہر ہے کہ جادوگروں نے اپنے جادو سے لوگوں کی نظر بندی کر دی تھی جس کے اثر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اُن لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ سمجھنے لگے۔ اور اُن کے دل میں تھوڑا سا خوف بھی آ گیا۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى

(موسیٰ نے اپنے جی میں خوف محسوس کیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ۔ لَاتَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی وَاَلْقِ مَا فِی یَمِیْنِکَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سٰحِرٍ وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی (کہ تم ڈرو نہیں تم ہی غالب رہو گے یہ جو تمہارے ہاتھ میں ہے اس کو ڈالدو انہوں نے جو کچھ کرتب کیا ہے اس کو تمہاری لاٹھی نگل جائے گی۔ انہوں نے جو کچھ بنایا ہے یہ صرف جادو کا مکر ہے۔ اور جادوگر جہاں بھی ہو کامیاب نہیں ہوتا)

معجزہ اور سحر میں فرق

جیسا کہ پہلے ہم نے عرض کیا کہ سحر کا اثر بھی اسباب کے تحت ہوتا ہے وہ اسباب عام لوگوں کے سامنے نہیں ہوتے۔ اور جادوگروں کو ان پوشیدہ اسباب کا پتہ ہوتا ہے۔ اب رہا حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا معجزہ تو اس میں کوئی سبب ظاہر یا پوشیدہ نہیں ہوتا اس میں بلا واسطہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کا فعل حقیقۃً مؤثر ہوتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے آگ کا ٹھنڈا ہو جانا اور موسیٰ علیہ السلام کے لاٹھی مارنے سے سمندر کا پھٹ جانا اور پتھر سے چشموں کا بہہ جانا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مٹھی خاک پھینک دینے سے کافروں کی آنکھوں میں پہنچ جانا مبارک انگلیوں سے پانی کا جاری ہو جانا۔ اور تھوڑی چیز کا زیادہ ہو جانا۔ تھوڑے سے آٹے کی روٹیاں کئی سو آدمیوں کے لئے کافی ہو جانا وغیرہ وغیرہ یہ سب کسی سبب کے تحت نہیں تھا۔ ختم نبوت کے بعد ایک مسلمان کو یہ عقیدہ رکھنا کہ اب کوئی نبی نہیں آسکتا ہر مدعی نبوت ساحر کے کرتبوں کی عقیدت سے اُسے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور اُوپر جو معجزہ اور سحر کا فرق ظاہر ہو گیا اس کے علاوہ دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ سحر گندے اور ناپاک لوگوں سے ظاہر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے نبی طاہرین اور صالحین بندے تھے۔ اس لئے بھی دونوں میں اشتباہ نہیں ہو سکتا۔ اور صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی جادوگر کو یہ طاقت نہیں دی کہ دریا کو پھاڑ دے یا مردوں کو زندہ کر دے یا جمادات سے بات کرا دے۔ اور ان کے علاوہ بھی اُن میں سے کسی کو ایسی چیز پر قدرت نہیں دی جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات تھے۔ نیز صاحب روح المعانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض محققین نے سحر اور معجزہ کے درمیان یوں فرق بتایا ہے کہ معجزہ تحدی کے ساتھ ہوتا تھا یعنی صاحب نبوت کے ہاتھ پر جو کوئی معجزہ ظاہر ہوا اسکی طرف سے نبوت کا دعویٰ ہوتا تھا اور جو معجزہ اس سے ظاہر ہوتا تھا وہ اس کے مقابلہ میں اس طرح کی چیز پیش کرنے کا چیلنج بھی کرتا تھا اور یہ صورت کسی جادوگر اور جھوٹے مدعی نبوت کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی عادت مستمرہ یوں ہی رہی ہے (ص ۳۳۹ ج ۱)

اور اب تو محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ہی ختم ہے۔ بہتیرے جھوٹے مُدعی نبوت پیدا ہوئے اگر کسی نے کوئی کرتب دکھایا بھی تو شعبدہ تھا اور سب جھوٹے اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ جادوگر تحدی یعنی چیلنج نہیں کر سکتے وہ تو مقابلہ سے ڈرتے رہتے ہیں اور ایک جادوگر دوسرے جادوگر کا کاٹ کر دیتا ہے اور تماشا دکھانے والے جادوگروں کو دیکھا ہے کہ بانسری بجتے بجتے اسکی آواز ختم ہو جاتی ہے اور مجمع میں کھڑا ہوا دوسرا جادوگر اسکی آواز بند کر دیتا ہے۔ کسی نبی کے کسی معجزہ کے موافق کوئی کر کے نہیں دکھا سکا اور نہ اسکی کاٹ کر سکا۔ تاریخ اسکی شاہد ہے۔

کرامت اور سحر میں فرق

بہت سے اولیاء اللہ سے کرامت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ حسب تحقیق صوفیاء کرام اس کرامت سے تقرب الی اللہ میں اور رفع درجات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اور بہت مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ صاحب کرامت کو اپنی کرامت کا پتہ بھی نہیں

چلتا اس لئے محقق صوفیہ کے نزدیک کرامت کی کوئی اہمیت نہیں۔ شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ معجزہ اور سحر میں تو فرق ظاہر ہو گیا اب نبوت باقی بھی نہیں رہی تا کہ کسی کو دھوکہ ہو سکے لیکن اولیاء اللہ تو ہوتے ہیں اور اُن سے کرامت کا صدور ہونا ممکن ہے۔ پھر کرامت اور جادو میں فرق ظاہر کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ سمجھ لینا چاہئے کہ کرامت اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں سے ظاہر ہوتی ہے جو عبادت میں اور ذکر اللہ میں اور اطاعت اور فرمانبرداری میں مشغول رہتے ہیں۔ پاک صاف ہوتے ہیں نجاست سے بچتے ہیں۔ جنابت ہو جانے پر جلدی غسل کر لیتے ہیں اور جادو اُن لوگوں کا کام ہے جو گندے اور ناپاک ہوتے ہیں جنہیں اللہ کے نام سے بیر ہوتا ہے اور جو اللہ کی عبادت سے دور بھاگتے ہیں۔ نجاست اور خباثت اور جنابت میں ملوث اور متلبس رہنا اُن کا مزاج بن چکا ہوتا ہے' جو شخص یہ کہے کہ میں ولی صاحب کرامت ہوں اور اُن کا حال وہ ہو جو شیاطین اور اُس کے دوستوں کا ہوتا ہے یعنی طاعت و عبادات اور ذکر اللہ سے دور اور نجاست و جنابت اور خباثت سے بھرپور اس کے ولی ہونے کا خیال کسی مسلمان کو نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کے کرتب کو کرامت کہا جا سکتا ہے۔

سحر فسق بھی ہے اور کفر بھی

صاحب بیان القرآن لکھتے ہیں کہ سحر کے فسق یا کفر وغیرہ ہونے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس کے کلمات کفریہ ہوں مثل استعانت بہ شیاطین یا کواکب وغیرہ تب تو کفر ہے خواہ اس سے کسی کو ضرر پہنچایا جائے یا نفع پہنچایا جائے۔ اور اگر کلمات مباحہ ہوں تو اگر کسی کو خلاف اذن شرعی کسی قسم کا ضرر پہنچایا جائے نہ اور کسی غرض ناجائز میں استعمال کیا جائے۔ تو اس کو عرف میں سحر نہیں کہتے بلکہ عمل یا عزیمت یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں۔ اور مباح ہے۔ البتہ لغت میں لفظ سحر اُسکو بھی شامل ہے کہ ہر تصرف عجیب کو کہا جاتا ہے۔ اور اگر کلمات مفہوم نہ ہوں تو وہ بوجہ احتمال کفر ہونے کے واجب الاحتراز ہے۔ اور یہی تفصیل ہے تمام تعویذ گنڈوں اور نقش وغیرہ میں کہ غیر مفہوم نہ ہوں اور غیر مشروع نہ ہوں اور غرض ناجائز میں استعمال نہ ہوں' اتنی شرطوں سے جائز ہیں ورنہ ناجائز' اور کفر عملی کا اطلاق ہر ناجائز پر صحیح ہے۔

پھر فرمایا: وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ (کہ وہ لوگ ایسی چیز سیکھتے تھے جو اُن کو ضرر دینے والی تھی نفع دینے والی نہ تھی) علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں جادو کی وجہ سے نقصان پہنچے گا۔ اگرچہ دنیا میں ذرا بہت نفع کما لیں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ دنیا میں بھی ان کے لئے ضرر ہے کیونکہ جادو کا ضرر جادوگر کو پہنچ جاتا ہے۔ حکومت اسلام اس کو سزا دے گی۔ اور جادوگری کی بدبختی اس کو لاحق ہو گی۔ اھ

صاحبِ روح المعانی لکھتے ہیں کہ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ماقبل پر معطوف ہے اور اس میں یہ بتایا ہے کہ جادو خالص شر ہے اور ضرر محض ہے ایسا نہیں کہ جیسی بعض ضرر والی چیزیں نفع بھی دے جاتی ہیں۔ (جیسے زہر کا کشتہ اور وہ دوا میں مفید ہو جاتا ہے) اس لئے کہ جادوگر جادو سیکھ کر جادوگری کی باتوں سے محفوظ رہنے کا ارادہ نہیں کرتا تا کہ فی الجملہ کوئی نفع متصور ہو سکے۔ اور یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ سیاق آیت سے یہ ظاہر ہے کہ وہ دونوں جہان میں غیر نافع ہے کیونکہ اس کا تعلق نہ امورِ معاش سے اور نہ معاد سے اور آیت میں جادو سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اھ

اگر کوئی شخص کبھی کوئی نفع جادو کے ذریعہ کسی مسلمان کو اس طرح کا پہنچا دے کہ مسلمانوں سے دفع ضرر کر دے تو گویا یہ ایک

نفع ہے لیکن چونکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور عام طور جادوگر بے دین ہوتے ہیں اس لئے عمومی طور پر جادو مطلقاً ضرر دینے والی چیز ہوئی۔ کوئی بھی جادوگر ایسا نہیں دیکھا گیا جس نے جادو کے زور پر دنیا جمع کر لی ہو جائیداد حاصل کر لی ہو یا حکومت پر قابض ہو گیا ہو۔ ان لوگوں کو ہمیشہ بدحالی میں دیکھا جاتا ہے دین اور اعمال دین سے اور طہارت اور ذکر و عبادت سے تو دور ہوتے ہیں ہیں دنیاوی اعتبار سے بھی میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں رہتے ہیں۔ تماشے دکھا کر یا لوگوں کے کہنے سے دوسروں پر جادو کر کے تھوڑے بہت پیسے وصول کرنے سے زندگی گزارتے ہیں اور چند پیسوں کے لئے دوسروں پر جادو کر دیتے ہیں انکی دنیا و آخرت کی تباہی نظروں کے سامنے ہے۔ اس کے بعد فرمایا: وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (یعنی کتاب اللہ کو چھوڑ کر جو یہودی) جادو کے پیچھے لگے انہیں معلوم ہے کہ جس نے جادو حاصل کیا اور کتاب اللہ کو چھوڑا ان کا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ یہ سب جاننے کے باوجود انہوں نے جادو اختیار کر کے کفر مول لیا) پھر فرمایا: وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ کہ انہوں نے اپنی جانوں کو جو بیچ دیا یعنی جانوں کے بدلہ جادو اور کفر خرید لیا اور اپنی جانوں کو دنیا اور آخرت کی نعمتوں سے محروم کر کے مبتلائے عذاب کر دیا۔ یہ بہت بُرا سودا کیا۔ اگر وہ اس کو جانتے تو ایسا نہ کرتے فی روح المعانی لو کانوا یعلمون ای مذمومیة الشراء المذکور لا متنعوا عنه . وفی معالم التنزیل باعوا به أنفسهم (ای) حظ انفسهم حیث اختاروا السحر و الکفر علی الدین والحق۔

مفسرین نے اشکال کیا ہے کہ پہلے تو وَلَقَدْ عَلِمُوْا فرمایا پھر لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ فرمایا اس میں بظاہر تعارض ہے۔ پھر اس کے دو تین جواب دیئے جن میں سے ایک جواب یہ ہے کہ اُن کا جاننا نہ جاننے کے درجہ میں ہے۔ جب ضرر جانتے ہوئے کسی چیز کو اختیار کیا اور ایمان سے منہ موڑا گویا کہ وہ جاننے کے باوجود نہیں جانتے۔ رُوح المعانی میں یہ بھی لکھا ہے کہ اُنہوں نے عتاب اور عذاب کو تو جانا لیکن اسکی حقیقت اور شدت کو نہ جانا گویا لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ کا مفعول محذوف ہے۔

پھر فرمایا: وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا (الآیۃ) یعنی یہ لوگ اگر اللہ کے پیغمبروں پر ایمان لاتے (جس میں خاتم النبیین محمد ﷺ پر ایمان لانا بھی شامل ہے) اور کفر و معاصی سے بچتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں اسکی جزا دی جاتی۔ جو اس سے بہتر ہے جس کے بدلہ انہوں نے اپنے نفسوں کو بیچا۔ اگر وہ جانتے ہوتے تو آخرت کے ثواب کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے اور خیر کی طرف بڑھتے۔ آخرت کا تھوڑا سا ثواب بھی فانی دنیا کے بہت بڑے نفع سے بھی بہت ہے۔ باقی اور فانی کا فرق خود سمجھ لینا چاہئے۔

جادوگر کی کیا سزا ہے اس کے بارے میں تفصیل ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ منقول و مشہور ہے کہ جادوگر علی الاطلاق قتل کیا جائے۔ جب یہ معلوم ہو کہ جادوگر ہے اس کا یہ کہنا کہ میں اب سے جادو نہ کرونگا توبہ کرتا ہوں قبول نہیں کیا جائے گا۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تکملہ شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں کہ جو سحر کفر ہے اس کا اختیار کرنے والا مرد مُرتد ہو جانے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور جادوگر عورت قتل نہیں کی جائے گی اس لئے کہ مرتدہ کو قتل نہیں کیا جاتا (وہ ہمیشہ قید میں رہے گی الا أن تتوب) اور جو سحر فسق کے درجے میں ہو اس میں سحر کی وجہ سے قتل نہ ہوگا لیکن اگر کوئی ایسا کام ہو جس سے کسی انسان کی ہلاکت ہوگئی یا مریض ہو گیا یا میاں بیوی میں جدائی کرا دی ہو تو زمین میں فساد کرنے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا۔ اور اس صورت میں ساحر اور ساحرہ دونوں قتل کئے جائیں گے کیونکہ اسکی علت ارتداد نہیں بلکہ فساد فی الارض ہے اھ حضرت

جندب بن کعب صحابی رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ایک آدمی کھیل کر رہا ہے اس نے ایک شخص کو ذبح کر دیا اور اُس کا سر جدا کر دیا پھر اُس کا سر واپس جوڑ دیا۔ لوگوں نے دیکھا تو چیخ اٹھے اور کہنے لگے کہ سبحان اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے حضرت جندب نے تلوار نکالی اور اس جادوگر کی گردن ماردی اور فرمایا اگر یہ سچا ہے تو اپنے نفس کو زندہ کرے۔ حضرت جندب کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ: **یضرب ضربۃ فیکون امۃ واحدۃ** کہ یہ ایک ایسی تلوار مارے گا جس کی وجہ سے یہ تنہا ایک اُمت کے برابر درجہ پالے گا۔ (الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ ص ۲۵۰ ج ۱)

چونکہ اس جادوگر کے عمل سے لوگ متاثر ہو کر یوں سمجھ رہے تھے کہ یہ شخص مردوں کو زندہ کرتا ہے اس لئے رفع فساد کی وجہ سے اُس کا قتل ضروری ہوا۔

تفسیر قرطبی میں اس قصے کو اس طرح لکھا ہے کہ ولید بن عقبہ (امیر عراق) کے پاس ایک شخص رسی پر چل رہا تھا اور گدھے کے پیچھے سے اس کی دم میں داخل ہوتا تھا اور اس کے منہ سے نکل جاتا تھا۔ حضرت جندب نے اسکو قتل کر دیا۔ آنحضرت سرور عالم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری اُمت میں وہ شخص ہوگا جس کو جندب کہا جائے گا وہ ایک مرتبہ ایسی تلوار مارے گا جس سے حق اور باطل کے درمیان تفریق کر دیگا۔ (ص ۴۷ ج ۲)

مسئلہ: اگر قرآن وحدیث کے کلمات ہی سے عمل کیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے استعمال کریں تو وہ بھی جائز نہیں۔ مثلاً کسی کو ناحق ضرر پہنچانے کے لئے کوئی تعویذ کیا جائے یا وظیفہ پڑھا جائے۔ اگر چہ وظیفہ اسماء الٰہیہ یا آیات قرآنیہ ہی کا ہو وہ بھی حرام ہے۔ (معارف القرآن)

مسئلہ: تعویذ گنڈے وغیرہ جو عامل کرتے ہیں ان میں بھی اگر جنات وشیاطین سے استمداد ہو تو بحکم سحر ہیں اور حرام ہیں اور اگر الفاظ مشتبہ ہوں معنی معلوم نہ ہوں اور شیاطین اور بتوں سے استمداد کا احتمال ہو تو بھی حرام ہے۔

فائدہ: عام طور پر عوام میں ایک قصہ مشہور ہے جو ہاروت ماروت اور زہرہ کے بارے میں ہے کہ ان دونوں فرشتوں کو قوت شہوانیہ دے دی گئی تھی' اور زمین میں اُتار دیئے گئے تھے اور وہ زمین میں آئے تو زہرہ سے شہوت والی مطلب براری کا ارادہ کیا اور اسکو آمادہ کرنے کی کوشش کی اس پر اس نے ان سے اسم اعظم پوچھ لیا جس کے ذریعہ وہ آسمان پر چلی گئی اور وہاں ستارہ بن گئی۔ ان دونوں فرشتوں سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دنیا کا عذاب چاہتے ہو یا آخرت کا۔ تو انہوں نے دنیا کے عذاب کو آخرت کے عذاب پر ترجیح دی اور وہ بابل کے کنویں میں اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں اور قیامت تک عذاب ہوگا۔ اس قصہ کو علامہ ابن جوزی نے دو طریق سے نقل کیا ہے۔ علامہ قرطبی اور صاحب روح المعانی نے بھی اس قصہ کی تردید کی ہے۔

قال القرطبی انه قول تدفعه الأصول فی الملائکة هم أمناء الله علی وحیه وسفرائه إلی رسله لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ' بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ. یُسَبِّحُوْنَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ہ وأما العقل فلا ینکر وقوع المعصیة من الملائکة وان یوجد منهم خلاف ما کلفوه ویخلق فیهم الشهوات اذفی قدرة الله تعالیٰ کل موهوم ومن هذا خوف الانبیاء والاولیاء الفضلاء العلماء لکن وقوع هذا الجائز لا یدرک الا بالسمع ولم یصح. (ص ۵۲ ج ۲)

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں:

قدأنکره جماعة منهم القاضی عیاض' وذکر أن ماذکره أهل الاخبار ونقله المفسرون فی قصة

هاروت وماروت لم يردمنه شئ لا سقيم ولا صحيح. عن رسول الله ﷺ، وليس هو شيئاً يوخذ بالقياس، وذكر فى البحر أن جميع ذلك لا يصح منه شئ، ولم يصح أن رسول الله ﷺ كان يلعن الزهرة. ولا ابن عمر رضى الله عنهما خلافا لمن رواهٗ وقال الامام الرازى بعد أن ذكر الرواية فى ذلك ان هذه الرواية فاسدة مردودة غير مقبولة ونص الشهاب العراقى. على أن من اعتقد فى هاروت و ماروت أنهما ملكان يعذبان على خطيئتهما مع الزهرة فهو كافر بالله تعالىٰ العظيم فان الملائكة معصومون ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ. لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾ والزهرة كانت يوم خلق الله تعالىٰ السمٰوت والارض والقول بأنها تمثلت لها فكان ما كان وردت إلى مكانها غير معقول ولا مقبول. واعترض الامام السيوطى على من أنكر القصة بأن الامام احمد و ابن حبان والبيهقى وغيرهم رووها مرفوعة وموقوفة على علىّ وابن عباس وابن عمر وابن مسعود رضى الله عنهم باسانيد عديدة صحيحة يكادالواقف عليها بصحتها لكثرتها وقوة مخرجيها وذهب بعض المحققين ان ماروى مروى حكاية لما قاله اليهود وهو باطل فى نفسه وبطلانه فى نفسه لا ينا فى صحة الرواية ولا يرد ما قاله الامام السيوطى عليه انما يرد على المنكرين بالكلية. (ص۳۴۱ ج ۱) اقوال صحة الند لا تستلزم صحة الرواية فان من لوازم الصحة اشياء أخر غير صحة الند ذكرها العلماء فى كتب الاصول، فلوصح بعض الاسانيد على رائ الامام السيوطى لا يستلزم منه قبول الرواية.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۗ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

اے ایمان والو! تم لفظ رَاعِنَا نہ کہو اور لفظ اُنْظُرْنَا کہو اور سنو! اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے

رَاعِنَا کہنے کی ممانعت اور یہود کی شرارت

تفسیر: یہودیوں کی بہت سی شرارتوں میں سے ایک یہ بات تھی کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو لفظ رَاعِنَا کہتے تھے۔ یہ عربی زبان کا لفظ بھی ہے اور عبرانی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری رعایت کیجئے۔ اور عبرانی زبان میں یہ لفظ بددعا کے معنی میں ہے۔ یہ لوگ شرارت اور بددعا دینے کی نیت سے اس لفظ کو استعمال کرتے تھے تاکہ حضور اقدس ﷺ اور دوسرے سُننے والے یہ سمجھیں کہ یہ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری رعایت فرمائیے اور ہماری طرف توجہ فرمائیے۔ اور اندر سے دل میں بُرے معنی کی نیت کرتے تھے۔ سورہ نساء میں فرمایا: وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ۔ مسلمان عربی زبان کے اعتبار سے رَاعِنَا یَا مُحَمَّدُ کہتے تھے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ یہودیوں کی زبان جانتے تھے اُنہوں نے محسوس کر لیا کہ یہودی رَاعِنَا یَا مُحَمَّدُ کہتے ہیں اور آپس میں ہنستے ہیں۔ لہٰذا اُنہوں نے یہودیوں سے کہا کہ آئندہ تم میں سے کسی نے یہ لفظ بولا تو گردن ماردوں گا۔ وہ کہنے لگے کہ تم لوگ بھی تو کہتے ہو اس پر یہ آیت اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی کہ اے مسلمانو! تم رَاعِنَا نہ کہو اس کی بجائے لفظ اُنْظُرْنَا کہو اس کا معنی بھی وہی ہے کہ ہماری طرف دیکھئے اور

توجہ فرمائیے۔ لٰہذا وہ لفظ بولا جائے جس کے معنی میں دوسرے معنی کا اشتباہ نہ ہو سکے اور یہودی یہ نہ کہہ سکیں تم بھی لفظ رَاعِنَا بولتے ہو تو ہم نے بھی بول دیا۔ نیز مسلمانوں سے خطاب ہوا کہ تم بات کو سنو اور اشاعت کرو اور یہ بھی فرمایا کہ کافروں کے لئے عذاب الیم ہے وہ آخرت میں اپنی حرکتوں کی دردناک سزا پالیں گے۔ (عن معالم التنزیل ص ۱۰۲ ج ۱)

بیان القرآن میں لکھا ہے کہ اس حکم سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر اپنے کسی فعل مباح سے کسی کو گنجائش گناہ کرنے کی ملے تو وہ فعل خود اُس کے حق میں مباح نہیں رہتا جیسے مثلاً عالم کے کسی فعل سے کوئی جاہل سند لے کر خلاف شرع کام کرنے لگے تو اگر وہ فعل ضروری نہ ہوگا تو خود اس عالم کے لئے بھی منع ہو جائے گا۔

لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا سے استنباط احکام

اور ابوبکر جصاص اُحکام القرآن میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اس میں دلالت ہے اس بات پر کہ جس لفظ میں احتمال خیر و شر دونوں کا ہو اس کا بولنا جائز نہیں جب تک کوئی ایسی چیز اس کے ساتھ نہ ملا لی جائے جس سے وہ خیر ہی کے لئے متعین ہو جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کی ہنسی کرنا، مذاق اُڑانا ممنوع ہے۔ اور ہر وہ لفظ ممنوع ہے جس میں احتمال مذاق اُڑانے کا ہو (چونکہ یہودی لفظ راعنا کہہ کر ہنستے تھے اور مذاق بناتے تھے اس لئے جصاص نے اس آیت کے ذیل میں یہ بات لکھی ہے)۔

مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو کافروں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا قول میں بھی اور فعل میں بھی۔ اس کے بعد مسند احمد اور سنن اُبی داؤد سے حدیث نقل کی ہے۔ **من تشبه بقوم فهو منهم** (کہ جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ اُنہیں میں سے ہے) اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس میں دلالت ہے اس بات پر کہ کافروں کے ساتھ اُن کے اقوال اور افعال اور لباس اور تہوار اور عبادات وغیرہ میں مشابہت اختیار کرنا سخت ممنوع ہے۔ اور مُشابہت کرنے والوں کے لئے تہدید اور وعید ہے۔

متعدد احادیث میں اس کا حکم دیا گیا ہے کہ خطاب اور گفتگو میں اچھے الفاظ استعمال کئے جائیں اور اُن الفاظ سے بچیں جو بُرے اور نامُناسب معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی لئے کسی کو مالک الاملاک یعنی شہنشاہ کہنے سے منع فرمایا (کیونکہ سب بادشاہوں کا بادشاہ اللہ تعالیٰ ہی ہے) ایک لڑکی کا نام عاصیہ (گنہگار) تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کا نام جمیلہ رکھ دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام اور باندی کو عَبْدِیْ اور اَمَتِیْ نہ کہے۔ تم سب اللہ کے بندے اور تمہاری سب عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں۔ عَبْدِیْ اور اَمَتِیْ کی بجائے غُلَامِیْ اور جَارِیَتِیْ کہا جائے۔ (یہ سب احادیث مشکوٰۃ المصابیح باب الاسامی میں مذکور ہیں)

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ

اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور مشرکین یہ پسند نہیں کرتے کہ نازل کی جائے تمہارے اُوپر

خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

تمہارے رب کی طرف سے کوئی خیر۔ اور اللہ تعالیٰ مخصوص فرمائے اپنی رحمت سے جس کو چاہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

یہودیوں اور مشرکوں کو یہ گوارا نہیں کہ مسلمانوں پر کوئی خیر نازل ہو

تفسیر: جب مسلمان یہودیوں سے کہتے تھے کہ تم اسلام قبول کرو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے تھے کہ تم جس دین کی طرف بلاتے ہو ہمارے دین سے بہتر نہیں ہے اور ہماری خواہش ہے کہ تمہارا دین بہتر ہوتا تو ہم اس کا اتباع کر لیتے انکی تردید میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور بتایا کہ اے مسلمانو! ان کو یہ پسند نہیں ہے تم کو کسی طرح کی خیر نصیب ہو یہودی تو اس حسد میں مرے جا رہے ہیں کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے کیوں آیا اور حضرت اسحاقؑ کی اولاد میں کیوں نہ ہوا اور مشرکین اس لئے ناراض ہیں کہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین پیش فرمایا وہ ان کی خواہشوں کے خلاف ہے ان کو توحید پسند نہیں۔ اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے محبت ہے جب اُن کی تردید کی جاتی ہے تو انہیں بُرا معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یہود اور مشرکین کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تمہارے خیالات کا پابند نہیں وہ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر دے وہ جسے چاہے نبوت سے سرفراز فرمائے اور جسے چاہے ہدایت دے۔ اس میں کسی کو اعتراض کرنے اور حسد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ (من معالم التنزیل ص ۱۰۳ ج ا روح المعانی ص ۳۵۰ ج ۱)

مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت شریفہ میں اہل کتاب اور مشرکین کی سخت دشمنی کا ذکر فرمایا ہے تا کہ اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان مودّت اور محبت بالکل منقطع ہو جائے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اس انعام کو بیان فرمایا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مومنین کو عطا فرمایا یعنی شریعت کاملہ عطا فرمائی مَنْ یَّشَاءُ کا عموم خود آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین سب کو شامل ہے۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى
ہم جس کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اُس جیسی آیت لے آتے ہیں۔ کیا تو نے نہیں جانا کہ بلاشبہ اللہ ہر
كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَا لَكُمۡ
چیز پر قادر ہے۔ کیا تو نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ کے لئے آسمان اور زمین کا ملک ہے اور تمہارے لئے
مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۰۷﴾
اللہ کے سوا کوئی ولی اور مددگار نہیں

نسخ آیات کی حکمت

تفسیر: قرآن مجید کے بعض احکام اللہ تعالیٰ منسوخ فرما دیتے تھے کبھی ایک حکم دیا پھر اس سے منع فرما دیا اور اُس کے خلاف حکم دیدیا کبھی ایک حکم کے بجائے دوسرا حکم نازل فرما دیا اس کو دیکھ کر مشرکین نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آج ایک بات کہتے ہیں اور کل کو اس سے رجوع کر لیتے ہیں اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہوتا تو اس میں منسوخیت والی بات کیوں ہوتی معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے بیان سے کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ سورۂ نحل میں ان دشمنوں کی بات کی

اس طرح بیان فرمایا: وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ (اور جب ہم کسی آیت کو ایک آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ نازل فرماتا ہے، تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ بس تو افتراء ہی کرنے والا ہے)

اللہ جل شانہ نے اس آیت شریفہ میں ان کی جہالت والی بات کی تردید فرمائی اور فرمایا کہ ہم جس کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔ منسوخ کرنے میں حکمت ہوتی ہے اور بندوں کا اس میں فائدہ ہوتا ہے۔ یا تو ان کے لئے دوسرا حکم اَنفع اور اسہل ہوتا ہے یا اس میں منفعت اور ثواب پہلی جیسی آیت کی طرح ہوتا ہے۔ سخت حکم کو آسان کر دیا گیا تو بندوں کے لئے یہ بھی بہتر ہے کہ اس میں عمل کے لئے آسانی ہوگئی اور اگر آسانی کی بجائے کوئی سخت حکم آ گیا تو یہ بھی بہتر ہے کیونکہ عمل جس قدر مشکل ہوگا اسی قدر ثواب زیادہ ہوگا۔

منسوخ ہونے کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ عبارت قرآنیہ باقی رہے اور اس کا حکم منسوخ ہو جائے اس کو منسوخ الحکم کہتے ہیں۔ جیسے عورت کے لئے شوہر کی وفات پر عدت ایک سال تک رکھی گئی تھی بعد میں چار مہینے دس دن کر دی گئی۔ اور جس آیت میں ایک سال کا ذکر ہے وہ بھی مصحف میں باقی ہے۔ (مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ) اور نسخ کی ایک صورت یہ ہے کہ اسکی تلاوت منسوخ ہو جائے اور حکم باقی رہے۔ اس کو منسوخ التلاوہ کہتے ہیں۔ اسکی مثال میں آیت رجم کو پیش کیا جاتا ہے اور منسوخ کی ایک صورت یہ ہے کہ پہلا حکم منسوخ ہو جائے اور اسکی جگہ دوسرا حکم آ جائے جیسے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا منسوخ کیا گیا اور اس کی بجائے نماز میں استقبال کعبہ کا حکم ہوا اور جیسے پہلے اقارب کے لئے وصیت کرنا واجب تھا پھر وہ آیت میراث سے منسوخ ہوگئی۔ اور بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں امر اوّل منسوخ ہو گیا اور اسکی جگہ دوسرا حکم نافذ نہیں کیا گیا جیسے سورۂ ممتحنہ میں اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ منسوخ کر دیا گیا اور اس کے بجائے دوسرا حکم نازل نہیں ہوا۔ نَنْسَخْ کے ساتھ نُنْسِهَا بھی فرمایا جس کا ترجمہ بھلا دینے کا ہے۔ بعض آیات ایسی تھیں جن کو بالکل ہی مصاحف سے اور ذہنوں سے بھلا دیا گیا تھا۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ سورۂ احزاب سورۂ بقرہ جیسی تھی۔ اس کا اکثر حصہ اُٹھا لیا گیا نہ تلاوت باقی رہی نہ حکم باقی رہا۔ درمنثور ص ۱۰۵ ج ۱ میں ہے کہ حضرت سہل بن حنیف سے مروی ہے کہ ایک رات کو ایک صحابی تہجد پڑھنے کھڑے ہوئے انہیں ایک سورت یاد تھی انہوں نے اسے نماز میں پڑھنا چاہا تو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے علاوہ وہ کچھ نہ پڑھ سکے اور اُس رات میں چند صحابہ کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا صبح کو جب بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ سورت گزشتہ رات منسوخ ہوگئی جو لوگوں کے سینوں سے اور ہر اُس جگہ سے محو کر دی گئی جہاں جہاں لکھی ہوئی تھی۔

وأما على قرّاءة ننسأها بفتح النون الاوّل وفتح السين مهموزا فمعناه نؤخرها فلا نبدلها أو نرفع تلاوتها ونؤخر حكمها أو نؤخرها ونتركها في اللوح المحفوظ فلا ننزل۔ (معالم التنزیل ص ۱۰۴ ج ۱)

پھر فرمایا کہ اے مخاطب کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اُسے حکم باقی رکھنے پر بھی قدرت ہے منسوخ کرنے پر بھی قدرت ہے ذہنوں سے بھلا دینے پر بھی قدرت ہے۔ وہ حکمت کے مطابق جو چاہے کرے جس حکم کو چاہے باقی رکھے جس کو چاہے منسوخ فرمائے۔ کسی کو کیا اعتراض ہے اگر کوئی اللہ پر اعتراض کرے گا تو اسکی سزا بھگت لے گا آسمان و زمین میں اس کی بادشاہت ہے جب وہ کافروں پر عذاب بھیجے گا ان کا کوئی یار اور مددگار اور دوست اور رشتہ دار اور کارساز نہیں ملے گا۔

قال ابن کثیر یرشد عباده تعالٰی بهذا إلی أنه المتصرف فی خلقه بما یشاء فله الخلق والأمر وهو المتصرف فکما خلقهم کما یشاء یسعد من یشاء ویشقی من یشاء ویصحح من یشاء ویمرض من یشاء ویوفق من یشاء ویخذل من یشاء کذالک یحکم فی عباده بما یشاء فیحل ما یشاء ویحرم مایشاء ویبیح ما یشاء ویحظر مایشاء وهو الذی یحکم بما یرید لا معقب لحکمه ولا یسئل عما یفعل وهم یسئلون ویختبر عباده وطاعتهم لرسله بالنسخ فیامر بالشیٔ لما فیه من المصلحة التی یعلمها تعالٰی ثم ینهی عنه لما یعلمه تعالٰی فالطاعة کل الطاعة فی امتثال أمره واتباع رسله فی تصدیق ما أخبروا وامتثال ما أمروا وترک ما عنه زجروا.

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو جیسا کہ اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کئے گئے اور جو شخص ایمان کے بدلہ

الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

کفر کو اختیار کرے سو وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا۔

بے جا سوالات کی ممانعت

تفسیر: معالم التنزیل میں اس آیت شریفہ کے دو شان نزول لکھے ہیں اوّل تو یہ کہ یہودیوں نے یوں کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم آسمان سے اسی طرح پوری کتاب بیک وقت لا کر پیش کرو جیسے موسیٰ علیہ السلام توریت شریف لائے تھے اور دوسرا یہ کہ مشرکین مکہ نے کہا کہ ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے یہاں تک کہ اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ۔ ممکن ہے دونوں باتوں کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ہو اللہ جل شانہٗ نے تنبیہ فرمائی کہ ایسے سوالات نہ کرو جیسے موسیٰ علیہ السلام سے پہلے سوالات کئے گئے بنی اسرائیل نے اُن سے کہا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً کہ ہمیں اللہ پاک کو آمنے سامنے دکھادو دلائل واضحہ سامنے ہیں عقل مند کیلئے کافی ہیں بے تکے سوالات کی کوئی ضرورت نہیں اور جن کو اعتراض ہی کرنا مقصود ہے وہ تو ہر فرمائش پوری ہو جانے پر بھی ماننے والے نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو پوری کتاب بیک وقت لائے تھے۔ پھر بھی ظالموں نے اُسے کہاں مانا؟ سورہ قصص میں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ۔

(سو جب ہماری طرف سے اُن لوگوں کے پاس حق پہنچا تو کہنے لگے ان کو ایسی کتاب کیوں نہ ملی جیسی موسیٰ کو ملی تھی کیا جو کتاب موسیٰ کو ملی تھی اس سے قبل یہ لوگ اُس کے منکر نہیں ہوئے۔ ان لوگوں نے کہا یہ دونوں جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور یوں بھی کہتے تھے کہ ہم تو ہر ایک کے منکر ہیں)

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو تم پر حج فرض کیا گیا لہٰذا حج کرو اس پر ایک آدمی نے سوال کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے۔ اس پر آپ خاموش رہے۔ یہاں تک کہ سائل نے تین بار سوال کیا، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا اور تم اس کو نہیں کر سکتے تھے پھر فرمایا کہ میں جب تک تم کو چھوڑے رکھوں (یعنی کوئی حکم نہ بتاؤں) تم بھی مجھے چھوڑے رکھو (یعنی سوالات نہ کرو) کیونکہ تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ سوالات زیادہ کرتے تھے اور اپنے نبیوں کے خلاف چلتے تھے سو میں جب کسی چیز کا

حکم کروں تو جہاں تک ممکن ہو اس پر عمل کرو اور اگر میں کسی چیز سے منع کردوں تو اُسے چھوڑ دو۔

ایک اور حدیث میں ہے جو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے قیل قال اور کثرتِ سوال اور اضاعت المال کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۱۹ از بخاری و مسلم)

آیت کا شان نزول خواہ وہی ہو جو معالم التنزیل سے نقل کیا گیا لیکن اس میں مسلمانوں کو بھی یہ نصیحت مل گئی کہ جو احکام ہیں اُن میں لگیں بے تکے سوال نہ کریں۔ قیل وقال میں وقت ضائع نہ کریں اور ضرورت کی بات پوچھیں۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ
اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ دل سے یہ چاہتے ہیں کہ کاش تم کو تمہارے ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹا لیں
اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ
اپنے دلوں کے حسد کے باعث، بعد اس کے کہ اُن کے لئے حق ظاہر ہو گیا ہے، سو تم معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ
بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا
اپنا حکم بھیج دے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جو کچھ
تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾
پہلے سے بھیج دو گے اپنی جانوں کے لئے کوئی خیر اُسے اللہ کے پاس پالو گے، بے شک اللہ اُن کاموں کا دیکھنے والا ہے جن کو تم کرتے ہو

کفار چاہتے ہیں کہ تمہیں کافر بنالیں

تفسیر: یہودیوں کو یہ تو خوب واضح طریقے پر معلوم ہو گیا تھا کہ نبی عربی محمد رسول اللہ ﷺ واقعی اللہ کے نبی ہیں لیکن اُن کو حسد کھا گیا خود تو مسلمان ہوتے ہی نہ تھے (الاقلیلا منھم) اور طرح طرح کی کوششیں کرتے تھے کہ عرب بھی مسلمان نہ ہوں اور جو لوگ مسلمان ہو چکے انکو واپس کرلیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اُن کے قلبی ارادوں سے مطلع فرمایا تا کہ اُن سے بچتے رہیں اور اُن کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئیں اور اُن کی جھوٹی ہمدردی کو کوئی حیثیت نہ دیں۔ چونکہ مسلمان اور یہودی ایک ہی شہر یعنی مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور اس وقت تک ظاہری اسباب کے اعتبار سے مسلمانوں کے غلبہ کی صورت ظاہر نہ ہوئی تھی اس لئے مسلمانوں سے فرمایا کہ تم معاف اور درگزر کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے منجملہ اس قدرت کے یہ بھی ہے کہ وہ تم کو ان پر غلبہ دے دے چنانچہ اس کے بعد وہ دن آیا کہ قبیلہ بنی نضیر کو مسلمانوں نے خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا اور یہود کے دوسرے قبیلہ بنو قریظہ کے مرد قتل کئے گئے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ نمازیں قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور جو کچھ اپنی جانوں کے لئے کوئی بھلائی پہلے سے بھیج دو گے اُسے اللہ کے پاس پالو گے۔ اس میں اعمالِ صالحہ میں مشغول رہنے اور جانی و مالی عبادت ادا کرتے رہنے کا حکم دیا جیسا کہ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا میں

صبر کا حکم دیا۔ صبر اور صلاۃ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں جیسا کہ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ میں یہ بات واضح طور پر بتا دی گئی ہے۔ اعمال صالحہ میں یہ بھی تاثیر ہے کہ دشمن پر غالب ہونے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ دنیا میں بھی ان سے فلاح اور کامیابی حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ان کا بدل ملے گا یہاں سے جو کوئی خیر بھیجیں گے اللہ تعالیٰ کے ہاں جمع رہے گی وہاں جائیں گے تو پالیں گے۔ آخر میں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو دیکھتا ہے) ہر خیر و شر کا اُسے علم ہے۔ جو شخص خیر یا شر لے کر پہنچے اس کے مطابق جزا اور سزا کا مستحق ہوگا قال ابن کثیر وھذا الکلام وان کان قد خرج مخرج الخبر فان فیه وعداً ووعیداً وأمراً وزجراً وذلک أنه علم القوم أنه بصیر بجمیع أعمالھم لیجدُّوا فی طاعته اذکان ذلک مذخوراً لھم عنده حتی یثیبھم علیه.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جو شخص ایک کھجور کے برابر حلال کمائی سے صدقہ کر دے اور اللہ تعالیٰ حلال ہی کو قبول فرماتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمالیتا ہے پھر اسکی تربیت فرماتا ہے (یعنی اس کو بڑھاتا رہتا ہے) جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنے گھوڑے کے بچہ کی تربیت کرتا رہتا ہے۔ (بڑھتے بڑھتے وہ بہت زیادہ ہوگا۔ یہاں تک کہ پہاڑ کے برابر ہو جائے گا۔ (صحیح بخاری ص ۱۸۹ ج ۱) جب قیامت کے دن ثواب ملنے لگے گا تو کھجور کے برابر جو چیز دی تھی اُس کا ثواب اتنا زیادہ ملے گا جیسے اُس نے اللہ کی راہ میں پہاڑ خرچ کر دیا ہو۔

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا

اور انہوں نے کہا کہ ہرگز کوئی شخص جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے اس کے جو یہودی ہو یا نصرانی ہو یہ اُن کی آرزوئیں ہیں' آپ فرما دیجئے کہ لے آؤ

بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ

اپنی دلیل اگر تم سچے ہو ہاں جس نے اپنی ذات کو اللہ کی فرمانبرداری کے لئے جھکا دیا اور وہ محسن ہو تو اُس کے لئے

اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اس کا اجر ہے اس کے رب کے پاس' اور ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں' اور نہ یہ لوگ رنجیدہ ہوں گے۔

یہود و نصارٰی کا قول کہ جنت میں ہم ہی جائینگے اور اسکی تردید

تفسیر: اس آیت شریفہ میں یہود اور نصارٰی کا یہ دعویٰ ذکر فرمایا ہے کہ جنت میں یہود و نصارٰی کے علاوہ ہرگز کوئی داخل نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے بارے میں یہ کہا کہ صرف ہم جنتی ہیں اور نصارٰی نے اپنے بارے میں یہی کہا دونوں فریق باوجودیکہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تحریف کر بیٹھے اور اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے رسول حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی' اور نصارٰی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں شرک داخل کر دیا۔ اس سب کے باوجود دونوں جماعتوں کو یہ غرور تھا اور اب بھی ہے کہ صرف ہم ہی جنتی ہیں۔ کفر اختیار کریں پھر بھی جنتی ہوں یہ اُن کی سراپا جہالت' حماقت اور سفاہت ہے۔ اور اُن کا یہ دعویٰ بالکل بے بُنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ کہ یہ اُنکی آرزوئیں ہیں۔ صرف آرزو سے کچھ نہیں ہوتا جب تک ایمان نہ ہو نجات نہیں ہو سکتی۔ پھر فرمایا قُلْ هَاتُوْا

بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آپ ان سے فرمادیجئے کہ تم اگر اپنی آرزوؤں میں سچے ہو تو اسکی دلیل پیش کرو) دعوٰی بلادلیل بلاسند بلاحجت کیسے مانا جائے گا؟ یہود و نصاریٰ کو بڑا غرور تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہم مقربان الٰہی ہیں سورۂ مائدہ میں ہے کہ انہوں نے کہا۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس کے محبوب ہیں) اولاد تو اسکی ہے ہی نہیں۔ یہ عقیدہ شرکیہ ہے کہ اسکی اولاد ہو، شرکیہ عقیدہ رکھنے والا اور اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے والا اللہ تعالیٰ کا محبوب اور مقرب کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنی حماقت سے اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے بہانے سے وہ یہی باطل خیال جمائے ہوئے ہیں کہ صرف ہماری ہی نجات ہوگی اور صرف ہم ہی جنتی ہیں یہودیوں کا دین تو خاندانی دین ہے وہ اپنے خاص خاندان کے باہر اپنے دین کی تبلیغ کرتے ہی نہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اُن کے نزدیک ساری دنیائے انسانیت کے لئے اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا کوئی دین نہیں ہے صرف اپنے خیال سے اپنی نجات کا یقین کر بیٹھنا اور یہ سمجھ لینا کہ ہم ہی جنتی ہیں اور باقی سارے انسانوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ اُن کے لئے خالق و مالک کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں جسے اختیار کر کے وہ مستحق جنت بنیں۔ سراسر خود فریبی ہے۔

نصاریٰ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے سمجھے جاتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ہم جس دین پر ہیں وہ دین نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دے کر بھیجا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہو کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں یا یہ فرمایا ہو کہ میری اور میری والدہ کی عبادت کرو یا یہ فرمایا ہو کہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے اور میرے قتل کے بعد جو شخص یہ عقیدہ رکھے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے کو قتل کرا کر اُن سب لوگوں کے گناہوں کا کفارہ کر دیا جو اُن کو اللہ کا بیٹا مانیں' ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ سب باتیں نصاریٰ کی خود تراشیدہ ہیں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے کوئی بات بھی نہیں فرمائی انہوں نے تو صرف اللہ کی عبادت کرنے کی تبلیغ کی اور نصاریٰ جو کچھ کہتے ہیں اُن کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بتائی ہیں۔ یہ باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد اُن کے جھوٹے ماننے والوں نے کئی سو سال کے بعد تجویز کیں کیونکہ اس میں تن آسانی ہے اور پورے گناہ کرتے ہوئے مغفرت اور نجات کی گارنٹی ہے اس لئے نصاریٰ نے ان باتوں کو بغیر تحقیق کے قبول کر رکھا ہے اتوار کے دن پادری کہہ دیتا ہے کہ میں نے اس ہفتہ کے سب گناہ معاف کر دیئے یہ کیسی خلاف عقل بات ہے کہ نافرمانی کی ہے خدائے پاک کی اور معاف کر رہی ہے مخلوق۔ اور پادریوں کو گناہ کے معاف کرنے میں خداوند تعالیٰ کا نائب مانتے ہیں ان کو یہ نیابت کہاں سے ملی کس نے ان کو نائب بنایا؟ ہر عقلمند کے سامنے یہ سوالات آتے ہیں۔ یہ سب کچھ نصاریٰ کا اپنا بنایا ہوا دین ہے۔ اور اوپر سے اس دھوکہ اور آرزو میں پڑے ہوئے ہیں کہ صرف ہماری ہی نجات ہوگی اور ہم ہی جنتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ کوئی بات بلا دلیل قبول نہیں ہوتی اور دنیا میں سب اسی قانون پر چلتے ہیں۔ لیکن آخرت کے بارے میں جہاں دوزخ کے دائمی عذاب سے نجات پانے کی ضرورت ہوگی۔ صرف خوش فہمی اور گمان اور خیالات اور اوہام اور آرزوؤں پر اکتفاء کئے ہوئے ہیں۔ ھداھم اللہ تعالیٰ

یہود و نصاریٰ کے علاوہ کفار کی دوسری قومیں بھی اپنی بارے میں خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں اور ان سب نے محض جھوٹی آرزوؤں کا سہارا لے رکھا ہے۔ انکے پاس ان کے دین کے حق ہونے کی اور اس بات کی کہ ان کا دین یوم آخرت میں ذریعہ نجات بنے گا کوئی دلیل نہیں ہے اور مشرکوں کی بیوقوفی دیکھو کہ پیدا کیا اللہ نے اور کھانے کو وہی دیتا ہے اور انسانوں کی ضرورت کا سامان اسی نے پیدا فرمایا ہے لیکن پرستش اور پوجا اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی کرتے ہیں اور اس میں نجات سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو سمجھ دے۔

عند اللہ جنتی کون ہے

یہود و نصاریٰ کے دعویٰ کی تردید کرنے اور اُن سے دلیل طلب کرنے کے بعد حق تعالیٰ شانہٗ نے ارشاد فرمایا: بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (الآیۃ) یعنی دوسرے لوگ کیوں جنت میں داخل نہ ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ کا قانون تو یہ ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو اور اپنی ذات کو اللہ کے احکام کی تعمیل میں جھکا دے اور وہ صفتِ احسان سے متصف بھی ہو تو اس کا اجر اُس کے رب کے پاس ضرور ملے گا۔ جو جنت کے داخلے کی صورت میں ہوگا۔ ان لوگوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ غمگین ہونے کا کوئی موقعہ ہے۔ یہ عمومی قانون ہے جو بھی اس پر عمل کریگا داخلہ جنت کا مستحق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے کسی کی قرابت رشتہ داری نہیں ہے اور نہ کوئی خواہ مخواہ محبوب اور مقرب بن جاتا ہے۔ ایمان پر دخول جنت کا مدار ہے۔

لفظ مُحْسِنٌ لفظ احسان سے مشتق ہے جو حسن سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے اچھے طریقے سے کام کرنا اور عمدگی کے ساتھ انجام دینا اس میں احسان عقیدہ اور احسان عمل سب کچھ داخل ہے۔ بعض مفسرین نے محسن کا ترجمہ مخلص سے کیا ہے اصل بات یہ ہے کہ عقیدہ بھی صحیح ہونا لازم ہے اور عمل بھی صحیح ہونا ضروری ہے۔ جس کا عقیدہ رسول اکرم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے عقیدوں کے خلاف ہو وہ عقیدہ میں محسن نہیں ہے لہٰذا اسکی نجات نہیں ہے۔ اس نے اپنی ذات کو اللہ کے لئے نہیں جھکایا وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول کی تکذیب کرتا ہے۔ لہٰذا مستحق نجات نہیں، اور جس شخص کا عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق نہیں ہے یا نیت میں اخلاص نہیں یعنی اللہ کی رضا مطلوب نہیں۔ اس کا وہ عمل مردود ہے۔ اللہ کی محبت کا دعویٰ ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہ ہو تو یہ دعویٰ جھوٹا ہے عقیدہ اور عمل دونوں میں اخلاص ضروری ہے منافق عقیدہ میں مخلص نہ تھے اور جو لوگ عقیدہ ٹھیک رکھتے ہیں لیکن عمل اللہ کی رضا کے لئے نہیں کرتے دکھاوے کیلئے اور دنیاوی جاہ و عزت حاصل کرنے کیلئے کرتے ہیں انکے عمل کا آخرت میں کوئی ثواب نہیں۔ سورہ کہف کے آخیر میں فرمایا: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا۔ سو جو شخص اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہے اُسے چاہئے کہ عمل صالح کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے۔

کافروں اور مشرکوں میں جو لوگ کوئی عمل کرتے ہیں اگر ان میں اللہ کی رضا کو مقصود رکھتے ہوں تب بھی وہ معتبر نہیں اور آخرت میں اس کا کوئی ثواب نہیں۔ کیونکہ عقیدہ کے اعتبار سے گمراہ ہیں اور اللہ کے دین پر نہیں ہیں ان کے لئے سورۂ فرقان میں فرمایا: وَقَدِمْنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا اور ہم اُن کے کاموں کی طرف جو وہ کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو اُن کو ایسا کر دیں گے جیسے پریشان غبار شاید کوئی شخص اپنی جہالت سے یہ سوال کرے کہ آیت میں مسلمان ہونے کی شرط نہیں ہے پھر یہ شرط کہاں سے آ گئی اس کا جواب یہ ہے کہ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ اور وَهُوَ مُحْسِنٌ سے ہی یہ قید ثابت ہوتی ہے اور دوسری آیات بھی پیش نظر رکھنا لازم ہے سورۂ آلِ عمران کی آیت وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ کو پیش نظر رکھیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ
اور کہا یہود نے کہ نصاریٰ کسی چیز پر نہیں، اور نصاریٰ نے کہا کہ یہودی

عَلٰى شَىْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ

کسی چیز پر نہیں، حالانکہ وہ لوگ کتاب پڑھتے ہیں۔ ایسا ہی کہا اُن لوگوں نے جو نہیں جانتے انہیں کی سی بات،

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

پس اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن اس بات میں جس میں وہ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں

یہود و نصاریٰ کا آپس میں نزاع اور اُنکی باتوں کی تردید

تفسیر: تفسیر درمنثور ص ۱۰۸ ج ۱ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل ہے کہ جب نجران کے نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہودیوں کے علماء بھی وہاں پہنچے دونوں فریقوں نے وہیں خدمت عالی میں حاضر ہوتے ہوئے آپس میں مباحثہ شروع کردیا۔ یہودیوں میں ایک شخص رافع بن حریملہ تھا۔ اس نے نصاریٰ سے کہا کہ کسی چیز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں اور نہ کبھی تھا۔ اس طرح انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا بھی انکار کیا اور انجیل کے کتاب اللہ ہونے کے بھی منکر ہوئے نصاریٰ کو مقابلہ میں جواب دینے کا جوش آیا تو ان میں سے ایک شخص نے یہودیوں سے کہا کہ تم کسی چیز پر نہیں ہو یعنی تمہارے دین کی کوئی اصلیت اور بنیاد نہیں۔ اللہ کے کسی نبی یا اللہ کی کسی کتاب سے تمہارا کوئی تعلق نہیں اور نہ کبھی تھا۔ اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر بیٹھے اور توراۃ شریف کے کتاب اللہ ہونے کے منکر ہوگئے۔ اللہ جل شانہ نے آیت بالا نازل فرمائی۔ اور دونوں جماعتوں کے دعوے ذکر کر کے فرمایا۔ وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (یعنی ہر فریق اللہ کی کتاب پڑھتا ہے) حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی رسالت کا علم ہوتے ہوئے انکی رسالت کے منکر ہو رہے ہیں۔ ہر فریق کو دوسرے فریق کے بارے میں معلوم ہے کہ باوجود تحریف کر لینے کے پھر بھی اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول سے ہر ایک کو انتساب ہے۔ گو یہ انتساب اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کو نجات دلانے والا نہیں لیکن فی الجملہ اس کا انکار بھی صحیح نہیں کہ اُن کے دین کی ابتداء اللہ کے کسی نبی یا کسی کتاب سے ہے۔

قال ابن كثير ولهذا قال تعالٰى وهم يتلون الكتاب اى وهم يعلمون شريعة التوراة والانجيل كل منهما كانت مشروعة في وقت ولكنهم تجاحدوا فيما بينهم عنادا و كفرا ومقابلة للفاسد بالفاسد .

پھر فرمایا كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (یعنی ایسی ہی بات اُن لوگوں نے کہی جو نہیں جانتے) یعنی یہود و نصاریٰ کے علاوہ جو اُن سے پہلے اُمتیں گزری ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی جہالت کی باتیں کرتی رہی ہیں۔ کہ عناد اور تعصب کی وجہ سے حق کو جھٹلایا اور حقیقت واضحہ کو نہ مانا۔ اور اب مشرکین عرب کا یہی حال ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کے منکر ہوئے حالانکہ آیات بینات اور دلائل واضحہ اُن کے سامنے ہیں۔ دلوں سے جانتے ہیں کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں لیکن مانتے نہیں۔ واختلف فيمن عنى فى قوله تعالٰى: الذين لا يعلمون، فقال عطاءٌ امم كانت قبل اليهود و النصارى وقال السُّدّى هم العرب، قالوا ليس محمد على شيئ واختار ابن جرير أن الحمل الجميع اولى (من ابن کثیر ص ۱۵۵ ج ۱)

پھر فرمایا: فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن سب کو جمع

فرمائینگے اور عدل کیساتھ اُن کے درمیان فیصلے فرمائینگے۔ اور اس فیصلہ سے سب پر حق ظاہر ہو جائے گا۔ اور باطل کا پتہ چل جائیگا۔

سورۃ سبا میں فرمایا: قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ (کہہ دیجئے کہ ہمارا رب ہم سب کو جمع فرمائے گا اور بڑا فیصلہ کرنے والا جاننے والا ہے)

بیان القرآن میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کے درمیان عملی فیصلہ فرما دیں گے۔ اور وہ عملی فیصلہ یہ ہوگا کہ اہل حق کو جنت میں اور اہل باطل کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ عملی فیصلہ کی قید اس لئے لگائی کہ قول اور برھانی فیصلہ تو عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعہ دُنیا میں بھی ہو چکا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَٰجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا
اور اُس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اس بات سے روکے کہ اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام لیا جائے اور اُن کی ویرانی کی کوشش کرے
أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ
اُن لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ اُن میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے، اُن کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور اُن کے لئے
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱۴﴾
آخرت میں بڑا عذاب ہے

اللہ کی مسجدوں میں ذکر سے روکنا بہت بڑا ظلم ہے

تفسیر: اس آیت شریفہ میں اُن لوگوں کو سب سے بڑا ظالم بتایا ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکیں، ان میں اللہ کا نام لینے اور اللہ کی عبادت کرنے سے منع کریں اور اُن کی ویرانی کی کوشش کریں اس کام کے کرنیوالے کون ہیں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی؟ معالم التنزیل ص ۱۰۷ ج ۱ میں حضرت عطا اور عبدالرحمن بن زید سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی، ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ والوں نے آپ کو مقام حدیبیہ میں روک دیا اور عمرہ کے لئے مسجد حرام تک نہ پہنچنے دیا۔ مساجد کی آبادی یہ ہے کہ اُن میں وہ کام ہوتے رہیں جن کاموں کے لئے وہ بنائی گئی ہیں۔ نماز، تلاوت، ذکر، اعتکاف وغیرہ اور مسجد حرام کے آباد کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اُس میں طواف کیا جائے، جو شخص ان کاموں سے روکے گا وہ انکی ویرانی کی کوشش کرنیوالا ہے۔ مشرکین مکہ اس وقت مسجد حرام کے متولی تھے لیکن کعبہ شریف میں انہوں نے بت رکھے ہوئے تھے ظاہری تعمیر کی دیکھ بھال ہی کو انہوں نے اسکی آبادی سمجھ لیا اور اس کی حقیقی تعمیر سے غافل تھے۔ توحید کے بجائے شرک کے کام کرتے تھے وہاں نمازیوں کو نماز نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ اُن کے ظلم اور زیادتی کی وجہ سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے پھر جب عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تو عمرہ نہ کرنے دیا۔ مشرکین کو سمجھایا بجھایا گیا کہ عمرہ کر کے واپس ہو جائیں گے لیکن وہ ایک نہ مانے اور ضد پر اڑے رہے۔ بالآخر آپ صحابہؓ کے ساتھ واپس تشریف لے آئے اور آئندہ سال عمرہ کی قضا فرمائی، یہ جو فرمایا۔ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ اس میں اس

بات کی خوشخبری دی کہ مکہ معظمہ فتح ہو گیا۔ جب غلبہ اہل اسلام کا ہو جائے گا تو یہ مشرکین اس میں ڈرتے ہوئے داخل ہوں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کرایا کہ خبردار اس سال کے بعد کوئی مشرک ہرگز حج نہ کرے۔ (عن معالم التنزیل ص ۱۰۷ ج ۱)

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ آیت شریفہ میں یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے کہ انہوں نے مختلف اوقات میں بیت المقدس کی بے حرمتی کی حضرت مجاہد نے فرمایا کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں جو بیت المقدس میں تکلیف دینے والی چیزیں پھینک دیتے تھے اور لوگوں کو نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ اور قتادہ کا قول ہے کہ اس سے رومی لوگ مراد ہیں انہوں نے یہودیوں کے بغض میں بیت المقدس کی بربادی میں بخت نصر مجوسی کی مدد کی اور کعب احبار سے منقول ہے کہ نصاریٰ بیت المقدس پر غالب ہوئے تو انہوں نے اس کو جلا دیا جب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی۔ لہٰذا جو بھی کوئی نصرانی اب بیت المقدس میں داخل ہوتا ہے تو خوف کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ (در منثور ص ۱۰۸ ج ۱)

سبب نزول جو بھی ہو اور نزول آیت کے وقت مساجد اللہ سے روکنے کا مصداق جو بھی کوئی جماعت ہو قرآن مجید کے عمومی بیان سے واضح ہوا کہ مسجدوں میں اللہ کا نام لینے سے روکنا ظلم کی چیز ہے اور یہ بڑے ظلم میں شمار ہے۔ فی روح المعانی وظاھر الآیۃ العموم فی کل مانع وفی کل مسجد وخصوص السبب لا یمنعہ نیز وَسَعیٰ فِی خَرَابِھَا کے عموم میں مسجدوں کو گرا دینا اور معطل کر دینا بھی شامل ہے۔ قال صاحب روح المعانی وسعیٰ فی خرابھا ای ھدمھا وتعطیلھا۔ اگر کوئی ایسی جماعت یا اُس کا کوئی فرد مسجد میں آنا چاہے جو دائرہ اسلام سے خارج ہوں مثلاً کسی نئے مدعی نبوت پر ایمان لانے والے لوگ جس نے ختم نبوت کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو ان لوگوں کو اپنی مسجد سے روک سکتے ہیں یہ منع کرنا ذکر اللہ سے منع کرنا نہیں بلکہ مسلمانوں کو کفر سے محفوظ رکھنے کے لئے ہوگا۔ اسی طرح کی ایک جماعت کو جب مسلمانوں نے مسجد سے روکا تو انہوں نے مذکورہ بالا آیت پڑھ دی جس پر ایک عالم نے سورۂ انعام کی یہ آیت پڑھ کر سنائی: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْقَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْہِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (اور اُس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس پر کسی بات کی بھی وحی نہیں آئی اور جو شخص یوں کہے کہ جیسا کلام اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے میں عنقریب ایسا نازل کروں گا) بعض مفسرین نے فرمایا کہ اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ صرف مسجد حرام کے بارے میں نہیں ہے بلکہ دیگر مساجد کو بھی اس کا عموم شامل ہے (کما فی تفسیر ابن کثیر ص ۱۵۷ ج ۱) مومنین سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اُن کی مدد ہوگی اور مسجدیں کافروں کے تسلط سے آزاد ہوں گی (کمامر) صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ پورا فرمایا اور بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں آیا اگر کوئی نصرانی اس میں داخل ہوتا تھا تو چوری چھپے اپنا روپ بدل کر داخل ہوتا تھا پھر قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ جو بھی کوئی نصرانی بیت المقدس میں پایا جاتا ہے اسکو خوب زیادہ سزا دی جاتی ہے۔ پھر صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ سوال اُٹھائے کہ بیت المقدس پھر نصاریٰ کے ہاتھ میں چلا گیا جسے صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ فتح کیا تو یہ سوال وارد نہیں ہوتا کیونکہ آیت میں کوئی کلمہ اس بات پر دلالت کرنے والا نہیں ہے کہ بیت المقدس ہمیشہ مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے قبضے میں دے دیا تو ان پر لازم تھا کہ قبضہ باقی رکھتے ضعف ایمان ضعف اعمال اور ضعف تدبیر کی وجہ سے کھو بیٹھے یہ اُنہوں نے ایمانی تقاضوں کے خلاف کیا۔

صاحبِ بیان القرآن نے اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ کا مطلب یہ لکھا ہے ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت اور بے باک ہو کر ان مساجد میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا بلکہ جب جاتے تو نہایت عظمت و حرمت و ادب سے جاتے جب بے باک ہو کر اندر جانے تک کا استحقاق نہیں تو اسکی ہتک حرمت کا کب حق حاصل ہے۔ اسی کو ظلم فرمایا گیا اھ خلاصہ یہ نکلا کہ اس میں مساجد کا ادب بتایا گیا ہے یہ بات سیاق کلام سے دل کو زیادہ لگتی ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

پھر فرمایا: لَھُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (کہ دنیا میں ان لوگوں کے لئے رسوائی ہے۔ اور آخرت میں وہ سب قومیں رسوا ہونگی جنہوں نے مسجد حرام یا بیت المقدس میں اللہ کے ذکر و عبادت سے روکا اور اُن کی ویرانی کی کوشش کی دنیا میں یہ قومیں مغلوب بھی ہوئیں مسلمانوں کی محکوم بھی بنیں اور یہود و نصاریٰ جزیہ دینے پر مجبور ہوئے اور آخرت میں سب کافروں کو جو بڑا عذاب ہوگا۔ بار بار قرآن مجید میں اس کا ذکر ہو چکا ہے اور اس عذاب کی تفصیلات آیات اور احادیث میں مذکور ہیں)

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب سو تم جس طرف بھی رُخ کرو اُدھر اللہ کا رُخ ہے بیشک اللہ واسع ہے علیم ہے

جدھر رُخ کرو اُدھر اللہ کا رخ ہے

تفسیر: الباب النقول میں تین واقعات لکھے ہیں جن میں اس آیت کے سبب نزول کا ذکر ہے تینوں واقعات میں یہ تذکرہ ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سفر میں تھے اندھیری رات میں (اور بعض روایات میں ہے کہ بادل کی وجہ سے) قبلہ کے بارے میں اشتباہ ہو گیا۔ ہر ایک نے اپنے غور و فکر کے مطابق جدھر قبلہ سمجھ میں آیا اُدھر نماز پڑھی صبح ہوئی تو غلطی معلوم ہوئی آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے خاموشی اختیار فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی ان میں سے ایک واقعہ سُنن ترمذی (ابواب التفسیر میں بھی مذکور ہے)

جہت قبلہ کا قانون

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرق کا بھی مالک ہے اور مغرب کا بھی مالک ہے (بلکہ تمام جہات کا مالک ہے اس عموم میں جنوب اور شمال بھی آ گئے۔ کما قال تعالیٰ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اِنَّا لَقَادِرُوْنَ لہٰذا اُسے پورا اختیار ہے کہ جس جہت کو چاہے قبلہ قرار دیدے اور چونکہ معبود وہی ہے اور سب جہات اُسی کے مملوک اور مخلوق ہیں اس لئے وہ اپنی عبادت کے لئے جس رُخ کا بھی حکم دے اور جس رُخ پر بھی عبادت کرنے سے راضی ہو جائے عبادت گزاروں کے لئے وہی جہت قبلہ ہے۔ کسی کو اس میں اعتراض کا کیا حق ہے وہ کعبہ شریف کو قبلہ مقرر فرما دے تو اُسے پورا اختیار ہے اور بیت المقدس کو قبلہ بنا دے تو اُسے پورا اختیار ہے ان دونوں کے علاوہ اور کسی رُخ پر نماز پڑھنے کی اجازت دے دے تو بھی اُسے اختیار ہے۔

اللہ تعالیٰ تو اس سے بلند اور بالا ہے کہ اس کا جسم ہو یا وہ کسی جہت میں ہو جدھر بھی رُخ کیا جائے اُدھر اللہ کا رُخ ہے۔ یعنی حکم خداوندی اور اذن خداوندی کے مطابق جدھر کو بھی نماز پڑھ لیں گے اُدھر ہی وہ جہت ہوگی جس کی طرف تمہیں رُخ

کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور اسی طرف نماز پڑھنے میں اسکی رضا ہے (قال فی الروح ای فهناک جهته سبحانه التی أمرتم بها ص ۳۷۵ ج ۱ وفی معالم التنزیل عن مجاهد فی هذه الآیة فثم وجه الله فتم قبلة الله والوجه والوجهة والجهة القبلة وقیل رضا الله تعالیٰ)

۱ قال القرطبی فی تفسیره إختلف الناس فی تاویل الوجه المضاف إلی الله تعالیٰ فی القرآن والسنة فقال الحذاق ذلک راجع إلی الوجود والعبارة عنه بالوجه من مجاز الکلام إذکان الوجه أظهر الاعضاء فی الشاهد وأجلّها قدرا' قال ابن عباس الوجه عبارة عنه عزّوجلّ کما قال ویبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام' وقال بعض الائمة تلک صفة ثابتة بالسمع زائدة علی ما توجبه العقول من صفات القدیم تعالیٰ قال ابن عطیة وضعف أبوالمعالی هذآ القول وهو کذلک ضعیف وانما المراد وجوده وقیل المراد بالوجه هنا الجهة التی وُجهنا إلیها أی القبلة وقیل الوجه المقصد وقیل المعنی وثم رضا الله وثوابه کما قال تعالیٰ انما نطعمکم' لوجه الله أی لرضائه وطلب ثوابه ومنه قوله ﷺ من بنی مسجدًا یبتغی به وجه الله بنی الله له مثله فی الجنة.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت سفر میں نفل نماز پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی رسول اللہ ﷺ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تشریف لا رہے تھے اور اپنی سواری پر نفل نماز پڑھ رہے تھے۔ سواری جدھر بھی متوجہ ہوتی آپ برابر نماز میں مشغول رہے (رواہ الترمذی فی تفسیر سورۃ البقرۃ)

انس بن سیرین کا بیان ہے کہ ہم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا استقبال کیا جبکہ وہ شام سے آ رہے تھے ہم نے دیکھا کہ مقام عین التمر میں اپنی سواری پر نماز پڑھ رہے ہیں اور رُخ قبلہ سے ہٹا ہوا ہے جو بائیں جانب کو ہے۔ میں نے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں آپ قبلہ کے رُخ کے علاوہ دوسری طرف کو نماز پڑھ رہے ہیں انہوں نے فرمایا کہ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں ایسا نہ کرتا یہ روایات صحیح مسلم میں مذکور ہیں۔

آیت کے آخیر میں فرمایا اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ یعنی وہ بندوں پر ان کے دین میں وسعت عطا فرماتا ہے اور ایسی کسی بات کا حکم نہیں دیتا جو انکی طاقت سے باہر ہو بعض حضرات نے فرمایا کہ واسعٌ سے یہ مراد ہے کہ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے ایسی کوئی چیز نہیں جو اس کے علم سے باہر ہو۔ جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں فرمایا وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ عِلْماً اور فراء کا قول یہ ہے کہ واسع بمعنی جوّاد اور سخی ہے جس کی عطا ہر ایک کو شامل ہے بعض مفسرین نے اس کا معنی واسع المغفرہ بتایا ہے یعنی کوئی بھی گناہ ایسا نہیں جس کا بخشنا اس کے نزدیک مشکل ہو۔ (من القرطبی ص ۸۴ ج ۲)

روح المعانی ص ۳۶۵ ج ۱ میں ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ) ای محیط بالا شیاء ملکا اور حمة فلهذا وسع علیکم القبلة ولم یضیق علیکم (علیمٌ) بمصالح العباد واعمالهم فی الاماکن

یعنی اللہ تعالیٰ مالکیت کے اعتبار سے یا رحمت کے اعتبار سے ہر چیز کو محیط ہے اسی لئے اس نے قبلہ کے بارے میں تم پر آسانی فرما دی۔ اور تنگی نہیں فرمائی اور وہ بندوں کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے اور جس جگہ بھی کوئی عمل کریں وہ اس سے باخبر ہے۔ اھ لہٰذا وہ سب کو ثواب عطا فرمائے گا وہ قلوب کے احوال بھی جانتا ہے اگر کسی نے اندھیرے میں اپنے غور و

فکر کے مطابق قبلہ کی معینہ جہت کے خلاف نماز پڑھی لیکن پڑھی اللہ ہی کے لئے اس کا مقصد اطاعت ہی ہے بغاوت نہیں تو ثواب کا مستحق ہوگا اور اُسے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔

قبلہ کے مسائل

مسئلہ: استقبال قبلہ نماز کی شرائط میں سے ہے غیر قبلہ کو نماز پڑھے تو نماز نہ ہوگی ہاں اگر کوئی شخص خائف ہے قوی دشمن اسے معینہ قبلہ کی طرف نماز نہیں پڑھنے دیتا تو جس طرف منہ کر کے پڑھ سکتا ہو اسی طرف پڑھ لے اُس وقت یہی اس کا قبلہ ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی ایک فرد یا جماعت کسی جگہ موجود ہوں اور قبلہ میں اشتباہ ہو جائے اور وہاں پر کوئی بتانے والا بھی نہ ہو تو ہر شخص اپنے اپنے طور پر خوب غور و فکر کرے۔ جس طرف دل جھکے ہر شخص اُس طرف کو نماز پڑھ لے۔ اگر غور و فکر کے بعد کسی طرف کو نماز پڑھنی شروع کی اور نماز کے اندر ہی پتہ چل گیا کہ قبلہ دوسری طرف کو ہے۔ تو اسی طرف گھوم جائے۔ پھر سے نماز پڑھنا ضروری نہیں۔

مسئلہ: اگر نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہو کہ غلط رُخ پر نماز پڑھی گئی تو نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ: اندھیری رات میں کسی جگہ چند مسلمان موجود ہیں قبلہ کا علم نہیں ہے اُن میں سے ایک شخص امام بن گیا اور امام اور مقتدی سب نے اپنے اپنے غور و فکر سے ایک ایک جہت کو نماز پڑھ لی اور ہر ایک کی جہت مختلف تھی اور مقتدیوں کو یہ علم نہیں کہ امام کا رُخ کدھر ہے تو یہ صحیح ہو جائے گی۔ ہاں اگر کسی کو یہ پتہ ہے کہ امام کا رخ فلاں جانب ہے۔ اور وہ رُخ اس مقتدی کے نزدیک صحیح نہیں ہے تو اس مقتدی کی نماز نہ ہوگی کیونکہ وہ اپنے امام کو غلطی پر سمجھے ہوئے ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص امام سے آگے بڑھ گیا یعنی امام کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اس طرح سے کہ امام کا چہرہ اُسکی پشت کی طرف ہو۔ تو بھی اقتدا صحیح نہ ہوگی۔ (من الھدایہ باب شروط الصلاۃ)

مسئلہ: جو شخص آبادی سے باہر ہو اور جانور پر سوار ہو وہ چاہے کہ میں نفل نماز پڑھوں تو وہ بیٹھے بیٹھے اپنی سواری پر نفل نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگرچہ سواری کا رُخ قبلہ کی جانب نہ ہو جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اور بعض صحابہؓ کا عمل بحوالہ صحیح مسلم گزر چکا۔

مسئلہ: فرض نماز غیر قبلہ کی طرف رُخ کر کے پڑھی جائے تو صحیح نہ ہوگی الا یہ کہ قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی بتانے والا نہ ہو تو اس صورت میں تحری یعنی غور و فکر کر کے نماز پڑھ لے جیسا کہ اُوپر مذکور ہوا۔

مسئلہ: ریل میں اور پانی کے جہاز میں نماز آسانی سے قبلہ رُخ ہو کر پڑھی جا سکتی ہے۔ بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا کہ فرض نماز بھی سفر میں بلا قبلہ پڑھنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور قبلہ کی طرف رُخ کرنے کی قدرت ہوتے ہوئے غیر قبلہ کو نماز پڑھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ صاحب سفر میں سب معاف ہے۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ اور اُن کا عمل فقہاء کی تصریحات کے خلاف ہے۔ انکی نماز نہیں ہوتی۔

حکمت تعیین قبلہ: کسی خاص جانب کو قبلہ قرار دینا بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے۔ اگر کسی خاص رُخ پر نماز پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا اور ہر شخص کو اختیار ہوتا کہ جدھر کو چاہے رُخ کر کے نماز پڑھ لے تو اس پر تشتت اور انتشار کا مظاہرہ ہوتا اور ایک ہی جانب قبلہ معیّن ہو جانے سے تنظیم اور اتحاد کا جو عملی سبق مل رہا ہے وہ بھی نہ رہتا لہٰذا سارے عالم کا قبلہ ایک ہی چیز کو قرار دیا گیا۔ ہجرت کے بعد ایک سال سے کچھ اوپر بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی گئی پھر کعبہ شریف کو قبلہ قرار دیا گیا جیسا کہ دوسرے پارے

کے شروع میں قصہ بیان ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوتی ہے بیت اللہ یا بیت المقدس؛ جس کی طرف بھی حکم خداوندی کے مطابق نماز پڑھی گئی وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہے۔ کسی جہت یا کسی گھر کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے سے اس جہت یا اس گھر کی عبادت نہیں ہوتی۔ اس سے بُت پرستوں کا یہ اعتراض ساقط ہو جاتا ہے کہ ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں تو تم بھی تو کعبہ کو نماز پڑھتے ہو۔ کیونکہ مسلمان رُخ کعبہ کرتے ہیں اور عبادت اللہ کی کرتے ہیں اور مشرکین بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں کہیں سے کہیں تک بھی یہ بات نہیں کہ ہم عبادت اللہ کی کر رہے ہیں اور بتوں کو بطور قبلہ سامنے رکھ رکھا ہے اگر مسلمانوں کی دیکھا دیکھی کہنے بھی لگیں تو یہ اُن کی جھوٹی بات ہوگی۔

فائدہ: بیت المقدس کو قبلہ قرار دینے کے بعد کعبہ شریف میں قبلہ قرار دینے سے جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ بیت المقدس یا کعبہ شریف میں نماز پڑھنا قبلہ کے طور پر ہے (یعنی حکمت اور مصلحت کی وجہ سے ان میں سے اللہ تعالیٰ نے جس کو جب چاہا قبلہ قرار دے دیا) وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ چاروں جہات میں سے کوئی جہت قبلہ کے لئے معیّن اور مخصوص نہیں ہے۔ جب کعبہ شریف کو قبلہ قرار دے دیا گیا تو قبلہ کی کوئی جہت معین نہ رہی سارے عالم کے مسلمانوں کو کعبہ شریف کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے دیا گیا اور سب اس پر عمل کرتے ہیں تو چاروں جہات کی طرف نمازوں میں رُخ ہو جاتا ہے اس سے فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور انہوں نے کہا کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے وہ اس سے پاک ہے بلکہ اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اسی کے لئے فرمانبردار ہیں۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

وہ بلا مثال کے پیدا فرمانے والا ہے اور جب فیصلہ فرمائے کسی امر کا تو بس یوں فرما دیتا ہے کہ ہو جا' پس ہو جاتا ہے

اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرنیوالوں کی گمراہی

تفسیر: اس آیت شریفہ میں مشرکین کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں پھر فوراً ہی سُبْحٰنَهٗ فرما کر انکی تردید کی اور خالق و مالک جل وعلیٰ کی تنزیہ بیان فرمائی' اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرنے کا شرکیہ عقیدہ یہود میں بھی رہا ہے۔ کیونکہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بناتے تھے۔ اور نصرانیوں کے بارے میں تو سبھی جانتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتاتے ہیں۔ سورہ توبہ میں ہے: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ اور مشرکین عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا: اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا (کیا تمہارے رب نے تم کو تو بیٹوں کے ساتھ خاص کیا اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنا لیا۔ بیشک تم بڑی بیجا بات کہتے ہو) اور سورہ زخرف میں فرمایا: وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ (اور انہوں نے فرشتوں کو جو کہ خدا کے بندے ہیں۔ عورت قرار دے رکھا ہے کیا اُن کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کا یہ

دعویٰ لکھ لیا جائے گا اور ان سے باز پرس ہوگی) قرآن مجید میں جگہ جگہ اس عقیدہ کی تردید فرمائی اور سورۃ اخلاص میں واضح طور پر فرمایا ہے۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ (کہ اس نے نہ کسی کو جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا اور کوئی بھی اس کے برابر نہیں) سورۃ انعام میں فرمایا: وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ ط سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهُ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (اور لوگوں نے جنات کو اللہ کا شریک قرار دے رکھا ہے حالانکہ ان کو خدا نے پیدا کیا اور ان لوگوں نے اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں محض بلا سند تراش رکھی ہیں وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جن کو یہ لوگ بیان کرتے ہیں وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اللہ کے اولاد کہاں ہوسکتی ہے حالانکہ اسکے کوئی ساتھ والی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے) سورۃ طٰہٰ میں فرمایا: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ط لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ہ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ہ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ہ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد اختیار کی ہے۔ تم بہت زیادہ بڑی بات لے کر آئے۔ کچھ بعید نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں اور زمین کے ٹکڑے اُڑ جائیں اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں اس بات سے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے جتنے بھی کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے روبرو بندے بنے ہوئے حاضر ہوتے ہیں)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان نے مجھے جھٹلایا حالانکہ اس کے لئے ایسا کرنا درست نہ تھا اور اُس نے مجھے گالی دی حالانکہ اس کے لئے ایسا کرنا دُرست نہ تھا اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں (موت دے کر) دوبارہ اُسے زندہ نہ کرونگا جیسا کہ میں نے اُسے شروع میں پیدا کیا اور اُس کا گالی دینا یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہوگیا حالانکہ یہ بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنا اور نہ میں جنا گیا اور نہ کوئی میرے برابر ہے۔ (صحیح بخاری ص ۷۴۴ ج ۲)

ان آیات سے اور حدیث شریف سے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت ہی زیادہ ناگوار ہے اور یہ بہت بڑا کفر ہے اور بہت بڑا شرک ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا حلم نہ ہو اور اُس کا مخلوق کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ نہ ہو تو اس شرک کی وجہ سے آسمان و زمین کے ٹکڑے ہو جائیں اور پہاڑ گر پڑیں۔

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی حلیم نہیں

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تکلیف دینے والی باتیں سن کر صبر کرنے میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے لوگ اللہ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں۔ وہ پھر بھی اُنکو عافیت دیتا ہے اور رزق عطا فرماتا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۳ از بخاری ومسلم)

تکلیف تو جسم اور جان کو ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہے۔ لیکن لوگوں کی باتیں ایسی ہیں جو

تکلیف دینے والی ہیں۔ اوران سے اللہ تعالیٰ کوسخت ناگواری اور بیزاری ہے وہ پھر بھی زندہ رکھتا ہے رزق اور عافیت دیتا ہے اور عذاب دینے میں جلدی نہیں فرماتا۔ اصحاب دنیا میں کسی ذرا سے صاحبِ اقتدار کو بھی کوئی ناگواری کی بات کہہ دی جائے تو وہ بہت جلدی سزادینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ کہ جو بھی کچھ آسمانوں میں اور زمین میں موجود ہے۔ یہ سب اللہ کی مخلوق ہے اور مملوک ہے اور سب اس کے بندے ہیں اور سب اس کے فرمانبردار ہیں خالق اور مخلوق کے درمیان اور مالک اور مملوک کے درمیان اور عابد و معبود کے درمیان نسبی کوئی رشتہ نہیں ہوسکتا۔ رشتہ کے لئے ہم جنس ہونا ضروری ہے لہٰذا خالق تعالیٰ شانہٗ کی کوئی اولاد ہونا ہی محال ہے اس کے لئے اولاد تجویز کرنا اس کے لئے عیب تجویز کرنا ہے۔ اور اسکی ذات کو محتاج بتانا ہے اور اس کے لئے برابر کا تجویز کرنا ہے اور وہ ان سب باتوں سے پاک ہے بلند و بالا ہے اس لئے حدیث شریف میں فرمایا کہ اللہ کے لئے اولاد تجویز کرنا اس کو گالی دینا ہے یعنی اسکی ذات کو ایسی چیز سے متصف کرنا ہے جو اس کے لئے نقص اور عیب کی چیز ہے۔ پھر فرمایا۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ الآیۃ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بلا مثال پیدا فرمایا ہے آسمان اور زمین کا پہلے وجود نہ تھا خداوند قدوس نے ان کو بغیر مثال اور بغیر نمونہ کے پیدا فرمایا اور جو کچھ ان کے اندر ہے وہ بھی پیدا فرمایا اور نظام محکم کا ان کو پابند بنایا سب اس کے حکم تکوینی کے پابند ہیں وہ جیسے چاہتا ہے تصرف فرماتا ہے۔ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے۔ وہ صفت انفعال سے متصف نہیں ہے اور جب کسی کے اولاد ہوتی ہے تو اس میں سے اولاد منفصل یعنی جدا ہوتی ہے۔ اور یہ سراپا صفت انفعال ہے جس سے اللہ جل شانہٗ منزہ اور پاک ہے اور برتر ہے۔ (من روح المعانی)

پھر فرمایا: وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو فرما دیتا ہے کہ ہو جا) پس اس کا وجود ہو جاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بھی چیز کے پیدا فرمانے کیلئے اسباب اور آلات کا محتاج نہیں ہے۔ کسی چیز کے وجود میں آنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا ارادہ[1] ہی کافی ہے جس طرح اُسے اسباب اور آلات کی ضرورت نہیں اسی طرح معین اور مددگار کی بھی ضرورت نہیں اولاد کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کاموں میں کچھ مدد کرے یا باپ کی موت کے بعد اس کا قائم مقام ہو۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ ازلی اور ابدی ہے۔ اُسے کسی اولاد کی ضرورت نہیں جو اسکی جگہ قائم مقام ہو اور اسکی قدرت بھی کامل ہے محض اس کے ارادہ سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔

یہ جو فرمایا کہ کسی چیز کے پیدا فرمانے کے لئے اللہ جل شانہٗ کن فرما دیتا ہے اس کے بارے میں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ کلام حقیقت پر محمول ہے اور واقعۃً اللہ تعالیٰ کلمہ کُنْ فرماتے ہیں جس سے اس چیز کا وجود ہو جاتا ہے۔ جس کے وجود میں لانے کے لئے یہ کلمہ فرماتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس پر یہ اشکال کیا ہے کہ جو چیز ابھی موجود نہیں اس کو کیوں کر خطاب کیا جاتا ہے۔ اس اشکال کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ خطاب کرنے کے لئے اس چیز کا علم ہونا کافی ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ لفظ کن سے لفظ کن مراد نہیں ہے بلکہ یہ مجاز ہے سرعۃ تکوین سے اور جلد سے جلد وجود میں آجانے سے۔ قال صاحب الروح والامر محمول علی حقیقته کما ذهب إلیه محققو ساداتنا الحنفیة والله تعالیٰ قد اجری سنة فی تکوین

---

[1] فی روح المعانی ای ارادشیأ بقرینة قوله تعالیٰ إنما امره اذا ارادشیئًا وَجاء القضاء علی وجوه ترجع کلها إلی اتمام الشیی قولاً أو فعلا والطلاقه علی الارادة مجاز من استعمال اللفظ المسبب فی السبب فان الایجاد الذی هوا تمام الشیی مسبب عن تعلق الارادة لانه یوجبه.

الاشیاء أن یکونها بهذه الکلمة وان لم یمتنع تکوینها بغیرها. والمراد الکلام الازلی لا نه یستحیل قیام اللفظ المرتب بذاته تعالیٰ وکثیر من أهل السنة إلی أنه لیس المراد به حقیقة الامر والا متثال. وانما هو تمثیل لحصول ما تعلق به الارادة بلا مهلة بطاعة المامور المطیع بلا توقف۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ

اور کہا اُن لوگوں نے جو نہیں جانتے' کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی دلیل' ایسا ہی کہا اُن لوگوں نے جو اُن سے پہلے

قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

تھے انہی جیسی بات' اُن کے دل آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوگئے' بلاشبہ ہم نے اُن لوگوں کے لئے دلیلیں بیان کردی ہیں جو یقین لاتے ہیں

جاہلوں کی باتیں کہ اللہ ہم سے بات کیوں نہیں کرتا

تفسیر: حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اُمتوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ سامنے صریح دلائل اور معجزات ہوتے ہوئے اپنے نبیوں کی نبوت کا انکار کرتے تھے اور اپنے پاس سے تجویز کر کے نبوت کی دلیلیں طلب کرتے تھے۔ انہیں میں سے ایک یہ مطالبہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خود بات کرے تو ہم مانیں' اور کہتے تھے کہ ہم جو معجزہ چاہتے ہیں وہ ہمارے سامنے آنا چاہئے۔ اس آیت میں بقول بعض مفسرین کے مشرکین عرب کا یہی سوال نقل فرمایا ہے اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں اگر مشرکین عرب مراد ہوں تو اُن کے بارے میں اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ جو فرمایا ہے اس میں کوئی اشکال ہی نہیں۔ کیونکہ وہ عموماً ان پڑھ تھے اور کسی کتاب کے حامل بھی نہ تھے اور اگر یہود و نصاریٰ مراد ہوں ان کو لَا يَعْلَمُوْنَ (نہیں جانتے) اس لئے فرمایا کہ انہوں نے جانتے ہوئے انجان ہونے کا کام کیا پھر فرمایا: كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ (یعنی ان سے پہلے جو لوگ تھے جنہوں نے کفر و عناد اور سرکشی پر کمر باندھی ہوئی تھی انہوں نے بھی اسی طرح کی باتیں کہی تھیں ان کے قلوب ایک دوسرے کے مشابہ ہوگئے) کفر وعناد اور سرکشی میں اور انکار حق میں یہ لوگ اور جو اُن سے پہلے تھے ایک ہی جیسے ہوگئے۔

پھر فرمایا قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (بے شک ہم نے دلائل بیان کر دیئے' اُن لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں) تمام انبیاء سابقین علیہم السلام کو معجزات دیئے گئے۔ وہ انکی نبوت اور رسالت ثابت کرنے کیلئے بالکل کافی و افی تھے۔ اور نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر بھی بڑے بڑے معجزات اور دلائل واضحہ سامنے آچکے ہیں۔ منکرین اور معاندین کو تو ماننا ہی نہیں ہے۔ جن کے دلوں میں اتباع حق کا جذبہ ہے اور جو حق سامنے آنے کے بعد حق کو تسلیم کر لیتے ہیں اور حق کو حق جان کر مان لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں یہ دلائل اُنہیں کے لئے مفید ہوتے ہیں منکرین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جو بھی کوئی معجزہ ان کے سامنے آیا اس کو جادو بتا دیا اور حق کو ٹھکرا دیا۔ جس کو سورت قمر میں یوں بیان فرمایا کہ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (اور اگر معجزہ دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا) سورۂ انعام میں فرمایا۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ

جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (یعنی انہوں نے خوب زوردار قسمیں کھا کر کہا کہ اگر ہمارے پاس (ایسا) معجزہ آ جائے (جس کی ہم فرمائش کرتے ہیں) تو ہم ضرور ضرور ایمان لے آئیں گے۔ آپ فرما دیجئے کہ سب نشانیاں اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں۔ پھر مسلمانوں سے خطاب فرمایا تم کو اسکی کیا خبر کہ نشانی فرمائش کے مطابق ظاہر ہو جائے تو یہ لوگ اُس وقت بھی ایمان نہ لائیں گے؟)

اپنی طرف سے تجویز کر کے دلائل و معجزات طلب کرنا ایمان لانے کے لئے نہیں ہے بلکہ محض ضد اور عناد مقصود ہے اُسی پر تُلے ہوئے ہیں ایمان و یقین کا ارادہ ہی نہیں رکھتے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ خوش خبری سنانیوالا اور ڈرانے والا اور دوزخ والوں کے بارے میں آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے

تفسیر: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے یہ فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اور آپ کا عہدہ یہ ہے کہ آپ جنت کی بشارت دیں اور دوزخ سے ڈرائیں بشارت میں وہ اعمال بتانا داخل ہے۔ جو دخولِ جنت کا سبب ہیں جن میں سب سے بڑی چیز ایمان ہے اور ڈرانے کے مفہوم میں ان اعمال سے باخبر کرنا شامل ہے جو دوزخ میں لے جانیوالے ہیں جن میں سب سے بڑی چیز کفر و شرک ہے، اور یہ جو فرمایا کہ وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ۔ (کہ آپ سے دوزخ والوں کے بارے میں سوال نہ ہوگا) اس میں آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ مسلمان نہ ہوں آپ اُن کے بارے میں پریشان نہ ہوں آپ اپنا کام کئے جائیں۔ اللہ کا کلام پہنچائیں۔ حق کو واضح طور پر بیان فرما دیں۔ آگے ایمان کو قبول کرنا یا نہ کرنا مخاطبین کی ذمہ داری ہے۔ آپ سے کوئی سوال نہ ہوگا کہ کافروں نے اسلام کیوں قبول نہ کیا اور وہ دوزخ کے مستحق کیوں ہوئے زبردستی ایمان قبول کرانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ آپ کا کام پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔ کما فی سورة الرعد فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ سورۃ غاشیہ میں فرمایا: فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (یعنی آپ حق کی یاد دہانی کرتے رہئے آپ تو مُذَكِّرٌ ہی ہیں (یاد دہانی کرنیوالے آپ کو ان پر مسلط نہیں کیا گیا) اور سورۃ قٓ کے آخر میں فرمایا: نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ۔ (یعنی ہم اُن باتوں کو خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنیوالے نہیں ہیں سو آپ ان کو قرآن کے ذریعہ نصیحت فرماتے رہیں جو میری وعید سے ڈرتا ہے) قال صاحب الروح والآية اعتراض لتسلية الرسول ﷺ يضيق صدره لا صرارهم على الكفرا (الى ان قال) اى ارسلناك غير مسئول عن اصحاب الجحيم مالهم لم يؤمنوا بعد ان بلغت ما ارسلت به والزمت الحجّة عليهم

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى

اور ہرگز راضی نہ ہوں گے آپ سے یہود اور نصاریٰ یہاں تک کہ آپ اُن کے دین کا اتباع کر لیں۔ آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ اللہ کی ہدایت

اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ

جو ہے وہی ہدایت ہے اور اگر آپ نے انکی خواہشوں کا اتباع کیا بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے

مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾

تو نہ ہوگا آپ کے لئے کوئی ولی اور مددگار جو اللہ سے بچادے

یہود ونصاریٰ راضی نہیں ہو سکتے جب تک اُنکے دین کا اتباع نہ کیا جائے

تفسیر: تفسیر معالم التنزیل ص ۱۱۰ ج ا میں ہے کہ یہود ونصاریٰ نے رسول اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپس میں کچھ صلح کرلیں (یعنی بعض چیزوں میں آپ نیچے اُتر جائیں اور کچھ ڈھیل دے دیں تو ہم آپ کا دین قبول کرلیں گے) اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔ تفسیر قرطبی ص ۹۳ ج ۲ میں آیت بالا کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اے محمد علیہ وسلم ان کا اپنے تجویز کردہ دلائل ومعجزات کا مطالبہ اس لئے نہیں ہے کہ ان کے کہنے کے مطابق معجزات ظاہر ہو جائیں تو یہ واقعی ایمان لے آئیں گے حقیقۃً بات یہ ہے کہ آپ ان کے سامنے وہ معجزات لے آئیں جن کا یہ سوال کرتے ہیں تب بھی آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ آپ اپنے دین اسلام کو چھوڑ دیں اور ان کا پورا پورا اتباع کرلیں۔ جب تک آپ ان کے دین کا اتباع نہ کریں گے یہ کبھی آپ سے راضی ہونیوالے نہیں۔

پھر فرمایا: قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی کہ بلاشبہ اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے اس کے سوا کوئی ہدایت نہیں اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ غلط ہے گمراہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہے لوگوں نے اپنے اپنے طور پر اپنی خواہشوں سے مذاہب بنا لئے ہیں۔ ان کا دین اختیار کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر آپ نے انکی خواہشوں کا اتباع کیا جبکہ آپ کے پاس علم آ چکا ہے آپ اللہ کی گرفت میں آ جائیں گے اور اس وقت اللہ کی گرفت سے بچانیوالا کوئی حامی اور مددگار نہ ہوگا۔ (کما فی سورۃ الرعد وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ بَعْدَ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ)

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ خطاب یا تو حقیقتاً رسول اللہ علیہ وسلم کو ہے اور یا بظاہر آپ کو خطاب کیا ہے اور مراد اس سے آپ کی اُمت ہے اگر پہلی صورت مراد لی جائے تب بھی اس میں اُمت کیلئے تادیب ہے کیونکہ اُمت کا مرتبہ رسول اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ سے کہیں کم ہے پس جب دوسروں کی خواہشوں کے اتباع سے رسول اللہ علیہ وسلم کا مواخذہ ہو سکتا ہے تو اگر اُمت ایسا کوئی کام کریگی جس میں دوسروں کا اتباع ہو وہ کیونکر مواخذہ سے بچے گی۔

مومن کا کام ہے کہ صرف اپنے خالق اور مالک کو راضی رکھے اور اُسے راضی رکھنے کے ذیل میں جو راضی ہوتا ہو وہ راضی رہے جو ناراض ہوتا ہو وہ ناراض رہے کوئی اپنا ہو یا پرایا خدا کو ناراض کر کے کسی دوسرے کو راضی کرنے کی کوشش ایمانی تقاضوں کے سراسر خلاف ہے۔ آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں وہ اپنے اعمال اور لباس اور وضع قطع اور شکل وصورت میں یہود ونصاریٰ کا اتباع کئے ہوئے ہیں اور اُن لوگوں کے سامنے اپنے کو حقیر جانتے ہیں انہیں راضی رکھنے کے لئے داڑھی بھی مونڈتے ہیں۔ یورپین لباس بھی پہنتے ہیں عورتوں کو بھی بے پردہ پھراتے ہیں اور غیروں

سے ان کے مصافحہ کراتے ہیں۔ ٹائی لگانے کو فخر سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یہ دشمنانِ اسلام طعنے دیں گے۔ اور ہمیں اچھی نظر سے نہ دیکھیں گے۔ افسوس ہے کہ ان کو یہ منظور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہو جائے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع چھوٹ جائے لیکن اہل کفر راضی رہیں اور عزت کی نظر سے دیکھیں چاہے آخرت میں گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے عذاب ہی بھگتنا پڑے حالانکہ وہ لوگ کسی بھی طرح سے راضی نہیں ہو سکتے وہ تو اسی وقت راضی ہوں گے جب العیاذ باللہ دین اسلام کو چھوڑ کر انکی ملت و مذہب کا اتباع کر لیا جائے۔

ہمیں کافروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ ہماری عزت اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ہم مومن موحد ہیں افضل الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں ان کا دامن ہمارے ہاتھ میں ہے۔ یہ ہمارے لئے اتنا بڑا فخر ہے کہ اس سے بڑا اور فخر نہیں اور یہی ہماری سب کچھ عزت ہے۔ دشمنوں کے اتباع میں دنیا و آخرت کی ذلت ہی ذلت ہے۔ اور ہلاکت اور بربادی ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا۔ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا (کیا اُن کے پاس معزز رہنا چاہتے ہو سو اعزاز تو سارا خدا تعالیٰ کے قبضے میں ہے)

فائدہ: آیت شریفہ میں حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ فرمایا حالانکہ ابتداء آیت میں یہود و نصاریٰ دونوں جماعتوں کا ذکر ہے اور ہر ایک کی ملت الگ الگ ہے۔ پھر بھی تثنیہ کا صیغہ نہیں لایا گیا۔ اور یوں نہیں فرمایا کہ آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ آپ انکی ملتوں کا اعتبار نہ کریں۔ اس سے علماء تفسیر نے یہ بات مُستنبط کی ہے کہ کافر اگرچہ مذہبی اعتبار سے اختلاف رکھتے ہوں۔ لیکن کفر میں سب شریک ہیں اس لئے ان سب کی ملت بھی ایک ہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ملتیں دنیا میں دو ہیں ایک ملت ایمان اور ایک ملت کفر فقہاء نے اس سے میراث کے بعض مسائل ثابت کئے ہیں اور یہ بات تو سب پر واضح ہے کہ کافروں کی ساری جماعتیں اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں ایک ہی رہیں۔ اور سب کی یہ کوشش ہے کہ اسلام نہ پھیلے اور مسلمان دنیا میں عروج نہ پائیں۔ اسلام کے خلاف جو تدبیریں کرتے ہیں ان میں سبھی کافر مشورے یا مال سے یا دل سے شریک ہوتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بعض وہ فرقے جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور عقائد کے اعتبار سے مسلمان نہیں ہیں وہ بھی اسلام دشمنی میں اور مسلمانوں کی حکومتوں کی تباہ کاری میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں۔

مسلمانوں کو تنبیہ: آیت بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کیلئے ایسی کوئی صورت نہیں کہ کافروں کے ساتھ اپنے دین میں کوئی مداہنت اور مصالحت کر لیں۔ دین اسلام اللہ کا بھیجا ہوا دین ہے۔ بندوں کا تجویز کیا ہوا نہیں ہے۔ بندوں کو کوئی اختیار نہیں کہ کچھ اُونچ نیچ کر کے دینی مسائل اور احکام میں رد و بدل کر کے دشمنوں کے ساتھ زندہ رہنے کیلئے کوئی راستہ نکالیں۔ دشمنان اسلام یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے دین کو بدل دیں کیونکہ انکا دین ان کا اپنا ہی بنایا ہوا ہے۔ اپنی بنائی ہوئی چیز میں ادل بدل کر سکتے ہیں لیکن مسلمان جو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے پابند ہیں وہ اپنے دین میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے اگر چند جاہلوں نے مل کر کسی حکم کو بدل بھی دیا تو ان کا یہ عمل کافرانہ ہوگا۔ اور اسلام میں کوئی تبدیلی نہ آئیگی۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖؕ اُولٰٓىٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسکی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اسکی تلاوت کا حق ہے۔ یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو شخص اس پر ایمان نہ لائے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

سو یہ لوگ پوری طرح خسارہ میں ہیں

جن کو کتاب ملی ہے وہ اسکی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کا حق ہے

تفسیر: اس آیت شریفہ میں اہل ایمان کی تعریف فرمائی ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اسکی تلاوت کا حق ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ ایسی تلاوت کرنا جیسا کہ تلاوت کا حق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب میں جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے اُن پر عمل کریں اور جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اُن کو اختیار نہ کریں اور قرآن کو اسی طرح پڑھیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا' اس کے کلمات میں تحریف نہ کریں اور اس کے معانی میں کوئی تبدیلی نہ کریں۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس کے محکمات پر عمل کریں اور متشابہات پر ایمان لائیں اور جو کچھ اشکال پیش آئے اس کو اہل علم کے سپرد کریں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو تلاوت کرتے وقت کسی رحمت والی آیت پر پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے ہیں اور جب کسی عذاب کی آیت پر پہنچتے ہیں تو اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (ابن کثیر ص ۱۶۳-۱۶۴ ج ۱)

یہ جو فرمایا کہ اسی طرح تلاوت کریں جیسا کہ نازل ہوا اسی میں تجوید کے ساتھ پڑھنا بھی داخل ہے سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید عربی زبان میں ہے۔ عربی ایک مستقل زبان ہے جو ۲۹ حروف پر مشتمل ہے۔ حروف کے مخارج بھی ہیں اور صفات بھی ہیں۔ مخارج اور صفات کا خیال نہ کرنے سے ایک حرف دوسرے حرف سے بدل جاتا ہے۔ جس سے معانی بھی بدل جاتے ہیں اور بعض مرتبہ نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ تلاوت کرنیوالے قرآن کو صحیح طریقہ پر مخارج و صفات کی رعایت کے ساتھ پڑھیں اور صحیح ادائیگی کے لئے اصحابِ تجوید سے رجوع کریں۔ علامہ جزری فرماتے ہیں۔

والاخذ بالتجوید حتم لازم' من لم یجوّد القران آثم

لانه به الاله انزلا وھکذا منه الینا وصلا

پھر فرمایا اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ کہ جو لوگ اللہ کی کتاب کی ایسی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں' معلوم ہوا کہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی تلاوت اُسی طرح کی جائے جیسا کہ اُسکی تلاوت کا حق ہے اور یہ کہ اسکی لفظی یا معنوی تحریف کرنیوالے اس پر ایمان والے نہیں۔ آخر میں فرمایا کہ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ؁ یعنی جو لوگ اللہ کی کتاب کے منکر ہیں۔ اس پر ایمان نہیں لاتے یہ لوگ بھرپور خسارہ اور نقصان میں ہیں انہوں نے کفر اختیار کیا اور ایمان کے قریب نہ آئے لہٰذا دوزخ کے عذاب کے مستحق ہوئے۔ اعاذنا اللہ منھا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى

اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن کا میں نے تم پر انعام کیا اور اس بات کو بھی کہ میں نے تم کو جہانوں پر

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا

فضیلت دی' اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی شخص کسی جان کی طرف سے کوئی مطالبہ ادا نہ کرے گا اور نہ کسی کی طرف سے جان کا کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ

تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

کوئی شفاعت نفع دے گی' اور نہ انکی مدد کی جائے گی

بنی اسرائیل کو نعمتوں کی مکرّر یاددہانی

تفسیر: یہ دونوں آیتیں سورۂ بقرہ کے چھٹے رکوع کے شروع میں گزر چکی ہیں۔ دونوں آیتوں میں وہاں ایک طرح کی تمہید تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر بنی اسرائیل کو اپنے انعامات یاد دلائے تھے اور انہیں آخرت کے عذاب سے ڈرایا تھا' اسکے بعد تفصیلی طور پر بعض نعمتوں کا تذکرہ فرمایا اور انکی حرکتوں اور بدعملیوں اور جھوٹی آرزوؤں کا اور بچھڑے کی پرستش کرنے اور جادو کے پیچھے لگنے اور فرشتوں کو اپنا دشمن بتانے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دبی زبان سے رَاعِنَا کہنے اور اسکے بُرے معنی مراد لینے کا اور بعض دیگر اُمور کا تفصیلی بیان ہوا۔ بیان کے ختم پر اب یہاں پھر انہیں دونوں آیتوں کو دہرایا جو بطور تمہید شروع میں مذکور تھیں۔ البتہ دوسری آیت میں ذرا سا لفظی فرق ہے اولاً و آخراً انکو اجمالی طور پر اپنے انعامات یاد دلا کر ایمان اور اعمالِ صالحہ میں لگنے کی طرف متوجہ فرمایا اور قیامت کے دن کے عذاب سے ڈرایا اگر انسان اللہ کی نعمتوں کو سامنے رکھے کہ اللہ نے مجھ پر کیا کیا انعامات فرمائے اور اپنے نفس کا محاسبہ بھی کرے کہ میں نے انکے مقابلے میں کیا کیا اور ساتھ ہی فکر آخرت بھی ہو تو ایسا شخص ایمانِ صالحہ سے دور نہیں رہ سکتا لیکن یہودی ایمان سے بھی گئے اور اعمالِ صالحہ سے بھی گئے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ

اور جب آزمایا ابراہیم کو ان کے رب نے چند کلمات کے ذریعہ تو انہوں نے اُن کو پورا کیا۔ ان کے رب نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ اُنہوں نے عرض کیا اور

ذُرِّيَّتِىْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

میری اولاد میں سے' ان کے رب نے فرمایا کہ میرا عہد ظلم کرنیوالوں کو نہ ملے گا

حضرت ابراہیمؑ کا آزمائشوں میں پورا اترنا اور انکی امامت کا اعلان فرمانا

تفسیر: اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کا پھر اس میں انکے پورا اُترنے کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے اُن کو چند کلمات کے ذریعہ آزمایا۔

کلمات کی تشریح اور توضیح جن کے ذریعہ آزمایا گیا

ان کلمات سے کیا مراد ہے اس کے بارے میں مفسرین کرام نے بہت کچھ لکھا ہے کلمات جمع ہے کلمۃ کی اور کلمہ لفظ مفرد با معنی کو کہا جاتا ہے اور کلام کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں کلمات سے احکام شرعیہ مراد ہیں جن کا ابراہیم

علیہ السلام کو مکلف بنایا گیا تھا۔ جو احکام ان کو دیئے گئے انہوں نے اُن کو پورا کیا اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان احکام کے انجام دینے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف فرمائی۔ یہاں فرمایا فَاَتَمَّھُنَّ ای قام بھن کلھن یعنی (جتنے بھی احکام) کا حکم دیا گیا اُن کو پورا فرمایا اور سورۂ النجم میں فرمایا: وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى (اور وہ ابراہیم جس نے احکام کی پوری بجا آوری کی) یہ کون سے احکام تھے جن کا انکو حکم دیا گیا اور وہ اُن پر پوری طرح قائم رہے۔ اس کے بارے میں مفسرین نے متعدد اقوال نقل کئے۔ خود حضرت ابن عباسؓ ہی کے متعدد اقوال ہیں جو تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں ان کا ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو مناسک حج کا حکم دیا جس کو انہوں نے پورا فرمایا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ طہارت اور نظافت سے متعلق ان کو احکام دیئے تھے اور یہ دس احکام ہیں جن میں پانچ سر کے متعلق اور پانچ باقی جسم سے متعلق ہیں۔ جو سر سے متعلق تھے وہ یہ ہیں۔ (۱) مونچھیں کاٹنا (۲) کلی کرنا (۳) سانس کے ساتھ ناک میں پانی لیکر ناک صاف رکھنا جیسا کہ وضوء اور غسل میں کرتے ہیں۔ احادیث میں اس کو استنشاق سے تعبیر فرمایا ہے۔ (۴) مسواک کرنا (۵) سر کے بالوں میں مانگ نکالنا۔ اور باقی جسم کے احکام یہ ہیں۔ (۶) ناخن کاٹنا (۷) ناف کے نیچے بال صاف کرنا (۸) ختنہ کرنا (۹) بغلوں کے بال اُکھاڑنا (۱۰) پیشاب اور پاخانہ کرکے پانی سے استنجاء کرنا۔ صحیح بخاری (ص ۴۷۳) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نبی ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں مقام قدوم میں اپنی ختنہ کی' حضرت سعید بن المسیب سے منقول ہے کہ ابراہیم خلیل الرحمٰن سب سے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے مہمان کی مہمان نوازی کی۔ اور سب سے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنی مونچھیں تراشیں اور وہ سب سے پہلے وہ شخص ہیں جن کے چہرے پر سفید بال نظر آئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب یہ کیا ہے؟ ربّ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ یہ وقار ہے (یعنی متانت اور سنجیدگی کی چیز ہے) اس پر انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب میرا وقار اور بڑھا دیجئے (مؤطا مالک) حضرت ابن عباسؓ سے تیسرا قول یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن احکام کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش فرمائی ان میں سے چھ چیزیں انسان کے اندر ہیں اور چار احکام حج کے متعلق ہیں جسم انسانی کے متعلق چھ عدد یہ ہیں۔ (۱) ناف کے نیچے بال صاف کرنا اور بغلوں کے بال اُکھاڑنا (۲) ختنہ کرنا (۳) ناخن کاٹنا (۴) مونچھیں تراشنا (۵) مسواک کرنا (۶) جمعہ کے دن غسل کرنا' اور باقی چار جو احکام حج سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں (۱) طواف کرنا (۲) صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا (۳) جمرات پر کنکریاں مارنا (۴) طواف زیارت کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ سے چوتھا قول یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جن چیزوں کا حکم دیا اور انہوں نے اُن کو پورا کیا وہ تیس چیزیں ہیں اُن میں سے دس سورۂ برآت کی آیت اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ (الی آخر الآیۃ) میں اور دس سورۂ مؤمنون کے اول میں اور سورۃ معارج (کے پہلے رکوع میں) اور دس سورہ احزاب کی آیت اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ میں مذکور ہیں۔ مکررات کو چھوڑ کر ان سب کا شمار اس طرح سے ہے۔ (۱) توبہ کرنا (۲) عبادت کرنا (۳) اللہ کی حمد کرنا (۴) روزہ رکھنا (۵) رکوع کرنا (۶) سجدہ کرنا (۷) امر بالمعروف کرنا (۸) نہی عن المنکر کی انجام دہی کرنا (۹) اللہ کی حدود کی حفاظت کرنا۔ اس آیت میں نو چیزیں مذکور ہیں۔ لیکن مفسر ابن کثیر نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ سورۂ براءت میں دس ہیں۔ احقر کے خیال میں یوں آتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے وہ آیت بھی ساتھ ملائی ہوگی جو آیت مذکورہ سے پہلے ہے۔ یعنی اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ

لَهُمُ الْجَنَّةَ اس آیت میں قتال اور جہاد مذکور ہے اسکو ملا کر دس صفات ہو جاتی ہیں۔ سورۃ مومنون میں یہ احکام مذکور ہیں۔ (۱) نماز میں خشوع کرنا (۲) لغو سے اعراض کرنا (۳) زکوٰۃ ادا کرنا (۴) شرم کی جگہ کو حرام سے محفوظ رکھنا (۵) اَمانتوں کی نگہداشت رکھنا (۶) عہد کی پابندی کرنا (۷) نمازوں کی پابندی کرنا۔ یہ چیزیں سورۂ مومنون کے پہلے رکوع میں مذکور ہیں۔ سورۂ معارج میں بھی ان چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں یہ چیزیں زائد ہیں۔ (۸) اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا حصہ رکھنا (۹) اپنے رب کے عذاب سے ڈرنا (۱۰) گواہیوں کو ٹھیک ادا کرنا۔

سورۂ احزاب میں یہ چیزیں مذکور ہیں۔ (۱) اسلام کا کام کرنا (۲) دل سے مومن ہونا (۳) فرمانبرداری کرنا (۴) قول و عمل میں سچائی اختیار کرنا (۵) طاعات کی ادائیگی میں اور مصائب کے آنے پر صبر اختیار کرنا۔ (۶) خشوع اختیار کرنا (۷) مال خیرات کرنا (۸) روزہ رکھنا (۹) شرم کی جگہوں کی حفاظت کرنا۔ (۱۰) بہت زیادہ اللہ کا ذکر کرنا۔ یہ دس چیزیں لیکن اس میں بعض چیزیں وہ ہیں جو سورۂ مومنین کی آیت میں بھی مذکور ہیں۔ اور یہاں اگر خشوع سے مراد مطلق خشوع لیا جائے (نماز میں اور غیر نماز میں) جس کا معنی ہے قلب کا جھکاؤ ہونا تو اس سے خشوع فی الاعمال اور خشوع فی المعاملات بھی مراد ہو سکتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ تکبر اختیار نہ کرے اور قلب و جوارح کو عناد سے اور ہر ایسی چیز سے بچائے جو قلب اور اعضاء جوارح کے جھکاؤ کے خلاف ہو۔ سورۂ براءت میں جو اَلسَّائِحُوْنَ ہے اس کا ترجمہ بھی روزہ دار کا کیا گیا ہے۔ سورۃ احزاب میں بھی الصائمین مذکور ہے۔ لیکن حضرت عطار نے السَّائِحُوْنَ هم طلبة العلم (كما فى معالم التنزيل) اگر ان میں سے کوئی معنی لیا جائے تو مستقل ایک صفت کا ذکر آ جاتا ہے اور تکرار ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پانچواں قول یہ منقول ہے کہ جن کلمات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبتلا فرمایا اور اُن کو آزمایا وہ یہ ہیں۔ (۱) اپنی قوم سے جدا ہو جانا اور اللہ کے لئے مفارقت اختیار کرنا (۲) نمرود سے اللہ کی توحید کے بارے میں مباحثہ کرنا اور جان کا خطرہ ہوتے ہوئے ایک جابر کے سامنے کلمہ حق کہہ دینا (۳) پھر آگ میں ڈالا جانا اور اس کے باوجود حق پر قائم رہنا (۴) اپنا وطن چھوڑ کر اللہ کے لئے ہجرت کرنا اور دوسری جگہ (ملک شام چلا جانا) (۵) اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ضیافت کے لئے مامور ہو جانا اور اپنی جان و مال سے اس پر ثابت قدم رہنا (۶) بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہونا پھر اس کے لئے نہ صرف یہ کہ آمادہ ہو جانا بلکہ اس کے گلے پر چھرا پھیر دینا (انہوں نے تو چھری پھیر ہی دی، آگے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوئی اور بیٹا ذبح نہ ہوا۔ یہ دوسری بات ہے) جب یہ سب کام کر گزرے اور امتحان میں پورے اُتر گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَسْلِمْ (فرمانبردار ہو جاؤ) اُنہوں نے عرض کیا اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ (میں رب العالمین کا فرمانبردار ہوں) مفسر ابن کثیر نے حضرت ابن عباسؓ کے یہ اقوال نقل کئے ہیں ہم نے تشریح میں بعض روایات کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور آیات مذکورہ میں جو احکام ہیں انکی تعداد میں جو کلام ہے وہ بھی ذکر کر دیا ہے۔ اس کے بعد مفسر ابن کثیر نے کلمات کی تفسیر میں حضرت حسن بصری کے اقوال نقل کئے ہیں پھر ابن عباسؓ سے یہ بھی نقل کیا ہے کلمات سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیات میں مذکور ہیں۔ حضرت مجاہد سے بھی ایسا ہی منقول ہے اس کے بعد حافظ ابن کثیر مفسر ابن جریر سے نقل فرماتے ہیں کہ کلمات کی تفسیر میں جتنے بھی اقوال ہیں۔ ان میں جو کچھ مذکور ہے کلمات سے یہ سب مراد ہوں یہ بھی جائز ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ان میں سے بعض چیزیں

مراد ہوں اور کسی بھی چیز کے بارے میں متعین طریقہ پر اُسی وقت یقین کیا جا سکتا ہے کہ جب کہ اس بارے میں کوئی صحیح حدیث ہو یا اجماع امت ہو لیکن صحیح حدیث یا اجماع سے ان میں سے کوئی چیز کلمات کی تفسیر میں ثابت نہیں ہے۔ اس کے بعد ابن جریر سے نقل کیا ہے کہ حضرت مجاہد نے جو کلمات کی تفسیر کی ہے وہ زیادہ ٹھیک معلوم ہوتی ہے' لیکن ابن کثیر فرماتے ہیں کہ تمام اقوال میں جو مذکور ہے ان سب کو مراد لینا زیادہ اقوای ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت

اس کے بعد ارشاد ہے: قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بلاشبہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا) علماء تفسیر نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو احکام دے کر آزمایا اور اُنہوں نے احکام کی پورے طور پر بجا آوری کر دی تو بطور صلہ اور انعام اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اُن کو لوگوں کا پیشوا بنا دیا۔ اور جن احکام میں اُن کو مبتلا فرمایا تھا اُن کے پورا کروانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ اعمال اور اخلاق کے اعتبار سے اُنکی پوری طرح تربیت ہو جائے تا کہ وہ امامت کے لائق ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس طرح پیشوا بنایا کہ اوّل تو ان کو نبوت سے سرفراز فرمایا ان پر صحیفے نازل فرمائے اور پھر ان کی نسل اور ذریت میں امامت کو جاری فرمایا یعنی ان کے بعد جتنے بھی نبی آئے ہیں وہ سب انہیں کی نسل میں سے تھے اور سب اس بات کے مامور تھے کہ ابراہیم خلیل علیہ السلام کی ملت کا اتباع کریں۔ حتیٰ کہ نبی عربی سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی انکی نسل میں سے تھے اور انکو بھی حکم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا اتباع کریں۔ کما قال تعالیٰ ثُمَّ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا گو پوری طرح سے انکی ملت کے احکام اُن کے بعد آنے والے انبیاء کرام علیہم السلام کی ملت میں نہ تھے لیکن اکثر یا بعض احکام انکے بعد کے شرائع میں انکی ملت کے موافق اور مطابق تھے۔ یہ تقریر اس صورت میں ہے جبکہ ابراہیم علیہ السلام کی امامت دوامی لی جائے اور اگر یہ مطلب ہو کہ اپنے زمانے کے لوگوں کے پیشوا تھے تو یہ بھی بعید نہیں ہے۔ روح المعانی میں دونوں باتیں لکھی ہیں۔ لیکن امامت سے نبوت مراد لینے کی صورت میں کلمات کی تفسیر میں جو بعض باتیں بیان کی گئی ہیں وہ نہیں آ سکتیں جب کہ پیشوا ہونے کا اظہار تمام کلمات کے بعد مراد ہو کیونکہ لڑکے کا ذبح اور بعض دیگر امور جو کلمات کی تفسیر میں بیان ہوئے ہیں وہ نبوت کے بعد ہی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ (ذکرہ فی الروح)

لیکن ان میں سے جو کوئی ظالم ہو گا وہ اس مرتبہ پر فائز نہیں ہو سکتا' مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں عہد سے مراد امامت ہے اور متعین طور پر اس سے نبوت مراد ہے اور ظالموں سے کافر مراد ہیں۔ کما قال تعالیٰ وَالْکٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذرّیت میں ظالم بھی ہوں گے اور ظالم کو نبوت نہیں مل سکتی اور نبوت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے ملتی چلی جائے وہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہا اللہ تعالیٰ نے نبی بنا دیا اور جب چاہا سلسلۂ نبوت ختم فرما دیا۔ قال فی الروح وعبّر عنها بالعهد للا شارة الی انها امانة الله تعالیٰ وعهده الذی لا یقوم به الاّمن شاء الله تعالیٰ من عباده و آثر النیل علی الجعل ایماءً الی ان امامة الانبیاء من ذریته علیهم السّلام لیست بجعل مستقل بل هی حاصلة فی ضمن امامته تنال کلا منهم فی وقته المقدرله.

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ

اور جب ہم نے بنایا خانہ کعبہ کو لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ اور امن، اور بنا لو مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ،

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ

اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم بھیجا کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع

وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

اور سجدہ کرنے والوں کے لئے

کعبہ شریف کو مرجع اور جائے امن بنایا

تفسیر: حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے وطن سے ہجرت فرما کر ملک شام چلے گئے تھے انکی ایک بیوی حضرت سارہ تھی اور اس سے جو اولاد تھی وہ سب وہیں رہتے تھے۔ دوسری بیوی حضرت ہاجرہ تھی، جن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تھے ان کو اور اُن کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو بحکم خدا آپ مکہ معظمہ میں چھوڑ گئے، جو اسوقت سنسان اور چٹیل میدان تھے جس کا واقعہ ان شاء اللہ سورہ ابراہیم کی تفسیر کے ذیل میں بیان ہوگا۔ جب اسمٰعیل علیہ السلام بڑے ہو گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُن کے ذبح کرنے کا حکم ہوا جس کی بجا آوری میں کامیاب ہو گئے۔ نیز دونوں کو کعبہ شریف بنانے کا حکم ہوا۔ دونوں باپ بیٹوں نے مل کر کعبہ بنایا جس کا ذکر ابھی آ رہا ہے۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)
اس آیت شریفہ میں کعبہ شریف کو اوّل تو مَثَابَة فرمایا جو ثَابَ يَثُوْبُ سے ظرف کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی ہے لوٹنے کی جگہ، حضرت ابن عباسؓ اور متعدد تابعین سے مروی ہے کہ اسکو مثابہ اس لئے فرمایا کہ لوگ بار بار اس کی طرف آتے ہیں طواف کرتے ہیں اور اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں پھر واپس آتے ہیں، اسکی حاضری دینے سے طواف کرنے سے دل نہیں بھرتا۔ دنیا کے مختلف شہروں کے لوگ اس کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں۔ حضرت عکرمہ، قتادہ، اور عطا خراسانی نے اس کا ترجمہ "مجمع" سے کیا یعنی جمع ہونے کی جگہ، مآل اس کا بھی وہی ہے جو دوسرے حضرات نے فرمایا۔ کیونکہ جب ہر طرف لوگ آتے ہیں تو وہاں جمع ہونے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے پھر فرمایا وَاَمْنًا (کہ ہم نے کعبہ شریف کو امن کی جگہ بنایا) سورۂ آلِ عمران میں فرمایا۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (اور جو شخص اس میں داخل ہوگا امن والا ہوگا) حضرت ابراہیم علیہ السلام بانی کعبہ ہی کے وقت سے کعبہ شریف کی حُرمت ذہنوں میں چلی آ رہی ہے۔ درمیان میں مشرکین بھی کعبہ شریف کے متولی رہے ہیں اور وہ بھی اسکی عظمت اور حرمت کے قائل تھے اور سارے عرب میں یہ بات مشہور تھی کہ یہ امن کی جگہ ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عرب کے لوگ آپس میں لڑتے رہتے تھے ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر غارت گری کر دیتا تھا اور جنگ کرنا اُن کا ضروری مشغلہ تھا لیکن مکہ معظمہ کے رہنے والوں میں کوئی قبیلہ حملہ آور نہیں ہوتا تھا۔ اللہ جل شانہٗ نے سورہ عنکبوت میں اہل مکہ پر اپنا انعام ظاہر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ

اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَكْفُرُوْنَ (کیا انہیں معلوم نہیں کہ ہم نے بنا دیا حرم کو امن کی جگہ اور انکے گردو پیش میں لوگوں کو اُچک لیا جاتا ہے یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں) چونکہ حرم مکہ امن کی جگہ قرار دے دی گئی۔ اس لئے اس میں قتل وقتال جائز نہیں ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہ تم میں سے کسی کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ مکہ میں ہتھیار ساتھ لئے پھرے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے پہلے کسی کیلئے اس میں قتال کرنا حلال قرار نہیں دیا گیا اور میرے لئے حلال نہیں کیا گیا مگر دن کے تھوڑے سے حصہ میں پس مکہ معظمہ حرام ہے (یعنی اسکی حرمت برابر قائم ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کیلئے اس کی حرمت باقی رکھی ہے۔ (بخاری)

یہ جو آپ نے فرمایا کہ میرے لئے اس میں تھوڑی دیر کے لئے قتال حلال کیا گیا اس سے فتح مکہ کا دن مراد ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص حرم کے باہر حل میں کسی کو قتل کر کے حرم میں پناہ لے لے تو اس کو حرم میں قتل نہ کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ اُٹھا بیٹھا نہ جائے خرید وفروخت نہ کی جائے کھانے پینے کو کچھ نہ دیا جائے تا کہ مجبور ہو کر حرم سے باہر آجائے پھر اُسے خارج حرم حل میں قتل کر دیا جائے (رُوح المعانی) حرم مکہ میں جیسا کہ قتل وقتال جائز نہیں ہے اسی طرح سے اس میں شکار کرنا۔ شکار کے جانوروں کو بھگانا دوڑانا بھی ممنوع ہے۔ حرم مکہ سے گھاس اور درخت کاٹنا اور وہاں کے کانٹے کاٹنا بھی ممنوع ہے جس کی تصریح بخاری ومسلم کی احادیث میں موجود ہے۔ اور کُتب فقہ میں تفصیل لکھی ہے۔ پھر فرمایا: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِیْمَ مُصَلًّى (اور مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنا لو) مقام ابراہیم سے کیا مراد ہے اس بارے میں متعدد اقوال مشہور ہیں اور معتمد قول یہ ہے جسے عام مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ (اور احادیث شریفہ سے اسکی تائید ہوتی ہے کہ) اس سے وہ پتھر مراد ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ شریف تعمیر فرماتے تھے یہ پتھر زینہ کا کام دیتا تھا حضرت اسماعیل علیہ السلام اینٹیں اور چونہ وغیرہ دیتے جاتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے لیکر تعمیر فرماتے تھے۔ جب کعبہ شریف کی تعمیر سے فارغ ہو گئے تو جس جانب کعبہ شریف کا دروازہ ہے اس طرف دیوار سے ملا ہوا اُس کو چھوڑ دیا۔ سالہا سال وہ وہیں تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی اُسی جگہ رہا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی وہیں تھا پھر جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے وہاں سے ہٹا کر اس جگہ رکھ دیا جہاں اب ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ سیلاب آ گیا تھا جو اس کو بہا کر لے گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُسے لیکر وہاں رکھ دیا جہاں اب حضرات صحابہ کے سامنے اسکی جگہ بدلی، کسی نے کوئی نکیر نہیں کی اور ساری اُمت نے اس کا ایک جگہ ہونا تسلیم کر لیا جہاں حضرت عمرؓ نے رکھ دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلفاء راشدین میں سے ہیں جن کے طریقے پر چلنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔ (علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین) اور اُن کے بارے میں یہ بھی فرمایا: اقتدوا بالذین من بعدی أبی بکر و عمر (رواہ الترمذی) (یعنی میرے بعد اُن کا اتباع کرنا جو میرے بعد ہوں گے یعنی ابو بکر وعمر) اور اسکو پہلی جگہ سے ہٹانے میں حکمت بھی ہے کیونکہ اب طواف کرنیوالوں اور طواف کی رکعتیں پڑھنے والوں کی زیادہ کثرت ہے اگر اپنی جگہ ہوتا اور طواف کرنے والے اسی کے پیچھے طواف کی رکعتیں پڑھتے تو طواف کرنے والوں کو کعبہ شریف کے قریب سے گزرنے کا راستہ نہ ملتا۔ ایک زمانہ تک مقام ابراہیم ایک چاردیواری کے اندر تھا جو

مسقّف تھی اور قفل پڑا رہتا تھا۔ موجودہ حکومت نے وہ مسقف عمارت ختم کر کے مقام ابراہیم کو بلوری شیشہ میں رکھ دیا ہے۔ باہر سے مقام ابراہیم دکھائی دیتا ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کے نشانات صاف نظر آتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے (ص ۳۹۵ ج ۱) کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ طواف کرنے کے بعد مقام ابراہیم کی طرف بڑھے اور قرآن مجید کے یہ الفاظ تلاوت فرمائے وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی اور وہاں دو رکعتیں اس طرح پڑھیں کہ مقامِ ابراہیم کو اپنے اور کعبہ شریف کے درمیان کر لیا۔ ان دو رکعتوں میں سورۂ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ اور سورۂ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنا لیتے تو اچھا تھا تو اس پر آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی نازل ہوئی (صحیح بخاری) طواف کے بعد جو دو رکعتیں پڑھنا واجب ہے۔ انکو مسجد حرام میں کسی بھی جگہ پڑھ سکتے ہیں لیکن مقام ابراہیم کے پیچھے پڑھنا افضل ہے۔

بیت اللہ کو پاک کرنے کا حکم

پھر فرمایا: وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (اور ہم نے حکم بھیجا ابراہیم اور اسماعیل کی طرف کہ پاک کرو میرے گھر کو طواف کرنیوالوں کیلئے اور وہاں کے مقیمین کے لئے اور رکوع اور سجدہ کرنیوالوں کیلئے) اس میں کعبہ شریف کو پاک رکھنے کا حکم ہے اور کعبہ شریف کے ساتھ مسجد حرام کے پاک رکھنے کا بھی حکم ہو گیا کیونکہ طواف اور نماز کی ادائیگی اس میں ہوتی ہے۔ اور پاک کرنے میں سب کچھ داخل ہے۔ باطنی ناپاکی شرک و کفر اور بُت پرستی ہے اور گندی باتوں سے جھوٹ سے فریب سے بدعملی سے اور ظاہری ناپاکی سے اسے پاک رکھیں۔ طواف ایک ایسی عبادت ہے جو صرف مسجد حرام ہی میں ہو سکتی ہے جو کعبہ شریف کے چاروں طرف ہے۔ آیت شریفہ میں جو لفظ اَلْعٰكِفِيْنَ آیا ہے اسکے بارے میں حضرت سعد بن جبیر کا قول ہے کہ اس سے مکہ معظمہ کے رہنے والے مراد ہیں اور حضرت عطاء نے فرمایا کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو دوسرے شہروں سے آتے ہیں اور مسجد حرام میں قیام کر لیتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہم جب بھی مسجد حرام میں بیٹھ گئے تو عاکفین میں شمار ہو گئے۔ اور اس کے عموم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو مسجد حرام میں اعتکاف کریں۔ کیونکہ لفظ عکوف اُن پر بھی صادق آتا ہے۔ اور اَلرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ (رکوع اور سجدہ کرنیوالے) سے نمازی مراد ہیں۔ مسجد حرام میں جس قدر بھی طواف اور نماز کا اہتمام ہو سکے غنیمت جانے اِن دونوں کی بہت بڑی فضیلت ہے۔

طواف کا ثواب

سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اس گھر کا طواف کرتے ہوئے سات چکر لگائے اور ٹھیک طرح سے شمار کیا اُسے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ہو گا اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ طواف کرنے والا جو بھی قدم رکھے گا اور اُٹھائے گا تو ہر قدم پر اللہ تعالیٰ اس کا ایک گناہ معاف فرما دیں گے اور ایک نیکی اس کے اعمال نامہ میں لکھ دیں گے۔

مسجد حرام میں نماز کا ثواب

مسجد حرام میں نماز پڑھنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری مسجد (یعنی مسجد نبوی) میں ایک

نماز دوسری نمازوں کے مقابلہ میں ہزار نمازوں سے افضل ہے مگر مسجد حرام اس سے مستثنیٰ ہے (کیونکہ اس کا ثواب مسجد نبوی میں نماز پڑھنے سے زیادہ ہے) مسجد حرام میں ایک نماز دوسری نمازوں کے مقابلہ میں ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔

(رواہ احمد وابن ماجہ باسنادین صحیحین کمافی الترغیب للحافظ المنذری ص ۲۱۴ ج ۲)

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ

اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بنا دے اس شہر کو امن والا اور رزق دے یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں سے جو

اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ

ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور جو شخص کفر اختیار کریگا سو میں اسے تھوڑا سا نفع پہنچاؤں گا۔ پھر اُسے دوزخ

اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

کے عذاب کی طرف جبراً پہنچاؤں گا۔ اور وہ بری جگہ ہے

اہل مکہ کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء

تفسیر: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کے لئے اللہ جل شانہٗ سے درخواست کی کہ اس کو امن والا شہر بنا دیجئے' اللہ جل شانہٗ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اس کو "بلد امین" قرار دیا جس کے متعلق بعض احکام گذشتہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں بیان ہو چکے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی دعا کی کہ اس شہر کے رہنے والوں کو جو بھی ان میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو رزق دیا جائے جو طرح طرح کے پھلوں سے ہو۔ چونکہ انہوں نے پہلے لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ۔ کا اعلان سُن لیا تھا اس لئے دعا میں اہل ایمان کی تخصیص کر دی اور عرض کیا پھلوں کا انعام اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو دیا جائے' چونکہ اللہ تعالیٰ دنیا سبھی کو دیتے ہیں اور رزق دنیاوی مومن اور کافر سبھی کو ملتا ہے اس لئے اللہ پاک کی طرف سے اعلان ہوا کہ رزق تو سبھی کو ملے گا اس میں ایمان والوں کی تخصیص نہیں ہے مومن اور کافر سبھی کھائیں گے لیکن آخرت کا رزق صرف مومنین کے لئے مخصوص ہے کافروں کو بھی دنیا میں رزق ملتا رہے گا۔ جتنی جس کی زندگی ہوگی اتنے دن دنیا میں اپنا رزق کھا سکے گا۔ اور دُنیا میں جتنی بھی بڑی زندگی ہو آخرت کے مقابلہ میں تھوڑی ہی سی ہے۔ اہل کفر دنیا میں کھا پی لیں گے دنیا سے نفع اٹھا لیں گے لیکن آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں وہاں اُن کو دوزخ جانے کے لئے مجبور ہونا پڑے گا۔ اور دوزخ کے عذاب سے انہیں کسی بھی طرح اور کبھی بھی کوئی چھٹکارا نہ ملے گا۔ اور دوزخ بہت بُری عذاب کی جگہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل میں جب تک اللہ نے چاہا اہل ایمان رہے اور مکہ معظمہ میں بستے رہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ پھر اہل مکہ مشرک ہو گئے۔ کعبہ شریف تک میں اُنہوں نے بُت رکھ لئے اور لات وعزّٰی اور منات کی پوجا کرنے لگے۔ اگر ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہو جاتی کہ جو اہل ایمان ہیں انہیں رزق ملے تو اہل مکہ نے جب کُفر اختیار کیا تھا اُسی وقت سے پھلوں سے محروم ہو جاتے لیکن اللہ جل شانہٗ نے اہل مکہ کو ہمیشہ رزق دیا مومنوں کو بھی اور کافروں کو بھی۔

مکہ معظمہ میں دنیا بھر کے پھل

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا ایسی قبول فرمائی کہ دنیا بھر سے مکہ معظمہ میں پھل آتے ہیں اور وہاں کے مقامی حضرات اور حجاج وزائرین سب کھاتے ہیں اور ان سے منتفع اور متمتع ہوتے ہیں۔ سورۂ قصص میں فرمایا: اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (کیا ہم نے اُن کو امن وامان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس سے کھانے کو ملتے ہیں لیکن اُن میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے)

مکہ معظمہ کے قریب ہی شہر طائف آباد ہے اور وہ سر سبز شاداب علاقہ ہے ہمیشہ وہاں سے طرح طرح کے پھل مکہ معظمہ پہنچتے رہے ہیں اور دنیا کے تمام اطراف واکناف سے مکہ معظمہ میں طرح طرح کے پھل آ رہے ہیں۔ شاید دنیا کا کوئی پھل ایسا نہ بچا ہو جو مکہ معظمہ نہ پہنچا ہو بعض حضرات کا یہ فرمانا ہے کہ ثمرات کے عموم میں درختوں کے پھلوں کے علاوہ مشینوں کی پیداوار اور دستکاریوں سے حاصل ہونے والا سامان بھی داخل ہے۔ مکہ کی سرزمین میں نہ کاشت ہے نہ شجر کاری ہے اور نہ صنعت کاری لیکن پھر بھی اس میں دُنیا بھر کی ثمرات اور طرح طرح کی مصنوعات ملتی ہیں۔

مدینہ منورہ کیلئے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء:

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے مکہ معظمہ کے لئے دعاء کی تھی اور حضرت حبیب اللہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کیلئے دعاء کی (صحیح مسلم) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اہل مدینہ کا یہ طریقہ تھا کہ جب پہلا پھل آتا تھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آتے تھے آپ اُسے لے کر یوں دعا کرتے تھے اے اللہ تو ہمارے لئے ہمارے پھلوں میں برکت دے اور ہمارے لئے ہمارے شہر میں برکت دے اور ہمارے لئے ہمارے ''صاع'' میں برکت دے اور ہمارے لئے ہمارے ''مُد'' میں برکت دے (صاع اور مُد اُس زمانہ کے پیمانے تھے) اے اللہ! بے شک ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے اور تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے اور میں تیرا بندہ تیرا نبی ہوں ابراہیم (علیہ السلام) نے آپ سے مکہ کیلئے دعا کی تھی اور میں آپ سے مدینہ کیلئے دعا کرتا ہوں جو کچھ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کیلئے مانگا میں اُسی قدر اور اُس کیساتھ اُس جیسا مزید آپ سے طلب کرتا ہوں اسکے بعد اپنے کسی سب سے چھوٹے بچہ کو بُلا کر وہ پھل دیدیتے تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دعا کی۔ اللھم اجعل بالمدینۃ ضعفی ما بمکۃ من البرکۃ (اے اللہ مدینہ میں اُس سے دوگنی برکت کردے جو مکہ میں ہے) صحیح مسلم

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی مقبول مدینہ منورہ میں بھی پورے عالم سے طرح طرح کے ثمرات ومصنوعات ومنتجات کھنچ کر آتے ہیں اور کھلی آنکھوں مکہ معظمہ سے دوچند برکات دیکھنے میں آتی ہیں۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ

اور جب اُٹھا رہے تھے ابراہیم کعبہ کی بنیادیں اور اسمٰعیل بھی اے ہمارے رب قبول فرمالے ہم سے بے شک تو ہی خوب سُننے والا

الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا

جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب اور بنادے ہم کو تو اپنا فرمانبردار اور بنادے ہماری اولاد میں سے ایک اُمت جو تیری فرمانبردار ہو اور ہمیں بتادے

مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۸﴾

ہمارے حج کے احکام اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو ہی توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے

حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا کعبہ شریف تعمیر کرنا

تفسیر: کعبہ شریف پہلے فرشتوں نے پھر حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا پھر عرصہ دراز کے بعد جب طوفانِ نوح کی وجہ سے اسکی دیواریں مسمار ہو گئیں اور عمارت کا ظاہری پتہ تک نہ رہا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر کعبہ شریف کی بنیادیں اٹھائیں اور کعبہ بنایا (کما ذکرہ الازرقی) چونکہ جگہ معلوم نہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو متعین کر کے اس کی جگہ بتا دی گئی جس کا ذکر سورہ حج کی آیت کریمہ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ میں فرمایا ہے۔ بنائے ابراہیمی میں حطیم کا حصہ کعبہ شریف میں داخل تھا قریش مکہ نے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال پہلے جب کعبہ شریف بنایا۔ تو ان کے پاس خرچہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے کعبہ شریف کا کچھ حصہ باہر چھوڑ دیا جسے حطیم کہا جاتا ہے اس حصہ میں میزاب رحمت کا پانی گرتا ہے اور نصف قد کے برابر دیواریں بنی ہوئی ہیں اس پر چھت نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا ہے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تیری قوم کے لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں تو میں کعبہ شریف کو توڑ دیتا اور اُسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر بنا دیتا اور اس کا دروازہ زمین پر کر دیتا اور حجر یعنی حطیم کو اس میں داخل کر دیتا دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں اس لئے دو دروازے بنا دیتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کعبہ شریف اُسی حال میں رہنے دیا جس طرح قریش مکہ نے بنایا تھا پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے قواعد ابراہیمیہ پر بنا دیا تھا اور حطیم کو کعبہ شریف میں داخل کر دیا تھا اور دروازے بنا دیئے تھے ایک داخل ہونے کا ایک خارج ہونے کا اور بالکل زمین کے برابر کر دیا تھا اندر جانے کے لئے زینہ کی ضرورت نہ تھی پھر حجاج بن یوسف نے اُسی طرح بنا دیا جیسا قریش نے بنایا تھا' حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے حجاج کے بعد ہارون الرشید بادشاہ نے پوچھا کہ ہم پھر سے اُسی طرح بنا دیں جیسا حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بنایا تھا تو اُنہوں نے فرمایا کہ اے امیر المومنین اس کو بادشاہوں کا کھلونا نہ بنایئے جو بھی آئے گا اسے توڑا کرے گا۔ اور بنایا کرے گا۔ اس طرح سے لوگوں کے دلوں سے اسکی ہیبت جاتی رہے گی (ذکرہ النووی فی شرح مسلم ص ۴۲۹ ج ۱) صحیح بخاری ص ۴۷۶ ج ۱ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے' کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام سے فرمایا کہ بے شک مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ اپنے رب کے حکم کی فرمانبرداری کیجئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میری مدد کرنا' عرض کیا کہ میں آپ کی مدد کرونگا۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہاں ایک گھر بناؤ اور ایک اُونچے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا اس کے بعد دونوں نے بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھانا شروع کیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ پتھر لاتے تھے اور حضرت ابراہیمؑ تعمیر کرتے جاتے تھے یہاں تک کہ جب دیواریں اُونچی ہو گئیں تو یہ پتھر (یعنی مقام ابراہیم) لے آئے جس پر کھڑے ہو کر تعمیر کرتے تھے۔ یہ پتھر زینہ کا کام دیتا تھا حضرت اسمٰعیلؑ ان کو پتھر دیتے تھے

اور دونوں یہ دعا کرتے جاتے تھے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ بات کس قدر ذہن میں بٹھانے کے لائق ہے کہ اللہ کے دو پیارے اللہ کے دونوں پیغمبر خلیل اللہ اور ذبیح اللہ علیہما السلام اللہ کا گھر اللہ کے حکم سے بنا رہے ہیں۔ اُن کے اخلاص میں ذرا بھی شبہ نہیں پھر بھی وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یُوں عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم نے قبول فرمائیے اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کیسا ہی مخلص ہو اور کیسا ہی عمل صالح کرے اُسے اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دُعا کرتے رہنا چاہیے اس بات سے ڈرتا رہے کہ کہیں خود پسندی اور عجب نفس میں مبتلا نہ ہو جائے درحقیقت اہل اخلاص کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کام کرتے جاتے ہیں اور ڈرتے جاتے ہیں کہ ہمارا یہ عمل قبول ہوتا ہے۔ یا نہیں۔؟ کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُھُمْ وَجِلَةٌ اَنَّھُمْ اِلٰی رَبِّھِمْ رٰجِعُوْنَ ٥ (مفسر ابن کثیر ص ۱۷۵ ج۱) نے بحوالہ ابن ابی حاتم وہیب بن الورد سے نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے آیت یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ (الآیۃ) پڑھی پھر رونے لگے اور کہنے لگے کہ اے رحمٰن کے دوست آپ بیت الرحمٰن کی بنیادیں اُٹھا رہے ہیں اور اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ قبول نہ ہو' حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے کعبہ شریف بناتے ہوئے یہ دعا بھی کی کہ اے ہمارے رب تو ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری ذریت میں سے بھی ایک اُمت بنا دے جو تیری فرمانبردار ہو' اس میں اوّل تو وہی خوف وخشیت والی بات کا مظاہرہ کیا کہ مسلم اور فرمانبردار ہوتے ہوئے بھی اپنے بارے میں دُعا کی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا فرمانبردار ہی رکھے مومن کو چاہیئے کہ ڈرتا رہے اور ایمان واسلام کی دولت کے لئے اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ شکر گزار رہے اور اس کو محض اللہ کی توفیق سمجھتے اور اس نعمت کے بقا اور دوام کی دعا کرتا رہے۔

اُمت مسلمہ کے لئے دعاء اور اسکی قبولیت:

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اپنی ذرّیت میں سے اُمت مسلمہ کے پیدا ہونے کی دعا بھی کی مفسرین نے فرمایا ہے کہ چونکہ ارشاد خداوندی لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اُن کی ساری ذرّیت مومن نہ ہوگی اس لئے اُنہوں نے یوں عرض کیا کہ اے ہمارے رب ہماری ذریت میں سے اُمت مسلمہ بنا دینا بعض حضرات کا فرمانا ہے کہ اس سے عرب مراد ہیں' جو حضرت اسمٰعیل اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن بندوں کو اپنے دین و ایمان کی فکر رکھتے ہوئے اپنی نسل اور ذرّیت کے دین ایمان کے لئے بھی فکر مند ہونا چاہیئے اور یہ دعا کرتے رہنا چاہیئے کہ ہماری نسل میں موحدین' مومنین' مخلصین' متقین باقی رہیں۔ سُورۃ فرقان میں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا (اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا پیشوا بنا دے) اور سورۂ تحریم میں فرمایا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (اے ایمان والو بچاؤ اپنی جانوں کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے) اہل وعیال کے دین وایمان کے لئے دعاء بھی کرنا چاہیئے اور فکر بھی کرنا چاہیئے۔

مناسک حج جاننے کے لئے دعاء

کعبہ شریف بناتے ہوئے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے یہ دُعا بھی کی کہ اے اللہ ہمیں مناسک

یعنی احکام حج سکھا دے تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کی تعمیر مکمل کر دی تو حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور اُن کے ہاتھ پکڑ کر صفا اور مروہ پر لے گئے کہ یہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں پھر اُن کو منٰی لے گئے' پھر مزدلفہ میں لے گئے اور فرمایا یہ المشعر الحرام ہے۔ پھر اُن کو عرفات میں لے گئے اور اُن کو احکام حج سکھا دیئے۔ جب عرفات میں لے گئے تو پوچھا کہ میں نے جو کچھ تم کو بتایا ہے تم نے پہچان لیا اور تین بار پوچھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں پہچان لیا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حضرت جبریل علیہ السلام نے حج کا طریقہ اور حج کے احکام بتائے انہوں نے حج کا اعلان عام کر دیا جس کا ذکر سورۂ حج میں ان الفاظ میں ہے وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو) ان کے بعد موحدین برابر حج کرتے رہے اور ان کے حجوں میں توحید کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ جب ان ہی کی نسل اور ذرّیت میں مشرکین پیدا ہو گئے اور وہی کعبہ شریف کے متولی بنے تو ان لوگوں نے حج میں شرک کی آمیزش کر دی اور حج کے احکام بدل دیئے' حج کا مہینہ بھی بدل دیتے تھے۔ عرفات ہی میں نہیں جاتے تھے۔ مزدلفہ سے واپس آ جاتے تھے۔ بیت اللہ شریف کا ننگے طواف کرتے تھے جب حضور اقدس ﷺ نے مکہ فتح کیا اور مکہ سے مشرکین کا تسلط ختم ہوا تو آپ نے اعلان کروا دیا کہ آئندہ کوئی شخص بیت اللہ کا ننگے طواف نہ کرے اور کوئی مشرک حج نہ کرے۔ پھر آپ نے ۹ھ میں حج کیا جسے حجۃ الوداع کہتے ہیں اور اُس میں پوری طرح حج کے احکام سکھائے اور بتائے اور حکم فرمایا کہ خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُم (یعنی تم مجھ سے احکام حج سیکھ لو) اور فرمایا: قفوا علی مشاعرکم فانکم علی ارث من ارث ابیکم ابراهیم علیه السلام۔ (کہ تم لوگ انہیں جگہوں میں وقوف کرو جو پرانی جگہیں معروف ہیں کیونکہ تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی میراث پر ہو)۔ (رواہ الترمذی وأبوداؤد والنسائی وابن ماجہ کما فی مشکوٰۃ ص ۲۲۸)

جس کسی کو بھی حج یا عمرہ کرنا ہو اُس کو لازم ہے کہ حج اور عمرہ کے احکام معلوم کرے۔ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ حج اور عمرہ کے لئے چل دیتے ہیں اور ذرا بھی انکے احکام معلوم نہیں کرتے تلبیہ تک نہیں جانتے' فرائض و واجبات تک چھوڑ دیتے ہیں اور جب کوئی عالم بتانے لگتا ہے تو اس کا بتانا ناگوار ہوتا ہے۔ نعوذ بالله من الجهل والسفاهه والحمق والضلالة.

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

اے ہمارے رب اور بھیج دے اُن میں ایک رسول اُن میں سے' جو تلاوت کرے اُن پر تیری آیات' اور سکھائے ان کو کتاب اور حکمت'

وَيُزَكِّيهِمْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾

اور اُن کا تزکیہ کرے' بے شک تو ہی عزیز ہے' حکیم ہے

اہل مکہ میں سے ایک رسول بھیجنے کی درخواست اور اسکی مقبولیت

تفسیر: اس آیت میں بھی حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دُعا کا تذکرہ ہے کعبہ شریف بناتے ہوئے جو دعائیں ان دونوں حضرات نے کی تھیں ان میں سے ایک یہ دُعا بھی ہے کہا اے ہمارے رب ان میں سے ایک رسول مبعوث فرما اس رسول سے خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں جو عربی بھی تھے اور مکی بھی اور حضرت ابراہیم و

حضرت اسمٰعیل علیہما السلام دونوں کی نسل میں سے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جتنے بھی انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے سب انہی کی نسل میں سے تھے۔ اور حضرت سرورِ عالم خاتم النبیین ﷺ کے علاوہ سب بنی اسحٰق تھے اور صرف آپ ہی بنی اسمٰعیل میں سے ہیں۔ مفسر ابن کثیر نے (ص ۱۸۴ ج ۱) مسند امام احمد سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کا ابتدائی تذکرہ اولاً کیسے شروع ہوا آپ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں اور میری والدہ نے جو خواب دیکھا کہ اُن کے اندر سے ایک نور نکلا ہے جس نے شام کے محلات کو روشن کر دیا۔ میں اس خواب کا مظہر ہوں یہ حدیث صاحب مشکوٰۃ نے بھی ص ۵۱۳ شرح السنہ سے نقل کیا ہے اس میں یوں ہے کہ میں اپنی والدہ کے خواب کا مظہر ہوں جنہوں نے وضع حمل کے وقت دیکھا تھا اُن کے لئے ایک نور روشن ہوا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔ حدیث نقل کر کے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ مطلب یہ کہ سب سے پہلے جنہوں نے میرا تذکرہ کیا اور لوگوں میں مجھے مشہور کیا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یہ تذکرہ دُعا کی صورت میں تھا۔ ذکر مشہور ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے جو آخری نبی تھے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام انہوں نے آپ کا نام لیکر بشارت دی۔ اور بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرمایا: يَا بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ (کہ اے بنی اسرائیل بلاشبہ میں تمہاری طرف بھیجا ہوا اللہ کا رسول ہوں۔ میرے سامنے جو توراۃ ہے اسکی تصدیق کرنے والا ہوں۔ اور ایک ایسے رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہوگا)

زمانۂ حمل میں آپ کی والدہ نے خواب دیکھا تھا کہ ان کے اندر سے ایک نور نکلا جس کی وجہ سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔ اُنہوں نے اپنا خواب اپنی قوم کو سنایا۔ جو لوگوں میں مشہور ہو گیا اور یہ آپکی تشریف آوری کے لئے ایک بہت بڑی تمہید تھی۔

آخر زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی مبعوث فرمایا جن کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی اور عیسیٰ علیہ السلام نے جن کی بشارت دی تھی۔ آپ کا نام احمد بھی ہے اور محمد بھی۔ آپ پر اللہ تعالیٰ نے نبوت اور رسالت ختم فرما دی اور سارے عالم کے انسانوں کے لئے رہتی دنیا تک آپ کو نبی اور رسول بنا کر بھیج دیا اور سورۃ احزاب میں آپکے خاتم النبیین ہونے کا اعلان فرما دیا۔ اور آپ نے لا نبیّ بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں) اور ختم بی النبیون (مجھ پر نبیوں کی آمد ختم ہو گئی) اور انّ الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبیّ (بلاشبہ نبوت ختم ہو گئی اب میرے بعد نہ کوئی رسول ہے نہ نبی ہے) (سنن ترمذی)

اعلان فرمایا:- آپ کی نبوت اور رسالت عامہ کا اعلان فرمانے کے لئے سورۃ اعراف میں یوں ارشاد فرمایا: قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا اللہ کا رسول ہوں)۔

جس رسول کے آنے کی دُعا کی اسکی صفات

حضرت ابراہیم وحضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے اپنی نسل میں سے جس رسول کے مبعوث ہونے کے لئے دعا کی تھی اسکی صفات میں يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِكَ اور يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ فرمایا تھا۔ سورۃ آلِ عمران (ع ۱۸) میں بھی آپ کی یہ صفات مذکور ہیں اور سورۃ جمعہ میں بھی آپ کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کام اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد فرمائے تھے۔ آپ نے ان کو پوری طرح سے انجام دیا۔

تلاوتِ کتاب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سورۃ بقرہ میں اوّل تو یہ فرمایا کہ ’’یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ‘‘ کہ وہ نبی لوگوں کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت فرمائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام بھی ہے اور اللہ کی کتاب بھی اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھانا اور سُننا اور سُنانا تلاوت کرنا صحیح طریقہ پر ادا کرنا بھی مطلوب اور مقصود ہے۔ بہت سے جاہل جو تلاوت کا انکار کرتے ہیں اور بچوں کو قرآن مجید حفظ کرانے سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طوطے کی طرح رٹنے سے کیا فائدہ؟ یہ لوگ کلامِ الٰہی کا مرتبہ اور مقام نہیں سمجھتے دشمنوں کی باتوں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید کو لوگوں کے آپس کے خطوط پر اور انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر قیاس کرتے ہیں۔ اور اپنی جہالت سے یوں کہتے ہیں کہ قرآن کے معانی اور مفاہیم کا سمجھنا کافی ہے۔ اس کا پڑھنا اور یاد کرنا ضروری نہیں (العیاذ باللہ) یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ قرآن مجید کے الفاظ کو محفوظ رکھنا فرض کفایہ ہے۔ صحیفوں پر اعتماد کئے بغیر سینوں میں یاد رکھنا لازم ہے تاکہ اگر مطبوعہ مصاحف (العیاذ باللہ) معدوم ہو جائیں تب بھی قرآن شریف اپنی تمام قراءتوں کے ساتھ محفوظ رہ سکے۔

تلاوت قرآن کے فضائل

نیز قرآن مجید کی تلاوت میں بہت بڑا ثواب ہے، سمجھ کر پڑھے یا بے سمجھے پڑھے تلاوت پر اجر عظیم ملتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رب تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جسے قرآن نے میرے ذکر سے اور مجھ سے مانگنے سے مشغول کر لیا میں اُسے اُس سے افضل عطیہ دوں گا جو مانگنے والوں کو دوں گا۔ اور کلام اللہ کی فضیلت دوسرے تمام کلاموں پر ایسی ہے جیسی اللہ کی فضیلت اس کی مخلوق پر ہے۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اللہ کی کتاب سے ایک حرف پڑھا اس کے بدلہ میں ایک نیکی ہے اور ایک نیکی دس گنی ہو کر ملتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے (بلکہ) الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے (صرف الٓمّٓ کا تلفظ کرنے سے تیس نیکیاں مل جائیں گی) (رواہ الترمذی وقال حسن صحیح) معلوم ہوا کہ تلاوت قرآن کو طوطے کی طرح رٹنے سے تشبیہ دینا سخت گمراہی ہے۔ جس کی تلاوت کرنے سے ہر حُرف پر ایک نیکی ملتی ہے اور ہر نیکی کی دس نیکیاں بن جاتی ہوں اُسکی تلاوت طوطے کی طرح رٹنی لگانے کے برابر کیسے ہوئی۔ درحقیقت قرآن کی تلاوت مُستقل کام ہے اس کے الفاظ کو محفوظ رکھنا مستقل ذمہ داری ہے اور اسکی تفسیر کو صحابہ اور تابعین کے طریقے پر محفوظ رکھنا اور بیان کرنا مُستقل کام ہے۔ اور اس کے معانی مفاہیم کو سمجھنا اور اس سے احکام کا استنباط کرنا مستقل عمل ہے۔ یہ سب چیزیں ضروری ہیں امت انکی مکلف ہے۔

جو لوگ اس پر زور دیتے ہیں کہ الفاظ کے پڑھنے اور یاد رکھنے کی ضرورت نہیں یہ لوگ نصاریٰ اور یہود سے بھی عبرت نہیں لیتے ان لوگوں نے اپنی کتابوں کے الفاظ کو محفوظ نہ رکھا تو اپنی کتابوں سے محروم ہو گئے۔ ان کی کتابوں کے ترجمے تو دنیا کی زبان میں ملتے ہیں مگر اصل کتاب مفقود ہے۔ ترجمہ صحیح ہے یا غلط اُس کے میلان کے لئے ان کے پاس اصل کتاب نہیں ہے اور یہیں سے اُن کے یہاں تحریف کا راستہ بھی نکل آیا۔ جب اصل کتاب موجود نہیں تو جس کا جو جی چاہے ترجمہ کر سکتا ہے۔

مسجد نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں ایک صاحب سے احقر کی ملاقات ہوئی اور اُنہوں نے کہا کہ میں نے اپنے بچہ کو قرآن مجید

حفظ کرنے میں لگایا ہے لیکن میرے ایک اُستاد آئے تھے اُنہوں نے کہا کہ اب قرآن حفظ کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ قرآن مجید کمپیوٹر میں آ گیا ہے۔ احقر نے اُن سے کہا کہ تراویح میں قرآن مجید سنانے کے لئے کیا کمپیوٹر محرابوں میں رکھ دیا جائے گا؟ اور دنیا بھر کے دیہات میں ایک ایک گاؤں میں پانچ چھ سات مسجدیں ہیں کیا گاؤں والے ہر مسجد کے لئے کمپیوٹر خریدیں گے اور کمپیوٹر سیکھنے کے لئے اپنے دیہاتی آدمیوں کو سکھانے والوں کے پاس بھیجیں گے؟ حفظ کی ضرورت صرف اس لئے نہیں ہے کہ یہ معلوم کرلیا جائے کہ فلانی آیت کس سورت میں ہے اور پوری آیت کس طرح سے ہے۔ قرآن کا تلاوت کرنا اور سننا اور سُنانا اپنی زبان اور کانوں کو اس میں مشغول رکھنا بہت بڑا عمل صالح ہے جو تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ جو لوگ قرآن مجید اور حدیث شریف کو نہیں جانتے اور ایمانی تقاضوں سے ناواقف ہوتے ہیں وہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی باتوں سے متاثر ہو کر الفاظِ قرآنیہ سے محروم ہونے کا سبق دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انکو ایمان کی سمجھ دے اور اہل شر کے شر سے بچائے۔

کتاب اور حکمت کی تعلیم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا کام ذکر کرتے ہوئے **وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ** ارشاد فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فریضہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی کتاب کی تعلیم دیں۔ کتاب اللہ کے الفاظ بھی سکھائیں اور معانی بھی سمجھائیں۔ عربی زبان جاننا قرآن کے سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر وہی معتبر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی اور سورۂ حضرات صحابۂ کرام نے سیکھی پھر اُن سے تابعین اور تبع تابعین اور سلف صالحین سے ہوتے ہوئے اُمت تک پہنچی۔ سُورۃ نحل میں فرمایا: **وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ** (اور ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لئے وہ بیان کریں جو انکی طرف تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا گیا)

آج کل بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تھوری بہت عربی جان کر قرآن شریف کے معانی اور مفاہیم اپنی طرف سے بتانے لگے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تفسیر سے بے نیاز ہو کر گمراہ ہو رہے ہیں اور گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جہالت اور گمراہی سے کہتے ہیں کہ قرآن اللہ کا خط ہے۔ جو مخلوق کی طرف بھیجا گیا اور رسول کی حیثیت محض ایک ڈاکیے کی ہے۔ ڈاکیے کا کام خط پہنچا دینا ہے۔ خط پڑھ کر سنانا۔ سمجھانا اس کا کام نہیں۔ قرآن مجید نے تو اپنے بارے میں یہ کہیں نہیں فرمایا کہ یہ اللہ کا خط ہے جو مخلوق کی طرف آیا ہے اس کو خود ہی سمجھ لینا اور اس کے لانے والے سے مت سمجھنا' بلکہ قرآن نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں کتاب و حکمت کی تعلیم دینا بتایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درمیان سے نکال کر قرآن سمجھنا کفر کی دعوت اور اشاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ اُمت مرحومہ کو ان لوگوں کے فریب سے محفوظ فرمائے۔

آیت شریفہ میں الکتاب اور الحکمۃ دو لفظ مذکور ہیں اور دونوں کی تعلیم دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کے فرائض میں شمار فرمایا ہے مفسر بغوی معالم التنزیل (ص ۱۱۶ ج ۱) میں لکھتے ہیں کہ الکتاب سے قرآن مجید مُراد ہے اور الحکمت سے مجاہد کی تفسیر کے مطابق فہم القرآن مراد ہے اور بعض حضرات نے اس سے احکام قضا مراد لئے ہیں۔ اور بعض حضرات نے حکمت کی تفسیر العلم والعمل سے کی ہے۔ صاحب روح المعانی نے بعض مفسرین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

الحکمة سے کتاب اللہ کے حقائق ودقائق اور وہ سب چیزیں مراد ہیں جن پر قرآن مجید مشتمل ہے۔ اس صورت میں تعلیم کتاب سے مراد اُس کے الفاظ سمجھانا اور اسکی کیفیت ادا بیان کرنا مراد ہے اور تعلیم الحکمة سے اس کا معانی اور اسرار اور جو کچھ اس میں ہے اس سے واقف کرانا مراد ہے اور بعض حضرات نے حکمت کی تفسیر یوں کی ہے۔ ما تکمل به النفوس من المعارف والاحکام یعنی وہ تمام معارف اور احکام جن سے نفوس کی تکمیل ہوتی ہے حکمت سے وہ سب مراد ہیں۔

درحقیقت حکمت کے جو معانی حضرات مفسرین نے بتائے ہیں وہ ایک دوسرے کے معارض اور منافی نہیں ہیں مجموعی حیثیت سے اُن سب کو مراد لیا جاسکتا ہے۔

تزکیہ نفوس: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا فرض منصبی وَيُزَكِّيهِمْ بیان فرمایا لفظ يُزَكِّي تزکیہ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ تزکیہ لغت میں پاک صاف کرنے کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف کتاب اللہ کا پڑھا دینا اور سمجھا دینا ہی نہیں دیا بلکہ نفوس کا تزکیہ بھی آپ کے فرض منصبی میں داخل تھا۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ میں تحلية النفوس بالفضائل اور یزکیهم میں تخلية النفوس عن الرزائل کا ذکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو توحید خداوندی سے آراستہ کیا اور کفر اور شرک کی نجاست سے پاک کیا۔ ایمان اور یقین دیا۔ شک سے بچایا۔ گناہوں کی گندگی سے دور کیا۔ نفوس کے رذائل دور کئے۔ اخلاق عالیہ اور اعمالِ صالحہ بتائے اور عمل کر کے دکھایا۔ گناہوں کی تفصیل بتائی ان کے اثرات ظاہرہ باطنہ دنیویہ اُخرویہ سے باخبر فرمایا۔ نیکیوں کی تفصیلی فہرست بتائی اور اُن کے منافع دنیویہ واُخرویہ سے مطلع فرمایا حسد، بخل، کینہ، تکبر، حرص، لالچ، حُبِّ جاہ کی مذمت فرمائی۔ حب فی اللہ اور تواضع اور فروتنی، صلہ رحمی، سخاوت، ضعیف کی مدد، بڑوں کی خدمت، یتیم کیساتھ رحمدلی، تقویٰ، اخلاص، اکرام اہل ایمان، نرمی، حسن الجوار، غصہ پی جانا وغیرہ وغیرہ کی تعلیم دی۔ انسان کو انسان بنایا حیوانیت اور بہیمیت سے بچایا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ بعثت لا تمم حسن الاخلاق (کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں) (رواہ مالک فی المؤطا)

نفوس کا تزکیہ صرف زبانی طور پر بتا دینے سے نہیں ہو جاتا اس کے لئے صحبت کی ضرورت ہوتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ کے لئے انسانوں ہی میں سے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے تا کہ وہ عملی طور پر ان کا تزکیہ کر سکیں اور تا کہ اُنکی صحبت سے انسانوں کے نفوس خیر کی طرف پلٹ سکیں اور اعمال صالحہ کے خوگر ہو جائیں اور نفوس کی شرارتوں کو سمجھ سکیں اور اُن سے بچ سکیں سورۂ توبہ میں ارشاد ہے۔ يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) اس آیت شریفہ میں سچوں کے ساتھ ہونے کی تعلیم فرمائی ہے جو لوگ اپنے اخلاص اور عمل میں سچے ہیں ان کے ساتھ رہنے سے طبیعت اعمال صالحہ کی طرف راغب ہوتی ہے اور نفس وشیطان کی مکاریوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے پھر ان کا توڑ بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ جس کسی کی صحبت اختیار کرے پہلے دیکھ لے کہ وہ متبع سُنّت ہے یا نہیں؟ اس میں فکر آخرت کتنی ہے؟ اور حب دنیا اور جلب زر کے لئے تو مرشد بن کر نہیں بیٹھا، جس کسی کو متبع سُنّت اور آخرت کا فکر مند پائے اس کی صحبت اُٹھائے، مال وجاہ کا حریص مصلح اور مُرشد نہیں ہو سکتا اس کی صحبت میں رہنا زہر قاتل ہے۔

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرٰهِمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ

اور ملت ابراہیم سے وہی روگردانی کریگا جس نے اپنے نفس کو احمق بنایا، اور بے شک ہم نے اُن کو منتخب کر لیا دُنیا میں،

وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ
اور وہ آخرت میں صالحین میں سے ہیں' جب فرمایا اُن کے رب نے کہ فرمانبردار ہو جا' تو انہوں نے عرض کیا کہ میں رب
الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾
العالمین کا فرمانبردار رہوں۔

ملت ابراہیمی سے وہی اعراض کرے گا جو احمق ہو

تفسیر: حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت میں توحید الٰہی پر جینے اور مرنے کا حکم ہے اور شرک سے بیزاری ہے۔ ظاہری باطنی نظافت اور طہارت ہے' مہمانی ہے' قربانی ہے' اللہ کی عبادت ہے اور فرمانبرداری ہے۔ انابت الی اللہ ہے صحیح انسانیت کی تعلیم ہے اُن کی ملت کا اتباع کرنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا۔ سورۃ نحل میں ارشاد ہے۔

ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ (پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ ابراہیم کی ملت کا اتباع کیجئے جو باطل دینوں کو چھوڑ کر حق ہی کی راہ پر چلنے والے تھے اور مشرکین میں سے نہیں تھے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل اتمام کلمات' اور اُن کو لوگوں کا پیشوا بنانے کے اعلان' اور ان کے کعبہ بنانے' اور قبولیت کی دعائیں کرنے' اور اپنی نسل میں سے نبی آخر الزماں کی بعثت کی دعا مانگنے کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد ہو رہا ہے کہ ملت ابراہیمی سے وہی شخص بے رغبت ہو سکتا ہے اور اُن کی ملت سے وہی روگردانی کر سکتا ہے جو عقل سے کورا ہو اور جس نے اپنے نفس کو بالکل ہی احمق بنا دیا ہو' کوئی سلیم الفطرت عقل مند انسان اُن کی ملت سے انکاری نہیں ہو سکتا۔

ملت ابراہیم اس وقت ملت محمد یہ میں منحصر ہے اور آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کے داعی ہیں۔ جو لوگ اس سے بیزار ہیں وہ لوگ مشرک' بُت پرست' بے حیا' بے شرم' بد اخلاق' بد اعمال' دھوکے باز اور زمین میں فساد کرنیوالے اور قوموں کو لڑانے والے ہیں اور جسقدر بھی دنیاوی قبائح اور خراب کام ہیں سب انہیں لوگوں میں پائے جاتے ہیں جو ملت ابراہیم سے ہٹے ہوئے ہیں گو کمزور ایمان والے مسلمانوں میں بھی معاصی ہیں لیکن اول تو انہیں گناہ سمجھتے ہوئے کرتے ہیں اور دوسرے توبہ کرتے رہتے ہیں اور ہر حال میں گناہ بھی حماقت ہی سے ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ نساء میں فرمایا اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَی اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ (الآیۃ) مسلمین اہل المعاصی کی حماقت ان لوگوں کی حماقت سے بہت زیادہ کم ہے جو کفر و شرک پر جمے ہوئے ہیں اور ملت ابراہیمی کو قبول کرنے کو بالکل تیار نہیں ہیں۔

یہ بتانے کے بعد کہ ابراہیم کی ملت سے وہی روگردانی کریگا جس نے اپنی جان کو بے وقوف بنا دیا ہو یہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چن لیا اور برگزیدہ بنا لیا۔ دنیا میں انکی فضیلت اور برتری سب پر ظاہر ہے سب قومیں اُن کی فضیلت کی قائل ہیں اور اُن کے بعد جو بھی کوئی نبی آیا ہے انہیں کی نسل اور ذریت میں سے آیا ہے اور سب ان کو مانتے ہیں اور اُن سے عقیدت رکھتے ہیں۔ اُن کو دشمن نے آگ میں ڈالا اللہ تعالیٰ نے وہ آگ اُن کے لئے گلزار بنا دی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے کعبہ تعمیر کرایا اس وقت سے لے کر آج تک کعبہ شریف کا حج ہوتا ہے۔ اور اُن کو جو مناسک حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بتائے

تھے۔ اُن پر برابر عمل ہو رہا ہے۔ انہوں نے جو بیٹے کی قربانی کی تھی اس قربانی کے اتباع میں کروڑوں قربانیاں ہر سال پورے عالم میں ہوتی ہیں۔ درود ابراہیمی میں اُن کا ذکر ہے اُمت محمدیہ جس کا نام اُنہوں نے مسلمین رکھا تھا (کمافی سورۃ الحج) وہ اُن کی ملت کی اتباع کرنیوالی ہے اور اُن کی یادگار ہے۔ پھر فرمایا: وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (آخرت میں بھی وہ صالحین میں سے ہوں گے) ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی گواہی ہے کہ وہ ثابت قدم صاحب استقامت اور خیر اور صلاح سے متصف ہونیوالوں میں شمار ہوں گے۔ وہاں بھی اُن کی رفعت ہوگی جیسا کہ دنیا میں انکی فضیلت مشہور و معروف ہوئی۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں۔ ای المشھود لھم بالثبات علی الاستقامة والخیر والصلاح اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

وذلک من حیث المعنی دلیل مبین لکون الراغب عن ملة ابراھیم سفیھا اذالاصطفاء والعز فی الدنیاغایة المطالب الدنیویة والصلاح جامع للکمالات الاخر ویة ولا مقصد للانسان الغیر السفیه سوی خیر الدارین.

یعنی ان کی خیر و صلاح اور ثبات علی الاستقامۃ میں اس امر کی واضح دلیل ہے کہ جو شخص ملت ابراہیمی سے منحرف ہو اوہ واقعی بیوقوف ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ بننا اور معزز ہونا دُنیاوی مطلوبات کا آخری مقام ہے اور صلاح کمالات اُخرویہ کو جامع ہے۔ اور سمجھدار آدمی کے لئے دونوں جہاں کی خیر سے بڑھ کر کوئی مقصد نہیں (ناسمجھ یعنی بیوقوف ہی ان مقاصد عالیہ سے مُنحرف ہوسکتا ہے)

اسلام کا معنی اور مفہوم

پھر فرمایا: اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یعنی جب ان کے رب نے ان سے کہا کہ فرمانبردار ہو جا تو انہوں نے عرض کیا میں رب العالمین کا فرمانبردار ہوں)

لفظ اسلام کا مادہ سین۔ لام۔ میم ہے۔ جب یہ مادہ باب افعال میں مستعمل ہوتا ہے تو حکم ماننے فرمانبرداری کرنے اور حکم کے سامنے جھک جانے اور ظاہر و باطن سے فرمانبردار ہو جانے پر دلالت کرتا ہے اس کا صیغہ اسم فاعل مُسلم ہے۔ جس کی جمع مسلمون اور مسلمین ہے۔ اللہ جل شانہٗ خالق اور مالک ہیں سب اس کے بندے ہیں۔ بندہ اپنے خالق کا فرمانبردار ہو اس سے بڑھ کر اسکی کوئی سعادت نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہما السلام کعبہ شریف بناتے ہوئے یہ دعا کرتے جا رہے تھے۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ (کہ اے ہمارے پروردگار تو ہم کو اُن لوگوں سے بنادے جو تیرے فرمانبردار ہیں) اور ساتھ ہی یہ بھی دعا کی وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (کہ ہماری ذرّیت میں سے بھی ایک اُمت مسلمہ بنادے) جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا کہ اپنے رب کے مطیع اور فرمانبردار ہو جاؤ تو اُنہوں نے عرض کیا کہ میں اپنے رب کا فرمانبردار ہوں۔ فرمانبردار تو وہ تھے ہی فرمانبرداری پر ثابت قدم رہنے کے لئے حکم ہوا اور انہوں نے ہمیشہ فرمانبردار رہنے کا اقرار کیا اور یہ بتا دیا کہ میں ہمیشہ کے لئے اپنے رب کا فرمانبردار ہوں لفظ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہہ کر یہ بات ظاہر کردی کہ چونکہ وہ رب العالمین ہے اس لئے اسکی اطاعت اور فرمانبرداری لازم ہی لازم ہے جو اسکی اطاعت اور فرمانبرداری کریگا وہ اپنے مخلوق ہونے کا فرض منصبی ادا کریگا۔ سورۃ انعام میں فرمایا۔

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ

عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ . سورۃ آل عمران میں فرمایا۔ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ (کیا اللہ کے دین کے سوا دوسرا دین چاہتے ہیں حالانکہ اس کے لئے سب فرمانبرداری کے ساتھ جھکے ہوئے ہیں جو بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے اور سب اُس کی طرف لوٹیں گے) ساری مخلوق پر لازم ہے کہ اپنے خالق و مالک کی اطاعت کریں۔ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام امتحانات میں کامیاب ہوئے ہر مرحلہ سے گزرتے گئے۔ اور اطاعت و فرمانبرداری ہی کو اختیار کئے رہے اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا یہ مقصد تھا کہ وہ سارے انسانوں کو اللہ تعالیٰ شانہٗ کی فرمانبرداری کی طرف بلائیں۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین اسلام تھا۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک مانیں اور شرک سے بیزار ہوں اور احکام الٰہیہ کی تعمیل کریں اور ہر طرح سے فرمانبردار رہوں۔ گو احکام فرعیہ میں اختلاف بھی رہا۔ لیکن اصول میں سب متحد اور متفق تھے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الانبیاء اخوة من علات و امهاتهم شتى و دينهم واحد (رواہ البخاری و مسلم کما فی المشکوٰۃ ص ۵۰۹)

اُن کی اپنی اپنی زبانوں میں اس دین کیلئے جو بھی لفظ اختیار کیا گیا ہو ہمارے رسول حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ عربی تھے اور ان پر کتاب بھی عربی میں نازل ہوئی اس لئے لفظی اور معنوی طور پر اُن کے دین کا نام اسلام ہی ہے اور یہ لفظ جہاں فرمانبرداری کے معنی دیتا ہے وہاں اپنے مادہ کے اعتبار سے اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ حقیقی سلامتی دین اسلام ہی میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم کو جو اسلام کا دعوت نامہ بھیجا تھا اُس میں تحریر فرمایا تھا۔ اَسْلِمْ تَسْلَمْ یُؤْتِکَ اللّٰهُ اَجْرَکَ مَرَّتَیْنِ (تو اسلام قبول کر سلامت رہے گا اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر عطا فرمائے گا) (صحیح بخاری ص ۵ ج ۱)

حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے جو اُمت مسلمہ کے لئے دعا کی اسکی قبولیت کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ وجود میں آ گئی اور اس امت کے اعیان و اشخاص و افراد کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ''مسلمین'' رکھ دیا تھا (حيث قال فى دعائه امة مسلمة لك)

سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا نام اسلام ہے دعوت بھی فرمانبرداری کی ہے۔ یہی دین اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا۔ اور تم پر اپنا انعام پورا کر دیا۔ اور میں نے اسلام کو دین کے اعتبار سے تمہارے لئے پسند کر لیا) اور فرمایا: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (کہ بلاشبہ دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے) اور فرمایا: وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (اور جو اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کریگا تو وہ اس سے قبول نہ ہوگا۔ اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہو گا) پس مسلمانوں کا دین لفظاً و معنیً سراپا اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری ہے۔ زندگی کے آخری لمحات تک فرمانبردار رہنے کا حکم ہے۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت میں مت مرنا معلوم ہو گیا کہ مسلمان کا کام بس یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرے۔ بغیر چوں چرا اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل پیرا ہو۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے کیونکہ رسول اللہ کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے (مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ) بہت سے لوگ اپنے دعوٰی میں تو مسلمان ہیں لیکن دل سے مسلمان نہیں۔ وہ اپنی عقل سے اسلام کی

باتوں کو رد کرتے ہیں اور دشمنان اسلام کی صحبتوں سے متاثر ہو کر اسلام پر اعتراض کرتے ہیں اور بہت سے لوگ اسلام کو اپنے نظریات کے تابع بنانا چاہتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ حقائق ایمانیہ کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام والے نہیں (اگرچہ مسلمان ہونے کے مدعی ہیں) ایسے لوگ ملت ابراہیمہ سے منحرف ہیں۔

دین اسلام کے علاوہ ہر دین مردود ہے

شاید کوئی ناسمجھ یہ اعتراض کرے کہ جب خالق و مالک کی فرمانبرداری ہی مطلوب ہے تو دین اسلام قبول کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ جس دین پر بھی کوئی شخص ہو اور اس دین میں رہتے ہوئے (اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرے تو مقصود حاصل ہو گیا اور وہ مستحق نجات ہو گا اس جاہلانہ سوال کا جواب یہ ہے کہ خالق و مالک نے اُسی کو فرمانبردار قرار دیا ہے جو اُس کے بھیجے ہوئے دین کے مطابق اسکی فرمانبرداری کرے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اپنے زمانہ میں آتے رہے ان پر ایمان لانا فرض تھا اور اُن کی کتابوں اور صحیفوں پر بھی ایمان لانا فرض تھا اور قیامت پر ایمان لانا بھی اُن تفصیلات کے ساتھ فرض تھا جو انہوں نے بتائیں اللہ کے کسی نبی سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری اللہ کے یہاں معتبر نہیں ہے۔ کسی بھی نبی کا انکار اور اللہ کی کسی کتاب کا انکار کفر ہے' کفر سب سے بڑی نافرمانی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کوئی عبادت اور کوئی فرمانبرداری معتبر نہیں سب سے آخر میں خاتم النبیین سیدنا محمد رسول ﷺ تشریف لائے۔ آپ پر اور آپ کی لائی ہوئی کتاب پر ایمان لانا ہر انسان پر فرض ہے جو شخص آپ کے لائے ہوئے دین سے اور آپ کی لائی ہوئی کتاب سے اور آپ کی نبوت اور رسالت سے منحرف ہو گا وہ اللہ تعالیٰ کا باغی اور نافرمان ہو گا۔ لہٰذا اس کی نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ اسلام کے علاوہ کوئی دین قبول نہیں۔ اس بارے میں آیاتِ قرآنیہ ہم گذشتہ صفحہ پر پیش کر چکے ہیں۔

اسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں۔ کفر تو ان سبھی میں ہے اور اُن میں اکثر مشرکین میں اور بہت بڑی بھاری تعداد میں وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں۔ یہ سب کیسے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو سکتے ہیں؟ پھر ان لوگوں میں بے شرمی' بے حیائی' سود خوری' رشوت ستانی' اور زنا کاری اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ یہ کسی بھی طرح فرمانبرداری کے دائرہ میں نہیں آسکتے ہندوؤں اور بدھسٹوں کے پیشوا تو لنگوٹی باندھے ہوئے عام مخلوق کے سامنے آجاتے ہیں یورپ اور امریکہ کے لوگ اور اُن کی تقلید کرنے والے جہاں کہیں بھی ہیں حتیٰ کہ ان کے مذہبی مقتدا اور سیاسی زعما بداعمالی اور بدکرداری میں لت پت ہیں۔ ان لوگوں کو خداوند قدوس کی فرمانبرداری سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جس قوم میں زنا کاری عام ہو اور اُن کے عقیدہ میں اتوار کے دن چرچ میں پوپ کے معاف کر دینے سے گناہ معاف ہو جاتے ہوں اور چھوٹے پوپ کے گناہ بڑا پوپ معاف کر دیتا ہو وہ خداوند قدوس کے حکم کے فرمانبردار نہیں ہو سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب اور انجیل شریف کی تحریف کی اور حضرت محمد رسول ﷺ پر نہ صرف یہ کہ ایمان نہ لائے بلکہ آپ کی ذات گرامی پر اعتراضات کئے اور کرتے رہے اور کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خداوند قدوس کے نافرمان اور سراپا نافرمان ہیں ان میں جو کوئی شخص راہب ہے اور اپنے خیال میں خداوند قدوس کی عبادت کرتا ہے اسکی رہبانیت اور عبادت سب بیکار ہے اور ضائع ہے' بھسم ہے اور راکھ کا ڈھیر ہے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا

اور ملت ابراہیمیہ کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے بھی اے میرے بیٹو بے شک اللہ نے منتخب فرمایا ہے تمہارے لئے اس دین کو

تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ

سو ہر گز مت مرنا مگر اس حالت میں کہ تم دین اسلام پر ہو۔ کیا تم حاضر تھے جس وقت آنے لگی یعقوب کو موت، جبکہ اُنہوں نے اپنے بیٹوں

لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

سے کہا کہ کس کی عبادت کرو گے میرے بعد، اُنہوں نے کہا ہم عبادت کریں گے آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم اسمٰعیل

وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

اور اسحٰق کے معبود کی، جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اس کے فرمانبردار ہیں

ملت ابراہیمی کی وصیت

تفسیر: یعنی ملت ابراہیمیہ کی وصیت کی ابراہیم علیہ السلام نے اور یعقوب علیہ السلام نے اپنے اپنے بیٹوں کو۔ اور اُنہوں نے فرمایا کہ اے بیٹو! تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیمیہ کو منتخب فرمادیا ہے۔ جس میں اخلاص ہے اور احکام الٰہیہ کا انقیاد ہے اور سراپا فرمانبرداری ہے۔ اس دین کو کبھی مت چھوڑنا، مرتے وقت تک اور زندگی کے آخری لمحات تک اسی پر قائم رہنا کہ تم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو۔ علامہ واحدی اسباب النزول میں لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یعقوبؑ نے اپنی موت کے وقت اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی تھی کہ تم یہودیت پر قائم رہنا اُن کی اس بات کی تردید میں آیت بالا نازل ہوئی کہ تم لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف یہ بات کیسے منسوب کرتے ہو کہ اُنہوں نے موت کے وقت یہودیت کی وصیت کی تھی کیا تم اُن کی موت کے وقت ان کے پاس موجود تھے؟ اُن کی موت کے سینکڑوں سال بعد تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی جن کے دین کو تم یہودیت سے تعبیر کرتے ہو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کو بھی صدیاں گزر گئیں۔

اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ یعقوب علیہ السلام نے یہودیت کی وصیت کی تھی تمہارے پاس تمہارے دعویٰ کی نہ کوئی دلیل ہے نہ کوئی گواہ ہے اور یہودیت ان کے زمانہ میں تھی بھی نہیں پھر اُنہوں نے بیٹوں کو کیسے اسکی وصیت کردی؟ اُنہوں نے تو توحید کی وصیت کی جس پر ملت ابراہیمیہ مشتمل ہے اور جو ملت ابراہیمیہ کا رکن اعظم ہے اُن کے بیٹے سراپا مطیع اور فرمانبردار تھے اور توحید خالص اُن کا دین تھا جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے تو ان سب نے جواب میں کہا کہ ہم اسی ذات پاک کی عبادت کریں گے جو آپ کا معبود اور آپ کے باپ دادوں یعنی ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق علیہم السلام کا معبود ہے۔ اور معبود صرف وہی ایک ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور ہم اُسی کے فرمانبردار ہیں اور طاعت گزار ہیں اور ہم اسی دین پر رہیں گے اور مریں گے در حقیقت جب عصبیت جاہلیہ کسی فرد یا قوم یا جماعت کے دلوں میں جگہ پکڑ لے تو حق اور ناحق کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور ایسے لوگ صرف اپنے نفسانی عقائد و اعمال کے پیچھے چلتے ہیں تدبر اور تفکر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کہاں ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق علیہم السلام کا دین جو توحید الٰہی پر مشتمل تھا اور جس میں سراپا خداوند قدوس کی فرمانبرداری تھی اور کہاں یہودیوں کا وہ دین جس پر وہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے جس میں حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں ابن اللہ

ہونے کا عقیدہ بھی تھا اور جس میں حق کا چھپانا بھی تھا اور جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب اور توریت شریف کی تحریف اور رشوت خوری اور سود خوری تھی جو آج تک بھی یہودیوں کے اندر باقی ہے۔

فائدہ: (۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے اسمٰعیل اور دوسرے اسحٰق تھے اور یعقوب اسحٰق کے بیٹے تھے۔ اسمٰعیل یعقوب کے والد نہ تھے پھر بھی اُنکے آباء کے عموم میں شامل فرمایا' مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ چچا پر بھی باپ کا اطلاق کرنا جائز ہے۔ تفسیر روح المعانی میں مصنف ابن ابی شیبہ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے۔ **واحفظو نی فی العباس فانه بقية آبائی** (ص ۳۵۱ ج ۱) کہ تم عباسؓ کے بارے میں میرے تعلقات کی حفاظت کرو کیونکہ وہ میرے آباء کا بقیہ ہیں۔

فائدہ: (۲) حضرت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی وصیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو جہاں اپنے دین کے لئے فکرمند ہونا ضروری ہے۔ وہاں یہ بھی لازم ہے کہ اپنی اولاد اور آنے والی نسلوں کے لئے اس بات کا فکرمند ہو کہ وہ توحید پر قائم رہیں اور دین اسلام پر جئیں۔ اور ہمیشہ اللہ کے فرمانبردار رہیں برخلاف اس کے اپنی اولاد کو ایسے ممالک میں بھیجنا یا لے جانا جہاں وہ دین خداوندی پر باقی نہ رہ سکیں یا ایسی درسگاہوں میں ان کو علم پڑھانا جہاں وہ اپنے دین کو کھو بیٹھیں یہ اُن کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔ جو لوگ اپنے نماز روزے کا خیال کرتے ہیں اور اولاد کو کفر اور فسق و فجور کے ماحول میں دھکیل دیتے ہیں اور وہ اس ماحول کو ان کے لئے تقدم اور ترقی سمجھتے ہیں وہ بڑے ظالم ہیں۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا
وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی' ان کے لئے وہ ہے جو انہوں نے عمل کیا' اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے عمل کیا' اور تم سے اس چیز کا سوال نہ ہوگا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾
جو وہ کیا کرتے تھے

یہودیوں کے اس غرور کا جواب کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں

تفسیر: یہودیوں کو اس بات پر بہت غرور تھا اور اب بھی ہے کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں اور ان کے نسل اور نسب میں ہونے کی وجہ سے ہم عذاب سے بچ جائیں گے اس آیت میں صاف صاف اس بات کی تصریح فرما دی کہ وہ حضرات اپنے اپنے عقائد اور اعمال لیکر دنیا سے چلے گئے انہوں نے جو کچھ کیا وہ ان کے ساتھ ہے ان کے اعمال صالحہ ان کے کام آئیں گے اور تم نے جو کچھ کیا وہ تمہارے ساتھ ہیں ان کے اعمال میں سے کوئی حصہ تمہیں نہ ملے گا دوسروں کے اعمال کی وجہ سے خواہ مخواہ آس لگائے بیٹھے ہو جبکہ یہ آس اور اُمید قانون خداوندی کے خلاف ہے۔ تم اپنے عقائد اور اعمال اور کفر و ایمان کو دیکھو تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کی تکذیب کرتے ہو انجیل اور قرآن کو نہیں مانتے پھر بھی نجات کی اُمید لگائے ہوئے ہو۔ یہ بہت بڑی جہالت ہے وہ حضرات سابقین جن سے تم انتساب رکھتے ہو ان کے اعمال کی تم سے پوچھ تک نہ ہوگی اور نہ اُن کا ذکر تمہارے سامنے آئے گا ان کے اعمال کا تمہیں نفع پہنچنا تو دور کی بات ہے۔

اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والتحیہ میں بھی بہت بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے جو سیدزادے پیرزادے ہونے پر گھمنڈ کئے

ہوئے ہیں تارک فرائض ہیں۔ مرتکب منہیات ومحرمات ہیں بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا ہیں لیکن وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہم کسی کی نسل اور نسب میں ہونے کی وجہ سے بخش دیئے جائیں گے اور بہت سے جعلی جھوٹے دنیادار پیروں نے اپنے عوام کو یہ دھوکہ دے رکھا ہے۔ کہ تم ہمارے جھنڈے کے نیچے ہوگے جس نے ہم سے بیعت کرلی بس وہ بخشا بخشایا ہے یہ سب فریب ہے گمراہی ہے قرآن وحدیث کی تصریحات کے خلاف ہے۔ (صحیح بخاری) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کو اور اپنے اعزہ واقرباء کو پکارا سب کو حق کی دعوت دی اور عمومی اور خصوصی خطاب فرمایا اس خطاب میں یہ بھی تھا کہ اے عباس بن عبدالمطلب میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا' اور اے صفیہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا اور فاطمہ بنت محمد ﷺ تم میرے مال سے جو چاہو سوال کرو میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ اپنا دین وایمان اور عمل صالح اللہ کے ہاں کام آئے گا۔ جو مومن نہ ہوگا اس کو میری رشتہ داری کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ جب آنحضرت ﷺ نے اپنی رشتہ داری کے بارے میں ایسا فرما دیا تو دوسروں کی کیا مجال ہے کہ وہ نسب کی بنیاد پر بخشے جانے کی اُمید رکھیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **من بطأبه عمله لم یُسرع به نسبه** یعنی جس کا عمل دیر لگائے گا اُس کا نسب جلدی کر کے آگے نہیں بڑھا دے گا۔ ص ۳۴۵

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ

اور انہوں نے کہا کہ ہو جاؤ یہودی یا نصرانی تم ہدایت پا جاؤ گے' آپ فرمایئے بلکہ ابراہیم کی ملت کا اتباع کرو جو پوری طرح حق ہی کی طرف تھے

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ

اور مشرکین میں سے نہ تھے' تم لوگ کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر بھی جو اس نے نازل کیا ہماری طرف' اور اس پر جو نازل کیا گیا ابراہیم

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ

اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب پر' اور اُن کی اولاد پر' اور اُس پر بھی جو عطا کیا گیا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو کچھ عطا کیا گیا دیگر

النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں

اللہ کے تمام نبیوں اور تمام کتابوں پر ایمان لانے کا حکم

تفسیر: تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن اسحاق وابن جریر وغیرہما حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن صوریا اعور (یہودی) نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ہدایت صرف وہی ہے جس پر ہم ہیں لہٰذا تم ہمارا اتباع کرو۔ ہدایت پا جاؤ گے۔ اور نصاریٰ نے بھی اسی طرح کی بات کہی تو اللہ تعالیٰ نے آیت وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا (الاٰیۃ) نازل فرمائی۔ (ص ۱۴۰ ج ۱)

مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے دین کو ہدایت بتایا اور اسکی دعوت دی اور نصاریٰ نے اپنے دین کو ہدایت بتایا اور اسکی دعوت دی اللہ جل شانہٗ نے انکی تردید فرمائی کہ تم ہدایت پر نہیں ہو تم اپنے اپنے دین کو چھوڑ دو اور ابراہیم حنیف کے

دین کو اختیار کرو جس کے داعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان کے دین کا عالم اور شارح اور داعی آپ کے سوا کوئی نہیں ہے اُن کے دین میں توحید ہے حق پر استقامت ہے۔ قربانی ہے ایثار ہے۔ اخلاص ہے اور تم میں سے کوئی بھی ملت ابراہیمی کا متبع نہیں ہے۔ دین حق میں اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرض ہے کہ اُسکی ساری کتابوں اور اس کے سارے نبیوں پر ایمان لایا جائے اور ایمان لانے میں کوئی تفریق نہ کی جائے۔ اگر کسی ایک نبی کو بھی نبی نہ مانا تو سب کی تکذیب لازم آئے گی۔ اس صورت میں ہدایت پر ہونے کا دعویٰ غلط ہے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو نہیں مانا اور یہود و نصاریٰ دونوں قوموں نے حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کا انکار کیا قرآن کو نہیں مانا پھر ہدایت پر کیسے ہو سکتے ہیں؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خصوصی وصف لفظ حنیفاً میں بیان فرمایا اور یہ قرآن مجید میں کئی جگہ ان کے حق میں استعمال ہوا ہے اس کا مادہ ح۔ ن۔ ف ہے امام راغب لکھتے ہیں: **الحنف هو الميل عن الضلال الى الاستقامة والحنيف هو المائل إلى ذلك** (ص ۱۲۳) یعنی حنف یہ ہے کہ گمراہی سے ہٹتے ہوئے حق پر استقامت ہو۔ اور حنیف وہ ہے جس میں یہ صفت پائی جائے۔ تفسیر در منثور ص ۱۴۰ ج ۱ میں مسند احمد اور الادب المفرد (للبخاری) سے نقل کیا ہے کہ عرض کیا گیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کو کون سا دین پسند ہے؟ آپ نے فرمایا **الحنيفية السمحة** یعنی وہ دین اللہ کو محبوب ہے جس میں باطل سے بچتے ہوئے حق کو اپنایا گیا ہو اور جس پر عمل کرنے میں دُشواری نہیں ہے (اس سے دین اسلام مراد ہے)

حنیفاً کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری صفت بیان فرمائی یعنی **وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** اُن کی یہ صفت دوسری آیات میں بھی ان الفاظ میں مذکور ہے۔ اس میں صاف اور واضح طور پر بتا دیا کہ ابراہیم علیہ السلام مُشرک نہیں تھے۔ جو بھی کوئی جماعت یا فرد مشرک ہوگا وہ دین ابراہیم پر نہیں ہو سکتا مشرکین مکہ بھی اس بات کے مُدعی تھے کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں۔ اُن کے اندر ختنہ کرنا، حج کرنا اور مہمان نوازی کرنا باقی تھا۔ لیکن ساتھ ہی مشرک بھی تھے۔ حج کے تلبیہ میں بھی شرک کے الفاظ بڑھا رکھے تھے اور کعبہ شریف میں بُت بھر رکھے تھے اور یہود و نصاریٰ نے بھی شرک اختیار کر رکھا ہے۔ حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام کو خدا کا بیٹا بناتے ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے ہیں اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ ملت ابراہیم کا اتباع کرو اور اُن کی ملت میں سب سے پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ توحید کے اقراری ہوں اور شرک کے انکاری ہوں۔

مذکورہ بالا آیت میں لفظ **الاسباط** جو آیا ہے یہ سبط کی جمع ہے اس سے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد مُراد ہے۔ ان میں سب تو نبی نہیں تھے لیکن ایک بڑی تعداد میں اُن میں انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے اسی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: **اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَاءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّ اٰتٰكُمْ مَّالَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِيْنَ** (ذکرہ حکایۃ عن موسیٰ علیہ السلام فی سورۃ المائدۃ)

مفسرین لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد بجز سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے بھی نبی آئے سب انہی کی اولاد میں سے تھے اور وہ حضرت اسحٰق کے بیٹے تھے (صلوات اللہ علیہم اجمعین) امت محمد یہ الحمد للہ کے تمام نبیوں پر اور اسکی ساری کتابوں پر ایمان رکھتی ہے سب کا ادب سے نام لیتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی عصبیت نہیں ہے۔ باوجودیکہ یہود و نصاریٰ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں بے جا باتیں کرتے ہیں لیکن مسلمان کبھی بھی اُلٹ کر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی شان میں کوئی ناروا کلمہ نہ کہتے ہیں اور نہ کہہ سکتے ہیں اگر ایسا کریں گے تو ان کا ایمان جاتا رہے گا۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ

سو اگر وہ ایمان لے آئیں ان چیزوں پر جن پر[1] تم ایمان لائے تو وہ ہدایت پا جائیں گے اور اگر وہ روگردانی کریں تو بس وہ مخالفت ہی میں لگے ہوئے ہیں۔

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾

پس عنقریب اللہ آپ کی طرف سے اُن کے لئے کافی ہوگا اور وہ سمیع ہے علیم ہے

اگر دشمنانِ دینِ اسلام نہ لائیں تو وہ مخالفت ہی پر تلے ہوئے ہیں

تفسیر: اس آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور حضور اقدس ﷺ کو تسلی بھی ہے ارشاد ہے کہ اپنے اپنے دین کو ہدایت پر بتانے والے اگر اسی طرح کے مومن ہو جائیں جسطرح کے تم مومن ہو اور اُن سب چیزوں پر ایمان لائیں جن پر تم ایمان لائے ہو تو وہ بھی ہدایت یافتہ ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ اعراض کریں اور اس ایمان سے رُوگردانی کریں جو اللہ کے نزدیک معتبر ہے اور جسے تم پیش کرتے ہو تو سمجھ لو کہ ان کو خواہ مخواہ کی ضد ہے حق قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں اور انہوں نے حق کی مخالفت پر کمر باندھی ہوئی ہے تھوڑا سا موقعہ ان کو مل رہا ہے اے نبی اللہ تعالیٰ عنقریب تمہاری طرف سے کفایت فرمائے گا اور اُن کے شر اور مکر و کید سے مستقل طریقہ پر تمہیں چھٹکارا اور خلاصی دے گا۔ وہ ذلیل ہوں گے خوار ہوں گے دنیا و آخرت کی سزا میں مبتلا ہوں گے اللہ تعالیٰ سمیع ہے وہ ان کی سب باتیں سنتا ہے اور علیم بھی ہے جو اُن کی سب باتوں کو جانتا ہے۔

صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾

ہم کو اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے اور وہ کون ہے جس کا رنگ دینا اللہ تعالیٰ کے رنگ دینے سے اچھا ہو اور ہم اُسی کی عبادت کرنے والے ہیں

ہم کو اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے

تفسیر: علامہ واحدی نے اسباب النزول میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نصاریٰ کا یہ طریقہ تھا کہ جب اُن کا کوئی بچہ سات دن کا ہو جاتا تھا تو اُسے پانی میں رنگ دیتے تھے اور اس بات کو معمودی کہتے تھے۔ مقصد اُن کا یہ تھا کہ اس طرح سے اُسے پاک کر دیں۔ اور (چونکہ ختنہ نہیں کرتے تھے) اس لئے کہتے تھے کہ یہ عمل ختنہ کی جگہ ہے جس سے طہارت حاصل ہوگئی جب یہ کام کر لیتے تھے تو سمجھتے تھے کہ اب پکا نصرانی ہو گیا۔ اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور بتا دیا کہ صحیح رنگ وہی ہے جس رنگ میں اللہ نے اپنے مومن بندوں کو رنگ دیا۔ اصل رنگ ایمان کا رنگ ہے اور اعمال صالحہ کا رنگ اور اللہ کے علاوہ وہ کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ کے رنگ دینے کی حالت سے اچھی ہو۔ حاصل یہ ہے کہ مومن بندے اعلان کر دیں کہ ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ نے ایمان رچا دیا اور اعمال صالحہ سے ہم کو آراستہ فرما دیا۔ ایمان اور اعمال صالحہ

---

[1] ترجمہ علی ان "مثل" زائدة کما فی تفسیر الجلالین ۱۲ قال صاحب معالم التنزیل ای بما آمنتم به و کذلک کان یقرء ها ابن عباس والمثل صلة کقوله تعالیٰ لیس کمثله شیء ای لیس هو کشیء وقیل معناه فان آمنوا بجمیع ما آمنتم به أی اتوبایمان کایمانکم و توحید کتوحید کم' وقیل معناه فان امنو مثل ما آمنتم والباء زائدة

پر ہم کو جو استقامت بخشی ہے ہمارا رنگ یہی ہے اور ہم اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ہم ایمان اور اعمال صالحہ کے رنگ کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں اس سے اچھا کوئی رنگ نہیں اللہ نے ہمیں رنگ دیا ہے اور ہم اسی رنگ میں خوش ہیں۔ ہم اللہ کی توحید پر جیتے اور مرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔ صاحب تفسیر جلالین فرماتے ہیں' صبغة الله مصدر مؤكد بامنا ونصبه بفعل مقدر أى صبغنا الله والمراد بها دينه الذى فطر الناس عليها لظهور أثره على صاحبه كالصبغ.

نصرانی معمودی کے نام کے پانی میں رنگنے سے اپنے بچوں کو اپنے باطل خیال میں پاک کرتے تھے اور اب بھی جس کو نصرانی بناتے ہیں بتسمیہ دیتے ہیں اور خاص پانی میں نہلاتے ہیں' کفر کے ساتھ باطن پاک ہو ہی نہیں سکتا' ظاہری پانی تطہیر باطن کا کام دینے والا نہیں ہے۔ آیت شریفہ میں مؤمنین کو ایمان پر استقامت کا حکم بھی ہو گیا اور نصاریٰ کی تردید بھی ہو گئی۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ
آپ فرمائیے کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو حالانکہ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے۔ اور ہمارے لئے ہیں عمل ہمارے اور تمہارے لئے ہیں عمل تمہارے
وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾
اور ہم اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص والے ہیں

اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے

تفسیر: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپ یہود و نصاریٰ سے فرما دیں کہ تم ہم سے اللہ کے دین کے بارے میں جو حجت بازی کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جو دین اللہ کو پسند ہے وہ یہودیت اور نصرانیت ہے۔ تمہارا یہ کہنا اور اپنے خیال کے مطابق جنت میں داخل ہونے کے خواب دیکھنا غلط ہے۔ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے سب کو اُسے راضی کرنے کیلئے فکر مند ہونا لازم ہے اور اُس نے جس دین اور جس ملت کو جس زمانہ میں ذریعہ نجات بنا دیا اُسی کو اختیار کرنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے عرب میں سے ایک نبی کو چن لیا۔ اس نبی پر ایمان لانا فرض ہے تم ایمان نہیں لاتے اور ہم سے جھگڑتے ہو۔ ہم سے جھگڑنا فضول ہے ہمیں اپنے ایمان اور اعمال حسنہ کا اجر ملے گا تمہیں تمہارے کفر اور تکذیب کی اور اللہ تعالیٰ کے اوامر کی مخالفت کی سزا ملے گی۔ ہم تو اللہ کیلئے مخلص ہیں اپنے اعمال کے ذریعہ صرف اُسی کی رضا چاہتے ہیں۔

قال صاحب الروح قل اتحاجوننا تجريد الخطاب للنبى ﷺ لما ان المامور به من الوظائف الخاصة به عليه الصلوة والسلام والهمزة للانكار فى الله اى فى دينه وتدعون ان دينه الحق اليهودية والنصرانية وتبنون دخول الجنة والاهتداء عليهما' وقيل: المراد فى شان الله تعالىٰ واصطفائه نبيا من العرب دونكم' بناء على ان الخطاب لاهل الكتاب' وسوق النظم يقتضى ان تفسر المحاجة بما يختص بهم' والمحاجة فى الدين ليست كذلك (الى آخر ما قال)

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ
کیا تم کہتے ہو کہ بے شک ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور انکی اولاد

كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ

یہودی تھے یا نصرانی تھے۔ آپ فرما دیجئے کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ زیادہ جاننے والا ہے۔ اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس نے چھپایا

شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

اُس گواہی کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے پاس موجود ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے بے خبر نہیں ہے جنہیں تم کرتے ہو

یہود و نصاریٰ کے اس قول کی تردید کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ یہودی یا نصرانی تھے

تفسیر: یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اُن کی اولاد جن کو اللہ نے نبوت سے سرفراز فرمایا یہودی تھے اور نصاریٰ کہتے تھے کہ یہ حضرات نصرانی تھے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان لوگوں کی تردید فرمائی اور فرمایا کہ یہ حضرات ملت ابراہیمی پر تھے یہودیت اور نصرانیت اور توریت اور انجیل اُن کے بعد نازل ہوئی ہیں جن سے تم اپنا جوڑ لگاتے ہو پھر ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے بیٹے اور پوتے یہودیت اور نصرانیت اور توریت پر کیسے ہو سکتے ہیں تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ تعالیٰ کو زیادہ علم ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا عالم ہے اُسی کو صحیح علم ہے تم جہاں حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوبؑ اور ان کے اسباط کے بارے میں غلط بات کہتے ہو اور ان کو یہودیت اور نصرانیت پر بتلاتے ہو وہاں اس شہادت اور گواہی کو بھی چھپاتے ہو جو اللہ کی طرف سے تمہارے پاس پہنچی۔ اور وہ شہادت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے موحد تھے مشرک نہیں تھے۔ یہودی اور نصرانی نہیں تھے۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا۔

قال تعالیٰ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ٥ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (اے اہل کتاب کیوں حجت کرتے ہو ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں نازل کی گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد، کیا پھر سمجھتے نہیں ہو۔ ہاں تم ایسے ہو کہ ایسی بات میں تو حجت کر ہی چکے تھے جس سے تم کو کسی قدر تو واقفیت تھی سو ایسی باتوں میں کیوں حجت کرتے ہو جس سے تم کو اصلاً واقفیت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے لیکن طریق مستقیم والے صاحب اسلام تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے)

آیت شریفہ کے عموم میں جہاں اس شہادت کے چھپانے کو بڑا ظلم بتایا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں تھی وہاں یہودیوں کی اس بد باطنی کی طرف بھی اشارہ ہے جس کی وجہ سے اُن لوگوں نے اس گواہی کو چھپا رکھا تھا جو تورات اور انجیل میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نبوت و رسالت کے بارے میں موجود تھی۔

قال فی الروح (ص ۴۰۰ ج ۱) وفی اطلاق الشهادة مع ان المراد بها ماتقدم من الشهادة المعينة تعريض بكتمانهم شهادة الله تعالىٰ لنبيه محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی التوراة والانجيل

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ

وہ ایک جماعت تھی جو گذر گئی ان کے لئے وہ ہے جو انہوں نے عمل کیا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے عمل کیا اور تم سے اُس چیز کا سوال نہ ہوگا

عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

جو وہ کرتے تھے۔

نسب و غرور کرنے والوں کو تنبیہ

تفسیر: یہ آیت مکرر ہے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہود کو دوبارہ متنبہ فرمایا ان کی طبیعتوں میں جو باپ دادوں پر فخر کرنا اور نسب پر بھروسہ کرنا مستحکم تھا اس کے نافع نہ ہونے پر دوبارہ بطور تاکید کے تنبیہ فرمائی اور بتادیا کہ اللہ تمہیں تمہارے اعمال پر جزا دے گا اور تمہارے باپ دادوں کا عمل تمہیں کچھ نفع نہ دے گا اور قیامت کے دن تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تمہارے باپ دادے کیا عمل کرتے تھے (یعنی ان کے اعمال کا بالکل ذکر نہ ہوگا) بلکہ تم سے تمہارے اعمال کا سوال ہوگا اس کے بعد صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ بعض حضرات نے یوں فرمایا ہے کہ یہ آیت پہلے جو گزری ہے وہاں اہل کتاب کو خطاب تھا۔ اور یہاں اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کو تنبیہ ہے کہ تم لوگ یہود کی اقتداء نہ کرنا اور اُن کی طرح سے آباؤ اجداد پر فخر نہ کرنا اور اپنے ذاتی اعمال کو نہ چھوڑ بیٹھنا۔

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ

عنقریب کہیں گے بیوقوف لوگ کس چیز نے پھیر دیا اُن کو اُن کے اُس قبلہ سے جس پر وہ تھے۔ آپ فرما دیجئے اللہ ہی کے لئے

الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۱۴۲﴾

مشرق اور مغرب ہے۔ وہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہے سیدھے راستہ کی طرف

تحویل قبلہ پر بیوقوفوں کا اعتراض اور اُن کا جواب

تفسیر: تفسیر درمنثور (ص ۱۴۱ ج ۱) میں بحوالہ ترمذی ونسائی وغیرہم حضرت براء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی اور آپ کا دل چاہتا تھا کہ کعبہ شریف کی طرف نماز پڑھیں۔ آپ آسمان کی طرف منہ اُٹھاتے تھے (اور وحی کا انتظار کرتے تھے کہ کعبہ شریف کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہو جائے) اللہ جل شانہٗ نے آیت قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (الآیۃ) نازل فرمائی اور کعبہ شریف کی طرف نماز میں رُخ کرنے کا حکم فرما دیا اس پر بیوقوفوں نے یعنی یہودیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ کسی چیز نے اس قبلہ سے ان کا رُخ پھیر دیا۔ جس پر یہ تھے (یعنی بیت المقدس کی طرف رُخ کرنا چھوڑ کر کعبہ شریف کی طرف رُخ کرنا کیوں شروع کیا) اللہ تعالیٰ نے (اس کے جواب میں) قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔ نازل فرمائی۔ تفسیر (درمنثور) میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جو حکم قرآنی منسوخ ہوا وہ قبلہ کی منسوخیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ منورہ تشریف لائے) تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے جو یہود کا قبلہ تھا۔ سترہ مہینے تک آپ نے اس طرف نماز پڑھی۔ تا کہ یہود ایمان لے آئیں اور آپ کا اتباع کریں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی آیت وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اور قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ الخ نازل فرمائی۔

جب کعبہ شریف کو قبلہ مقرر کر دیا گیا تو یہودیوں نے باتیں بنانا اور اعتراض کرنا شروع کیا اور کہنے لگے کہ (حضرت) محمد (ﷺ) اور اُن کے اصحاب کو کس چیز نے اُس قبلہ سے پھیر دیا جس کی طرف اب تک نماز پڑھتے رہے۔ اللہ جل شانہ کی طرف سے ارشاد ہوا۔ اے نبی آپ فرما دیں اللہ ہی کے لئے مشرق و مغرب ہے اُسے اختیار ہے اپنے عبادت کرنے والوں کو جس طرف چاہے نماز پڑھنے کا حکم دیدے۔ کسی کو خداوند قدوس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ مومن بندے اللہ کے قانون پر چلتے ہیں وہ اُسی کے پابند ہیں۔ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا تو ادھر نماز پڑھنے لگے۔ کعبہ شریف کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا تو اُسے قبلہ بنا لیا۔ قبلہ بدلنے کا اعتراض کرنا مسلمانوں پر اعتراض نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے۔ مقصد اللہ کی عبادت اور اطاعت ہے۔ کسی جہت یا کسی جانب کا رُخ کرنا مقصود نہیں ہے۔ اور اسی لئے اعتراض کرنے والوں کو بے وقوف بتایا وہ یہ نہیں سمجھ رہے کہ ہمارا اعتراض کس پر ہو رہا ہے۔ معترض اندھا تو ہوتا ہی ہے اُسے یہ ہوش نہیں ہوتا کہ میری بات کہاں لگے گی اور میرا اعتراض کہاں پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چلنا ہی صراط مستقیم کو اختیار کرنا ہے۔ اللہ کا

ہر فرمان حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی حکمت کے موافق بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا۔ پھر حکمت ہی کے مطابق اپنے بندوں کا رُخ کعبہ شریف کی طرف پھیر دیا اس نے اپنے بندوں کو ہدایت دی اور ہدایت کے لئے چُن لیا۔ ہدایت یافتہ بندے حکم کے پابند ہیں۔ بے چوں وچرا حکم پر عمل کرتے ہیں۔ دشمنان اسلام صراط مستقیم سے دور ہیں اور اللہ کے حکم اور اسکی حکمت پر معترض ہیں۔ ایسے معترضین کا بے وقوف ہونا ظاہر ہے۔ قال صاحب الروح (ص ۳ ج ۲) کانه قيل ان التولية المذكورة هداية يخص الله تعالىٰ بها من يشاء ويختار من عباده. وقد خصّنا بها فلله الحمد.

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ
اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دی جو اعتدال والی ہے تا کہ تم ہو جاؤ لوگوں پر گواہ اور ہو جائے رسول
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ
تم پر گواہ

اُمت محمدیہ ساری اُمتوں سے افضل ہے

تفسیر: ابھی قبلہ کا مضمون باقی ہے۔ درمیان میں اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کی فضیلت بیان فرمادی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ سب قبلوں سے افضل بنا دیا اسی طرح ہم نے تم کو اعتدال والی اُمت بنادی اور ساری اُمتوں سے افضل اُمت بنادی۔ اس امت کی افضلیت کا ظہور میدانِ حشر میں اس طرح سے ہوگا کہ یہ اُمت تمام اُمتوں کے بارے میں گواہی دے گی اور رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے بارے میں گواہی دیں گے کہ ہاں میری اُمت عدل ہے۔ ثقہ ہے اس کی گواہی معتبر ہے۔

دُوسری اُمتوں کے مقابلہ میں اس اُمت کی گواہی اور اس پر فیصلے

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز حضرت نوح علیہ السلام کو لایا جائے گا اور اُن سے سوال ہوگا کیا تم نے تبلیغ کی وہ عرض کریں گے یا رب میں نے واقعۃً تبلیغ کی تھی۔ اُن کی اُمت سے سوال ہوگا کہ بولو انہوں نے تم کو احکام پہنچائے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ ہمارے پاس تو کوئی نذیر (ڈرانے والا) نہیں آیا۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے دعوے کی تصدیق کے لئے گواہی دینے والے کون ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ حضرت محمد ﷺ اور ان کے اُمتی ہیں۔ یہاں تک بیان فرمانے کے بعد آنحضرت سیدنا عالم ﷺ نے اپنی اُمت کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس کے بعد تم کو لایا جائے گا اور تم گواہی دو گے کہ بے شک حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کو تبلیغ کی تھی اس کے بعد آنحضرت سید عالم ﷺ نے آیت ذیل تلاوت فرمائی۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنادی ہے جو نہایت اعتدال پر ہے تا کہ تم دوسری اُمتوں کے لوگوں کے مقابلہ میں گواہ بنو اور تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ گواہ بنیں)

یہ بخاری شریف کی روایت ہے (ص ۶۴۵ ج ۲) اور مسند احمد وغیرہ کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام

کے علاوہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی اُمتیں بھی انکاری ہوں گی اور کہیں گی کہ ہم کو تبلیغ نہیں کی گئی ان کے نبیوں سے سوال ہوگا کہ تم نے تبلیغ کی؟ وہ اثبات میں جواب دیں گے کہ واقعی ہم نے تبلیغ کی تھی۔ اس پر ان سے گواہ طلب کئے جائیں گے تو وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور اُنکی اُمت سے سوال ہوگا کہ اس بارے میں آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟ وہ جواب میں عرض کریں گے کہ ہم پیغمبروں کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ سے سوال ہوگا کہ تم کو اس معاملہ کی کیا خبر ہے؟ وہ جواب میں عرض کریں گے کہ ہمارے پاس ہمارے نبی ﷺ تشریف لائے اور اُنہوں نے خبر دی کہ تمام پیغمبروں نے اپنی اپنی اُمت کو تبلیغ کی۔ (درمنثور)

آیت کا عموم لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ بھی اس کو چاہتا ہے کہ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی اُمتوں کے مقابلہ میں بھی امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ گواہی دے گی۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ بعض روایات میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جب اُمت محمدیہ علی صاحبھا الصلوٰۃ والتحیہ دوسری امتوں کے بارے میں گواہی دے گی کہ ان کے نبیوں (علیہم السلام) نے ان کو تبلیغ کی ہے تو سیدنا حضرت محمد ﷺ کو لایا جائے گا اور آپ سے آپکی امت کے بارے میں سوال کیا جائے گا کیا آپ کی امت عادل ہے گواہی دینے کے لائق ہے؟ آپ پر آپ اُن کا تزکیہ فرمائیں گے اور گواہی دیں گے کہ واقعی میری امت عدل ہے۔ گواہی کے لائق ہے اس کی گواہی معتبر ہے۔ (ص ۵ ج ۲) بلاشبہ اس اُمت کا بڑا مرتبہ ہے اور بڑی فضیلت ہے جس کا میدانِ حشر میں تمام اولین و آخرین کے سامنے ظہور ہوگا۔ یہ اُمت خیر الامم ہے اس کو افضل الانبیاء کی امت میں ہونے کا شرف حاصل ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے سب کتابوں میں سے افضل کتاب عطا فرمائی جو اللہ کی کتاب ہی نہیں اللہ کا کلام بھی ہے۔ جو چھوٹے بچوں تک کے سینوں میں محفوظ ہے اور صغیر و کبیر سب کے وردِ زباں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو تمام بنی آدم سے منتخب فرمایا۔ سورۂ حج میں ارشاد ہے۔ وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ ط هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ط هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے اُس نے تم کو منتخب فرمایا اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی، تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو اللہ نے تمہارا لقب مسلمان رکھا پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ تمہارے لئے رسول گواہ ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ بنو)

امت محمدیہ کی آپس میں گواہی پر بخشش کے فیصلے

اِس اُمت کی فضیلتوں میں یہ بہت بڑی فضیلت ہے کہ اسکی گواہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے اُنکی گواہی سے دوسری امتوں کے خلاف فیصلہ ہوگا۔ اور آپس میں بھی ان کی گواہی معتبر ہے۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ کچھ لوگ ایک جنازے کو لے کر گزرے تو حاضرین نے اس جنازہ کے بارے میں اچھے کلمات کئے اور اسکی تعریف کی۔ آپ نے فرمایا وَجَبَتْ پھر دوسرا جنازہ لے کر گزرے تو حاضرین نے بُرائی کے ساتھ اس کا ذکر کیا آپ ﷺ نے اس پر بھی وَجَبَتْ فرمایا۔ حضرت عمر نے عرض کیا وَجَبَتْ کا کیا مطلب ہے؟

آپ نے فرمایا کہ اُس کے بارے میں تم نے خیر کے کلمات کہے لہٰذا اس کیلئے جنت واجب ہوگئی اور اس کے بارے میں تم نے شر کے الفاظ استعمال کئے اس کے لئے دوزخ واجب ہوگئی۔ انتم شھدآء اللہ فی الارض۔ یعنی تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ (صحیح بخاری) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی مسلمان کیلئے چار آدمی خیر کی گواہی دے دیں اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل فرمائیں گے۔ ہم نے عرض کیا کہ اگر دو شخص گواہی دے دیں؟ آپ نے فرمایا' دو کا بھی یہی حکم ہے پھر ہم نے ایک کی گواہی کے بارے میں دریافت نہیں کیا۔ (صحیح بخاری ص ۱۸۳ ج ۱)

تفسیر درمنثور (ص ۱۴۵ ج ۱) میں بحوالہ مسند احمد وسنن ابن ماجہ وغیرہ حضرت ابوزہیر ثقفی سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عنقریب ایسا ہوگا کہ تم اپنے اچھے لوگوں کو بڑے لوگوں سے ممتاز کرسکو گے۔ اور جان سکو گے کہ کون کیسا ہے۔ حضرات صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کیسے ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ اچھا ذکر ہونے سے اور بُرا ذکر ہونے سے (یعنی جسے مسلمان اچھا کہیں وہ اچھا ہے اور جسے بُرا کہیں وہ بُرا ہے) تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ اھ۔ گواہی دینے کے اس بڑے مرتبہ سے وہ لوگ محروم ہوں گے جو لعنت کے الفاظ زیادہ نکالتے ہیں۔ سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زیادہ لعنت کرنے والے قیامت کے دن نہ شہید ہوں گے نہ شفیع ہونگے۔ (یعنی قیامت کے دن یہ لوگ نہ گواہی دینے کے اہل ہونگے اور نہ سفارش کرنے کے لائق ہوں گے۔)

امت محمدیہ کا اعتدال اور لفظ وَسَطًا کی تشریح

امت محمدیہ کی تعریف میں اُمَّةً وَّسَطًا فرمایا لفظ وسط کا معنی بہترین بھی کیا گیا ہے اور عدول بھی کیا گیا ہے عدول' عدل کی جمع ہے عدل اس کو کہتے ہیں جو ثقہ ہو۔ منصف ہو اور اسکی گواہی معتبر ہو۔ اوصاف عالیہ سے متصف ہو۔ خیر کی صفات کو جامع ہو برائیوں سے دور ہو' اور بعض حضرات نے اس کا معنی معتدل کا بھی لیا ہے یعنی یہ اُمت ہر اعتبار سے اعتدال پر ہے اس کے اخلاق اور اعمال سب میں اعتدال ہے افراط وتفریط سے بری ہے۔ نہ عبادت سے غفلت ہے نہ راہبوں کی طرح دنیا کو چھوڑ کر پہاڑوں میں رہنا ہے۔ ساری رات نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ نفس اور بیوی اور مہمان کے حقوق کی ادائیگی کی تعلیم دی گئی۔ روزانہ روزہ رکھنے سے منع فرمایا گیا۔ نہ فضول خرچی ہے نہ بخل بلکہ درمیانی راہ ہے جس کا نام جود ہے۔ اسی طرح نہ بزدلی نہ ضرورت سے زیادہ بہادری جس سے لوگوں پر ظلم ہو جائے بلکہ ان کے درمیان شجاعت ہے ظالم بھی نہیں اور مظلوم رہنے کو بھی تیار نہیں نہ عورتوں کو سردار بنایا گیا نہ ان کی مظلومیت روا رکھی گئی۔ نہ ہر فعل حلال قرار دیا گیا نہ ہر چیز کا کھانا جائز کیا گیا بلکہ حلال حرام کی تفصیلات بتائی گئی۔ ضرر دینے والی اور خبیث چیزوں کے کھانے سے منع کردیا گیا' جن سے اخلاق واجسام پر بُرا اثر پڑے طیّب اور حلال چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی۔ انسانیت کو اونچا کیا گیا۔ بہیمیت سے بچایا گیا بربریت سے دور رکھا گیا۔ حد یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ عین میدانِ جنگ کے موقع پر عمل کرنے کے لئے بھی ایسے احکام صادر فرمائے جن میں اعتدال ہی اعتدال ہے' بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا گیا مُثلہ کرنے یعنی دشمن کے ہاتھ پاؤں' ناک' کان کاٹنے سے منع فرمایا۔ معاشی نظام میں زکوٰۃ فرض کی گئی۔ نفلی صدقات کا بھی حکم دیا گیا۔ میراث کے احکام جاری کئے گئے تا کہ دولت ایک جگہ سمٹ کر نہ رہ جائے۔ جان کا بدلہ قصاص مقرر کیا گیا لیکن خطا میں دیت رکھی گئی۔ اور

قصاص واجب ہونے کی صورت میں اولیاء مقتول کو یہ اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو قصاص لے لیں۔ چاہیں دیت لے لیں۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں عام ابواب پر نظر کی جائے تو احکام میں سراسر اعتدال ہی نظر آتا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى

اور جس قبلہ پر آپ تھے اسے ہم نے مقرر نہیں کیا مگر اس لئے کہ ہم جان لیں کون اتباع کرتا ہے رسول کا اس سے ممتاز ہو کر جو پیچھے پلٹ جاتا ہے

عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ

اپنے الٹے پاؤں، اور بے شک یہ قبلہ بدلنا بھاری بات ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ نے ہدایت دی اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ ضائع کرے

اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

تمہارے ایمان کو۔ بیشک اللہ لوگوں کے ساتھ بڑا مشفق مہربان ہے۔

تحویل قبلہ امتحان کے لئے ہے

تفسیر: اُمت محمدیہ کی فضیلت ظاہر فرما کر پھر قبلہ کے موضوع سے متعلق باقی بیان شروع ہوتا ہے۔ بیت المقدس کی طرف جو سولہ سترہ مہینے تک نمازیں پڑھی گئیں، پھر کعبہ شریف کی طرف نماز میں رُخ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ہم نے پہلے قبلہ کی بجائے دوسرے قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا جو حکم دیا اس میں یہ حکمت ہے کہ ہم جان لیں کہ رسول کا اتباع کون کرتا ہے اور تبدیل قبلہ کی وجہ سے کون اُلٹے پاؤں لوٹتا ہے۔ اور اتباع رسول سے روگردانی کرتا ہے۔ مومن بندوں کا مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت اور طاعت ہے۔ جدھر منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہو گیا وہی جہتِ قبلہ ہے۔ فرمانبردار بندوں کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ کے احکام ماننے میں ذرا بھی کوئی جھجک نہیں ہوتی اور نہ ان کے نزدیک چوں چرا کا موقع ہوتا ہے۔ ؎

زبان تازہ کردن باقرارِ تو نینگیختن علّت از کار تو

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قبلہ بدلنے میں یہی حکمت تھی کہ ہم جان لیں یعنی علم اَزلی کا ظہور ہو جائے کہ کون ہمارے رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون منکر اور منحرف ہو جاتا ہے۔ اور اُلٹے پاؤں چلا جاتا ہے۔ جب قبلہ بدلنے کا حکم ہوا تو بعض ضعیف الایمان، ایمان سے پھر گئے۔ اور انہوں نے کہا کہ کبھی ادھر نماز پڑھنے کا حکم ہوتا ہے اور کبھی اُدھر (اس کو بہانہ بنا کر مرتد ہو گئے)

(نقلہ فی الدر المنثور عن ابن جریج ص ۱۴۶ ج ۱)

اللہ تعالیٰ کو سب اختیار ہے بندوں کو جو چاہے حکم دے لیکن جاہلوں، بیوقوفوں اور منافقوں اور یہودیوں کے نزدیک قبلہ بدلنا بہت بڑی چیز ہو گئی۔ ان کے نفسوں پر یہ امر بہت شاق گزرا۔ اور اسے ہدف طعن و تشنیع اور محل اعتراض بنا لیا اور مومنین کے لئے اس میں کوئی اشکال اور اعتراض کی بات ہی نہیں ہے۔ فرمانبرداریوں بھی خوش ہے اور یوں بھی راضی۔ وہ تو پابند حکم ہے اُسے فرمانبرداری کے سوا اور کچھ مطلوب نہیں۔

قال صاحب الروح ص ۶ ج ۲ وان كانت لكبيرة اى شاقة ثقيلة والضمير لمادل عليه قوله تعالىٰ وما جعلنا (الخ) من الجعلة او التولية او الردة او التحويلة او الصيرورة او المتابعة او القبلة وفائدة اعتبار التانيث على بعض الوجوه الدلالة على ان هذا الرد والتحويل بوقوعه مرة واحدة وقوله الا على الذين

هدى الله اى الى سر الاحكام الشرعية المبنية على الحكم والمصالح اجمالا او تفصيلا والمراد بهم (من يتبع الرسول) من الثابتين على الايمان الغير المتزلزلين المنقلبين على اعقابهم (ا ه بحذف)

قبلۂ اُولیٰ کی طرف جو نمازیں پڑھی گئیں اُن کا ثواب ضائع نہیں:

پھر فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ (اور اللہ نہیں ہے کہ ضائع کرے تمہارے ایمان کو) تفسیر درمنثور میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بحوالہ سنن ترمذی و معجم طبرانی و مستدرک حاکم حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں کعبہ شریف کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا تو حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا جو بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھتے رہے (اور قبلہ بدلنے سے پہلے وفات پاگئے) اس پر اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرمایا اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو ضائع فرمادے۔

اس آیت میں نماز کو ایمان فرمایا اس سے نماز کا رُتبہ معلوم ہوگیا۔ بعض روایات میں نماز کے بارے میں فرمایا ہے کہ اسلام میں نماز کا مرتبہ ایسا ہے جیسے انسان کے جسم میں سر کا مرتبہ ہے۔ (الترغیب ص ۲۴۶ ج ۱)

سر موجود ہے تو جسم کی بھی حیثیت ہے، جسم سے سر کٹ گیا تو کچھ بھی نہ رہا۔ آیت کے اخیر میں فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ (کہ بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ بڑا مشفق اور مہربان ہے) اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہے حاکم بھی ہے۔ وہ حکمت کے مطابق ان کاموں کا جو لوگوں کو حکم دیتا ہے جن میں بندوں کا بھلا اور نفع ہوتا ہے ہر حکم میں ان کے ساتھ رأفت اور رحمت کا معاملہ ہے۔ جو نمازیں حکم کے مطابق پڑھ لی گئیں ان کے ضائع ہونے کا وہم و گمان صحیح نہیں۔ وہ عمل صحیح کو ضائع نہیں فرماتا جو حکم کے مطابق انجام دیا گیا ہو لفظ رحمت اور رأفت دونوں ہی مہربانی کے معنی میں آتے ہیں لیکن رأفت میں رحمت سے زیادہ مبالغہ ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ

ہم دیکھ رہے ہیں آپ کا آسمان کی طرف بار بار منہ اُٹھانا پس ہم آپ کو ضرور ضرور متوجہ کردیں گے ایسے قبلہ کی طرف جس سے آپ راضی ہوں گے سو آپ پھیر دیجئے

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف، اور جہاں کہیں بھی تم لوگ ہو سو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف متوجہ کیا کرو، اور بلا شبہ جن لوگوں کو کتاب دی گئی۔

لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

وہ ضرور جانتے ہیں کہ بلا شبہ یہ حکم حق ہے ان کے رب کی طرف سے ہے اور اللہ غافل نہیں ہے اُن کاموں سے جن کو وہ کرتے ہو

کعبہ شریف کی طرف رُخ کرنیکا حکم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شدت سے اس کا انتظار

تفسیر: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے سلام پھیر کر آسمان کی طرف (اس انتظار میں) منہ اُٹھاتے تھے کہ کعبہ شریف قبلہ مقرر کیا جائے۔ لہٰذا آیت قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ۔ نازل ہوئی۔ علامہ واحدی (اسباب نزول ص ۳۹) میں لکھتے ہیں کہ

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کے قبلہ سے ہٹا کر تیرے لئے کوئی دوسرا قبلہ مقرر فرما دے اور مقصد یہ تھا کہ کعبہ شریف مقرر ہو جائے کیونکہ وہ قبلہ ابراہیمیہ ہے۔ حضرت جبریلؑ نے عرض کیا کہ میں بھی تو آپ کی طرح ایک بندہ ہوں کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ آپ اپنے رب سے سوال کریں کہ وہ آپ کو قبلہ ابراہیمی کی طرف رُخ کرنے کا حکم فرما دے۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام اُوپر چڑھ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر اس اُمید میں آسمان کی طرف نظر فرماتے رہے کہ جبریل آپ کی خواہش کے مطابق حکم خداوندی لے کر نازل ہوں۔ اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔ ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے اور یہ سولہ یا سترہ مہینے تک رہا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش پر کعبہ شریف کو قبلہ مقرر کر دیا گیا۔ اور کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔ اور عمومی طور پر سب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو (مکہ یا مدینہ میں یا بیت المقدس میں یا دُنیا کے کسی گوشہ میں) مسجد حرام ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔

جہت قبلہ سے تھوڑا سا انحراف مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے

مسجد حرام اس مسجد کا نام ہے جو کعبہ شریف کے چاروں طرف ہے۔ اس پر ساری اُمت کا اتفاق ہے کہ کعبہ شریف ہی قبلہ ہے۔ چونکہ کعبہ شریف مسجد حرام کے اندر ہے اس لئے مسجد حرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم فرمایا۔ اس میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ خاص کعبہ ہی کی طرف ہر دُور اور قریب کے نمازی کو رُخ کرنا لازم نہیں بلکہ مسجد حرام کی طرف منہ کرنے سے نماز ہو جائے گی۔ جو لوگ مسجد حرام میں حاضر نہ ہوں چونکہ عین کعبہ کی طرف رُخ کرنا اُن کی قدرت سے باہر ہے اس لئے آسانی اور رفع حرج کے لئے مسجد حرام کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔ لیکن جو شخص مسجد حرام میں موجود ہے اس کے لئے لازم ہے کہ عین کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھے۔ (تفسیر قرطبی ص ۱۵۹ ج ۲) میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کعبہ شریف مسجد حرام والوں کا قبلہ ہے اور مسجد حرام اہل حرم کا قبلہ ہے اور حرم شرقاً و غرباً میری تمام اُمت کے لئے قبلہ ہے زمین میں جہاں کہیں بھی ہوں، فقہا نے لکھا ہے کہ جس جہت پر کعبہ شریف ہو اس طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے سے نماز ہو جائے گی۔ تھوڑا سا انحراف مفسد صلوٰۃ نہیں۔ جب کوئی شخص جہت کعبہ کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہو اور کعبے شریف سے دائیں یا بائیں جانب ۴۵ درجے کے اندر انحراف ہو گیا تو نماز ہو جائے گی۔ قرآن مجید میں جو شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ فرمایا ہے اس سے حضرات فقہاء نے یہ استنباط کیا کہ کعبہ شریف کے رُخ پر نماز پڑھنا کافی ہے۔ اگرچہ تھوڑا سا انحراف ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مابین المشرق و المغرب قبلۃ (رواہ الترمذی) فرما کر یہ بتا دیا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان جو جہت ہے اس طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے سے نماز ہو جائے گی۔ یہ آپ کے اہل مدینہ کے لئے فرمایا کیونکہ کعبہ شریف مدینہ منورہ سے جنوب کی طرف واقع ہے۔ اور وہاں سے جہت جنوب مشرق اور مغرب کے درمیان پڑتی ہے۔ پورے عالم میں بسنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے استقبال کے بارے میں یہ بہت آسانی دی گئی ہے کہ وہ جہت قبلہ کی طرف نماز پڑھ لیں۔ تھوڑا سا انحراف ہو جائے۔ تب بھی نماز ہو جائے گی۔ احکام شرعیہ کو اللہ جل شانہٗ نے اس قدر آسان رکھا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل اور پہاڑ اور جزیرہ میں بسنے والے

مسلمان احکام شریعت پر عمل کر سکتے ہیں۔ اوقات نماز طلوع وغروب کے مشاہدہ سے سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح حسابات اور ریاضی اور ہیئت اور آلات رصدیہ کے احتیاج کے بغیر کسی تکلف کے اپنا قبلہ مقرر کر سکتے ہیں یعنی جہت کعبہ کی طرف نماز پڑھ سکتے ہیں جس میں کافی وسعت ہے۔ ہاں مسجدیں بناتے وقت خوب محقق کر کے قبلہ مقرر کرنا افضل ہے۔

کعبہ شریف کو قبلہ بنانے میں حکمت

اللہ جل شانہ، کی ذات پاک سمت اور جہت سے بالا اور برتر ہے مشارق اور مغارب سب اُسکی ملکیت ہیں۔ اسی لئے قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فرمایا۔ تاہم نماز میں اجتماع اور وحدت کے لئے تمام دنیا کے تمام انسانوں کا رُخ کسی ایک جہت کی طرف ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا کعبہ شریف کو آخر میں قبلہ نماز مقرر فرما دیا گیا۔ اور کعبہ شریف چونکہ اول حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا اور وہ سب سے پہلے پیغمبر تھے اور تمام انسانوں کے باپ تھے اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا جن کو ان کے بعد آنے والی تمام قومیں مانتی ہیں۔ اس لئے کعبہ شریف کو ہمیشہ کے لئے قبلہ قرار دیا گیا۔ اس سے تمام مسلمانوں کی وحدت اجتماعیہ فی الصلوٰۃ حاصل ہوگئی۔ اگر انسانوں پر اس کا فیصلہ چھوڑا جاتا تو بہت سے اختلافات رونما ہوتے اور کسی طرح سے وحدت حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ کعبہ شریف کو قبلہ صلوٰۃ مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ چاروں جہات میں ہر جہت نماز کے لئے مقرر ہوگئی۔ ہر جہت والے اس رُخ پر نماز پڑھتے ہیں جس رُخ پر ان کے علاقہ کے اعتبار سے کعبہ شریف واقع ہے۔ اب نمازیں مشرق کو بھی ہو رہی ہیں اور مغرب کو بھی اور جنوب وشمال کو بھی اس میں لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ اور اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ کا پورا پورا مظاہرہ ہے۔ پھر آیت کے ختم پر ارشاد فرمایا: وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (جن لوگوں کو کتاب دی گئی یعنی یہود ونصاریٰ ان کو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ قبلہ کا بدلنا اور کعبہ شریف کو قبلہ قرار دینا بالکل صحیح ہے اور حق ہے اور اُن کے رب کی طرف سے ہے)

لیکن وہ ضد اور عناد کی وجہ سے معترض ہو رہے ہیں اور حق کی تکذیب کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی ہیں جن کی بشارت انکی کتابوں میں موجود ہے اور وہ باطل کا حکم نہیں دیتے۔ (روح المعانی)۔

آخر میں ارشاد فرمایا: وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے اعمال سے اور ان کی حرکتوں سے غافل نہیں ہے۔ اُسے سب کچھ معلوم ہے۔ یہ لوگ اپنے کفر اور اعمال بد کی سزا پائیں گے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ

اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی اگر آپ ان کے پاس تمام دلیلیں لے آئیں تب بھی آپ کے قبلہ کا اتباع نہ کریں گے۔ اور نہ آپ ان کے قبلہ کا اتباع کرنے والے ہیں،

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ

اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کا اتباع کرنے والے ہیں۔ اور البتہ اگر آپ نے اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے ان کی خواہشوں کا اتباع کیا تو

الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

بے شک آپ اس وقت یقیناً ظلم کرنے والوں میں سے ہوں گے

یہود و نصاریٰ کی ضد اور عناد کا مزید تذکرہ

تفسیر: اس آیت شریفہ میں یہود و نصاریٰ کے عناد اور ضد کو مزید واضح کر کے بیان فرمایا اور صاف طور پر بتا دیا کہ ان لوگوں سے قبول حق کی کوئی اُمید نہیں۔ انہوں نے جو آپ کے قبلہ کو قبول نہیں کیا تو یہ کسی دلیل کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ لوگ صرف مخالفت اور عناد اور مکابرہ پر تلے ہوئے ہیں آپ دلیلیں پیش کر دیں انہیں آپ کی موافقت کرنا نہیں ہے۔ نہ وہ آپ کے قبلہ کا اتباع کریں گے اور نہ ہی آپ ان کے قبلہ کا اتباع کرنے والے ہیں اہل کتاب نے دھوکہ دینے کے لئے کہا تھا۔ یا محمد ﷺ عُدْ الی قبلتنا نؤمن بک و نتبعک۔ (کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے قبلہ کی طرف واپس آ جاؤ۔ ہم تم پر ایمان لے آئیں گے اور تمہارے قبلہ کا اتباع کر لیں گے) اللہ تعالیٰ نے دونوں طرف کی اُمید کو ختم فرما دیا کہ نہ وہ آپ کے قبلہ کا اتباع کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کی طرف متوجہ ہوں گے۔ یہود کا قبلہ بیت المقدس ہے۔ اور نصاریٰ نے اپنا قبلہ جہت مشرق کو تجویز کر لیا تھا۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رفع الی السماء تک کبھی بھی مشرق کی طرف نماز نہیں پڑھی ان کا قبلہ وہی تھا جو بنی اسرائیل کا قبلہ تھا یعنی بیت المقدس۔ (روح المعانی)

پھر یہ فرمایا: وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ۔ (کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کا اتباع کرنے والے نہیں ہیں) صاحب روح المعانیؒ (ص ۱۲ ج ۲) لکھتے ہیں کہ اس میں یہود و نصاریٰ کے الحاد اور تصلب فی الھویٰ کو بیان فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُنکی یہ مخالفت اور عناد صرف آپ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے خود آپس میں بھی انکی مخالفت اور عناد کا یہی حال ہے۔ آخر میں فرمایا: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے پاس اللہ کی طرف سے علم آ گیا۔ اور یہ یقین ہے کہ یہ صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں۔ انہیں حق قبول کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ لہٰذا بالفرض اگر آپ نے ان کی خواہشوں کا اتباع کر لیا تو آپ اُن لوگوں میں شمار ہو جائیں گے جو ظلم کرنے والے اور حق کو چھوڑ کر ناحق کی طرف جانے والے ہیں۔ اس طرز بیان میں اتباع ہویٰ سے بچنے کی بہت زیادہ تاکید ہے اور یہ بتایا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ اتباع ہویٰ اور ارتکاب گناہ ظالموں کا شیوہ ہے۔ اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہر ظلم سے محفوظ اور معصوم ہیں۔ (روح المعانی ص ۱۲ ج ۱)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ رسول کو پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور بلاشبہ اُن میں سے ایک فریق ایسا ہے

لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

جو ضرور حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں' حق ہے آپ کے رب کی طرف سے سو آپ ہرگز شک کرنیوالوں میں سے نہ ہو جائیں

اہل کتاب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پہچانتے ہیں اور حق چھپاتے ہیں

تفسیر: اس آیت شریفہ میں اہل کتاب کا مزید عناد اور تمرد بیان فرمایا کہ اہل کتاب صرف قبلہ کے بارے میں ہی عناد پر قائم نہیں بلکہ وہ تو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہی کے منکر ہیں اور اُن کا یہ انکار خالص عناد پر مبنی ہے۔ وہ اپنی کتابوں میں آپ کی صفات جلیلہ اور آپ کی تشریف آوری کی بشارت عظیمہ پڑھتے رہے ہیں اور وہ نعوت اور صفات خوب اچھی طرح واضح طور پر دیکھ کر آپ کی نبوت کو اس طرح پہچان گئے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں کہ یہ ہمارے بیٹے ہیں اور اپنے بیٹوں کو پہچاننے میں اُن کو ذرا شک وشبہ نہیں ہے (تفسیر درمنثور) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (جو یہود کے علماء میں سے تھے) آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا کہ آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں انہوں نے اسلام قبول کیا اور کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننا کہ یہ واقعی اللہ کے رسول ہیں مجھے اپنے بیٹے کے پہچاننے سے زیادہ یقینی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ کیوں کر۔؟ انہوں نے کہا کہ میں بالکل یقین کر کے ساتھ گواہی دیتا ہوں کہ بلاشبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں لیکن میں اس طرح کی گواہی اپنے بیٹے کے بارے میں نہیں دے سکتا' کیونکہ میں نہیں جانتا کہ عورتیں (مردوں کے پیچھے) کیا کرتی ہیں ممکن ہے میری بیوی نے خیانت کی ہو اور میں جسے اپنا بیٹا کہہ رہا ہوں وہ میرا بیٹا نہ ہو۔ (اسباب النزول للواحدی ص ۴۰ درمنثور ص ۱۴۷ ج ۱)

پھر فرمایا کہ بلاشبہ اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو حق کو چھپاتا ہے اور حال یہ ہے کہ وہ جانتے بھی ہیں کہ یہ حق ہے۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم حق کو چھپا رہے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ حق چھپانے کا وبال اور عذاب بہت زیادہ ہے۔

آخر میں فرمایا کہ یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے لہٰذا آپ ہرگز شک کرنیوالوں میں سے نہ ہو جائیں۔

صاحب روح المعانی ص ۱۴ ج ۲ لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق اپنی جگہ ثابت اور متحقق ہے اور ظاہر و باہر ہے اس میں کسی کو کچھ بھی شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ صیغہ نہی کا ہے لیکن مقصود اخبار ہے۔ حق میں شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۗ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ
اور ہر جماعت کے لئے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ اپنا رُخ کرنے والے ہیں۔ لہٰذا تم نیک کاموں کی طرف آگے بڑھو جہاں کہیں بھی تم ہو گے اللہ تعالیٰ تم سب کو لے آئے گا۔
جَمِيعًا ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۴۸﴾
بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ہر ملت کا قبلہ الگ ہے

تفسیر: اس میں لکل کا مضاف الیہ محذوف ہے۔ ای لکل اهل ملة او جماعة من المسلین والیهود والنصاریٰ یعنی ہر مذہب و ملت اور جماعت کا عبادتوں میں اپنا رُخ الگ ہوتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ خواہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کر دیا گیا ہو۔ خواہ لوگوں نے کوئی جہت اپنے طور پر مقرر کر لی ہو پھر اگر نبی اکرم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے

قبلہ ابراہیمی مقرر کر دیا گیا جو دوسروں کے قبلہ سے مختلف ہے تو اس میں اعتراض اور تعجب کی کیا وجہ ہے۔ اور یہ معنی بھی لیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا رخ مختلف بلاد و امصار اور مختلف آفاق و اطراف میں مختلف ہوتا ہے۔ چار جہات (مشرق مغرب جنوب شمال) میں سے کوئی جہت بھی مسلمانوں کا قبلہ نہیں ہے بلکہ ان کا قبلہ کعبہ ہے اور کعبہ شریف کو رُخ کرنے سے مختلف علاقوں کے لوگ مختلف جہات کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ رُخ سب کا کعبہ شریف ہی کی طرف ہے کوئی مشرق کو رُخ کئے ہوئے ہیں۔ کوئی مغرب کی طرف نماز پڑھتا ہے کسی کا قبلہ جنوب اور کسی کا قبلہ شمال کی طرف ہے۔ **او لکل قوم من المسلمین جھة و جانب من الکعبة یصلی الیھا جنوبیة او شمالیة او شرقیة او غربیة۔** (رُوح المعانی)

پھر فرمایا: **فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ** اے مومنو! اُن کاموں کی طرف آگے بڑھو اور پہل کرو جن میں دارین میں سعادت حاصل ہو قبلہ کا استقبال بھی امر خداوندی کے مطابق کرو اور اُس کے سوا دیگر احکامِ الٰہیہ پر بھی بڑھ چڑھ کر عمل کرو۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ الخیرات سے نمازیں مراد ہیں جب نماز کا وقت مامور بہ ہو جائے تو نماز کی طرف لپکنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

پھر فرمایا: **اَيْنَ مَا تَكُونُوا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ** یعنی تم جہاں کہیں بھی ہو جس خطۂ زمین میں ہو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی جزا دینے کے لئے تم سب کو جمع فرمائے گا۔ فرمانبرداری اور اعمال صالحہ کی اچھی جزا ملے گی اور بُرے کاموں کی سزا ملے گی۔ لہٰذا فرصت کو غنیمت جانیں اور موت اور حشر نشر سے غافل نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی ہر چیز پر قدرت ہے۔ زندگی بخشنا موت دینا جمع کرنا جزا دینا سب اُس کے لئے آسان ہے۔

یہ جو فرمایا کہ "ہر جماعت کا الگ الگ قبلہ ہے پس تم نیک کاموں کی طرف سبقت کرو" اس سے واضح ہو رہا ہے کہ مسلمان کا کام فضول بحثوں میں اُلجھنا نہیں جب یہ معلوم ہو گیا کہ اہل کتاب تمہارے قبلہ کی طرف رُخ کرنیوالے نہیں اور تم ان کے قبلہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تو اب بحث بلا ضرورت ہے اور فضول ہے اور وقت کا ضائع کرنا ہے ان بحثوں کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگیں یعنی خیر کے کاموں کی طرف سبقت کریں جو آخرت میں اجر و ثواب کا ذریعہ ہیں اور فَاسْتَبِقُوا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب بھی کبھی خیر کا موقع مل جائے تو فوراً اس کی طرف بڑھنا اور لپکنا چاہیے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۗ

اور جس جگہ سے بھی آپ باہر جائیں تو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔ اور بلا شبہ یہ ضرور حق ہے آپ کے رب کی طرف سے

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ

اور اللہ غافل نہیں اُن کاموں سے جو تم کرتے ہو اور جس جگہ سے بھی آپ باہر جائیں اپنا چہرہ مسجد

الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا

حرام کی طرف پھیر دیجئے۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو سو اپنے چہرے اُس کی طرف پھیر لو تا کہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔ سوائے

الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۰﴾

اُن کے جنہوں نے اُن میں سے ظلم کیا۔ لہٰذا تم اُن سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو تا کہ میں پوری کر دوں تم پر اپنی نعمت اور تا کہ تم ہدایت پر رہو

دنیا میں جہاں بھی ہوں مسجد حرام کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں

تفسیر: ان آیات میں اول تو یہ فرمایا کہ اے نبی ﷺ آپ جس جگہ سے بھی کہیں سفر میں باہر نکلیں نماز میں اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کیا کریں اور فرمایا کہ یہ حکم حق ہے آپ کے رب کی طرف سے ہے۔ اللہ سب کاموں کو دیکھتا ہے کسی کے عمل سے غافل نہیں۔ پھر مذکورہ بالا حکم کا دوبارہ اعادہ فرمایا اور ساتھ ہی عامۃ المسلمین کو بھی خطاب فرمایا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو نمازوں میں اپنے چہرے مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو۔ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ سے لیکر لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تک فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تین مرتبہ ہے اور وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ دوبار ہے۔ تحویل قبلہ کا مسئلہ چونکہ بہت اہم بن گیا تھا۔ مخالفوں کا اعتراض اور شور و شغب کی وجہ سے بعض کچے مسلمان بھی متاثر ہو گئے تھے اور اُن میں سے بعض مُرتد بھی ہو گئے تھے۔ جیسا کہ پہلے گزرا۔ اس لئے تاکید کے طور پر بار بار مسجد حرام کی طرف استقبال کرنے کا حکم فرمایا گیا اور درمیان میں اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ اور لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لایا گیا۔

اور بعض حضرات نے یوں بھی کہا ہے کہ پہلے حالت حضر کا بحالت سفر کا حکم بیان فرمایا کہ سفر میں بھی مسجد حرام ہی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں اور مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ دوبارہ ذکر فرمایا تا کہ خوب اچھی طرح واضح ہو جائے کہ سفر قریب کا ہو یا بعید کا مشرق کا ہو یا مغرب کا جنوب کا ہو یا شمال کا۔ ہر حالت میں مسجد حرام ہی کی طرف نماز پڑھنا ہوگا۔

قبلہ بدلنے پر یہودیوں کی حجت ختم ہوگئی:

آخر میں یہ فرمایا: لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ۔ اس کے بارے میں مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ کی علت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیت المقدس کی بجائے کعبہ شریف کی طرف رُخ پھیر دینے میں یہودیوں کی حجت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اُن کا یہ اعتراض تھا کہ توریت شریف میں تو یہ مذکور ہے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ کعبہ شریف ہوگا لیکن یہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں اور دُوسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے دین کا انکار کرتے ہیں لیکن ہمارے قبلہ کا اتباع کرتے ہیں یہودیوں کے یہ دونوں اعتراض کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ملنے سے ختم ہو گئے۔ اور مشرکین جو یہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ملت ابراہیمی کا اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اُنکے قبلہ کے علاوہ دُوسرا قبلہ اختیار کئے ہوئے ہیں تحویل قبلہ سے ان کا اعتراض بھی ختم ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ النَّاسَ کا عموم یہود اور مشرکین دونوں کو شامل ہے۔

پھر فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ یعنی کعبہ شریف کو قبلہ مقرر کر دینے سے لوگوں کی حجت ختم ہو گئی اور اب کسی کا اعتراض باقی نہیں رہا سوائے ان لوگوں کے جو ظالم ہیں جنہوں نے عناد پر ہی کمر باندھ رکھی ہے۔ اور جنہیں حق قبول کرنا ہی نہیں۔ مثلاً یہودی معاندین کہیں گے کہ انہوں نے کعبہ کو قبلہ اس لئے اختیار کر لیا کہ اپنی قوم کے دین کی طرف مائل ہو گئے اور وطن کی محبت نے ان کو کعبہ کو قبلہ بنانے پر آمادہ کر لیا۔ یا یوں کہیں گے کہ ان کو اس وقت یہ خیال آ گیا کہ اپنے باپ دادوں کا قبلہ اختیار کر لیں ممکن ہے کہ پھر ہمارے قبلہ کی طرف واپس آ جائیں۔ معترض اور معاند کا منہ تو کبھی بند نہیں ہو سکتا وہ تو کٹ حجتی کرتا ہی رہتا ہے۔

پھر فرمایا: فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ (کہ تم اُن سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو) جو حکم کعبہ شریف کو رُخ کرنے کا ہوا ہے اسکی تعمیل کرو اور معترضین اور معاندین کی کسی بات کا کوئی خیال نہ کرو ان سے نہ ڈرو کیونکہ ان کے طعنے اور

اعتراضات تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچائیں گے مجھ سے ڈرو میرے امر کی مخالفت نہ کرو۔

آخر میں فرمایا: وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ یہ محذوف کی علت ہے یعنی وامرتکم لا تمامی النعمة علیکم وارادتی اهتداء کم یعنی میں نے تم کو تحویل قبلہ کا حکم دیا ہے جو اس لئے ہے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہو۔ (کل من البیضاوی)

كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱلْكِتَٰبَ
جیسا کہ ہم نے بھیجا تمہارے اندر ایک رسول جو تم میں سے ہے وہ تلاوت کرتا ہے تم پر ہماری آیات اور تمہیں پاکیزہ بناتا ہے اور تم کو کتاب
وَٱلْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا۟ تَعْلَمُونَ ﴿۱۵۱﴾ فَٱذْكُرُونِىٓ أَذْكُرْكُمْ وَٱشْكُرُوا۟ لِى
اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ چیزیں سکھاتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔ سو تم مجھ کو یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا، اور میرا شکر کرو
وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۵۲﴾
اور میری ناشکری نہ کرو

اہل ایمان کے لئے تکمیل نعمت

تفسیر: یہ ماقبل سے متعلق ہے ای ولا تم نعمتی علیکم فی امر القبلة اوفی الاخرة کما اتممتها بارسال رسول منکم یعنی ہم نے تم کو کعبہ شریف کیطرف نمازوں میں رُخ کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ تم پر اپنی نعمت قبلہ کے بارے میں اور آخرت میں پوری کروں جیسا کہ میں نے اپنی نعمت تم پر اس طرح بھی پوری کی ہے کہ تمہارے اندر تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے۔ جو ہماری آیتیں پڑھ کر تم کو سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔ اس کی تعلیمات پر عمل کرنے سے تم ظاہری باطنی برائی اور خرابی سے پاک ہو جاؤ گے۔ وہ تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ وہ باتیں بتاتا ہے جن کو تم نہیں جانتے تھے۔ جن کے جاننے کا راستہ وحی الٰہی کے علاوہ بالکل نہیں ہے۔ ہم نے اپنا رسول بھیجا اس پر وحی بھیجی اور وحی کے ذریعہ تم کو بہت کچھ بتایا اور سمجھایا لہٰذا تم میرا ذکر کرو، میں تمہیں یاد کرونگا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ کی تفسیر

مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ فاذکرونی باطاعتی اذکرکم بالثواب یعنی تم مجھے فرمانبرداری کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں ثواب دے کر یاد کروں گا۔ دل سے زبان سے اللہ کو یاد کرنا یہ بھی یاد ہے اور فرمانبرداری اور اطاعت میں لگنا یہ بھی یاد ہے۔ اللہ کے خوف سے گناہوں کو چھوڑ دینا یہ بھی یاد ہے محققین نے فرمایا ہے۔ کل مطیع لله فهو ذاکر۔ یعنی ہر وہ شخص جو اللہ کی فرمانبرداری میں مشغول ہو وہ ذاکر ہے۔ زبان سے یاد کرنے کی بھی بہت زیادہ فضیلت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرے اور میری یاد میں اس کے ہونٹ حرکت کریں (صحیح بخاری عن ابی ہریرۃ) اور ایک حدیث میں یوں ہے کہ آنحضرت

سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندہ کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرے سو اگر اس نے مجھے تنہائی میں یاد کیا تو میں بھی اُسے تنہا یاد کروں گا اور اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرے تو میں بھی اُسے جماعت میں یاد کرتا ہوں جو اسکی جماعت سے بہتر ہے۔ (یعنی عالم بالا کے درباری فرشتوں کے سامنے)۔ (صحیح بخاری ایضاً عن ابی ہریرۃ)

ذکر اللہ کے فضائل: احادیث شریفہ میں تسبیح تہلیل اور تکبیر میں مشغول ہونے کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں یوں کہوں کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ تو یہ مجھے ان سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن چیزوں پر آفتاب طلوع ہوا۔ (صحیح مسلم ص ۳۴۵ ج ۲)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سا کلام (ذکر کے لئے) سب سے زیادہ افضل ہے۔ آپ نے فرمایا جو اللہ نے اپنے فرشتوں کے لئے منتخب فرمایا یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ. (رواہ مسلم ص ۳۵۱ ج ۲)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے یوں کہا سُبْحٰنَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ اس کے لئے جنت میں ایک کھجور کا درخت لگا دیا جائے گا۔ (رواہ الترمذی فی ابواب الدعوات)

حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کہ دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں (قیامت کے دن) ترازو میں بھاری ہوں گے اور رحمٰن کو محبوب ہیں اور وہ یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ صحیح بخاری آخری حدیث۔

ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ اسلام کی باتیں تو بہت ہیں آپ مجھے کوئی ایسی چیز بتائیں جس میں لگا رہوں آپؐ نے فرمایا لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ یعنی تیری زبان ہر وقت اللہ کی یاد میں تر رہے۔ (رواہ الترمذی وحسنہ)

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چل رہا تھا اور دِل میں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ پڑھ رہا تھا آپ نے فرمایا کہ اے عبداللہ بن قیس (یہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کا نام ہے) کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتا دوں؟ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ضرور ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا وہ خزانہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ہے (صحیح مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ کسی جگہ بیٹھ کر اس کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں اُن کو فرشتے گھیر لیتے ہیں اور اُن پر رحمت چھا جاتی ہے اور اُن پر اطمینان کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنے درباریوں میں یاد فرماتا ہے۔ (صحیح مسلم ص ۳۴۵ ج ۲)

شکر کی فضیلت اور اہمیت:

ذکر کا حکم فرمانے کے بعد شکر کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (یعنی میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو) ذکر کے ساتھ شکر ادا کرنا بھی لازم ہے۔ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں جن کا شمار بھی بندوں کی قُدرت سے باہر ہے۔ اُن نعمتوں کا شکر ادا کرنا واجب ہے شکر میں یہ سب کچھ آ جاتا ہے کہ نعمتوں کا اقرار کریں۔ قول اور فعل سے نعمتوں کا اظہار کریں۔ نعمتوں کی قدردانی کریں۔ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں اور نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور

اطاعت میں خرچ کریں۔ نعمتوں کا منکر ہونا ان کی ناقدری کرنا ان کو گناہوں میں خرچ کرنا ناشکری ہے۔ یہ کتنی بڑی حماقت ہے کہ نعمتیں اللہ تعالیٰ عنایت فرمائے اور اُن نعمتوں کا استعمال اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں اور نفس وشیطان کی فرمانبرداری میں ہو۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو سبھی استعمال کرتے ہیں لیکن شکر گزار بندے کم ہیں جیسا کہ سورۂ سبا میں فرمایا۔ وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ شکر بہت بڑی چیز ہے اس کی وجہ سے نعمتیں باقی بھی رہتی ہیں اور نعمتوں میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ اور ناشکری پر نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔ سورت ابراہیم (ع ۱) میں فرمایا۔ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (اور جب تمہارے رب نے اعلان فرمایا کہ البتہ اگر تم شکر کرو گے تو تمہیں ضرور ضرور اور زیادہ دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے۔ تو بلاشبہ میرا عذاب سخت ہے)

انسان کے مزاج میں ناشکری غالب ہے۔ سورۂ زخرف میں فرمایا کہ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ (بلاشبہ انسان کھلا ناشکرا ہے اور سورہ ابراہیم میں فرمایا) وَآتَاكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ (اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ان سب چیزوں میں سے دیا جن کا تم نے سوال کیا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار نہ کرسکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ظالم ہے (اور) بڑا ناشکرا ہے)۔

بندوں کا یہی کام ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہیں اسکی نعمتوں کو یاد کریں۔ جب انہیں استعمال کریں تو اللہ کی حمد وثنا میں مشغول ہوں۔ حدیث شریف کی کتابوں میں جو دُعائیں وارد ہوئیں۔ ان میں نعمتوں پر بار بار اللہ کی حمد کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ الحمد رأس الشکر ما شکر اللّٰہ عبدٌ لا یحمدہ (یعنی اللہ کی حمد کرنا اصل شکر ہے جو بندہ اللہ کی حمد بیان نہیں کرتا اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کمافی المشکوٰۃ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۳﴾

اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد حاصل کرو، بے شک اللہ صابروں کے ساتھ ہے

صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد مانگنے کا حکم

تفسیر: اس سے پہلی آیت میں ذکر اور شکر کا حکم فرمایا اور اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو۔ لفظ صبر کا لغوی معنی رُکنے اور ٹھہر جانے کا ہے۔ شریعت میں یہ لفظ تین معنی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اوّل اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت وفرمانبرداری پر لگائے رہنا دوم اپنے نفس کو گناہوں سے روک کر رکھنا سوم آفات اور مصائب پر جو تکلیف ہو اُسے سہ جانا اور اس طرح گزر جانا کہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور قدر پر راضی ہو اور اللہ تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہ کرے اور دکھ تکلیف اور مصیبت پر ثواب کا اُمیدوار رہے عام لوگ صبر صرف تیسرے معنی ہی کے لئے استعمال کرتے ہیں پہلے دو معنی کی طرف اُن کا ذہن نہیں جاتا حالانکہ یہ تینوں صورتیں صبر کا جُزو ہیں اور صبر کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اور تینوں میں مشترک امر وہی ایک بات ہے یعنی نفس کو دَبانا اور ہر اُس بات سے روکنا جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو۔ جو شخص بھی صبر کے ان تینوں طریقوں کو اختیار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نُصرتیں اس پر نازل ہوں گی۔ سورہ زمر میں ارشاد فرمایا۔ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ کہ صابروں کو پورا پورا اجر بغیر حساب کے دیا جائیگا۔

صبر کی فضیلت اور اہمیت: درحقیقت صبر اور شکر مومن کی زندگی کے لئے (جو ایک رواں دواں سیارہ کے مشابہ ہے) پہیے ہیں اور مومن کی کوئی چیز ضائع نہیں ہے۔ آرام وراحت ہو نعمتیں ہوں یا دکھ تکلیف ہو اور کلفتیں ہوں ہر حال میں اُس کے لئے نفع ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کا معاملہ عجیب ہے۔ اسکی ہر حالت خیر ہے۔ اور یہ مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر مومن کو خوش کرنے والی حالت پہنچ گئی تو اس نے شکر کیا جو اس کے لئے بہتر ہوا اور اگر اس کو تکلیف دینے والی حالت پہنچ گئی تو اس نے صبر کیا یہ بھی اس کے لئے بہتر ہوا۔ (رواہ مسلم)

صحیح بخاری (ص ۹۵۸ ج ۲) میں ہے کہ ولن تعطوا عطاء خیرا وا وسع من الصبر۔ (یعنی تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صبر سے بہتر اور وسیع کوئی عطاء نہیں دی گئی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو چار چیزیں عطا کر دی گئیں اُسے دنیا و آخرت کی بھلائی دے دی گئی۔ (۱) شکر گزار دل (۲) ذکر کرنے والی زبان (۳) مصیبت پر صبر کرنے والا بدن (۴) ایسی بیوی جو اپنی جان کے بارے میں اور شوہر کے مال کے بارے میں شوہر کی خیانت نہ کرے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کما فی المشکوٰۃ ص ۲۸۳)

صبر میں تھوڑی سی تکلیف تو ہوتی ہے مگر اس کے بعد نعمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ کچھ ملتا ہے جس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ تکلیفیں تو سبھی کو پہنچتی ہیں۔ مومن ہو یا کافر نیک ہو یا بد۔ فرق اتنا ہے کہ جو لوگ صبر کر لیتے ہیں وہ ثواب بھی لے لیتے ہیں اور آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد۔ رحمت اور نصرت کے دروازے بھی ان کے لئے کھل جاتے ہیں۔ جو لوگ صبر نہیں کرتے واویلا کرتے ہیں چیختے چلاتے ہیں۔ اللہ پر اعتراض کرتے ہیں اور اسکی قضا اور قدر پر راضی نہیں ہوتے تکلیف بھی اُٹھاتے ہیں اور ثواب سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ اور اللہ پر اعتراض کر کے کافر ہو جاتے ہیں۔ اور درحقیقت اصل مصیبت زدہ وہی لوگ ہیں جو ثواب سے بھی محروم رہتے ہیں۔ وانما المصاب من حرم الثواب (رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ)

جس نے اپنی تکلیف پر صبر کر کے ثواب لے لیا آخرت میں درجات بلند کروا لئے۔ اسکی تکلیف کوئی تکلیف نہیں ہے کیونکہ اُسے اس تکلیف کی قیمت مل گئی۔ دنیا میں دیکھتے ہیں کہ مہینہ بھر ملازمت کی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ مزدور دن بھر دھوپ میں کام کرتے ہیں لیکن چونکہ ان سب کا معاوضہ مل جاتا ہے اس لئے یہ تکلیف خوشی سے برداشت کر لیتے ہیں اور اس کو تکلیف سمجھا ہی نہیں جاتا۔

دفع مصائب کیلئے نماز: صبر کے ساتھ نماز کا تذکرہ بھی فرمایا اور نماز کے ذریعہ بھی مدد حاصل کرنے کا حکم فرمایا۔ نماز بھی اللہ کی مدد اور نُصرت لانے کے لئے بہت بڑی چیز ہے۔ اور ہر طرح کی پریشانیاں دور کرنے کے لئے اکسیر ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی مشکل پیش آجاتی تھی تو نماز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

نماز فرض کا تو بہر حال اہتمام ہوتا ہی تھا۔ مشکلات سے نکلنے کے لئے اور حاجات پوری کرانے کے لئے آنحضرت سرور عالم ﷺ خصوصیت کے ساتھ نفل نماز میں مشغول ہو جاتے تھے صلوٰۃ الحاجۃ، صلوٰۃ الاستخارہ، صلوٰۃ التوبہ، صلوٰۃ الاستسقاء (بارش طلب کرنے کی نماز) یہ سب رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں۔ جو اللہ کی رحمت اور نصرت طلب کرنے کے لئے مشروع کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ کی بعض روایات آیت کریمہ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کے ذیل

میں گزر چکی ہے لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ کوئی مصیبت آجائے دنیا بھر کی تدبیریں کرتے ہیں اور مخلوق سے مدد چاہتے ہیں لیکن صبر اور صلوٰۃ کو مدد حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ اس کے برعکس بے صبری کرتے ہیں اور تھوڑے بہت چند افراد جو نمازیں پڑھتے ہیں وہ فرض نمازیں بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ نفل نمازوں میں لگنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اور جن گناہوں میں مبتلا تھے۔ ان سب گناہوں میں بھی لگے رہتے ہیں۔ پھر رحمت اور نصرت کیسے ملے؟ آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ کہ اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہے۔ صابروں کے لئے یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہے۔ اگر حکومت کا کوئی معمولی درجہ کا آدمی بھی یقین دلا دے کہ فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں تو اس سے بڑی ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ طبیعت میں بڑا اطمینان ہو جاتا ہے۔ لیکن اللہ جل شانہٗ نے جو وعدہ فرمایا کہ میں صبر والوں کے ساتھ ہوں اس وعدہ پر عموماً لوگ یقین نہیں رکھتے اور صبر کے موقعہ میں بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ درحقیقت مومن کو کسی بھی جگہ ناکام ہونے اور گھبرانے کا کوئی موقع نہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر و شکر میں اور صبر و صلوٰۃ میں لگا رہے پھر اس کے لئے کامیابی ہی کامیابی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں اُن کے بارے میں یوں نہ کہو کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم اس کا ادراک نہیں کرتے

شہداء کے فضائل

تفسیر: علامہ واحدی اسباب النزول میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت بدر میں شہید ہو جانیوالے مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ جن میں آٹھ حضرات انصار میں سے اور چھ حضرات مہاجرین میں سے تھے۔ شہید ہو جانے والوں کے بارے میں بعض لوگوں نے یوں کہا کہ فلاں مر گیا اور دنیا کی لذت اور نعمت اس سے فوت ہو گئی تو آیات بالا کا نزول ہوا۔ اھ

اللہ کے دین کے پھیلانے اور حق کے آگے بڑھنے میں جو لوگ آڑے آتے ہیں اُن سے نبٹنے کے لئے جہاد اور قتال کرنا پڑتا ہے جب جہاد کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ سب کافر ہی مقتول ہوں اس میں بہت سے مسلمان بھی مقتول ہو جاتے ہیں ان مقتول مسلمانوں کو شہداء کا معزز خطاب دیا گیا ہے۔ شہیدوں کے بڑے مرتبے ہیں۔ اُن سے بلند درجات کے وعدے ہیں ان کی برزخی زندگی بھی دوسروں سے ممتاز ہے اسی لئے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں ان کے بارے میں یوں نہ کہو کہ وہ مُردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اُن پر موت طاری ہوئی ہے لیکن برزخی زندگی میں اُن کو امتیازی مرتبہ حاصل ہے۔ تم لوگ انکی اس حیات کا ادراک نہیں کر سکتے۔ سورۃ آل عمران میں شہداء کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (اور ان لوگوں کے بارے میں جو اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ وہ مُردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں اللہ نے جو کچھ ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا اس پر خوش ہیں)

حیاتِ برزخیہ میں سب سے زیادہ قوی تر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات ہے۔ اُن کے اجسام کو زمین نہیں

[1] فی روح المعانی أی ارادشیأ بقرینة قوله تعالیٰ إنما امره اذا ارادشیأ وجاء القضاء علی وجوه ترجع کلها إلی اتمام الشیی قولا أوفعلا والطلاقه علی الارادة مجاز من استعمال اللفظ المسبب فی السبب فان الایجاد الذی هوا تمام الشی مسبب عن تعلق الارادة لانه یوجبه.

کھاتی۔ حدیث شریف میں ہے۔

ان اللہ حرّم علی الارض أن تاکل اجساد الانبیاء (رواہ ابوداؤد) اور ان کی حیات برزخیہ اس قدر ممتاز ہے کہ اس کے ظاہری آثار احکام دنیا بھی بعض اُمور میں ظاہر ہیں مثلاً انکی میراث کا تقسیم نہ ہونا اور ازواج مطہرات کا انکی وفات کے بعد دوسروں سے نکاح جائز نہ ہونا۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ممتاز اور قوی تر حیاتِ برزخیہ کے بعد شہداء کی حیات کا درجہ ہے۔ جس کا آیت بالا میں اور سُورۂ آلِ عمران کی آیت مذکورہ میں تذکرہ ہے۔ ان کے بعد دوسرے لوگوں کی حیات ہے جس کے ذریعہ قبر میں عذاب ہوتا ہے یا آرام ملتا ہے ان کی تفصیلات احادیث شریفہ میں موجود ہیں۔

شہید چونکہ اپنا جان و مال لے کر حاضر ہو جاتا ہے اور اللہ کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے اُس کا اللہ کے یہاں بہت بڑا مرتبہ ہے ان کا جو وہاں اکرام ہوتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ دُنیاوی زندگی اس کے سامنے ہیچ در ہیچ ہے۔

حضرت مسروق تابعی نے بیان فرمایا کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیت کریمہ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتاً بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ (الآیۃ) کے بارے میں معلوم کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہیں اُن کے لئے قندیل ہیں جو عرش کے نیچے لٹکے ہوئے ہیں یہ پرندے جنت میں جہاں چاہتے ہیں چلتے پھرتے ہیں۔ پھر ان قندیلوں میں آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان سے فرمایا کہ تم کچھ خواہش رکھتے ہو انہوں نے کہا ہم کیا خواہش کریں۔ (اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ) ہم جنت میں جہاں چاہیں پھرتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے تین مرتبہ ان سے یہی سوال فرمایا جب اُنہوں نے دیکھا کہ سوال ہوتا ہی رہے گا کچھ نہ کچھ جواب دینا ہی ہے تو عرض کیا اے رب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری روحیں دوبارہ جسموں میں واپس کر دی جائیں تاکہ ہم پھر تیری راہ میں مقتول ہو جائیں۔ جب اُنہوں نے کسی اور حاجت کا سوال نہ کیا (اور وہاں سے واپسی کا قانون نہیں ہے) تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ (رواہ مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کوئی بندہ وفات پا جاتا ہے جس کے لئے اللہ کے پاس خیر ہو (یعنی عذاب سے نجات ہو اور وہاں کی نعمتوں سے متمتع ہو رہا ہو) اُسے یہ خوشی نہیں ہوتی کہ دنیا میں واپس آجائے۔ اگرچہ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب اُسے مل جائے سوائے شہید کے، شہید کو اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ دنیا میں دوبارہ آجائے اور پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو جائے کیونکہ وہ (وہاں پہنچ کر) شہادت کی فضیلت دیکھ لیتا ہے۔ (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ ضرور میری یہ خواہش ہے۔ کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ (بخاری)

نبوت کا مرتبہ تو ہر مرتبہ سے فائق ہے اور برتر ہے پھر بھی آنحضرت ﷺ نے اللہ کی راہ میں بار بار شہید ہونے کی تمنا ظاہر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی بہت سی حکمتیں ہیں بار بار قتل ہونے اور زندہ ہونے کی تمنا پوری نہ فرمائی لیکن آپ کو درجہ شہادت اس طرح سے عطا فرما دیا کہ غزوۂ خیبر میں جو ایک یہودی عورت نے بکری کے بھنے ہوئے دست میں زہر ملا کر دے دیا تھا۔ اُس کا اثر وقتی طور پر رُک گیا تھا لیکن وفات کے وقت اس نے اثر کیا اور وہ آپکی وفات کا ذریعہ بن گیا۔

حقوق العباد کے علاوہ شہید کا سب کچھ معاف ہے

شہید کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا لیکن فی سبیل اللہ قتل ہو جانے سے حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے یُغفر للشهيد كل ذنب الا الدَّین (کہ شہید کا ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے۔ قرض کے علاوہ) (صحیح مسلم)

جہاد میں اخلاص کی ضرورت:

شہادت کا درجہ ملنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ صرف اللہ کی رضا کے لئے دشمنان دین سے جنگ کی ہو اور اُس میں مقتول ہوا ہو اور اللہ کی بات اُونچی کرنے کے لئے لڑا ہو۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ایک شخص غنیمت کے لئے جنگ کرتا ہے ایک شخص اپنی شہرت کے لئے لڑتا ہے اور ایک شخص اس لئے لڑا ہے کہ بہادری میں اس کا مقام اور مرتبہ مشہور ہو جائے۔ سوان میں اللہ کی راہ میں کون سا ہے آپ نے فرمایا جو اس لئے جنگ کرے کہ اللہ کی بات بُلند ہو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری ظاہر کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے اور ایک شخص (قوم یا وطن) کی حمیّت کی وجہ سے جنگ کرتا ہے اور ایک شخص ریاکاری کے لئے جنگ کرتا ہے۔ سوان میں اللہ کی راہ میں کون ہے؟ آپ نے فرمایا جو اس لئے جنگ کرتا ہے کہ اللہ کی بات بلند ہو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ (صحیح مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی بھی شخص کو اللہ کی راہ میں زخم پہنچ جائے اور اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اُس کی راہ میں کس کو زخم پہنچا تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اُس کے زخم سے خون جاری ہوگا۔ رنگ خون کا ہوگا اور خوشبو مشک کی ہوگی۔ (صحیح ص ۱۳۳ ج ۲)

اس میں یہ جو فرمایا کہ "اللہ ہی کو معلوم ہے جو اللہ کی راہ میں زخمی ہوا"۔ اس میں اُسی اخلاص کی طرف اشارہ ہے جس کی ہر عبادت میں ضرورت ہے۔ بندے ظاہری اعمال تو دیکھتے ہیں لیکن اصل معاملہ اللہ سے ہے اگر اللہ کے نزدیک اُس کی نیت یہ ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے تو عمل کا ثواب ملتا ہے اور وہ فضیلتیں حاصل ہوتی ہیں جن کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور اگر کسی عمل سے ریا اور شہرت مقصود ہو تو اس سے ثواب کیا ملتا۔ وہ تو آخرت میں وبال بن جائے گا۔ اور آخرت میں دوزخ میں داخل کرانے کا ذریعہ ہوگا۔

وطنی اور قومی جنگ میں قتل ہونے والے شہید نہیں ہیں:

آجکل بھی دنیا میں جنگ وجدال اور قتل وقتال جاری ہے لوگ برابر مر رہے ہیں قتل ہو رہے ہیں۔ لیکن عموماً قومی، وطنی، لسانی، صوبائی عصبیت کی وجہ سے لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ اللہ کی رضا کا کہیں سے کہیں تک بھی خیال نہیں۔ پھر ان لڑائیوں میں جو کوئی مارا جاتا ہے اس کو شہید بھی کہتے ہیں حالانکہ شہید وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہید ہو۔ اور اب تو شہید وطن اور شہید قوم کے الفاظ بھی زبانوں پر جاری ہیں اور صحیفوں جریدوں میں آرہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کافروں اور ملحدوں کے لئے شہید کا لفظ استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ سب جہالت اور الحاد اور بے دینی کی باتیں ہیں۔ حفظنا الله من الضلال.

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ

اور ضرور ضرور ہم تم کو آزمائیں گے کچھ خوف سے اور کچھ بھوک سے اور کچھ مالوں میں اور جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے

وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ

اور خوشخبری سُنا دیجئے صبر کرنے والوں کو جن کی صفت یہ ہے کہ جب پہنچے ان کو کوئی مصیبت تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی

وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

کے لئے ہیں اور بے شک ہم اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اُن کے رب کی طرف عام رحمتیں ہیں اور خاص رحمت بھی ہے اور یہ وہ لوگ

الْمُهْتَدُوْنَ ۝

ہیں۔ جو ہدایت پانے والے ہیں

مختلف طریقوں سے آزمائش ہوگی

تفسیر: یہ دنیا دارالابتلاء اور دارالامتحان ہے۔ موت اور حیات کی تخلیق ہی ابتلاء اور امتحان کے لئے ہے۔ جیسا کہ سورۂ ملک میں فرمایا: تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (بابرکت ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں پورا ملک ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے پیدا فرمایا موت کو اور زندگی کو۔ تا کہ وہ آزمائے کہ تم میں کون عمل کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے۔)

سورۂ محمد (ﷺ) میں فرمایا: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِيْنَ وَنَبْلُوَ اَخْبَارَكُمْ (اور البتہ ہم تم کو ضرور جانچیں گے تا کہ معلوم کرلیں جو تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں اور جو صبر کرنیوالے ہیں۔ اور تا کہ ہم جان لیں تمہاری خبریں)۔

مذکورہ بالا آیت میں بھی ابتلاء و امتحان کا تذکرہ فرمایا اور لام تاکید اور نون ثقیلہ کے ساتھ مؤکد کر کے فرمایا کہ ہم تم کو ضرور ضرور جانچ میں ڈالیں گے اور امتحان کریں گے۔ کبھی خوف ہوگا۔ کبھی بھوک سے دوچار ہو گے' مال کم ہوگا' جانیں بھی کم ہوں گی۔ اعزاء و اقرباء اولاد اور احفاد فوت ہوں گے پھلوں میں کمی ہوگی اس میں تمام امہات المصائب کا تذکرہ آ گیا' دنیا میں دشمنوں کا خوف قحط سالی' سیلاب اور زلزلے' تجارتوں میں نقصان۔ مکانات کا گر جانا۔ اموال کا چوری ہونا۔ کہیں دفن کر کے بھول جانا۔ رکھے ہوئے مالوں کا تلف ہو جانا۔ کارخانوں کا بند ہو جانا۔ مشینوں کا خراب ہو جانا۔ بجلی کا بند ہو جانا۔ اعزہ و اقربا اور احباب کی موتیں ہونا۔ وبائی امراض کا پھیل جانا۔ باغوں میں پھل کم آنا یا بہت زیادہ پھل آ کر آندھی سے گر جانا۔ کھیتوں میں کیڑا لگ جانا۔ ٹڈی آ جانا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب امور کی طرف اشارہ ہو گیا۔

مومن بندے صبر سے کام لیتے ہیں جس طرح کی بھی کوئی مصیبت درپیش ہو اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور اللہ کی قضا و قدر پر راضی رہتے ہیں اور ثواب کی اُمید رکھتے ہیں۔ جو مصیبتیں درپیش ہوتی ہیں۔ وہ گناہوں کی سزا کے طور

پر بھی پیش آتی ہیں اور کفارہ سیئات کے لئے بھی ہوتی ہیں۔ امتحان کے لئے بھی ہوتی ہیں اور رفع درجات کے لئے بھی۔ قرآن مجید سے اور احادیث شریفہ سے یہ باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔

مومن بندوں کو مصائب کا فائدہ:

سورۂ نساء میں فرمایا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (جو شخص بھی کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ دیا جائے گا) تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں یہ بات نقل کی گئی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کیا اب کامیابی کی صورت ہے۔ جبکہ ہر بدی کا بدلہ ملنا ضروری ہے آپ نے فرمایا اے ابو بکر اللہ تمہاری مغفرت فرمائے۔ کیا تم مریض نہیں ہوتے ہو، یا تمہیں تکلیف نہیں پہنچتی، کیا تم رنجیدہ نہیں ہوتے، کیا تم کو کوئی مصیبت در پیش نہیں ہوتی عرض کیا ہاں یہ چیزیں تو پیش آتی ہیں۔ آپ نے فرمایا ان چیزوں کے ذریعہ گناہوں کا بدلہ ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا اے ابو بکر تم اور تمہارے اصحاب مومنین دنیا میں گناہوں کا بدلہ پالیں گے یہاں تک کہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کریں گے کہ کوئی گناہ باقی نہ ہوگا۔ لیکن دوسرے لوگ (یعنی کافر) ان کے سب گناہ جمع کئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ان سب کی سزا اُن کو قیامت کے دن ملے گی۔ (ابن کثیر)

سورۂ شوریٰ میں فرمایا: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (اور جو کوئی مصیبت تم کو پہنچی سو وہ بدلہ ہے اسکا جو کمایا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور اللہ معاف فرما دیتا ہے بہت سے گناہ)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی بندے کو کوئی تھوڑی یا زیادہ تکلیف پہنچتی ہے وہ گناہ کی وجہ سے ہوتی ہے اور جو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں وہ بہت زیادہ ہے۔ پھر آپ نے آیت کریمہ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ تلاوت فرمائی۔ (رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اُسے تکلیف میں مبتلا فرما دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری ص ۸۴۳ ج ۱)

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ جب بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی درجہ مقرر کر دیا گیا جس درجہ میں وہ اپنے عمل کی وجہ سے نہ پہنچ سکتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو جسم یا مال میں یا اولاد میں (تکلیفوں کیساتھ) مبتلا فرما دیتے ہیں پھر اس پر اس کو صبر دے دیتے ہیں یہاں تک کہ اُسے اُسی درجہ میں پہنچا دیتے ہیں جو پہلے سے اُس کے لئے طے فرما دیا تھا۔ (رواہ احمد و ابوداؤد کما فی المشکوٰۃ ص ۱۳۷)

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کو جو بھی کوئی تکلیف، مرض، فکر، رنج، اذیت، غم پہنچ جائے یہاں تک کہ اگر کانٹا بھی لگ جائے تو اللہ تعالیٰ شانہٗ اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کا کفارہ فرما دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری ص ۸۴۳ جلد ۲)

ام السائب ایک صحابیہ تھیں۔ آنحضرت سرورِ عالم ﷺ اُن کے پاس تشریف لے گئے وہ کپکپا رہی تھیں آپ نے فرمایا کیا بات ہے کیوں کپکپا رہی ہو؟ انہوں نے کہا اس کا بُرا ہو بخار چڑھ گیا۔ آپ نے فرمایا بخار کو بُرا نہ کہو کیونکہ وہ بنی آدم

کی خطاؤں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جیسے بھٹی لوہے کے میل کچیل کو ختم کر دیتی ہے۔ (صحیح مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو دنیا ہی میں سزا دے دیتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ شر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کی سزا کو روکے رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کو قیامت کے دن پوری سزا دے دیں گے۔ (رواہ الترمذی فی ابواب الزہد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن مَرد اور مومن عورت کو جان مال اور اولاد میں برابر تکلیف پہنچتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کریگا کہ اس کا کوئی گناہ بھی باقی نہ رہا ہوگا۔ (رواہ الترمذی فی ابواب الزہد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس ہی بھی مسلمان کے تین بچے فوت ہو گئے ہوں جو بالغ نہیں ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ ان بچوں پر رحمت فرمانے کی وجہ سے اس مسلمان کو (یعنی ان کے والد کو) جنت میں داخل فرما دیں گے۔ (بخاری)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ عورتیں جمع ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ نے اُن کے سامنے وعظ و نصیحت کی باتیں فرمائیں اور یہ بھی فرمایا کہ جس کسی کے تین بچے فوت ہو گئے وہ اس کے لئے دوزخ سے بچانے کے لئے آڑ بن جائیں گے ایک عورت نے کہا کہ اگر کسی کے دو بچے فوت ہوئے ہوں تو آپ نے فرمایا کہ اگر کسی کے دو بچے فوت ہوئے ہوں تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ (بخاری) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دو مسلمان (میاں بیوی) جن کے تین بچے فوت ہو جائیں اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل فرمادے گا اپنی رحمت کے فضل سے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر دو بچے فوت ہوئے ہوں؟ فرمایا دو کا بھی یہی حکم ہے عرض کیا اگر ایک بچہ فوت ہوا ہو۔ فرمایا ایک کا بھی یہی حکم ہے۔ پھر فرمایا قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ بلا شبہ اَدھورا بچہ اپنی ماں کو اپنی ناف کے ذریعہ کھینچتا ہوا لے جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔ اگر اسکی ماں نے اس کی موت پر ثواب کی پختہ امید رکھی ہو۔ (مشکوٰۃ ص ۱۵۳)

مومن بندوں کے لئے تکالیف اور مَصائب کوئی گھبرانے اور پریشان ہونے کی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ تو اس کے لئے خیر ہی خیر ہے۔ فانی دنیا میں تھوڑی بہت تکلیفیں پہنچ گئیں اور آخرت کے مواخذہ سے بچ گیا اور وہاں کی نعمتوں سے مالا مال ہو گیا تو اس کے حق میں یہ سراسر بہتر ہی بہتر ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ مصیبت اور تکلیف دور ہونے کی دعا نہ کرے کیونکہ دعا بھی سنت ہے۔ اور ہمیشہ اللہ سے عافیت کا سوال کرے۔ مصیبت' تکلیف اور مرض کا سوال بھی نہ کرے' آجائے تو صبر کرے۔

صابرین کی ایک خاص صفت

یہ فرمانے کے بعد کہ ہم تم کو ضرور ضرور آزمائیں گے۔ صابرین کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (صبر کرنے والوں کو بشارت دے دو) پھر انکی صفت بیان فرمائی۔ اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب اُنکو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہتے ہیں۔ یہ کلمہ بہت سے

حقائق کو اپنے اندر سموئے ہوئے اور اس میں بہت بڑی تسلی ہے۔ اس میں اول تو زبان اور دل سے اس بات کا اقرار ہے کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں جب ہم اللہ ہی کے بندے ہیں۔ اسکی مخلوق ہیں اس کی مملوک ہیں تو ہمیں پوری طرح اپنے خالق و مالک کے فیصلے پر راضی ہونا ضروری ہے۔ ہم بھی اللہ ہی کے ہیں اور جو جان و مال اس نے لے لیا وہ بھی اللہ ہی کا ہے اس نے جو کچھ کیا اپنی مخلوق اور مملوک میں تصرف کیا۔ کسی کو بولنے اعتراض کرنے دل اور زبان سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ایک صاحبزادی کا بچہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ انہوں نے آپ کی خدمت میں خبر بھیجی اور تشریف لانے کی گزارش کی۔ آپ نے اُن کو سلام کہلوایا اور فرمایا: اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلَهٗ مَا اَعْطٰى وَكُلٌّ عِنْدَهٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ (کہ بلاشبہ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ اس نے لیا اور اُسی کے لئے ہے جو اس نے عطا فرمایا اور ہر ایک کی اُس کے نزدیک اجل مقرر ہے۔ لہٰذا صبر کر اور اللہ سے ثواب کی اُمید رکھ۔ (بخاری)

دوسرے اس بات کا اعلان اور اقرار ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچیں گے تو ہم کو ہر ضائع اور فوت شدہ چیز کا ثواب مل جائے گا۔ اور یہ ثواب دنیا کی حقیر چیزوں سے کہیں اعلیٰ و افضل ہے جن کے چلے جانے پر رنج ہوتا ہے۔ اپنے اعزہ و اقرباء آل اولاد جو فوت ہو گئے ان سے بھی عارضی جدائی ہے۔ جہاں وہ گئے وہیں ہم کو جانا ہے۔ وہاں دار النعیم میں ان شاء اللہ تعالیٰ اُن سے مُلاقاتیں ہو جائیں گی۔

سُنن ترمذی۔ میں ہے کہ جب بندہ کا کوئی بچہ فوت ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندہ کے بچے کو قبض کر لیا وہ کہتے ہیں کہ ہاں! پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم نے اس کے دل کے پھل کو قبض کر لیا وہ کہتے ہیں کہ ہاں! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندہ نے کیا کہا۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ اس نے آپ کی تعریف کی اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ پڑھا اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندہ کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اُس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ مسلمان مرد یا عورت کو جو بھی کوئی تکلیف پہنچ جائے۔ اور اسکو بعد میں یاد کرے اگرچہ اس کو عرصہ دراز گزر چکا ہو۔ اور اُس وقت پھر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو پھر اُسی جیسا اجر عطا فرماتے ہیں جیسا کہ اُس دن عطا فرمایا تھا جس دن اُس کو مصیبت پہنچی تھی۔ (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان کما فی المشکوٰۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تب بھی اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھے۔ کیونکہ یہ بھی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت ہے۔
(رواہ المشکوٰۃ عن شعب الایمان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا تو اللہ تعالیٰ اُسکی مصیبت کی تلافی فرما دیں گے اور اسکی آخرت اچھی کریں گے اور اسے ضائع شدہ چیز کے بدلہ اچھی چیز عطا فرمائیں گے۔ (درِ منثور)

صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ : صابرین کی صفت بیان فرمانے کے بعد (کہ جب اُن کو مصیبت پہنچتی ہے تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہتے ہیں) ان کے لئے جو بشارت ہے اس کا ذکر فرمایا اور وہ یہ کہ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ

14

صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ.

لفظ صَلَوٰت صلوٰۃ کی جمع ہے صلوٰۃ رحمت کو کہتے ہیں۔ اور صَلَوٰت کے ساتھ لفظ رحمت بھی مذکور ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ لفظ رحمت بطور تاکید کے لایا گیا ہے۔ و كرّر الرحمة لما اختلف اللفظ تاكيدا او اشباعا للمعنى (قرطبی)

مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف لفظ صلاۃ کی نسبت ہو تو اس سے تزکیہ اور مغفرت مراد ہوتی ہے اور اس کو جمع لانے میں اُسکی کثرت پر اور اسکی مختلف انواع پر تنبیہ فرمائی اور رحمت سے مراد لطف اور احسان ہے۔ (ص ۱۱۷ ج ۱) بعض حضرات نے فرمایا کہ صلوٰۃ سے عام مہربانیاں اور رحمت سے خاص رحمت مراد ہے۔ رحمتوں کا انعام ذکر کرنے کے بعد فرمایا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ کہ صابرین جو مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی قضا پر دل اور زبان سے رضامندی ظاہر کر کے اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھ کر حق اور ثواب کی راہ پانے والے ہیں۔ (بیضاوی ص ۱۱۸ ج ۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ صابرین کے لئے صلوات اور رحمت کے وعدہ کے ساتھ ہی جو اُن کو ہدایت یافتہ بتایا اور اُن کی شان میں المھتدون فرمایا۔ یہ زائد چیز بھی بہت عمدہ ہے۔ رحمتوں کا وعدہ بھی اور ہدایت پر ہونے کا اعلان بھی یہ سب کچھ نفع ہی نفع ہے اور خیر ہی خیر ہے۔

صبر سے متعلق چند فوائد

فائدہ: (۱) اس دنیا کا یہ مزاج ہے کہ دُکھ تکلیف کا ہر ایک کو سامان کرنا پڑتا ہے۔ اور نہ آرام ہمیشہ رہتا ہے اور نہ تکلیف ہمیشہ رہتی ہے۔ مومن بندے صبر اور شکر کو اختیار کرتے ہیں۔ جو لوگ صبر نہیں کرتے اجر سے محروم ہوتے ہیں۔ شدہ شدہ کچھ دن کے بعد ان کو بھی صبر آ ہی جاتا ہے اور مصیبت کو بھول جاتے ہیں لیکن اس صبر کا کوئی اعتبار نہیں اجر و ثواب اور فضیلت اُسی صبر کے متعلق ہے جو عین مصیبت کے وقت ہو۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ابن آدم اگر تو صدمہ اُولیٰ کے وقت صبر کرے اور ثواب کی امید باندھے تو میں تیرے لئے جنت کے علاوہ کسی دوسرے ثواب سے راضی نہ ہوں گا۔ (یعنی تیرے صبر اور احتساب کا بدلہ جنت ہی ہے) (رواہ ابن ماجہ)

(صحیح بخاری ص ۱۷۱ ج ۱) اور (صحیح مسلم) میں ایک قصہ لکھا ہے جو حضرت اُنس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عورت پر گزر ہوا وہ ایک قبر کے پاس رو رہی تھی آپ نے اس سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر اور صبر کر اس عورت نے آپ کو پہچانا نہیں' کہنے لگی کہ ہٹو مجھے چھوڑ دو کیونکہ تمہیں وہ مصیبت نہیں پہنچی ہے جو مجھے پہنچی ہے۔ (اگر تمہیں ایسی مصیبت پہنچتی تو پتہ چلتا کیسی مصیبت ہے اسکے بعد آپ تشریف لے گئے) اس عورت سے کسی نے کہا کہ (تجھے معلوم ہے کس کو تو نے بے ڈھنگا جواب دیا ہے) آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ یہ سن کر وہ عورت بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئی دروازہ پر پہنچی تو وہاں دربان (چوکیدار) نہ پائے (حالانکہ اس کو خیال تھا کہ آپ بہت ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہوں گے اور آپ کے دروازہ پر بادشاہوں کی طرح دربان ہوں گے یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئی کہ سید الخالق صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی سادہ زندگی ہے) کہنے لگی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ کو پہچانی نہیں (اس لئے ایسا جواب دیا) آپ نے فرمایا اصلی صبر وہی ہے جو تازہ تازہ مصیبت کے موقعہ پر ہو (کیونکہ وقت گزر جانے پر خود ہی صبر آ جاتا ہے)۔

اس حدیث میں اسی خاص نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن وحدیث میں جو صبر کی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں۔ اُس سے وہ صبر مراد ہے جو عین مصیبت اور تکلیف کے وقت ہو نیا نیا حادثہ ہے ابھی ابھی کسی کی موت ہوئی ہے یا رقم کھوگئی ہے دل رنجیدہ ہے اس وقت اگر ہم نے صبر کر لیا تو اس صبر کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ بلکہ حقیقت میں صبر ہی وہ ہے جو دل دکھا ہوا ہونے کے وقت ہو کیونکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے مصیبت کا احساس طبعی طور پر کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کچھ دن کے بعد تکلیف کا بالکل احساس نہیں رہتا۔ وقت گزر جانے پر جب مصیبت بھول بھلیاں ہوگئی تو یہ نہ صبر ہے اور نہ اسکی کوئی فضیلت ہے اس میں مومن کافر سب برابر ہیں۔ جس صبر پر مومن سے اجر کا وعدہ ہے اس سے وہی صبر مراد ہے جو اس وقت ہو جب کہ رنج تازہ ہو دل بے چین ہو طبیعت بے قرار ہو۔ بُرے بُرے وسوسے آرہے ہوں۔ زبان اللہ پاک پر اعتراض کرنے کے لئے کھلنا چاہتی ہو۔ نفس خلاف شرع کاموں پر اُبھارتا ہو۔ ایسی حالت میں صبر کرنا باعثِ اجر ہے۔

فائدہ: (۲) کسی کی موت پر دل کا رنجیدہ ہونا یا آنکھوں سے آنسو آجانا۔ یا زبان سے رنج اور تکلیف کا اظہار کر دینا یہ بے صبری نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں (ص ۱۷۴ج ۱) ہے کہ حضور اقدس ﷺ اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی جانکنی کے وقت تشریف لائے اس وقت آپکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) (عام لوگ تو بچوں کی موت پر روتے ہی ہیں) بھلا آپ بھی رونے لگے آپ نے فرمایا یہ طبعی رحمت ہے (جو اللہ پاک نے دل میں رکھی ہے) پھر فرمایا کہ بے شک آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور دل غم زدہ ہے اور زبان سے ہم وہی کہتے ہیں جس سے ہمارا رب راضی ہو پھر فرمایا اے ابراہیم تمہاری جدائی سے ہم کو رنج ہے۔

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسوؤں اور دل کے رنج پر عذاب نہیں دیتا لیکن وہ زبان کی وجہ سے عذاب دیتا ہے یا رحم فرماتا ہے۔ یعنی زبان سے بُرے کلمات کہنے اور اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنے پر گرفت اور عذاب ہے۔ اور اگر یوں کہا کہ میں اللہ کی قضا اور قدر پر راضی ہوں اس نے جو کچھ کیا بہتر ہے تو اسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے۔

فائدہ: (۳) جس طرح زبان سے بُرے کلمات نکالنا ممنوع ہے اور بے صبری ہے اسی طرح عمل سے کوئی ایسی حرکت کرنا جو صبر کے خلاف ہے یا غیر مسلموں کا طریقہ ہے اس کو اختیار کرنا بھی سخت ممنوع ہے۔ لوگوں کی عادت ہے کہ مُصیبت' دُکھ' تکلیف کے وقت خاص کر جب کوئی بچہ فوت ہو جائے اپنے چہرے پر طمانچے مارتے ہیں۔ دیوار پر سر دے کر مارتے ہیں گریبان پھاڑتے ہیں جاہلانہ الفاظ زبان سے نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرا ہی بچہ رہ گیا تھا اُسے اللہ نے موت دی۔ یہ سب جہالت ہے اور اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا کفر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے جو رُخساروں پر طمانچے مارے اور گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی دُہائی دے۔ (صحیح مسلم)

بعض علاقوں میں مرنے والے کے سوگ میں بال مُنڈوا دیتے ہیں اور خاص کر عورتیں تو بہت ہی چیختی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس سے بری ہوں جو (کسی کی موت پر) سر مونڈے' آوازیں بلند کرے اور کپڑے پھاڑے۔ (صحیح مسلم)

عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ عزیزوں کی موت پر چیختی ہیں اور چلاتی ہیں۔ گھر سے باہر آوازیں جاتی ہیں اور برس چھ مہینے تک جو بھی کوئی مہمان آئے اُس کے سامنے زبردستی کا رونا لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور نوحہ کرنا ان کی ایک خاص عادت ہے۔ میت کو خطاب کر کے کہتی ہیں اے میرے پیارے اے میرے جوان اے بیٹا تو کہاں گیا۔ مجھے تو کس پر چھوڑے تو ایسا تھا ویسا تھا۔ اور اس طرح کی

بہت سی باتیں پکار پکار کر بیان کرتی ہیں اور رونا پیٹنا مہینوں تک کے لئے اُن کا مشغلہ بن جاتا ہے۔ باوجود منع کرنے کے اور شرعی ممانعت کے جاننے کے نوحہ کرتی رہتی ہیں۔ حدیث شریف میں ہے **لعن اللہ النائحۃ والمسمعۃ** کہ اللہ کی لعنت ہو نوحہ کرنے والی پر اور اس کا نوحہ سننے والی پر (رواہ ابوداؤد) حضور اقدس ﷺ نے نوحہ کرنے والی پر لعنت فرمائی اور ساتھ ہی نوحہ سننے والی پر بھی (کیونکہ نوحہ کرنے والی کا نوحہ سننے کے لئے جو عورتیں جمع ہوں وہ بھی نوحہ کا سبب بنتی ہیں۔ عموماً نوحہ کرنے والی عورت تنہائی میں نوحہ نہیں کرتی) (صحیح مسلم ص ۳۰۳) میں ہے کہ نوحہ کرنے والی موت سے پہلے توبہ نہ کرے گی تو قیامت کے دن اس حال میں کھڑی کی جائے گی کہ اس کے بدن میں ایک کرتہ قطران کا ہوگا اور ایک کرتہ کھجلی کا ہوگا۔

عرب میں قطران ایک درخت کا پانی ہوتا تھا جس کو کھجلی والے بدن پر لگاتے تھے اسکی خاصیت تیزاب جیسی تھی اس سے کھجلی جل جاتی تھی اور کھجلی جل کر آرام ہو جاتا نوحہ کرنے والی کے جسم پر قیامت کے دن اول تو کھجلی مسلّط کی جائے گی۔ دنیا میں رواج ہے کہ جب کسی کو ایگزیما اور داد ہو جاتا ہے تو اس پر تیزاب لگا دیتے ہیں۔ اس سے جو تکلیف ہوتی ہے بیان سے باہر ہے اور یہ تکلیف دنیا میں ہوتی ہے آخرت کی تکلیف دنیا کی تکلیفوں سے کہیں زیادہ ہے (العیاذ باللہ) پھر دنیا میں جو تیزاب لگاتے ہو اُس سے ایگزیما اور داد اچھا ہو جاتا ہے لیکن آخرت میں چونکہ عذاب دینا مقصود ہوگا۔ اس لئے قطران لگا ہوا ہونے سے کھجلی نہیں جائے گی بلکہ اور شدید تکلیف ہوتی رہے گی۔

فائدہ: (۴) **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ** کے ساتھ ایک اور دُعا بھی حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا تھا کہ جس کسی مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچ جائے اور وہ اللہ جل شانہٗ کے فرمان کے مطابق **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ** پڑھے اور ساتھ ہی یہ بھی پڑھے: **اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَاخْلُفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْھَا**. (اے اللہ میری مصیبت میں اجر عطا فرما اور اس کا بدلہ مجھے اس سے بہتر عنایت فرما)۔ تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کو اس سے بہتر عطا فرمائے گا۔ جب اُبوسلمہ کی وفات ہوگئی تو میں نے (دل میں) کہا کہ ابوسلمہ سے بہتر کون سا مسلمان ہوگا؟ اس کا گھرانہ پہلا گھرانہ ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کی۔ پھر بھی میں نے مذکورہ دُعا پڑھ لی لہٰذا مجھے اللہ تعالیٰ نے ابوسلمہ کے بدلہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی عطا فرما دی۔ (یعنی آپ سے نکاح ہوگیا) اور آپ اُبوسلمہ سے بہتر ہیں۔ (صحیح مسلم)

فائدہ: (۵) یہاں تک جو متعدد احادیث کا ترجمہ لکھا گیا اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے دنیاوی تکالیف اور مصائب امراض و آلام سب نعمت ہیں ان کے ذریعہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ درجات بلند ہوتے ہیں اور گناہوں کا کفارہ ہو جانے کی وجہ سے برزخ اور روز قیامت کے عذاب سے حفاظت ہو جاتی ہے۔ مومن بندوں پر لازم ہے کہ صبر و شکر کے ساتھ ہر حال کو برداشت کرتے چلیں اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی بہت زیادہ پختہ اُمید رکھیں اور یقین جانیں کہ ہمارے لئے صحت و عافیت بھی خیر ہے اور دُکھ تکلیف بھی بہتر ہے۔ اصل تکلیف تو کافر کی تکلیف ہے اُسے تکلیف بھی پہنچی اور ثواب بھی نہ ملا۔ مومن کی تکلیف، تکلیف نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مصیبت و تکلیف اور مرض کی دعاء کیا کریں یا شفاء کی دعا نہ مانگیں۔ کیونکہ جس طرح صبر میں ثواب ہے شکر میں بھی ثواب ہے۔ سوال تو عافیت ہی کا کریں اور کرتے رہیں اور تکلیف پہنچ جائے تو صبر کریں۔

فائدہ: (۶) بہت سے لوگ جو آرام و راحت اور دکھ تکلیف کی حکمت اور اس بارے میں قانون الٰہی کو نہیں جانتے

بہت سی بے تکی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ جہان کی ساری مصیبتیں مسلمانوں پر ہی آ پڑی ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ کافروں کو محلات اور قصور اور مسلمانوں کو صرف وعدۂ حور کبھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غیروں کو خوب نوازا ہے اور اپنوں کو فقر و فاقہ اور دوسری مصیبتوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ جاہل اتنی بات نہیں جانتے کہ اپنا ہونے ہی کی وجہ سے تو مسلمانوں کو تکلیفوں میں مبتلا فرمایا جاتا ہے تاکہ ان کے گناہ معاف ہوں۔ درجات بلند ہوں۔ اور آخرت میں گناہوں پر سزا نہ ہو در حقیقت یہ بہت بڑی مہربانی ہے کہ دنیا کی تھوڑی بہت تکلیف میں مُبتلا فرما کر آخرت کے شدید عذاب سے بچا دیا جاتا ہے' اور کافروں کو چونکہ آخرت میں کوئی نعمت نہیں ملنی۔ کوئی آرام نصیب نہیں ہونا بلکہ ان کے لئے صرف عذاب ہی عذاب ہے۔ اس لئے ان کو دنیا زیادہ دے دی جاتی ہے اور اُن پر مصیبتیں کم آتی ہیں۔ اگر کسی کافر نے خدمت خلق وغیرہ کا کوئی کام کیا تو اس کا عوض اس دنیا میں دے دیا جاتا ہے۔ لیکن آخرت میں اُسے ذرا سی بھی خیر اور معمولی سا بھی آرام نہ ملے گا۔ اور ابد الاباد تک دوزخ میں رہے گا۔ صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انہوں نے بیان فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ چٹائی اور آپ کے جسم کے درمیان کوئی بستر نہیں ہے۔ چٹائی کی بناوٹ نے آپ کے مُبارک پہلوں میں نشان ڈالدیئے ہیں۔ آپ ایسے تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے ہیں جو چمڑے کا ہے۔ جس کے اندر کھجور کی چھال بھری ہوئی ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ اللہ سے دعا کیجئے اللہ تعالیٰ آپ کی اُمت کو خوب مال دیدے۔ کیونکہ فارس اور روم میں لوگوں کو وسعت دی گئی ہے اور وہ اللہ کی عبادت بھی نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابن خطاب کیا تم (ابھی تک) اسی (سوچ بچار) میں پڑے ہو (تمہیں معلوم نہیں) کہ ان لوگوں کو عمدہ چیزیں اس دنیا میں دے دی گئی ہیں (آخرت میں اُن کو کچھ نہیں ملنا) ایک روایت میں ہے کہ آپ نے یوں فرمایا کیا تم اُس پر راضی نہیں ہو کہ ان کے لئے دنیا اور ہمارے لئے آخرت ہو۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ سو جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے اُس پر اس بات میں ذرا بھی گناہ نہیں

عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۸﴾

کہ ان دونوں کے درمیان آنا جانا کرے اور جو شخص خوشی سے کوئی نیک کام کرے تو اللہ تعالیٰ قدردان ہے جاننے والا ہے

حج وعمرہ میں صفا مروہ کے درمیان سعی کرنیکی مشروعیت اور اس کی ابتداء

تفسیر: شعائر شعیرۃ کی جمع ہے جس کے معنی علامت کے ہیں صفا اور مروہ مکہ معظمہ میں دو پہاڑیاں ہیں جو کعبہ شریف سے تھوڑے سے فاصلے پر واقع ہیں ان میں صفا بہ نسبت مروہ کے کعبہ شریف سے زیادہ قریب ہے' حج اور عمرہ میں سات مرتبہ ان دونوں پر آنا جانا ہوتا ہے۔ اس کو سعی کہا جاتا ہے یہ حج اور عمرہ دونوں میں واجب ہے اللہ تعالیٰ شانہٗ نے صفا اور مروہ کو شعائر اللہ میں سے فرمایا جس کا معنی یہ ہے کہ یہ دونوں اللہ کے دین کی نشانیوں میں سے ہیں۔ ان کے درمیان سعی کی جاتی ہے جو مناسک حج میں سے ہے اور حج اسلام کے پانچ ارکان میں سے ہے اس اعتبار سے دین اسلام میں ان دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان آنے جانے کی ابتداء کس طرح ہوئی اس کا واقعہ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح بخاری ص ۴۷۵ ج ۱ میں اس طرح نقل کیا ہے کہ بحکم خداوندی حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو مکہ معظمہ میں چھوڑ کر تشریف لے گئے (جو اس وقت چٹیل میدان تھا) انکے پاس ایک تھیلہ میں کچھ کھجوریں اور مشکیزہ میں پانی رکھ دیا۔ جب واپس ہونے لگے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ انکے پیچھے ہولیں۔ اور کہنے لگیں کہ اے ابراہیم ہمیں یہاں چھوڑ کر آپ کہاں جا رہے ہیں؟ یہاں نہ کوئی انسان ہے نہ اور کوئی چیز ہے کئی بار اُنہوں نے یہی سوال کیا وہ سوال کر رہی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی طرف توجہ نہیں فرما رہے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ نے سوال کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ انہوں نے فرمایا ہاں' وہ کہنے لگیں بس تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لے گئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ اپنے بچہ اسماعیل کو دودھ پلاتی رہیں اور جو پانی موجود تھا اس میں سے پیتی رہیں' مشکیزہ میں جو پانی تھا جب وہ ختم ہو گیا تو خود بھی پیاسی ہو گئیں اور بچہ بھی پیاسا ہو گیا۔ وہ بچہ کو تڑپتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ جب اسکی حالت نہ دیکھی جا سکی تو صفا پہاڑی پر چڑھ گئیں تا کہ بچہ پر نظر نہ پڑے۔ صفا پر کھڑے ہو کر نظر ڈالی کہ کوئی شخص نظر آتا ہے یا نہیں' وہاں کوئی نظر نہ آیا تو صفا سے اُتر کر مروہ کی طرف چلیں' درمیان میں نشیب تھا وہاں پہنچیں تو تیزی کے ساتھ دوڑ کر گزر گئیں۔ مروہ پر پہنچ کر پھر نظریں ڈالیں کہ کوئی شخص نظر آتا ہے یا نہیں' وہاں بھی کوئی نظر نہ آیا۔ سات مرتبہ ایسا ہی کیا (کبھی صفا پر جاتیں کبھی مروہ پر) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہاں تک پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا کہ اسی وجہ سے لوگ صفا مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں (یعنی یہ سعی کی ابتداء ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کے عمل کو حج و عمرہ کی عبادت کا جزو بنا دیا) جب آخری مرتبہ مروہ پر تھیں تو اُنہوں نے ایک آواز سنی' آواز سنکر اپنے نفس کو خطاب کر کے کہنے لگیں کہ مطمئن ہو جا۔ اس کے بعد انہوں نے کان لگایا تو پھر آواز سنی' آواز سن کر کہنے لگیں (کہ اے بولنے والے) تو نے آواز تو سنا دی اگر تیرے پاس کوئی مدد کی صورت ہے تو ہماری مدد کر دے' اچانک کیا دیکھتی ہیں کہ جس جگہ زمزم ہے وہاں فرشتہ نے اپنی ایڑی سے تھوڑی سی زمین کریدی۔ یہاں تک کہ زمین پر پانی ظاہر ہو گیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ نے وہاں حوض کی صورت بنانی شروع کر دی اور اس میں سے اپنے مشکیزہ میں پانی بھر لیا۔ مشکیزہ میں بھرنے کے بعد بھی پانی جوش مار رہا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ رحم فرمائے اسماعیل کی والدہ پر اگر وہ زم زم کو (اپنے حال پر) چھوڑ دیتیں تو زمزم (زمین پر) جاری ہونے والا چشمہ ہوتا۔ اب انہوں نے اس میں سے پانی پیا اور بچہ کو دودھ پلایا۔ اور فرشتے نے ان سے کہا کہ تم ضائع ہونے سے نہیں ڈرنا کیونکہ یہاں بیت اللہ ہے جسے یہ لڑکا اور اس کا والد دونوں مل کر تعمیر کریں گے۔ فرشتہ نے یہ بھی کہا بلا شبہ اللہ اپنوں کو ضائع نہیں فرماتا۔ (اس کے بعد بخاری شریف میں وہاں بنی جرھم کے آباد ہونے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اسی قبیلہ میں شادی ہونے کا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تشریف لانے کا اور کعبہ شریف تعمیر کرنے کا ذکر ہے) اللہ تعالیٰ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ کا صفا مروہ کے درمیان آنا جانا ایسا پسند آیا کہ حج عمرہ کرنیوالوں کے لئے اس کو احکام حج عمرہ میں داخل فرما دیا۔ اللہ کی راہ میں قربانی والوں کی عجیب شان ہوتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں صفا مروہ کی سعی

صحیح بخاری ص ۲۴۶ ج ۲ میں حضرت عاصم بن سلیمان سے نقل کیا ہے۔ کہ ہم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صفا مروہ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ اُن پر آنے جانے کو جاہلیت کے کاموں میں سے سمجھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو ہم ان پر جانے سے رُک گئے اللہ تعالیٰ نے آیت إن الصفا والمروة الاية نازل فرمائی (صحیح مسلم) میں اس

بارے میں متعدد روایات درج ہیں ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں انصار منات کے لئے احرام باندھتے تھے (جو ایک مشہور و معروف بت تھا) جب اُس کے لئے احرام باندھتے تو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کو حلال نہیں سمجھتے تھے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لئے آئے تو اُنہوں نے آپ سے اس کا ذکر کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یہ بیان فرما کر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ اس کا حج پورا نہیں کرے گا جس نے صفا مروہ کے درمیان سعی نہ کی' (صحیح بخاری) میں اُبو بکر بن عبدالرحمٰن کا بیان نقل کیا ہے میں نے متعدد اہل علم سے سنا ہے کہ عام طور پر زمانہ جاہلیت میں لوگ صفا مروہ کی سعی کیا کرتے تھے۔ سوائے ان لوگوں کے جن حضرت عائشہؓ نے ذکر فرمایا (کہ جو لوگ منات کے لئے احرام باندھتے تھے وہ صفا مروہ پر آنے جانے سے بچتے تھے) جب قرآن مجید میں طواف بیت اللہ کا حکم آیا (جو سورۂ حج میں ہے) اور صفا مروہ کا ذکر نہیں آیا تو لوگوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم صفا مروہ پر آیا جایا کرتے تھے اور یہ جاہلیت کے زمانہ کی بات تھی۔

اللہ تعالیٰ نے طواف کے بارے میں حکم نازل فرمایا ہے اور صفا مروہ کا ذکر نہیں فرمایا تو کیا اس بات میں کچھ حرج ہے کہ ہم صفا مروہ پر آنا جانا کریں' اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (آخر تک) نازل فرمائی۔ اس کے بعد ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے فرمایا کہ آیت بالا دونوں فریقین کے بارے میں نازل ہوئی جو لوگ زمانہ جاہلیت میں صفا مروہ پر نہیں جاتے تھے ان کے بارے میں بھی اور جو لوگ زمانہ جاہلیت میں صفا مروہ پر جاتے تھے پھر زمانہ اسلام میں جانے کو پسند نہ کیا ان کے بارے میں بھی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں اس بارے میں لمبی بحث کی ہے اور روایات میں تطبیق دینے کی کوشش فرمائی ہے۔

نسائی نے نقل کیا ہے کہ صفا اور مروہ پر تانبہ کے دو بت تھے۔ ایک کا نام اساف اور دوسرے کا نام نائلہ تھا مشرکین (حج یا عمرہ میں صفا مروہ پر جاتے تھے تو ان کو ہاتھ لگاتے تھے) حضرت شعبی سے منقول ہے کہ ایک بت صفا پر تھا جس کا نام اساف تھا اور ایک بت مروہ پر تھا جس کا نام نائلہ کہا جاتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ صفا مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے۔ جب اسلام کا زمانہ آیا تو ان دونوں کو پھینک دیا گیا اب مسلمان کہنے لگے کہ صفا مروہ پر آنا جانا جاہلیت والوں کا کام ہے جو اپنے بتوں کی وجہ سے ان پر آتے جاتے تھے لہٰذا ان دونوں کے درمیان سعی کرنے سے رُک گئے اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی۔

حضرت عائشہؓ کا علمی جواب

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے حضرت عروہ نے حضرت عائشہؓ سے سوال کیا کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا. اس میں لفظ لَا جُنَاحَ سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جو شخص صفا مروہ کی سعی نہ کرے تو کچھ حرج نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اے میری بہن کے بیٹے اگر بات اس طرح ہوتی جیسے تم کہہ رہے ہو تو آیت کے الفاظ یوں ہوتے لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا (یعنی اس پر کوئی گناہ نہیں جو صفا مروہ پر آنا جانا نہ کرے) آیت میں تو یوں ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں جو صفا مروہ پر آنا جانا کرے' پھر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی جو صفا مروہ پر جانے سے رکتے تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ اب صفا مروہ پر جائیں یا نہ جائیں تو اس پر یہ آیت اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ (صفا مروہ پر

جانے میں کچھ حرج نہیں ہے) پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ صفا مروہ کی سعی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع فرمایا ہے۔ کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ ان دونوں کے درمیان سعی چھوڑ دے۔ (صحیح بخاری)

سعی کے مسائل

مسئلہ: صفا مروہ کی سعی طواف کے بغیر معتبر نہیں ہے۔ حج کی سعی طواف قدوم کے بعد بھی ہو سکتی ہے اور طواف زیارت کے بعد بھی اور طواف زیارت کے بعد سعی کرنا افضل ہے۔ البتہ جس کا حج قران ہو اُسے طواف قدوم کے بعد کرنا افضل ہے۔

مسئلہ: پہلے زمانہ میں صفا مروہ کے درمیان ایک جگہ نشیب تھا۔ حضرت اسمٰعیل کی والدہ وہاں سے دوڑ کر گزری تھیں اس لئے حج وعمرہ میں سعی کرنے والے بھی اس جگہ دوڑ کر گزرتے ہیں۔ اب نشیب نہیں ہے زمین برابر ہموار ہے اُوپر چھت پڑی ہوئی ہے اس جگہ کی نشانی کے لئے ہرے ستون بنا دیئے گئے ہیں۔ ایک ہرے ستون سے دوسرے ہرے ستون تک دوڑ کر چلنا مسنون ہے۔

مسئلہ: سعی کے صرف سات چکر ہیں۔ صفا سے مروہ تک ایک چکر اور مروہ سے صفا تک دوسرا چکر ہوتا ہے اسی طرح سات چکر پورے کئے جائیں، صفا سے شروع کر کے مروہ پر سعی ختم کی جائے۔

مسئلہ: سعی خود کرنا واجب ہے اس میں نیابت نہیں ہو سکتی۔ (الا یہ کہ کوئی شخص احرام سے پہلے بے ہوش ہو جائے تو دوسرا شخص اسکی طرف سے احرام باندھ لے اور مکہ معظمہ پہنچ کر اسکی طرف سے طواف قدوم اور سعی کرے تو یہ صحیح ہے بشرطیکہ اس سے پہلے اسے ہوش نہ آیا ہو)

مسئلہ سعی پیدل کرنا لازم ہے اگر کسی نے بلا عذر سواری پر سعی کی اور پھر اعادہ نہیں کیا یعنی دوبارہ نہیں کی تو دم واجب ہوگا۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص سعی چھوڑ کر مکہ معظمہ سے چلا گیا تو اسکی تلافی کے لئے ایک دم واجب ہوگا۔

مسئلہ: ہرے ستونوں کے درمیان تیزی سے چلنا صرف مردوں کے لئے ہے عورتوں کے لئے نہیں (کیونکہ انکی طرف سے ان کی جنس کی ایک عورت یہ کام کر چکی اور اُسی کے عمل کی تو یہ نقل ہے جو حج اور عمرہ کا جزو بنا دی گئی ہے)

آیت کے اخیر میں فرمایا: وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ۔ کہ جو بھی شخص کوئی اچھا کام اپنی خوشی سے کر دے (جو اس پر فرض واجب نہ ہو) تو اللہ تعالیٰ اس کا بھی ثواب دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اعمالِ صالحہ کی قدر دانی فرماتے ہیں اور جو شخص کوئی عمل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اسکی پوری طرح خبر ہے۔ خیر وشر کا کوئی ذرّہ اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اُن چیزوں کو جو ہم نے نازل کیں جو واضح چیزیں ہیں اور ہدایت کی باتیں ہیں بعد اس کے کہ ہم نے اس کو لوگوں کے لئے

فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا

کتاب میں بیان کیا یہ چھپانے والے وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت فرماتا ہے۔ اور ان پر لعنت بھیجتے ہیں لعنت کرنے والے سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی

وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

اور بیان کیا سو یہ وہ لوگ ہیں میں جن کی توبہ قبول کروں گا۔ اور میں، بہت توبہ قبول کرنے والا ہوں۔ رحیم ہوں

حق چھپانے والوں کی سزا

تفسیر: علامہ واحدی نے اسباب النزول میں لکھا ہے کہ یہ آیت علماء اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی۔ جنہوں نے آیت رجم کو چھپایا اور آنحضرت ﷺ کی صفات کو (جو توریت شریف میں پڑھتے آئے تھے) پوشیدہ رکھا۔ تفسیر درمنثور میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبل اور بعض دیگر انصار نے بعض علماء یہود سے توریت کی بعض باتیں دریافت کیں تو انہوں نے بتانے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی نیز درمنثور میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابوالعالیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اہل کتاب کا ذکر ہے جنہوں نے حسد کی وجہ سے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور آپ کی نعت کا کتمان کیا (یعنی اس بات کو بھی چھپایا کہ توریت شریف میں آپ کی بعثت کا ذکر ہے اور آپ کی نعت اور صفت جو توریت شریف میں مذکور تھی اس کو بھی پوشیدہ رکھا) حالانکہ وہ یہ سب کچھ اپنے پاس لکھا ہوا پاتے تھے۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام پر جو کھلی کھلی آیات واضحہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں جن میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ بھی تھا۔ اس کو اُھل کتاب نے چھپایا اور پوشیدہ رکھا۔ پھر فرماتے ہیں کہ اَلْھُدٰی عطف ہے البیّنات پر اور اس سے عمومی طور پر ہدایت کی سب چیزیں مُراد ہیں۔ جن میں حضرت خاتم النبیین پر ایمان لانا اور آپ کا اتباع کرنا بھی شامل ہے۔ اور آیات اگرچہ اُھلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئیں لیکن ان کا حکم سب کے لئے عام ہے یعنی علم دین کا چھپانا ہر جاننے والے کیلئے گناہ ہے۔ (ص ۲۶-۲۷ ج ۲)

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اگر دو آیتیں نہ ہوتیں (جن میں علم چھپانے کی وعید مذکور ہے) تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا پھر اُنہوں نے مذکورہ بالا آیات تلاوت فرمائیں اور سُنن ابن ماجہ ص ۲۳ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کوئی ایسا علم چھپایا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دینی معاملہ میں نفع پہنچاتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس کے منہ میں آگ کی لگام لگائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی نازل فرمودہ آیات بینات اور ہدایت کے چھپانے والوں کے بارے میں فرمایا: اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ (کہ اللہ تعالیٰ اُن پر لعنت فرماتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں) لعنت کا معنی ہے رحمت سے دور کر دینا' اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے دور فرماتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی ان کے لئے بددعا کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہوں۔ تفسیر درمنثور (ص ۱۶۲ ج ۱) میں حضرت عطاء سے نقل کیا ہے کہ لعنت کرنے والوں سے جنات اور انسان اور زمین پر چلنے والے تمام جاندار مُراد ہیں پھر فرمایا: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا (الآیۃ) یعنی جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کر لی اور بیان کر دیا تو میں ان کی توبہ قبول کر لوں گا۔

حق چھپانے اور گمراہ کرنے والوں کی توبہ کی شرائط

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا ای رجعوا من الکتمان أو عنہ وعن سائر ما یجب أن یتاب عنہ۔ (یعنی وہ لوگ لعنت سے بچ جائیں گے جنہوں نے علم کے چھپانے سے اور ہر اُس عمل سے توبہ کی جس سے توبہ کرنا لازم ہے) پھر فرمایا وَاَصْلَحُوْا' اس کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں: اصلحوا ما افسدوا بالتدارک فیما

یتعلق بحقوق الحق والخلق ومن ذلک ان یصلحوا قومھم بالارشاد الی الاسلام بعد الاضلال وان یزیلوا الکلام المعرف ویکتبوا مکانہ ما کانوا ازالوہ عند التحریف۔ یعنی توبہ کرنے کے ساتھ اصلاح بھی کریں جو فساد کیا تھا اس کو دور کریں حق کے چھپانے کی وجہ سے خالق جل مجدہ اور مخلوق کے جو حقوق تلف ہوئے تھے ان کا تدارک کریں اور جن لوگوں کو گمراہ کیا تھا اُن کو اسلام قبول کرنے کی طرف دعوت دیں اور بتادیں کہ ہم نے تم کو حق سے روکا تھا حق یہ ہے کہ جو ہم اب کہہ رہے ہیں اور اللہ کی کتاب میں جو کچھ تحریف کی تھی اس کو دُرست کردیں۔ غلط کو ہٹادیں اور صحیح کو اس کے قائم مقام کر دیں۔ پھر فرمایا: وَبَيَّنُوْا اسکی تفسیر کرتے ہوئے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں۔ ای اظھر واما بینہ اللہ تعالٰی للناس معاینۃ (یعنی اللہ تعالیٰ شانہٗ نے جو کچھ بیان فرمایا تھا اور انہوں نے اُس کو چھپادیا تھا اب اُس کو خوب واضح طور پر بیان کریں)۔

نیز صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: وبھذین الامرین تتم التوبۃ۔ یعنی جن لوگوں نے حق کو چھپایا فساد کیا لوگوں کو گمراہی پر ڈالا ان کی توبہ اُسی وقت پوری ہوگی جب وہ اصلاح بھی کریں اور بیان بھی کریں۔ ان کے قول وفعل سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں اور عوام وخواص میں جو گمراہی پھیلی اسکی تلافی کریں جو حقوق تلف ہوئے ہیں ان کا تدارک کریں۔

یہ بات بہت اہم ہے جسکی طرف لوگوں کی بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ بہت سے آزاد خیال لوگ جو اہل حق کو چھوڑ کر خود رو مجتہد اور مجدد بن جاتے ہیں اور مصنف اور مضمون نگار ہونے کے زعم میں زور قلم دکھاتے ہیں ایسے لوگ اہل سنت والجماعت سے ہٹ کر اپنی راہ نکالتے ہیں اور اُسی کی اشاعت کرتے ہیں یہ لوگ اگر توبہ کرنے لگیں تو صرف تنہائی میں توبہ کرنا کافی نہیں ہے ان لوگوں پر لازم ہے کہ صاف صاف اعلان کریں اور عوام کو بتائیں کہ فلاں فلاں عقیدہ یا عمل کو جو ہم نے اہل السنّت والجماعت کے مسلک کے خلاف تبلیغ واشاعت کی ہے وہ غلط ہے۔ آجکل فتنوں کا دور ہے۔ بہت سے لوگ صریح کفر اختیار کرلیتے ہیں اور اس کی تبلیغ واشاعت بھی کرتے رہتے ہیں۔ پھر جب توبہ کرتے ہیں تو چپکے سے توبہ کر کے گھر میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر لازم ہے کہ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا۔ تینوں پر عمل کریں۔

فائدہ اولیٰ: جہاں علم دین کو چھپانا گناہ ہے۔ وہاں یہ بات بھی جان لینا ضروری ہے کہ جو شخص واقعی عالم ہو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے واقف ہو حلال حرام کا علم رکھتا ہو مسائل سے پوری طرح واقف ہو مسئلہ بتانے فتویٰ دینے کا مقام اُسی شخص کا ہے۔ غلط مسئلہ بتانے کا وبال بھی بہت زیادہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: من سئل من علم عَلِمہٖ ثم کتمہ اُلجم یوم القیامۃ بلجام من نار (کہ جس شخص سے علم کی بات پوچھی گئی جسے وہ جانتا تھا پھر اس نے اس کو چھپایا تو قیامت کے دن اُس کو آگ کی لگام لگائی جائے گی) (سنن الترمذی ابواب العلم)

اس میں لفظ عَلِمہٗ جو زیادہ فرمایا ہے یہ اس بات کو واضح کررہا ہے کہ جو شخص جانتا ہو بتانے کی ذمہ داری اُسی کی ہے بے علم اگر دینی بات بتانے کی جُرأت کرے گا تو گمراہی کے گڑھے میں گرے گا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو! جسے علم کی کوئی چیز معلوم ہو تو وہ اُسے بتادے اور جسے معلوم نہ ہو تو واللہ اعلم کہہ دے (یعنی اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہے) اس لئے کہ یہ بھی علم کی بات ہے کہ جو کچھ نہ جانتا ہو اُس کے بارے میں اللہ اعلم کہہ دے اور خواہ مخواہ اپنے پاس سے نہ بتادے اور بتکلف عالم نہ بنے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا ہے۔ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (آپ فرمادیجئے کہ میں تم سے اس پر کسی اُجرت کا سوال نہیں کرتا اور میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں)

اسی لئے علماء نے فرمایا کہ لا ادری نصف العلم (یعنی یہ کہہ دینا کہ میں نہیں جانتا یہ آدھا علم ہے) بہت سے ناقص العلم آدمیوں کو دیکھا جاتا ہے کہ اُن کے ہاں لا ادری کا خانہ ہی نہیں ہے ہر بات بتانے کو تیار ہیں اور علم پڑھے بغیر دینی کتابیں لکھتے ہیں غلط مسائل جمع کرتے ہیں اور یہ بھی دیکھا گیا کہ جب کسی اچھے علم والے ماہر مفتی سے کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو وہ ابھی غور ہی کر رہا ہے لیکن پاس کے بیٹھنے والے جاہلوں نے بتا کر بات ختم بھی کر دی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ دینی ذمہ داری اور آخرت کے مواخذہ کا احساس نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ اَجْرَءُ کُمْ عَلَی الْفُتْیَا اَجْرَءُ کُمْ عَلَی النَّارِ (یعنی تم میں جو شخص فتویٰ دینے میں زیادہ جَری ہے وہ دوزخ میں جانے پر زیادہ جرأت کرنے والا ہے) سنن الدارمی۔

درحقیقت قرآن کے معنی بتانا یا حدیث کی روایت کرنا یا مسئلہ بتانا بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ حضرت محمد بن المنکدر ر نے فرمایا کہ بلاشبہ عالم (جو علم کی باتیں بتاتا ہو) وہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ بن جاتا ہے۔ اب اس ذمہ داری سے نکلنے کا راستہ سوچے (سنن الدارمی) نکلنے کا راستہ یہ ہے کہ اٹکل سے اور بھرپور علم کے بغیر باتیں نہ بتائے اور جو کوئی بات معلوم نہ ہو صاف کہہ دے کہ مجھے معلوم نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کو کوئی فتویٰ دیا گیا۔ جو علم اور تحقیق کے بغیر تھا تو اس کا گناہ اُسی پر ہے جس نے اُسے فتویٰ دیا۔ (سنن دارمی) و (سنن ابوداؤد)

اول تو مسئلہ خوب تحقیق کے بعد بتائیں پھر بھی اگر غلطی ہو جائے تو اپنی غلطی کا اعلان کریں اور جسے فتویٰ دیا ہوا اُسے تلاش کریں اور بتائیں کہ ہم سے غلطی رہ گئی، صحیح مسئلہ یہ ہے۔

فائدہ ثانیہ: علم کی باتوں کو چھپانا گناہ ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت اور حدیث سے معلوم ہوا لیکن بتانے والے کو یہ بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ سائل جو کچھ پوچھ رہا ہے وہ اس کے جواب کو سمجھنے کا اہل ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر سمجھ بھی لے تو اس سے مطلب کیا نکالے گا اور لوگوں میں یہ بات مشہور ہو گی تو وہ اس کو سمجھ پائیں گے یا نہیں اور کسی فتنہ میں تو نہ پڑ جائیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو وہ باتیں بتاؤ جو جانتے پہچانتے ہوں (ان کی عقل و فہم سے اُونچی باتیں کرو گے تو وہ اللہ و رسول کی تکذیب کریں گے) کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اُس کے رسول کی تکذیب کی جائے (بخاری) حضور اقدس ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: من لقی اللہ لا یشرک بہ شیئا دخل الجنۃ (کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ اس نے شرک نہ کیا ہو تو جنت میں داخل ہو گا) انہوں نے عرض کیا لوگوں کو اس کی خوشخبری نہ دے دوں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، مجھے ڈر ہے کہ لوگ (اسی پر) بھروسہ کر بیٹھیں گے (اور اعمال چھوڑ دیں گے) (صحیح بخاری)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان الذی یفتی الناس فی کل ما یُستفتیٰ لمجنون۔ (جو شخص لوگوں کے ہر استفتاء کا جواب دے وہ دیوانہ ہے) (سنن دارمی ورواہ الطبرانی فی الکبیر کما فی جمع الفوائد)

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِکَةِ وَ النَّاسِ

بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور وہ اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر تھے سو یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی اور

اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

تمام لوگوں کی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی

کفر پر مرنے والوں پر لعنت اور عذاب

تفسیر: اس آیت شریفہ میں کفر پر مرنے والوں کی سزا کا ذکر ہے آیت کا عموم ان یہود کو بھی شامل ہے جو کفر پر جے رہے اور دوسروں کو بھی کفر پر جمائے رہے۔ حضور اقدس ﷺ کی نعت اور صفت کو چھپایا اور حق کو قبول نہ کیا اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیا' اور یہود کے علاوہ دوسرے تمام کفار نصاریٰ مشرکین منکرین خدا منکرین رسالت انبیاء علیہم السلام اور منکرین عقائد اسلامیہ اور منکرین ضروریات دین اور ختم نبوت کے منکر اور تمام ملاحدہ اور زنادقہ اور وہ لوگ جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا پھر کافر ہو گئے ان سب کو آیت کا عموم شامل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تمام کافر جو کفر پر مر جائیں اُن سب پر اللہ کی لعنت ہے اور سب فرشتوں کی اور سب انسانوں کی' گزشتہ آیت کی تفسیر میں بتا دیا گیا ہے کہ لعنت خدائے پاک کی رحمت سے دوری کو کہتے ہیں۔ سب سے بڑی دوری یہ ہے کہ دوزخ میں ہمیشہ کے لئے داخلہ ہو جائے کافروں کے لئے یہ سب سے بڑی لعنت ہے اس کے لئے خَالِدِیْنَ فِیْهَا فرمایا۔ حضرت ابو العالیہ نے اسکی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا خالدین فی جھنم فی اللعنۃ یعنی وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل ہوں گے اور لعنت میں رہیں گے۔ (درمنثور)

شاید کسی کے ذہن میں یہ خیال وارد ہو کہ کافر تو ایک دوسرے پر لعنت نہیں کرتے۔ پھر ان لوگوں کی لعنت کیسے ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اس دنیا میں لعنت نہیں کرتے مگر آخرت میں سب ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔ ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّیَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَّمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (یعنی پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے سے برگشتہ ہو جاؤ گے۔ اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا۔ اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہو گا اور تمہارا کوئی حمایتی نہ ہو گا)۔

سورۃ اعراف میں ہے: كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ (جب بھی کوئی جماعت دوزخ میں داخل ہو گی تو وہ دوسری جماعت پر لعنت بھیجے گی۔ یہاں تک کہ جب سب دوزخ میں ایک دوسرے کو پالیں گے تو بعد والے پہلے والوں کے بارے میں کہیں گے کہ اے ہمارے رب ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا لہٰذا ان کو آگ کا دوگنا عذاب دے)۔

اور سورۃ احزاب میں فرمایا: وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِیْرًا (اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم نے اطاعت کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑوں کی' سو انہوں نے ہم کو راہ سے بھٹکا دیا اے ہمارے رب اُن کو دُہری سزا دیجئے اور ان پر بڑی لعنت فرما۔ تفسیر درمنثور میں ہے کہ حضرت ابو العالیہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن کافر کھڑا کر دیا جائے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ پھر اس کے فرشتے لعنت کریں گے۔ پھر تمام انسان اس پر لعنت بھیجیں گے)

پھر فرمایا: لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ یعنی ان لوگوں سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا سورۃ نحل میں فرمایا: اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یُفْسِدُوْنَ (یعنی جو لوگ کفر کرتے تھے اللہ کی راہ سے روکتے تھے اُن کے لئے ہم ایک سزا پر دوسری سزا بمقابلہ اُن کے فساد کے بڑھا دیں گے)۔

سورۂ زخرف میں فرمایا: اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ (بلاشبہ مجرمین جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اس میں ناامید ہو کر پڑے رہیں گے)۔

سورۂ مومن میں فرمایا: وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْماً مِّنَ الْعَذَابِ قَالُوْا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوْا بَلٰى قَالُوْا فَادْعُوْا وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلَالٍ (اور جو لوگ دوزخ میں ہوں گے جہنم کے داروغاؤں سے کہیں گے کہ اپنے رب سے تم دُعا کرو ایک دن ہمارا عذاب ہلکا فرما دے، وہ کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہارے رسول کھلے کھلے دلائل لے کر نہ آئے تھے وہ کہیں گے ہاں آئے تو تھے۔ داروغہ کہیں گے کہ پھر تم ہی دُعا کرلو اور کافروں کی دعا نہیں ہے مگر بے اثر)۔

آخر میں فرمایا: وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (اور اُن کو مہلت نہ دی جائے گی) مہلت اُسے دی جاتی ہے جسے اپیل کرنے کا موقع دیا جائے۔ کافروں کو بہر حال دائمی عذاب میں رہنا ہے کسی طرح کی اُن کو کوئی مہلت نہیں دی جائے گی نہ اُن کو کسی طرح کی معذرت خواہی کی اجازت دی جائے گی۔ سورۂ مرسلات میں فرمایا: هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (یہ دن ہے جس میں وہ نہ بولیں گے اور نہ اُن کو اجازت دی جائے گی کہ عذر پیش کریں۔ ہلاکت ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے)۔

لعنت کرنے سے متعلقہ مسائل

مسئلہ: عام طور سے یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت اور ظالموں پر اللہ کی لعنت لیکن کسی خاص شخص کو مقرر کر کے یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ ملعون ہے خواہ مومن ہو یا کافر ہو، خاص طور پر معین کر کے صرف اُسی شخص پر لعنت بھیج سکتے ہیں جس کا کفر پر مرنا یقینی ہو جیسے فرعون۔ اُبولہب۔ اُبوجہل وغیر ہم، جو شخص اسی دنیا میں موجود ہے اور حالت کفر میں ہے اس کو بھی متعین طریقہ پر ملعون کہنا جائز نہیں کیونکہ یہ یقین نہیں ہے کہ وہ کفر پر مرے گا۔ بہت سے لوگ اس میں بے احتیاط ہوتے ہیں نہ صرف کافروں کو بلکہ مسلمانوں کو ملعون لعین کہہ دیتے ہیں۔ بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ کی زبان اس میں زیادہ کھلی ہوئی ہوتی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ جب کوئی شخص کسی پر لعنت کرے تو لعنت آسمان کی طرف چڑھ جاتی ہے۔ سو آسمان کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں پھر زمین کی طرف اُتاری جاتی ہے سو زمین کے دروازے بھی بند کر دیئے جاتے ہیں پھر وہ دائیں بائیں اپنا راستہ دیکھتی ہے جب کوئی جگہ نہیں پاتی تو اس پر لوٹ جاتی ہے جس پر لعنت بھیجی ہے۔ سو اگر وہ اس کا اہل تھا تو اس پر پڑ جاتی ہے اور اگر اس کا اہل نہیں تھا تو اسی پر لوٹ جاتی ہے جس نے لعنت کے لفظ زبان سے نکالے تھے۔ (سنن ابوداؤد کتاب الادب ص ۳۱۶ ج ۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص کی چادر ہوا نے ہٹا دی اس نے ہوا پر لعنت کر دی حضرت رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس پر لعنت نہ کر۔ کیونکہ وہ تو اللہ کے حکم کے مطابق چلتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو شخص کسی چیز پر لعنت کرے اور وہ چیز اس کی اہل نہ ہو تو لعنت کرنے والے پر ہی لعنت لوٹ جاتی ہے۔ (سنن ابوداؤد کتاب الادب)

مسئلہ: لعنت کے ہم معنی جو بھی الفاظ ہوں اُن کا استعمال کرنا بھی اُسی وقت جائز ہے جبکہ اُصول کے مطابق اس پر

لعنت بھیجنا جائز ہو۔ لفظ مردود بھی ملعون کے معنی میں ہے۔ اور پھٹکار بھی اردو میں لعنت کے معنی میں آتا ہے۔ عورتوں کو لعنت اور اس کے ہم معنی لفظ استعمال کرنے کی بہت زیادہ عادت ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ ایک مرتبہ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کی نماز کے لئے تشریف لے جا رہے تھے عورتوں پر آپ کا گزر ہوا آپ نے فرمایا کہ اے عورتو! تم صدقہ کرو مجھے دوزخ میں تمہاری تعداد زیادہ دکھائی گئی ہے۔ عورتوں نے عرض کیا کیوں یا رسول اللہ ﷺ؟ آپ نے فرمایا کہ تم لعنت زیادہ کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۳ از بخاری و مسلم)

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾
اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے

معبود حقیقی ایک ہی ہے

تفسیر: اس آیت میں خالق تعالیٰ شانہٗ کی توحید بیان فرمائی ہے اور مشرکین کی تردید فرمائی ہے۔ فرمایا کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اپنی ذات صفات میں یکتا ہے اور تنہا ہے۔ اور ایک ہے وہ بہت مہربان ہے اور بہت زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ اسکی کوئی نظیر نہیں اور اُس کا کوئی ہمسر اور برابر نہیں۔ وہ واحد ہے احد ہے وحدہ لاشریک ہے۔ ساری مخلوق کو تنہا اُسی نے پیدا فرمایا۔ لہٰذا وہی واحد معبود ہے ساری مخلوق پر وہ رحم فرماتا ہے۔ لوگوں نے اُس کے علاوہ جو دوسرے معبود بنائے ہیں وہ جھوٹے معبود ہیں اُن میں سے کوئی بھی مستحق عبادت نہیں نہ وہ خالق ہیں نہ مالک ہیں نہ رحمٰن ہیں نہ رحیم ہیں۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي
بلاشبہ آسمان اور زمین کے پیدا فرمانے میں اور رات و دن کے اُلٹ پھیر میں اور کشتیوں میں جو کہ چلتی ہیں
الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ
سمندر میں وہ سامان لے کر جو لوگوں کو نفع دیتا ہے اور جو کچھ نازل فرمایا اللہ نے آسمان سے یعنی پانی پھر زندہ فرمایا اس کے ذریعہ زمین کو
بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ
اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد اور پھیلا دیئے ہیں میں ہر قسم کے چلنے پھرنے والے جانور اور ہواؤں کے گردش کرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہیں
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾
ضرور نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں

توحید کے دلائل کا بیان

تفسیر: تفسیر در منثور ص ۱۶۳ ج ۱ میں ہے کہ جب آیت وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ نازل ہوئی تو مشرکین کو تعجب ہوا اور کہنے لگے کہ محمد ﷺ یہ کہتے ہیں کہ معبود صرف ایک ہی ہے۔ اگر وہ سچے ہیں تو کوئی نشانی دکھائیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت

نازل فرمائی اور اپنے خالق و مالک ہونے کا اور کائنات میں تصرف فرمانے کا تذکرہ فرمایا۔ مشرک بھی جانتے ہیں کہ یہ تصرفات اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کرتا۔ سمجھ سے کام لیں تو اللہ تعالیٰ کو واحد ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں اور حضرت عطار سے منقول ہے کہ جب مدینہ منورہ میں آیت کریمہ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ نازل ہوئی تو مکہ میں کفار قریش نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ سب لوگوں کا ایک ہی معبود ہو اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آخر تک) نازل فرمائی۔ ان آیات میں غور کریں تو سمجھ میں آجائے گا کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود ہے اور واحد ہے اور وہ ہر چیز کا معبود ہے اور ہر چیز کا خالق ہے (ایضاص ۱۷۴) مشرکین کا عجیب طریقہ تھا اور اب بھی ہے کہ پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے رزق دیا اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی پرورش اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اولاد وہ دیتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں وہ پیدا فرماتا ہے لیکن مشرکین عبادت دوسروں کی کرتے ہیں اور عجیب تر بات یہ ہے کہ جب مشرکین مکہ کے سامنے یہ بات آئی کہ معبود صرف ایک ہی ہے۔ تو تعجب سے کہنے لگے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ۔ (کیا تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا دیا بلاشبہ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے) دنیا بھی عجیب جگہ ہے جو بھی چیز رواج پاجائے خواہ کیسی ہی باطل اور بُری ہو رواج کی وجہ سے لوگ اسے اچھی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ انسانوں پر فرض ہے کہ وہ صرف اپنے خالق مالک کی عبادت کریں۔ اُس کے علاوہ کسی دوسرے کو معبود نہ بنائیں یہی انسانوں کا دین ہے جو ان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام نے بتایا اور اختیار کیا اور اُن کے بعد تمام انبیاء کرام علیہم السلام اس کی دعوت دیتے رہے۔ جب لوگوں میں شرک پھیل گیا تو اُسی سے مانوس ہو گئے اور توحید کی دعوت پر تعجب کرنے لگے۔

مذکورہ بالا آیت میں چند ایسی چیزوں کا ذکر ہے۔ جو سب کے سامنے ہیں اور سب کو اقرار ہے کہ یہ ساری چیزیں صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت اور تصرف سے وجود میں آئی ہیں اور اُن کا بقا اور وجود صرف اسی کی مشیت سے ہے۔ کسی دوسرے کو ذرہ بھر بھی انکے وجود و بقا میں دخل نہیں۔

آسمان وزمین کی تخلیق

سب سے پہلے آسمان وزمین کی تخلیق کا تذکرہ فرمایا: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو تو وہ کہیں گے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔ سورۃ احقاف میں فرمایا: قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (آپ کہیے کہ یہ تو بتلاؤ جن چیزوں کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو مجھ کو یہ دکھلاؤ کہ اُنہوں نے کون سی زمین پیدا کی یا اُن کا آسمان میں کچھ ساجھا ہے۔ میرے پاس کوئی کتاب جو اس سے پہلے کی ہے یا وہ کوئی مضمون منقول لے آؤ اگر تم سچے ہو)۔

رات دن کا آنا جانا: آسمان وزمین کی پیدائش کا ذکر فرمانے کے بعد اختلاف اللیل و النہار یعنی رات دن کے آگے پیچھے آنے ایک کے کم ہونے دوسرے کے زیادہ ہونے کا تذکرہ فرمایا۔ سورۃ فرقان میں ارشاد ہے۔ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (اور وہ وہی ذات پاک ہے جس نے بنا دیا رات و دن کو آگے پیچھے آنے والا اُس شخص کے لئے جو نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ کرے یا ارادہ کرے شکر گزار

ہونے کا) سورۂ زمر میں فرمایا: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۔ (پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ وہ لپیٹتا ہے۔ رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے۔ دن کو رات پر اور اس نے مسخر فرمایا۔ سورج کو اور چاند کو)

سورۂ فاطر میں فرمایا: یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ لَهُ الْمُلْکُ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ (وہ داخل فرماتا ہے رات کو دن میں اور داخل فرماتا ہے دن کو رات میں اور اُس نے مسخر فرمایا سورج کو اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے اپنی مقررہ اجل کے لئے یہ اللہ ہے تمہارا رب اُسی کے لئے ملک ہے اور جن لوگوں کو تم اس کے علاوہ پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں)

رات اور دن کا وجود میں آنا کم و بیش ہونا کسی علاقہ میں کسی زمانہ میں رات کا زیادہ ہونا اور کسی علاقہ میں کسی زمانہ میں دن کا زیادہ ہونا سب اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام کے تحت ہے کسی کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں سب اہل عقل اس کو جانتے اور مانتے ہیں۔

سمندروں میں جہازوں کا چلنا

پھر تیسری نشانی کا ذکر فرمایا: وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ (یعنی جو کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں وہ سامان لے کر جس سے لوگ نفع اُٹھاتے ہیں) ان کشتیوں کا چلنا بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے سمندر خود اللہ تعالیٰ کی بڑی مخلوق ہے اس میں طرح طرح کے جانور اور بہت سی چیزیں ہیں جو انسانوں کے کام آنے والی ہیں۔ سمندروں نے ایک براعظم کو دوسرے براعظم سے ملا رکھا ہے۔ اگر سمندر نہ ہوتے تو خشکی ہی کے ذریعہ دُور و نزدیک کے سامان کو منتقل کرنا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر میں کشتیاں جاری فرما دیں اگر اللہ چاہتا تو کوئی کشتی سمندر کی سطح پر نہ چلتی بلکہ ڈوب کر رہ جاتی۔ ایک سوئی سمندر کی سطح پر نہیں ٹھہر سکتی۔ لیکن ہزاروں من کے جہاز اور کشتیاں سمندر کی سطح پر ہزاروں من سامان لے کر چلتی ہیں۔ یہ سامان یورپ سے ایشیا اور ایشیا سے یورپ تک جاتا ہے۔ ایک براعظم کے لوگ دوسرے براعظم کی پیداوار سے منتفع ہوتے ہیں۔ باوجودیکہ ہوائی جہازوں کی سروس بہت زیادہ ہوگئی ہے اور ٹرینیں بھی کثیر تعداد میں چلنے لگی ہیں لیکن سامان کے نقل و حمل کے لئے آج تک بحری جہازوں سے بے نیازی نہیں ہے۔

سورۃ نحل میں فرمایا: وَتَرَی الْفُلْکَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ سمندر میں پانی کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور تا کہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور تا کہ شکر کرو)

سمندر کا سفر ہے نیچے پانی ہے۔ اُوپر آسمان ہے۔ بھاری بھرکم جہاز دریا کا تلاطم ہواؤں کے تھپیڑے اور ڈوبنے کا ڈر۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرماتے ہیں۔ ڈوبنے سے بچاتے ہیں۔ جو سامان لدا ہوا ہے اور جو لوگ اس میں سوار ہیں۔ صرف اللہ کی حفاظت سے منزل مقصود تک پہنچتے ہیں جب سمندر میں طغیانی آ جائے تو ڈرتے ہیں اور لرزتے ہیں اور اُس وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر نظر نہیں جاتی اور صرف اُسی کو پکارتے ہیں۔ سارے باطل معبودوں کی یاد یوں ہی دھری رہ جاتی ہے۔ سورۃ عنکبوت میں فرمایا: فَاِذَا رَکِبُوْا فِی الْفُلْکِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَی الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِکُوْنَ لِیَکْفُرُوْا بِمَا اٰتَیْنٰهُمْ وَلِیَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد

کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب وہ اُن کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں تا کہ وہ ناقدری کریں اُس نعمت کی جوانکو ہم نے دی اور تا کہ وہ نفع حاصل کرلیں۔ سو عنقریب جان لیں گے)

یہ مشرک انسان کا عجیب مزاج ہے کہ جب مصیبت پڑتی ہے تو صرف اللہ کو یاد کرتا ہے اور اُسی کو پکارتا ہے اور جب مصیبت سے چھوٹ جاتا ہے تو شرک کرنے لگتا ہے۔ اور غیر اللہ کو پکارتا ہے اور اس کی عبادت میں لگ جاتا ہے۔

بارش کا نازل فرمانا: چوتھی نشانی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے جو پانی اُتارا ہے اور اس کے ذریعہ مُردہ زمین کو زندہ فرمایا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے خالق مالک اور واحد ہونے کی نشانیوں میں سے ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ نعمت بہت زیادہ ہے کروڑوں انسان اور چوپائے اور درخت اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ لیکن ختم ہونے نہیں پاتا بارشیں ہوتی ہیں میٹھا پانی برستا ہے۔ خشک زمینیں اس سے سیراب ہوتی ہیں۔ کھیتیاں ہری بھری ہوتی ہیں۔ باغات سرسبز شاداب ہوتے ہیں۔ تالابوں میں پانی جمع ہوتا ہے۔ مہینوں انسان اور جانور اس کو اپنے خرچ میں لاتے ہیں بہت سے علاقوں میں بارش کے سوا پانی کا کوئی انتظام ہی نہیں۔ کنویں ہیں تو وہ بھی بہت گہرے اور کم پانی والے ہیں۔ پانی پینے' کپڑے دھونے اور کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے' بارش کے لئے اللہ سے لو لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو جان میں جان آتی ہے۔ جن علاقوں میں میٹھے پانی کی نہروں سے سیرابی ہوتی ہے وہ بھی آسمان ہی کا برسایا ہوا ہے۔ کیونکہ آسمان کی بارشیں پہاڑوں پر برف کی صورت میں منجمد ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ برف پگھل پگھل کر نہروں میں آتی ہے۔ سُورۃ شوریٰ میں فرمایا: وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ ۔ (اور وہی ہے جو بارش نازل فرماتا ہے اس کے بعد کہ وہ نا اُمید ہو چکے اور وہ پھیلاتا ہے اپنی رحمت کو اور وہی کام بنانے والا سب تعریفوں کے لائق)

سورہ حٰم سجدہ میں فرمایا: وَمِنْ آیَاتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ اِنَّ الَّذِیْٓ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (اور اسکی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ دبی ہوئی پڑی ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے اور پھولتی ہے۔ بلاشبہ جس نے اس زمین کو زندہ فرمایا وہی مردوں کو زندہ کر دے گا۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے)

سورۃ روم میں فرمایا: وَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثَارِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (سو رحمت الٰہی کے آثار دیکھو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد کس طرح زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے)۔

زمین کا خشک ہو جانا اور اس کے درختوں کا سُوکھ جانا اسکو زمین کی موت سے تعبیر فرمایا اور اسکی سرسبزی شادابی کو حیات سے تعبیر فرمایا۔

جانوروں کو پیدا فرمانا اور زمین میں پھیلانا

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے پانچویں نشانی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پھیلا دیئے ہر قسم کے چلنے پھرنے والے جانور۔ اس کا عطف اَنْزَلَ پر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اَحْیٰ پر بھی (کما ذکرہ

صاحب الروح) عربی لغت کے اعتبار سے دَابَّۃ ہر اُس چیز کو کہا جاتا ہے جو زمین پر چلے پھرے اگرچہ عرف عام میں بڑے بڑے جانور گائے، بیل، بھینس اُونٹ وغیرہ کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ زمین پر چلنے پھرنے والے طرح طرح کے جانور بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ کس قدر کثیر تعداد میں مختلف اجناس واصناف کے جانور پیدا فرمائے ہیں اُن کی طبیعتیں الگ الگ ہیں۔ صورتیں الگ الگ ہیں۔ منافع مختلف ہیں۔ اور ان سب پر انسان کو مسلط فرما دیا ہے۔ خوب زیادہ غور کیا جائے اور ایک ایک جانور کے خواص پر نظر ڈالی جائے تو بے شمار قدرت الٰہیہ کے مظاہر سمجھ میں آجاتے ہیں۔

ہواؤں کو مختلف رُخوں پر چلانا

چھٹی نشانی ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ یعنی ہواؤں کو چلانے پھرانے اُن کے رُخوں کو بدلنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی قُدرت کی نشانیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ جیسا چاہتے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں جس رُخ پر اللہ چاہتے ہیں۔ اُدھر ہی جاتی ہیں۔ تیز چلنے کا حکم ہو تو تیز چلتی ہیں اور آہستہ چلنے کا حکم ہو تو آہستہ چلتی ہیں عذاب کا ذریعہ بھی بنتی ہیں اور رحمت کا سبب بھی۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں ہے کہ انکا رخ بدل دے یا اُن کی تیز رفتاری کو کم کر دے یا سست رفتاری کو تیز کر دے۔

سورۂ روم میں فرمایا: وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِہٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْکُ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے جو خوشخبری دیتی ہیں اور تاکہ تم کو اپنی رحمت چکھادے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں تاکہ اس کے فضل کو تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو) قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے عذاب دینے کے لئے ہوا بھیج دی وہ آندھی بن کر سات رات اور آٹھ دن چلتی رہی۔ پوری نافرمان قوم ہلاک اور برباد ہوگئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اُس کو نعمت بنا دیا۔ صبح کو ایک ماہ کی مُسافت تک لے جاتی تھی اور شام کو بھی ایک ماہ کی مسافت پر لے جاتی تھی۔ غزوۂ خندق میں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آندھی بھیج دی جس نے دُشمنان اسلام کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔ اُن کے خیمے اُکھڑ گئے، ہانڈیاں اُلٹ گئیں۔ اُنکے چہرے مٹی سے اَٹ گئے۔ سخت تیز اور سخت ٹھنڈی ہوا تھی۔ جس کی وجہ سے بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

سورۃ احزاب میں ارشاد فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا (اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کی نعمت کو جبکہ آگئے تمہارے پاس لشکر سو ہم نے بھیج دیا اُن کے اُوپر ہوا کو اور ایسے لشکر کو جسے تم نہیں دیکھ رہے تھے (صحیح بخاری میں ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نُصِرت بالصبا واھلکت عاد بالدبور یعنی صبا کے ذریعہ میری مدد کی گئی اور قوم عاد دبور کے ذریعہ ہلاک کی گئی (صبا اور دبور ہواؤں کے نام ہیں)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہوا رحمت لے کر آتی ہے اور عذاب لے کر آتی ہے۔ جب تم اس کو دیکھو تو اُسے بُرا نہ کہو اور اللہ تعالیٰ سے اسکی خیر کا سوال کرو اور اللہ تعالیٰ سے اسکے شر سے پناہ مانگو۔ (سنن ابی داؤد)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب ہوا چلتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا فرماتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ خَیْرَھَا وَخَیْرَ مَا فِیْھَا وَخَیْرَ مَآ اُرْسِلَتْ بِہٖ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّھَا وَشَرِّ مَا فِیْھَا وَشَرِّ مَآ اُرْسِلَتْ بِہٖ (اے اللہ میں آپ سے اسکی خیر کا اور جو کچھ اس میں ہے اسکی خیر کا اور جو کچھ یہ لے کر بھیجی گئی اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور میں آپ کی پناہ مانگتا

ہوں اس کے شر سے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے اور جو کچھ یہ لیکر بھیجی گئی ہے اس کے شر سے)۔ (صحیح مسلم ص ۲۹۴ ج ۱)

بادلوں کی تسخیر

ساتویں نشانی ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ (اور بادلوں میں نشانی ہے جو مسخر ہیں آسمان وزمین کے درمیان) بادلوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان وزمین کے درمیان مسخر فرمایا کہ یہ پانی بھر بھر کر لاتے ہیں جب بارش ہوتی ہے تو ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بارش ہونے والی ہے۔ ان کو دیکھ کر لوگ اپنا انتظام کر لیتے ہیں اور پانی سے بھرے ہوئے بادل اُدھر ہی جاتے ہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔

سورۂ اعراف میں فرمایا: وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (اور وہ ایسا ہے کہ اپنی رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے جو وہ خوش کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اُٹھا لیتی ہیں تو ہم اس بادل کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر اس کے ذریعہ پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ یوں ہی ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے۔ تاکہ تم سمجھو)

بادلوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو میدان تیہ میں سایہ عطا فرمایا۔ بادل اُن کے ساتھ چلتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت اور تصرف سے بادلوں کا ہلکا بھاری ہونا بہت زیادہ بادلوں کا آجانا بالکل ختم ہو جانا نظروں کے سامنے ہوتا رہتا ہے۔ سب اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ قوم عاد پر عذاب آنے کی ابتداء اسی طرح سے ہوئی تھی کہ عرصہ دراز سے بارش نہ ہوئی تھی اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ بادل ظاہر ہو گئے۔ اُنہوں نے سمجھا کہ بادل بارش برسائے گا۔ سخت گرمی کی وجہ سے جب میدان میں نکل کر کھڑے ہو گئے تو بجائے بارش کے سخت آندھی آگئی جس کی وجہ سے وہ بالکل تہس نہس ہو کر رہ گئے۔ (صحیح بخاری) میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ آنحضرت سرورِ عالم ﷺ جب کوئی بادل یا ہوا دیکھتے تھے تو اس کا اثر آپ کے چہرہ مبارک میں ظاہر ہو جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ لوگ جب بادل کو دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اس امید پر کہ بارش ہوگی اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ جب آپ کے سامنے بادل آجائے تو آپ کے چہرہ مبارک میں پریشانی محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا اے عائشہ مجھے کیا اطمینان ہے اس میں عذاب ہو۔ ایک قوم کو ہوا کے ذریعہ عذاب دیا گیا۔ جب اُنہوں نے عذاب کو دیکھا (جس کی ابتداء بادل ظاہر ہونے سے تھی) تو اُنہوں نے کہا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (کہ یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا) لیکن وہ ہوا کی صورت میں سخت عذاب تھا ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ جب آسمان میں کچھ بادل وغیرہ معلوم ہوتا تھا تو آنحضرت سرورِ عالم ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا تھا آپ کبھی اندر جاتے کبھی باہر آتے کبھی آگے بڑھتے کبھی پیچھے ہٹتے جب بارش ہو جاتی تھی تو آپ کی وہ کیفیت جاتی رہتی تھی۔ (صحیح مسلم ص ۲۹۴ ج ۱)

یہ امور جو آیت میں مذکور ہوئے ان سب میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور خالقیت کی نشانیاں ہیں توحید کے منکر بھی مانتے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور اس کی تصریف سے عالم میں سب کچھ ہو رہا ہے پھر بھی توحید کا اقرار نہیں کرتے اور شرک میں مبتلا ہیں۔ ہداھم اللہ تعالیٰ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ

اور بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ کے علاوہ اس کے شریک تجویز کر رکھے ہیں وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے محبت ہونی واجب ہے اور جو لوگ

اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ

ایمان لائے اُن کا اللہ سے محبت کرنا بہت ہی زیادہ قوی ہے اور اگر جان لیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا جس وقت دیکھیں عذاب کو کہ بلا شبہ ساری قوت

لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

اللہ ہی کے لئے ہے۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے

مشرکین کی باطل معبودوں سے محبت اور اس پر سخت عذاب

تفسیر: توحید کا ذکر کرنے اور توحید کے دلائل بیان فرمانے کے بعد اب اُن لوگوں کی حالت بیان فرمائی جنہوں نے توحید سے منہ موڑا اور شرک کو اختیار کیا۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ معبود تجویز کر لئے جن کو وہ اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھتے ہیں۔ ان کی عبادت کرتے ہیں ان کے لئے نذریں مانتے ہیں۔ اور ان کے لئے جانور ذبح کرتے ہیں۔ ان کا حال بتانے کے بعد فرمایا: يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ کہ یہ لوگ ان باطل معبودوں سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے محبت ہونی چاہئے۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں ص ۳۴ ج ۲ کہ یہاں محبت سے تعظیم اور فرمانبرداری مُراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور معبودان باطلہ کے درمیان برابری کرتے ہیں اور باطل معبودوں کی تعظیم اور اطاعت میں اسی طرح لگتے ہیں جیسا کہ معبودِ حقیقی کی عبادت اور اطاعت کرنا لازم ہے چونکہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر سمجھتے ہیں اس لئے وہ ضمیر جمع لائی گئی جو عقلاء کیلئے استعمال ہوتی ہے یعنی يُحِبُّوْنَهُمْ فرمایا يُحِبُّوْنَهَا نہیں فرمایا۔ بعض مُفسرین نے اَنْدَادًا سے قوم و قبیلے اور علاقہ کے بڑے لوگ مراد لئے ہیں یعنی بہت سے لوگ اپنے رؤساء کو ایسا مُطاع مانتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور فرمانبرداری کرنا لازم ہے۔

اہل ایمان کو اللہ سے محبت ہے:

پھر فرمایا: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (یعنی جو لوگ ایمان لائے اُن کا اللہ سے محبت کرنا بہت ہی زیادہ قوی ہے) کیونکہ اہل ایمان کی جو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے وہ کامل ہے اور راسخ ہے۔ اور مضبوط ہے۔ اُس کی محبت میں کبھی کمی نہیں آتی۔ وہ کبھی بھی اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے مدد نہیں مانگتے اور غیر اللہ کی کبھی بھی عبادت نہیں کرتے۔ برخلاف بُت پرستوں کے کہ جب وہ مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں تو بتوں کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ مثلاً جب کشتی میں سوار ہوں اور وہ ڈوبنے اور ڈگمگانے لگے تو سارے معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ ہی سے نجات کا سوال کرتے ہیں۔ اور دوسرے احوال میں بھی جب بھی کوئی پریشانی ہو اس کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک زمانہ تک کسی بت کی پوجا پاٹ کرتے رہتے ہیں۔ پھر اُسے چھوڑ کر دوسرا بت تراش کر اُس کے سامنے جبین نیاز رگڑنے لگتے ہیں اور بعض مرتبہ حلوے وغیرہ کا بت بنا لیتے ہیں۔ پھر عند الضرورت اُسے کھا جاتے ہیں۔ ہندوستان کے مشرکوں کو دیکھا جاتا ہے کہ دیوالی کے موقعہ

پر (جواُن کا ایک تہوار ہے) کھانڈ کی مورتیاں بناتے ہیں پھران کو بیچتے ہیں اور چھوٹے بڑے مل کران کو کھا جاتے ہیں۔

پھر فرمایا: وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ (کہ جن لوگوں نے خدا کے ہمسر تجویز کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا قیامت کے دن جب عذاب کو دیکھیں گے تو اُس وقت جان لیں گے کہ ساری قوت اللہ ہی کے لئے ہے اور اس موقعہ پر ان کو بہت زیادہ ندامت' پشیمانی اور شرمندگی ہوگی جس سے کچھ بھی فائدہ نہ پہنچے گا۔ یہ آیت کی ایک تفسیر ہے۔ اور اس تفسیر کی بناء پر جواب لو محذوف ہے۔)

قال البیضاوی لو یعلمون ان القدرة لله جميعا اذا عاينوا العذاب لندموا اشد الندم ۔اور مفسر ابن کثیر (ص ۲۰۲ ج ۱) نے اسکی تفسیر اس طرح سے کی ہے کہ۔

اگر وہ جان لیں اُس عذاب کو جسے وہاں یوم قیامت میں دیکھیں گے (جو سخت عذاب ان کے شرک اور کفر کی وجہ سے ان کو دیا جائے گا) تو آج ہی اس دنیا میں اپنے کفر سے باز آجائیں۔ مفسر بیضاوی نے بعض مفسرین سے آیت کی تفسیر اس طرح بھی نقل کی: وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوا اَنْدَادَهُمْ لَا تَنْفَعُ لَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ كُلَّهَا لَا يَنْفَعُ وَلَا يَضُرُّ غَيْرُهٗ (یعنی جنہوں نے ظلم کیا اگر وہ جان لیں کہ ان کے بنائے ہوئے خدا نفع دینے والے نہیں ہیں تو یہ بات ضرور جان لیں کہ ساری قوت اللہ ہی کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی نفع اور ضرر کا مالک نہیں۔ اس صورت میں یَرٰی کا مفعول یعنی اندادھم لا ینفع محذوف ہوگا۔ وذکرہ فی الروح ایضا (ص ۳۵ ج ۲)

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ

جب کہ بیزار ہو جائیں گے وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی ان لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی تھی۔ اور دیکھ لیں گے عذاب کو اور کٹ جائیں

الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا

گے ان کے آپس کے تعلقات' اور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی کاش ہم کو واپس جانا نصیب ہو جاتا تو ہم ان سے بیزار ہو جاتے۔

مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

جیسا کہ وہ ہم سے بیزار ہو گئے۔ اللہ اسی طرح دکھائے گا ان کو ان کے اعمال حسرتیں بنا کر اور وہ آگ سے نکلنے والے نہ ہوں گے

قیامت کے دن متبوعین کا اپنے ماننے والوں سے بیزاری ظاہر کرنا اور اس وقت ان کو پشیمانی ہونا

تفسیر: ان آیات میں کافروں کی ایک اور حسرت اور ندامت اور شناعت اور فظاعت ذکر فرمائی۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ دنیا میں پیشوا تھے اور قوموں اور قبیلوں کے اور ملک وطن کے بڑے تھے جن کے پیچھے چل کر ان کی اولاد نے اور قوم وقبیلہ نے اور ملک کے بسنے والوں نے اپنا ناس کھویا اور کفر اور شرک میں مبتلا ہوئے۔ یہ سرداران قوم اور زعماء ملک و وطن قیامت کے دن اپنے ماننے والوں اور پیچھے چلنے والوں اور انکی رضامندی کے لئے قربانیاں دینے والوں سے صاف

صاف کہہ دیں گے کہ ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں اور یہ بیزاری ایسے موقع پر ہوگی جب اُن کے ماننے والے اس دنیا سے گزر چکے ہوں گے اور کفر وشرک پر مرچکے ہوں گے وہاں نہ ایمان لانا معتبر ہوگا نہ دنیا میں واپس آسکیں گے اور عذاب بھگتنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا اور ان کے آپس کے تعلقات ختم ہو چکے ہوں گے اور کوئی کسی کو کسی طرح بھی مدد نہ دے سکے گا۔ کما قال تعالیٰ۔ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ۔ (سورۃ مومن) (ظالموں کے لئے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی ہوگا جس کی اطاعت کی جائے)

جب سردارانِ قوم بیزاری ظاہر کر دیں گے تو وہ لوگ جنہوں نے ان کا اتباع کیا تھا۔ یوں کہیں گے کہ اگر ہمیں دنیا میں واپس جانا نصیب ہو جائے تو ہم ان سے اسی طرح بیزاری ظاہر کریں جیسا کہ آج وہ ہم سے بیزار ہو گئے۔

پھر فرمایا: كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ (یعنی جس طرح ان کو آپ کی بیزاری کا منظر دکھایا جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کے دوسرے اعمال بھی حسرتیں بنا کر اُن کو دکھائے گا اور حسرت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا دوزخ کے عذاب کے ساتھ حسرتوں کا عذاب مستقل عذاب ہوگا۔ بار بار نادم ہوں گے کہ حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کا اتباع کر لیتے تو اچھا تھا۔ کفر وشرک اختیار نہ کیا ہوتا' فلاں فلاں عمل اختیار کرتے تو کیسا ہی اچھا ہوتا اور اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتے اُس دن کا سوچنا' سمجھنا' نادم ہونا۔ دوزخ سے نکلنے کا ذریعہ نہ بنے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے کبھی بھی اُس سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ
اے لوگو! کھاؤ ان چیزوں میں سے جو زمین میں حلال پاکیزہ ہیں اور مت پیچھے چلو شیطان کے قدموں کے ۔
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ
بے شک وہ تمہارے لئے کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تم کو صرف برائی کا اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے اور یہ کہ تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾
جن کو تم نہیں جانتے

حلال کھانے اور شیطان کے اتباع سے پرہیز کرنے کا حکم

تفسیر: ان آیات میں اوّل تو ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی جو زمین میں حلال اور پاکیزہ چیزیں موجود ہیں۔ پھر یہ فرمایا کہ شیطان کے قدموں کا اتباع نہ کریں۔ شیطان کا اتباع کرنے اور اسکی بات ماننے میں سراسر نقصان اور خسران اور ہلاکت اور بربادی ہے۔ اس کا کوئی مشورہ اور کسی بھی عمل کی ترغیب انسانوں کے لئے خیر نہیں ہو سکتی وہ تمہارا دشمن ہے اس نے دشمنی پر کمر باندھی ہوئی ہے۔ اُسے دوزخ میں جانا ہے اُسکی کوشش یہ ہے کہ سب بنی آدم بھی میرے ساتھ دوزخ میں چلے جائیں۔ وہ ہمیشہ بُرائی ہی کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور بدکاری ہی کا راستہ بتاتا ہے۔ اس کا یہ بھی کام ہے

کہ تم سے شرک کرائے اور تمہیں غلط عقیدوں پر ڈالے۔ اور پھر تم سے یہ کہلوائے کہ یہ جو کچھ ہم نے کیا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا ہے اور اسکی رضا کے لئے کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں فرمایا: وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَا اٰبَاءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو اسی طریق پر پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ فحش بات کا حکم نہیں دیتا' کیا خدا کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کو تم نہیں جانتے)۔

اسباب النزول للواحدی ص ۴۳ میں ہے کہ آیت يَا اَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ (الآیۃ) بنی ثقیف اور بنی خزاعہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان لوگوں نے کچھ کھیتیاں' کچھ جانور اپنے اُوپر حرام کر لئے تھے اور جن جانوروں کو حرام کیا تھا (ان کی حُرمت کے لئے کچھ شرطیں اور قیدیں لگادی تھیں اور) اُن کے نام بحیرہ' سائبہ اور وصیلہ اور حام تجویز کر لئے تھے۔ اھ سورۃ مائدہ اور سورۃ انعام کی تفسیر میں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی تفصیلات مذکور ہوں گی۔ یہ باتیں ان کو شیطان نے بتائی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرنے کا یا حرام کو حلال کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ یہ جو تحریم و تحلیل کا سلسلہ مشرکین نے نکالا تھا اس میں شیاطین کو اور بتوں کو راضی رکھنے کے جذبات تھے۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت میں جو چیزیں حلال ہیں ان کو حرام کر لینا حلال نہیں ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی شریعت کو بدلنا ہے۔ اور تحریف کرنا ہے۔

تحلیل و تحریم کا حق صرف اللہ ہی کو ہے

سورۃ مائدہ میں فرمایا: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (اے ایمان والو! اللہ نے جو چیز تمہارے واسطے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو اور حدود سے آگے مت نکلو۔ بلاشبہ اللہ حد سے نکلنے والوں سے محبت نہیں فرماتے)۔

حضور اقدس ﷺ نے ایک مرتبہ شہد پینے کے متعلق فرمادیا تھا کہ اب ہرگز نہ پیوں گا' اللہ جل شانہٗ نے آیت نازل فرمائی: يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ.

(اے نبی تم اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہو جسے اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا ہے) ایسی بہت سی رسمیں آج لوگوں میں موجود ہیں جن میں عملاً بلکہ اعتقاداً بھی بہت سی حلال چیزوں کو حرام سمجھ رکھا ہے مثلاً ذی قعدہ کے مہینہ میں (جسے عورتیں خالی مہینہ کہتی ہیں) اور محرم اور صفر میں شریعت میں شادی کرنا خوب حلال اور درست ہے لیکن اللہ کی اس حد سے لوگ آگے نکلتے ہیں اور ان میں شادی کرنے سے بچتے ہیں۔ ماہ محرم میں میاں بیوی والے تعلق سے بچتے ہیں۔ اور بہت سی قوموں میں بیوہ عورت کے نکاح ثانی کو معیوب سمجھتے ہیں اور عملاً اس کو حرام بنا رکھا ہے۔ بہت سی قوموں میں ماموں' خالہ' چچا' پھوپھی کی لڑکی سے نکاح کرنے کو عملاً بلکہ اعتقاداً حرام قرار دے رکھا ہے۔ یہ سب حدود سے آگے بڑھ جانا ہے۔ جس طرح حلال کو حرام کرنا منع ہے اسی طرح حرام کو حلال کر لینا بھی منع ہے۔ حرام و حلال مقرر فرمانے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے خواہ اس نے قرآن میں نازل فرمایا ہو یا اپنے نبی ﷺ کی زبانی بتایا ہو۔ سورۃ نحل میں ارشاد ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلَالٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (اور جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا زبانی جھوٹا دعویٰ ہے۔ ان کی نسبت یوں مت کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے۔ جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے)۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کا اتباع کرو جو اللہ نے نازل فرمایا تو کہتے ہیں کہ بلکہ ہم اُس کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔ کیا

كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾

وہ اپنے باپ دادوں کا اتباع کریں گے۔ اگرچہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور ہدایت پر نہ ہوں

باپ دادے ہدایت پر نہ ہوں تو اُنکا اتباع اور اقتداء باعث ہلاکت ہے

تفسیر: مشرکین کا یہ طریقہ تھا اور اب بھی ہے کہ وہ اپنے باپ دادوں کو مقتدیٰ سمجھتے رہے ہیں۔ اُن کو ہزار سمجھایا جائے، حق کی دعوت دی جائے، توحید کی طرف بُلایا جائے۔ اللہ کے دین اور اسکی شریعت قبول کرنے کے لئے کہا جائے اور توحید کی دلیلیں خوب کھول کر بیان کردی جائیں۔ اور شرک و کفر کی مذمت خوب واضح کر کے بتادی جائے تو بھی وہ کسی قیمت پر اپنے باپ دادوں کا دین کفر و شرک چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے ان کا یہی ایک جواب ہوتا ہے کہ ہم اس دین اور طور طریق اور رسم و رواج کے پابند ہیں جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔ اس آیت شریفہ میں مشرکین کی یہی بات نقل فرمائی ہے اور پھر اسکی تردید کی ہے۔ تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اَوَلَوْ كَانَ آبَاءُ هُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُونَ (کیا وہ اپنے باپ دادوں کا اتباع کریں گے اگرچہ وہ کچھ ہی نہ سمجھتے ہوں اور ہدایت پر نہ ہوں) باپ دادوں نے اپنی ناسمجھی سے شرک اختیار کیا، غیر اللہ کی پرستش کی بُرے رسم و رواج نکالے، وہ لوگ کیسے لائق اتباع ہو سکتے ہیں؟ پھر یہ معلوم ہے کہ باپ دادوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں۔ نہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ان کے پاس تھی نہ کسی نبی سے اُنہوں نے ہدایت حاصل کی تھی، سراپا گمراہی میں تھے گمراہوں کا اتباع کرنا کہاں کی سمجھ داری ہے۔ ہاں اگر باپ دادے ہدایت پر ہوں اور اُنہوں نے حق کی راہ بتائی ہو تو اُن کا اتباع کیا جائے جیسا کہ سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول نقل فرمایا کہ اُنہوں نے اپنے جیل کے ساتھیوں سے فرمایا: وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِیْ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ۔ (کہ میں نے اتباع کیا اپنے باپ دادوں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کی ملت کا) باطل میں کسی کی بھی تقلید کرنا حلال نہیں ہے۔ البتہ جو اہل حق ہو اللہ کے دین پر چلتا ہو اور اُسی کی دعوت دیتا ہو اُس کا اتباع کرنا لازم ہے۔ جیسا کہ سورۃ لقمان میں فرمایا: وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ (کہ جو شخص میری طرف رجوع ہو اُس کا اتباع کرو)

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً صُمٌّ

اور مثال اُن لوگوں کی جنہوں نے کُفر کیا اُس شخص کی مثال ہے جو آواز دے ایسی چیز کو جو نہ سُنے سوائے پُکار کے اور بُلاوے کے، بہرے ہیں،

بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾

گونگے ہیں، اندھے ہیں سو وہ سمجھ نہیں رکھتے

کافروں کی ایک مثال

تفسیر: صاحب روح المعانی (ص ۴۸ ج ۲) پر لکھتے ہیں کہ مشبہ یا مشبہ بہ کی جانب میں مضاف محذوف ہے پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ کافروں کی دعوت دینے والے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اُن جانوروں کے پیچھے چیخ رہا ہو جو بس پکار اور آواز سُنتے ہیں اور اُس سے زیادہ کوئی بات وہ نہیں سمجھتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں کسی نے آواز دی لیکن کیا کہا اس کو بالکل نہیں سمجھتے اور دوسری صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ کافروں کی مثال اُس شخص کے جانوروں کی طرح سے ہے جو اپنے جانوروں کو پُکارتا اور چیختا چلاتا ہے اور جانوروں کو پُکار کے سوا کچھ خبر نہیں۔ خلاصہ مطلب دونوں صورت میں یہ ہے کہ کافر لوگ اپنی جہالت اور حماقت سے باپ دادوں کی تقلید میں لگے ہوئے ہیں حق سمجھنے اور قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس بارے میں وہ جانوروں کی طرح سے ہیں۔ حق کی آواز سُنتے ہیں لیکن سب اَن سُنی کر دیتے ہیں۔ نہ اُدھر اپنے ذہنوں کو متوجہ کرتے ہیں اور نہ غور و فکر کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ بالکل جانوروں کی طرح سے ہیں۔ آواز تو سُنی لیکن سمجھے کچھ نہیں۔

کافر بہرے، گونگے، اندھے ہیں

پھر فرمایا: صُمٌّ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۔ کہ یہ لوگ حق سننے کو تیار نہیں بہرے بنے ہوئے ہیں، حق بولنے کو تیار نہیں گونگے بنے ہوئے ہیں۔ راہ حق پر چلنے کو تیار نہیں۔ اندھا پن اختیار کئے ہوئے ہیں، اپنے حواس کھو چکے ہیں۔ لہٰذا حق کو ذرا بھی نہیں سمجھتے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

اے ایمان والو! کھاؤ اُن پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اُس کی عبادت کرتے ہو

حلال کھانے اور شکر ادا کرنے کا حکم

تفسیر: اس آیت شریفہ میں بھی پاکیزہ چیزوں کے کھانے کا حکم فرمایا اور اللہ پاک نے جو نعمتیں دی ہیں اُن کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اگر تم اللہ کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر ادا کرو کیونکہ جو عبادت اُس کی عظمت و کبریائی کی شایان شان ہے وہ شکر کے بغیر کامل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے جو حلال رزق عطا فرمایا ہے اُسے کھاؤ پیو اور شکر کرو۔ سورۃ سبا میں فرمایا كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ (اپنے رب کے رزق سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو) نعمتوں کے شکر کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اللہ کی اطاعت اور عبادت میں مشغول ہوں۔ اور اسکی نعمتوں کو گناہوں میں خرچ نہ کریں۔ مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ میں یہ بھی نکتہ ہے کہ دوسروں کا مال چھین کر یا چُرا کر یا خیانت کر کے استعمال نہ کیا جائے کہ اللہ نے جو مال جس کسی کو دیا ہے وہ اگرچہ فی نفسہ اصول شریعت کے مطابق حلال اور طیب ہے۔ لیکن دوسروں کے لئے اسی وقت حلال اور طیب ہوگا جبکہ حلال طریقہ سے صاحب مال سے حاصل کیا ہو۔

حرام کھانے کا وبال: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ پاک ہے اور وہ پاک ہی (مال اور قول و عمل) کو قبول فرماتا ہے۔ (پھر فرمایا کہ) بلاشبہ (حلال کھانے کے بارے میں) اللہ

جل شانہٗ نے پیغمبروں کو جو حکم فرمایا ہے وہی مومنین کو حکم فرمایا ہے چنانچہ پیغمبروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے رسولو! طیب چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو اور مومنین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! جو پاک چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں اُن میں سے کھاؤ' اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر کر رہا ہو۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہوں جسم پر گرد و غبار اَٹا ہو اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے یا رب یا رب کہہ کر دعا کرتا ہو یہ شخص دعا تو کر رہا ہے اور حال یہ ہے کہ اُس کا کھانا حرام ہے۔ پینا حرام ہے اور پہننا حرام ہے اور اس کو حرام غذا دی گئی ہے پس ان حالات کی وجہ سے اسکی دعا کیونکر قبول ہوگی۔ (صحیح مسلم ص ۳۲۶ ج ۱)

اس حدیث میں حرام سے پرہیز کرنے اور حلال کھانے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جو صدقہ حلال مال سے ہوگا وہی قبول ہوگا۔ اللہ پاک ہے اور اس کی بارگاہ میں پاک چیز ہی قبول ہو سکتی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی دو آیتیں تلاوت فرمائیں۔ پہلی آیت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کو حکم ہے کہ پاک چیزیں کھائیں اور نیک عمل کریں اور دوسری آیت میں ایمان والوں کو حکم ہے کہ اللہ پاک کی عطا کردہ چیزوں میں سے پاک چیزیں کھائیں۔ اللہ جل شانہٗ نے جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے کہ حلال کھائیں' وہی حکم اپنے مومن بندوں کو دیا ہے۔ حلال کی اہمیت اور ضرورت ظاہر کرنے کے بعد آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو لمبے سفر میں ہو اور بدحالی کی وجہ سے اس کے بال بکھرے ہوں جسم پر غبار پڑا ہو اور وہ اپنی اسی بدحالی میں آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے یا رب یا رب کہہ کر خدائے پاک کو پکار رہا ہو اور چاہتا ہو کہ میری دعا قبول ہو جائے اسکی دعا قبول نہ ہوگی کیونکہ اس کا کھانا حرام ہے' پینا حرام ہے اور لباس حرام ہے اور اُس کو حرام غذا دی گئی ہے' مسافر کا شمار اُن لوگوں میں ہے جن کی دعا خصوصیت سے قبول ہوتی ہے اور مضطر و پریشان حال شخص کی بھی دُعا مقبول ہوتی ہے۔ لیکن مسافر اور پریشان حال ہونے کے باوجود ایسے شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی جس کا کھانا پینا اور پہننا حرام ہو' آج کل بہت سی دُعائیں کی جاتی ہیں۔ لیکن دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ لوگ شکایتیں کرتے پھرتے ہیں کہ دعاؤں کا اس قدر اہتمام کیا اور اتنی بار دعا کی لیکن دعا قبول نہیں ہوتی۔ شکایت کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اپنا حال دیکھیں اور اپنی زندگی کا جائزہ لیں۔ ہر شخص غور کرے کہ میں حلال کتنا کھاتا ہوں اور حرام کتنا' اور کپڑے جو پہنتا ہوں وہ حلال آمدنی سے ہیں یا حرام سے اگر روزی حرام ہے یا لباس حرام ہے تو اُس کو ترک کریں' خوراک اور پوشاک کو حدیث شریف میں بطور مثال ذکر فرمایا ہے۔ اوڑھنا بچھونا' رہائش کا مکان' آسائش کی چیزیں اگر حرام کی ہوں تو وہ بھی لباس کے حکم میں ہیں انکا استعمال بھی حرام ہے۔

حرام کی کمائی کی چند صورتیں

رشوت آجکل بہت عام ہے سب کو معلوم ہے کہ رشوت کا مال حرام ہے۔ رشوت کا نام ہدیہ یا تحفہ رکھ لیا جائے تب بھی حرام ہی رہتی ہے۔ جو لوگ حکومت کے کسی جائز شعبے میں کام کرتے ہیں اور رشوت لیتے ہیں ان کی رشوت تو حرام ہے ہی تنخواہ بھی حلال نہیں اس لئے کہ جس کام کے لئے حکومت نے ان کو دفتر میں بٹھایا ہے وہ کام اُنہوں نے نہیں کیا رشوت لینے کے لئے اُن اصول و قواعد کے خلاف کام کرتے ہیں جو کام کرنیوالے کے لئے مقرر کئے ہیں۔ سود کم ہو یا زیادہ عوام سے لیا جائے یا کسی بھی ادارہ سے وہ سب حرام ہے اگرچہ اس کا نام نفع رکھ لیا جائے' ہر وہ ملازمت حرام ہے۔ جس میں گناہ کیا جاتا ہو'

کیونکہ گناہ کرنا اور گناہ کی مدد کرنا دونوں حرام ہیں اس لئے گناہ کی اُجرت بھی حرام ہے اور گناہ پر مدد کرنے کی اُجرت بھی حرام ہے۔ حرام چیزوں کی تجارت حرام ہے اور اس پر نفع بھی حرام ہے۔ شراب' خنزیر' خون' مُردار گوشت' تصویریں' مورتیاں ان سب چیزوں کی خرید و فروخت حرام ہے۔ اور ان کی قیمت اور نفع بھی حرام ہے جتنے بھی ٹیکس ہیں سب کا وصول کرنا حرام ہے اور اس سلسلہ کی تمام ملازمتیں بھی حرام ہیں اور ان کی تنخواہ بھی حرام ہے۔ محکمہ آبکاری کی ملازمت حرام ہے اور اسکی تنخواہ بھی حرام ہے۔ بیمہ پالیسی سراسر قمار ہے یعنی جوا ہے زندگی کا بیمہ ہو یا اموال تجارت کا کارخانوں کا یا گاڑیوں کا یہ سب حرام ہے۔ اور ان میں اپنی جمع کردہ رقم سے زائد جو کچھ ملے وہ سب حرام ہے۔ جتنے بھی قمار کے طریقے ہیں گھوڑ دوڑ وغیرہ ان کی آمدنی سب حرام ہے۔ غصب' چوری' ڈاکہ زنی کے ذریعہ جو کچھ حاصل کیا جائے وہ سب حرام ہے۔ لوگوں کو اغواء کر کے جو اُن پر رقم حاصل کی جائے وہ بھی حرام ہے۔ جو لوگ پیری مُریدی کا کاروبار کرتے ہیں اُن کو اہل حق اور اہل ارشاد سمجھ کر جو کچھ دیا جاتا ہے۔ (حالانکہ وہ حقیقت میں ایسے نہیں ہیں) ان کے لئے وہ سب حرام ہے۔ میراث شریعت کے مطابق تقسیم نہیں کی جاتی۔ جس وارث کے قبضہ میں جو مال آجاتا ہے وہی اپنا بنا کر بیٹھ جاتا ہے۔ مرنے والے کے بیٹے اپنی بہنوں کو اور ماؤں کو میراث نہیں دیتے۔ اور چونکہ میراث تقسیم نہیں ہوتی اس لئے یتیموں کے حصہ کا مال بھی خورد برد کر دیا جاتا ہے۔ شرعاً جو دوسروں کا مال ہے اس کو اپنی ملکیت اور کام میں لانا حرام ہے۔ اور نفس کی خوشی سے جو مال نہ دیا گیا ہو اگرچہ دینے والے نے بظاہر کسی دباؤ میں خاموشی اختیار کر لی ہو وہ مال بھی حرام ہے۔ یہ تھوڑی سی تفصیل زیر قلم آگئی ہے۔ حرام کے شعبے بہت ہیں۔ ہر شخص اپنی آمدنی اور اخراجات کا فکر کرے۔

حرام مال کا وبال: بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حرام آمدنی میں سے صدقہ کر دیا جائے تو باقی سب مال حلال ہو جاتا ہے۔ حرام صدقہ کرنا تو اور گناہ ہے۔ وہ مقبول ہی نہیں ہوتا۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ ہی کو قبول فرماتے ہیں جو صدقہ خود ہی قبول نہیں اس کے ذریعہ باقی مال کیسے حلال ہو جائے گا جو صدقہ دیا وہ بھی وبال اور جو باقی مال ہے وہ بھی وبال اور آخرت کے عذاب کا ذریعہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جو بھی کوئی بندہ حرام مال سے کسب کرے گا پھر اس میں سے صدقہ کرے گا تو وہ قبول نہ ہوگا اور اُس میں سے خرچ کریگا تو اس کے لئے اُس میں برکت نہ ہو گی۔ اور اپنے پیچھے چھوڑ کر جائے گا تو وہ اس کے دوزخ میں جانے کا ذریعہ ہوگا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بُرائی کو برائی کے ذریعہ نہیں مٹاتے لیکن بُرائی کو نیکی کے ذریعہ مٹاتے ہیں۔ بے شک خبیث' خبیث کو نہیں مٹاتا۔ (رواہ احمد کما فی المشکوٰۃ ص ۲۴۲)
حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں وہ گوشت داخل نہ ہوگا جو حرام سے پلا بڑھا اور ہر وہ گوشت جو حرام سے پلا بڑھا ہو دوزخ کی آگ اسکی زیادہ مستحق ہے۔ (ایضاً) ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں وہ جسم داخل نہ ہوگا۔ جس کو حرام سے غذا دی گئی۔ (مشکوٰۃ ص ۲۴۳)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس نے دس درہم کا کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم حرام کا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ اسکی کوئی بھی نماز قبول نہ فرمائے گا جب تک کہ وہ کپڑا اس کے بدن پر رہے گا۔ (مشکوٰۃ ص ۲۴۳)

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جانور حرام کیے ہیں جن کے ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔ سو جو شخص مجبوری میں ڈال دیا

اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

جائے اس حال میں کہ باغی نہ ہو اور حد سے بڑھ جانے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے

محرمات کا اجمالی بیان اور اضطرار کا حکم

تفسیر: اس آیت شریفہ میں مردہ جانور (جو اپنی موت سے بغیر ذبح کیے مر جائے) اور خون اور خنزیر کا گوشت کھانے کی اور اُن جانوروں کے کھانے کی حرمت بیان فرمائی ہے جن پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔ ان چیزوں کے کھانے کا عرب کے مشرکوں میں رواج تھا۔ اور ان کے علاوہ حلال چیزیں بھی کھاتے تھے۔ ان کے رواج کی چیزوں میں جو چیزیں حرام تھیں اُصولی طور پر ان کی حرمت بیان فرمائی اور لفظ اِنَّمَا سے جو حصر معلوم ہو رہا ہے۔ یہ حصر اضافی ہے۔ جو چیزیں یہاں مذکور ہیں ان کے علاوہ بھی حرام چیزیں ہیں جس کا ذکر دیگر آیات میں اور احادیث میں وارد ہوا ہے۔

سورۂ مائدہ میں مزید چند حرام چیزوں کا بیان ہے۔ ہم ان شاء اللہ تعالیٰ پوری تفصیل سورۃ مائدہ ہی کی تفسیر میں لکھیں گے یہاں یہ جو فرمایا کہ: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھوک سے ایسا دوچار ہو رہا ہو کہ جان پر بن رہی ہو اور اُس کے پاس حلال چیزوں میں سے کھانے کو کچھ بھی نہ ہو تو وہ حرام چیزوں میں سے اپنی جان بچانے کے لئے اتنا سا کھالے جس سے موت سے بچ جائے۔ صرف اتنا ہی کھائے جس سے جان بچ جائے۔ اس سے آگے نہ بڑھے اور لذت کا طالب بھی نہ ہو۔ مثلاً اگر بھوک سے جان جا رہی ہو تو شراب پینے اور سؤر کھانے کی اجازت کو بہانہ بنا کر یہ نہ سوچے کہ آج اجازت مل گئی ہے خوب مزے سے کھاؤں پیوں گا۔ خُم کے خُم چڑھا لوں گا۔ اور پیٹ بھر کے خنزیر کا گوشت کھالوں گا۔ پھر کبھی موقعہ ملے یا نہ ملے' ایسا آدمی باغی اور عادی یعنی حد سے بڑھنے والا ہے۔ اگر طلب لذت کے لئے کھائے گا یا ضروری مقدار سے زیادہ کھائے گا تو گنہگار ہو گا۔ اور لَا اِثْمَ عَلَيْهِ فرما کر یہ بتایا کہ جان بچانے کی مجبوری میں تھوڑا سا کھانے کی جو اجازت ہے وہ درجہ معافی میں ہے یوں نہ کہا جائے گا کہ یہ چیز حلال ہو گئی۔ یوں کہیں گے کہ اس کا کھانا حلال ہو گیا۔ حرام اپنی جگہ حرام ہی ہے۔ بہت سے لوگ یورپ' امریکہ اور آسٹریلیا میں بلا تکلف شراب پیتے ہیں' اور خنزیر کھاتے ہیں۔ اور اُن جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں۔ جو شرعی طریقے پر حلال نہیں کیے گئے اور جب اُن سے بات ہوتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں۔ اور لفظ فَمَنِ اضْطُرَّ کا سہارا لیتے ہیں۔ حالانکہ اضطرار اور مجبوری اُن کو کہیں سے کہیں تک بھی نہیں ہے۔ ان ملکوں میں سینکڑوں قسم کی چیزیں ملتی ہیں مچھلی بھی ہے انڈے بھی ہیں۔ دودھ بھی ہے اور انتظام کرنے سے حلال گوشت بھی مل جاتا ہے۔ ایسی حالت میں حرام کھانا پینا کسی طرح بھی حلال نہیں ہے اور بالفرض واقعی کوئی شخص مجبور ہو جس کی جان ہی جا رہی ہو کھانے کو کچھ بھی نہ مل رہا ہو وہ جان بچانے کے لئے ذرا سا کھا سکتا ہے۔ یہ پیٹ بھر بھر کر روزانہ حرام کھانا اور پینا اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ ہم تو سؤر

کا گوشت بسم اللہ پڑھ کر کھا لیتے ہیں۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ، بسم اللہ پڑھنے سے حرام حلال نہیں ہو جاتا بلکہ حرام پر بسم اللہ پڑھنے سے ایمان سلب ہو جانے کا خطرہ ہے۔ پھر یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ مسلمان کو کسی ایسے ملک میں رہنے کی کیا مصیبت ہے جہاں حلال نہ ملتا ہو۔ حرام ہی کھانا پڑتا ہو طلب دنیا کے جذبات ہی ایسے ملکوں میں لے جاتے ہیں اور حرام کھلاتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ

بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اللہ نے نازل فرمائی یعنی کتاب، اور خریدتے ہیں اس کے بدلہ تھوڑی قیمت تو یہ وہ لوگ ہیں

مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ

جو نہیں بھرتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ، اور اللہ قیامت کے دن ان سے بات نہ کرے گا۔ اور نہ انہیں پاک کرے گا، اور اُن کے لئے

عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا

دردناک عذاب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لیا گمراہی کو ہدایت کے بدلے، اور عذاب کو مغفرت کے بدلے، سو وہ

أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا

کس قدر صبر کرنے والے ہیں آگ پر، یہ اس وجہ سے کہ بے شک اللہ نے نازل فرمایا کتاب کو حق کے ساتھ، اور بے شک جن لوگوں نے

فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾

کتاب میں اختلاف کیا بے شک وہ بڑی دور کی خلاف ورزی میں ہیں

کتاب اللہ کی تحریف کرنے والوں کا انجام

تفسیر: ان آیات میں اللہ کی نازل فرمودہ کتاب کو چھپانے اور اس میں تحریف و تبدیل کرنے اور غلط تفسیر بتانے اور پھر اس کو دنیاوی معاوضہ کا ذریعہ بنانے کی مذمت کی گئی ہے۔ اسباب النزول میں علامہ واحدی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے رؤسا اور علماء کے بارے میں نازل ہوئی جو اپنے نیچے کے لوگوں سے ہدایا وصول کرتے تھے اور وہ یہ اُمید باندھے ہوئے تھے کہ نبی آخر الزماں ﷺ اُن میں سے ہوں گے۔ لیکن جب نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت ہوگئی جو ان کے قبائل میں سے نہیں ہیں تو ان کی صفات کو بدل دیا جو توریت میں پاتے تھے اور دوسری صفات بتا دیں جو توریت میں نہیں تھیں تاکہ اُن کے عوام نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان نہ لائیں اور انکی ریاست باقی رہے اور رشوت ملتی رہے۔ اس سے پہلے بھی اللہ کی کتاب کے مضامین کو چھپانے پر وعید مذکور ہوئی تھی۔ یہود کے علماء میں یہ مرض بہت زیادہ تھا۔ دوبارہ اس مضمون کا اعادہ فرمایا اور اُن کو توجہ دلائی کہ حقیر دنیا کے حقیر مال کے لئے جو حرکتیں کرتے ہو آخرت میں اس کا نتیجہ بہت بُرا ہوگا۔ یہ حرکتیں دوزخ میں لے جانے والی ہیں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ گو اس دنیا میں کھانے پینے کی چیزوں سے پیٹ بھرتے ہیں لیکن یہ پیٹ بھرنا دوزخ کی آگ کے انگارے پیٹ میں بھرنے کا ذریعہ بنے گا یہ لوگ دنیاوی غذائیں نہیں کھا رہے ہیں بلکہ اپنے پیٹوں میں دوزخ کے انگارے ہی بھر رہے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا غصہ بہت زیادہ ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے مہربانی کے ساتھ بات بھی نہ فرمائے گا اور اُن کو پاک بھی نہ کرے گا۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ

نیکی اس میں نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لیا کرو۔ لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص

بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓىٕكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی

اللہ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور نبیوں پر، اور اپنا مال دے اس کی محبت ہوتے ہوئے

الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَ السَّآىٕلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ

قرابت والوں کو اور یتیموں کو، اور مسکینوں کو اور مسافروں کو، اور سوال کرنے والوں کو، اور گردنوں کے چھڑانے میں، اور قائم کرے نماز کو

وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ

اور ادا کرے زکوٰۃ، اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جبکہ وہ عہد کریں۔ اور صبر کرنے والے ہیں سختی میں اور تکلیف میں اور

الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

جنگ کے موقعہ پر۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے سچائی کی راہ اختیار کی اور یہی لوگ متقی ہیں

اعمالِ حسنہ اور اخلاق عالیہ کا بیان

تفسیر: یہ آیت کریمہ اُن آیات میں سے ہے جن میں بہت سے اعمال حسنہ اور اخلاق عالیہ کو ایک ہی جگہ جمع فرما دیا ہے۔ لباب النقول (ص ۲۳) میں بحوالہ مصنف عبدالرزاق حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ یہودی مغرب کی جانب نماز پڑھتے تھے اور نصاریٰ مشرق کی طرف (اور اپنے اپنے قبلہ پر جمنے ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے اور ایمان قبول نہ کرتے تھے) لہٰذا آیت لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ (الآیۃ) نازل ہوئی۔ حضرت قتادہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی (کی تفصیلات) کے بارے میں سوال کیا اُس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی آپ نے اُس شخص کو بلایا اور آیت کریمہ پڑھ کر اُسے سُنا دی۔

مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا پھر کعبہ شریف کو قبلہ قرار دے دیا گیا تو اہل کتاب اور بعض مسلمانوں کو شاق گزرا اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کی حکمت نازل فرمائی کہ کوئی جہت مقصود بالذات نہیں ہے۔ بندوں کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کریں اس کے حکموں کو مانیں جدھر رُخ کرنے کا حکم ہو اُدھر کر لیں۔ بس یہ نیکی ہے اور تقویٰ ہے اور ایمان کامل کا تقاضا ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق عمل ہو جائے مشرق یا مغرب کو رُخ ہو عند اللہ یہ کوئی چیز نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے اسکی تفسیر میں فرمایا یہ نیکی نہیں ہے کہ نماز پڑھا کرو اور دوسرے احکام پر عمل نہ کرو، اور ضحاک کا یہ قول نقل کیا ہے۔ ولکن البرو التقوی ان تؤدوا الفرائض علی وجھھا یعنی نیکی اور تقویٰ یہ ہے کہ تمام فرائض کو حکم کے مطابق صحیح طریقے پر پورا پورا ادا کرو۔

اس آیت میں بہت سے نیک کام مذکور ہیں۔ سب سے پہلے تو ایمان کا ذکر فرمایا اور اُصول عقائد بتا دیئے۔ ایمان وہ

چیز ہے جس کے بغیر کوئی نیکی قبول نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ ایمان تو لاتے نہیں تھے اور اپنے اپنے قبلہ کی طرف رُخ کرنے ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اصلی نیکی اُس شخص کی ہے جو اللہ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور اللہ تعالیٰ کی سب کتابوں پر اور اس کے سب نبیوں پر۔ جو شخص ان چیزوں پر ایمان لائے گا۔ اللہ کی کسی کتاب یا اس کے کسی رسول کی تکذیب نہ کرے گا اور رسولوں کے درمیان تفریق نہ کرے گا۔ وہ مومن ہوگا پھر ایمان کے تقاضوں کے مطابق جو اعمال کریگا اور جو اموال خرچ کرے گا اور جو اقوال اُس سے صادر ہوں گے وہ سب نیکی اور تقویٰ میں شمار ہوں گے۔

اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرنا:

اصول عقائد بتانے کے بعد مال خرچ کرنے کی عمومی مدّیں ذکر فرمائیں۔ اور مال کی محبت ہوتے ہوئے رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو مال دینا نیکی میں شمار فرمایا۔ اور جو ایسے غلام ہیں جن سے اُن کے آقاؤں نے کتابت کا معاملہ کرلیا (یعنی اُن کو کہہ دیا کہ اتنا مال لاکر دے دو تو آزاد ہو) ان کی گردنوں کے آزاد کرانے میں مال خرچ کرنے کو نیک کاموں میں ذکر فرمایا۔ لفظ عَلٰی حُبِّہٖ میں جو ضمیر مجرور مضاف الیہ ہے اس کا مرجع مفسرین نے مال کو قرار دیا ہے اور بعض حضرات نے یہ بھی احتمال نکالا ہے کہ یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اپنے مال کو وجوہِ خیر میں خرچ کرتے ہیں۔ لیکن پہلا معنی دوسرے معنی کو شامل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو شخص مال کی محبت ہوتے ہوئے مذکورہ وجوہ خیر میں خرچ کرے گا وہ اللہ تعالیٰ ہی کی محبت میں خرچ کرے گا۔

افضل الصدقہ: صحیح بخاری ص ۱۹۱ ج ۱ میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سا صدقہ ثواب کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تو ایسے وقت میں صدقہ کرے جبکہ تو تندرست ہو اور خرچ کرتے ہوئے نفس کنجوس بن رہا ہو۔ تجھے تنگدستی کا ڈر ہو اور مالداری کی اُمید لگائے بیٹھا ہو اور صدقہ کرنے میں تو اتنی دیر نہ لگا کہ جب روح حلق کو پہنچنے لگے تو تو کہنے لگے کہ فلاں کو اتنا دینا (اب تیرے دینے اور اعلان کرنے سے کیا ہوگا) اب تو فلاں کا ہو ہی چکا۔ مطلب یہ ہے کہ صدقہ کرنے کا سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ تندرستی کے وقت (جب کہ مرض الموت میں مبتلا نہیں ہے) اللہ کی راہ میں خرچ کرے، اس وقت خرچ کرتا ہے تو نفس یوں کہتا ہے کہ خرچ نہ کر پھر بھی نفس کے تقاضے کو دبا کر خرچ کرتا ہے۔ نفس کہتا ہے خرچ کروگے تو تنگدستی آجائے گی۔ اور مالدار بننے میں دیر لگے گی۔ پہلے خوب مالدار ہو جاؤ پھر خرچ کرنا۔ لیکن خرچ کرنے والا نفس کی کوئی بات نہیں مانتا اللہ کی رضا کے لئے وجوہِ خیر میں خرچ کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ موت کے وقت صدقہ کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں کو اتنا دینا، فلاں کو اتنا دینا اسکی وہ حیثیت نہیں رہتی جو تندرستی میں خرچ کرنے کی تھی اب دوسروں کو کیا دے رہے ہو اب تو دوسروں کا ہو ہی چکا۔

رشتہ داروں پر خرچ کرنے کی فضیلت:

مال خرچ کرنے کے مصارف خیر بتاتے ہوئے پہلے ذَوِی الْقُرْبٰی کا ذکر فرمایا، عربی زبان میں ذوی القربیٰ رشتہ داروں کو کہا جاتا ہے۔ سُنن الترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسکین کو صدقہ دینے میں صرف صدقہ کا ثواب ہے اور جس سے رحم کا رشتہ ہو اُس کو صدقہ دینے میں (دوہرا) ثواب ہے۔ (کیونکہ وہ) صدقہ بھی ہے اور

صلہ رحمی بھی ہے۔ رشتہ داروں میں سب سے پہلا اور بڑا رشتہ ماں باپ کا اور اپنی اولاد کا ہے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم جگہ جگہ دیا گیا ہے اور بیوی پر اور اولاد پر خرچ کرنے کی فضیلت بھی وارد ہوئی ہے۔ ان رشتوں کے تعلق سے طبعی تقاضے کے باعث سب ہی خرچ کرتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نہ صرف والدین اور اولاد بلکہ دور اور نزدیک کے دوسرے رشتہ داروں پر خرچ کرنے میں بھی ثواب رکھا ہے۔ اللہ کی رضا مقصود ہو' ریاکاری نہ ہو۔ جن پر خرچ کرے اُن پر احسان نہ جتائے۔ طعن و تشنیع نہ کرے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل خرچ کرنا اُس دینار کا ہے۔ جو تو اپنے گھر والوں پر خرچ کرے اور وہ دینار جسے تو اپنے ساتھیوں پر جہاد میں خرچ کرے (یعنی سب سے زیادہ افضل صدقہ ہے) (صحیح مسلم)

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان آدمی کا اپنے گھر والوں پر ثواب سمجھتے ہوئے خرچ کرنا صدقہ ہے (یعنی اس میں بھی ثواب ہے) صحیح بخاری ص ۳۲۴ ج ۱۔ بلکہ خرچ کرنے سے پہلے اُن لوگوں کا سب سے پہلے دھیان رکھنے کا حکم فرمایا جو اپنے عیال میں ہوں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۷۰)

یتیموں پر خرچ کرنے کی فضیلت

ذوی القربٰی کے بعد یتامٰی پر خرچ کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہ یتیم کی جمع ہے۔ یتیم ان نابالغ بچوں کو کہا جاتا ہے جن کا باپ زندہ نہ ہو۔ عموماً ایسے بچے حاجت مند ہوتے ہیں۔ ان پر خرچ کرنے کا خصوصی خیال رکھا جائے۔ اخراجات کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی اُنکی دلداری کی جائے۔ سنن ترمذی میں ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور صرف اللہ کی رضا کیلئے ایسا کیا تو ہر بال جس پر اُس کا ہاتھ گزرے گا اسکے عوض نیکیاں ملیں گی۔ اور صحیح بخاری ص ۸۸۸ ج ۲ میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنیوالا جنت میں اس طرح ساتھ ہوں گے۔ اس موقع پر آپ نے اپنی انگلیاں (انگوٹھے کے پاس والی اور بیچ والی) ساتھ ملا کر دکھائی۔ آجکل لوگوں میں یہ رواج ہو گیا ہے کہ وہ یتیموں پر اپنا مال تو کیا خرچ کرتے انہیں کا مال کھا جاتے ہیں۔ باپ کی میراث میں سے جو حصہ ان کو ملتا ہے۔ اُس کو دبا لیتے ہیں۔ اپنے نام یا اپنی اولاد کے نام کروا لیتے ہیں۔ یتیم کے مال پر قبضہ کرنے سے ذرا نہیں جھجکتے۔

مساکین پر مال خرچ کرنا:

پھر مساکین پر مال خرچ کرنے کا ذکر فرمایا' جن لوگوں کے پاس کچھ بھی نہ ہو ان کو مسکین کہا جاتا ہے۔ ان میں بہت سے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی حاجت کو کسی پر ظاہر نہیں کرتے' دُکھ' تکلیف میں بھوکے پیاسے وقت گزار لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کا بہت زیادہ ثواب ہے۔ جن کو سوال کرنے کی عادت ہوتی ہے وہ تو سوال کر کے اپنی حاجت پوری کر لیتے ہیں۔ لیکن آبرو مند آدمی سوال نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی تلاش رکھنی چاہئے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسکین وہ نہیں ہے جو (سوال کرنے کے لئے) لوگوں کے پاس چکر لگاتا ہے۔ جسے ایک لقمہ اور دو لقمہ یا ایک کھجور اور دو کھجوریں واپس کر دیتی ہیں۔ یعنی کوئی دیتا ہے کوئی نہیں دیتا (لیکن واقعی) مسکین وہ ہے' جو ایسی چیز نہیں پاتا جو اُسے بے نیاز کرے اور اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تا کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور وہ سوال کرنے کے لئے بھی کھڑا نہیں ہوتا۔

سورۂ بلد میں فرمایا: فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ فَکُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (سو کیوں گھاٹی میں سے ہو کر نہ نکلا اور اے مخاطب تجھے معلوم ہے۔ گھاٹی کیا ہے؟ گردن کا چھڑانا (یعنی غلام آزاد کرانا) یا بھوک کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم یا کسی خاک نشین کو کھانا کھلانا) اس میں غلاموں کی آزادی میں مدد دینے اور یتیم اور مسکین کو کھانا کھلانے کو گھاٹی کے پار کرنے سے تعبیر فرمایا۔ کیونکہ یہ چیزیں نفس پر شاق ہیں۔

مسافر پر مال خرچ کرنا: پھر ابن سبیل پر خرچ کرنے کا ذکر فرمایا۔ عربی زبان میں ابن سبیل مسافر کو کہا جاتا ہے۔ بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مسافر کے پاس سفر میں خرچہ ختم ہو جاتا ہے یا مال چوری ہو جاتا ہے۔ یا جیب تراش کر رقم نکال لی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا حال معلوم ہو جائے تو ان پر خرچ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ ضروری نہیں کہ یہ لوگ حاجت کا اظہار کریں تب ہی دیا جائے۔ کسی طرح بھی انکی حاجت معلوم ہو جائے تو انکی مدد کر دی جائے۔ مسافر کے گھر پر جس قدر بھی مال ہو اور اپنے اموال واملاک' جائداد کی وجہ سے غنی ہو لیکن سفر میں حاجتمند ہو گیا تو اس پر خرچ کر کے ثواب لیا جائے۔

سوال کرنے والے کو دینے کا حکم:

پھر سوال کرنے والوں کو دینے کا فرمایا۔ ان لوگوں میں کئی قسم کے لوگ ہوتے ہیں ان میں واقعی ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔ ان کو تو دینا ہی چاہئے اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں یقین تو نہیں کہ وہ حاجت مند ہوگا لیکن اُس کے ظاہر حال اور غالب گمان سے ضرورت مند ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ان کو بھی دینا دُرست ہے۔

بھیک مانگنے کا پیشہ اختیار کرنے کی ممانعت:

مجبوری میں بھوک دفع کرنے یا اور کسی حاجت کے پورا کرنے کے لئے کوئی مانگ لے تو اسکی گنجائش ہے۔ لیکن اس کو پیشہ بنالینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ جن کو سوال کی عادت ہوتی ہے وہ مانگتے رہتے ہیں۔ مال جمع کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نہ دیا جائے۔ دنیا میں تو سوال کرنے والے بن کر بے آبرو ہوتے ہی ہیں۔ قیامت کے دن بھی بے آبرو ہوں گے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے لوگوں سے ان کے مالوں کا سوال اس لئے کیا کہ مال زیادہ جمع ہو جائے تو وہ آگ کے انگاروں کا سوال کرتا ہے (جو دوزخ میں اسے ملیں گے) اب چاہے کم کرے یا زیادہ کرے (رواہ مسلم)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ انسان دنیا میں برابر سوال کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ قیامت میں اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی۔ (صحیح بخاری)

اس کا چہرہ دیکھ کر لوگ سمجھ لیں گے کہ یہ دنیا میں سائل تھا وہاں اپنے چہرے کی آبرو کھوئی تو یہاں بھی اسی کا ظہور ہوا۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ غنی کو اور ٹھیک ٹھاک بدن والے قوی آدمی کو سوال کرنا حلال نہیں ہے۔ الا یہ کہ ایسا مجبور ہو کہ تنگدستی نے اُسے مٹی میں ملا رکھا ہو (یعنی زمین کی مٹی کے سوا اُس کے پاس کچھ نہ ہو) یا قرضے میں مبتلا ہو گیا ہو جو ذلیل کرنے والا ہو اور جس شخص نے مال زیادہ کرنے کے لئے لوگوں سے سوال کیا تو قیامت کے دن اُس کا چہرہ چھلا ہوا ہوگا۔ اور یہ مال گرم پتھر بنا ہوگا جس کو جہنم سے لیکر کھاتا ہوگا اب جی چاہے تو کمی کرے اور چاہے تو زیادہ کرے۔

(مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۶۳)

ہر شخص کو اپنی اپنی ذمہ داری بتادی گئی مانگنے والا مانگنے سے پرہیز کرے اور جس سے مانگا جائے وہ موقع دیکھ کر خرچ کرے۔ سائل کو جھڑکے بھی نہیں۔ کیا معلوم مستحق ہی ہو اور غور وفکر بھی کر کے حاجت مندوں کو تلاش بھی کرے۔

مسئلہ: جو شخص مسجد میں سوال کرتا ہے اُسے نہ دے۔

غلاموں کی آزادی میں مال خرچ کرنا:

مال خرچ کرنے کے سلسلہ میں سب سے آخر میں وَفِی الرِّقَابِ فرمایا رقاب' رقبة کی جمع ہے۔ رقبہ گردن کو کہتے ہیں۔ مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں فی الرقاب سے مکاتبوں کے آزاد کرانے میں مدد دینا مراد ہے' جو غلام کسی کی ملکیت میں ہو اور اُس کا آقا کہہ دے کہ اتنا مال دے دو تو تم آزاد ہو تو اُس کو مکاتب کہا جاتا ہے۔ ان کو مال دے کر آزاد کرا دینا بھی وجوہ خیر میں سے ہے اور ثواب کا کام ہے۔ مفسر بیضاوی لکھتے ہیں کہ قیدیوں کی جانوں کا فدیہ دے کر اُن کا چھڑا لینا یا غلام خرید کر آزاد کر دینا بھی اس کے عموم میں شامل ہے (جب کبھی مسلمان اللہ کے لئے جنگ کرتے تھے اور شریعت کے مطابق جہاد اور قتال ہوتا تھا۔ اس وقت غلام اور باندیوں کے مالک ہوتے تھے۔ اب نہ اللہ کے لئے جہاد ہے نہ غلام ہیں نہ باندیاں ہیں۔ کوئی انسان کسی انسان کا مالک نہیں ہے۔ پھر جب کبھی مسلمان اللہ کے لئے جنگ کریں گے اور اُصولِ شریعت پر لڑیں گے تو پھر غلام باندیاں قبضہ میں آئیں گی) ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا: مال خرچ کرنے کے مواقع ذکر فرما کر فرمایا: وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ۔ یعنی تقویٰ کے کاموں میں یہ بھی ہے کہ فرضِ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ اُدا کریں۔ نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا بیان پہلے بھی آ چکا ہے۔ اوپر مال کے مصارف خیر بیان فرما کر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو بھی ذکر فرمایا۔ مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ پہلے مصارفِ زکوٰۃ بیان کئے اور پھر زکوٰۃ کی ادائیگی پر متوجہ فرمایا پھر لکھتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے جو وجوہ خیر بیان کی ہیں ان سے نفلی صدقات مُراد ہوں (اور نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر فرمانے میں اسکی فرضیت بتانا مقصود ہو)۔

عہد پورا کرنا: نیکی اور تقویٰ کے کام بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (اور اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے جبکہ وہ عہد کرلیں)۔ ایفائے عہد کی شریعت مطہرہ میں بڑی اہمیت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا ہو اور یہ نہ فرمایا ہو کہ: اَلَا لَا اِيْمٰنَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ (خبردار اس کا کوئی ایمان نہیں جو امانت دار نہیں اور اس کا کوئی دین نہیں جو عہد کا پورا نہیں)۔ (مشکوٰۃ المصابیح عن شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے اندر چار خصلتیں ہوں گی خالص منافق ہوگا اور جس میں اُس میں سے ایک خصلت ہوگی تو یوں مانا جائے گا کہ اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے جب تک کہ اُسے چھوڑ نہ دے۔ (۱) جب اُس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔
(۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ (۳) جب عہد کرے تو دھوکہ دے۔
(۴) جب جھگڑا کرے تو گالیاں بکے۔ (صحیح بخاری ص۱۰ ج۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ دھوکہ دینے والے

کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی دھوکہ بازی (کا جھنڈا) ہے اور اس جھنڈے کے ذریعہ اُسے پہچانا جائے گا۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ہر دھوکہ دینے والے کے لئے ایک جھنڈا ہوگا۔ جو اس کے پیچھے اس کے دھڑ پر کھڑا ہوا ہوگا۔ اور جتنا بڑا اس کا غدر ہوگا اُسی قدر وہ جھنڈا اونچا ہوگا۔ (پھر فرمایا) خبردار اُس سے بڑھ کر بڑا دھوکے باز کوئی نہیں جو عوام کا امیر ہو اور عوام کو دھوکہ دے۔ (صحیح مسلم ص ۸۳ ج ۲)

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی بندہ کو اللہ تعالیٰ کسی رعیت کا راعی بنادے (یعنی صاحب اقتدار بنا کر عوام کی نگرانی اور خیر خواہی اس کے سپرد کردے) پھر وہ اسکی خیر خواہی نہ کرے تو وہ شخص جنت کی خوشبو نہ سُونگھے گا۔ (صحیح بخاری)

اور ایک روایت میں یوں ہے کہ آنحضرت سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کی کسی جماعت کا والی ہو اور اُن کی نگرانی اور نگہداشت اُس کے ذمہ ہو پھر وہ اس حال میں مر جائے کہ وہ ان کے ساتھ خیانت کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ اُس پر جنت حرام فرمادے گا۔ (صحیح بخاری)

جو لوگ بڑے وعدے کر کے حکومت حاصل کرتے ہیں یا حکومت کے چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں پھر وہ عوام کے ساتھ غدر کرتے ہیں اور سارے عہد و پیان توڑ دیتے ہیں اُن لوگوں کے حق میں یہ کیسی سخت وعیدیں ہیں غور کرلیں۔

مسئلہ: اگر کافروں سے کوئی معاہدہ ہو تو اس کا پورا کرنا بھی لازم ہے۔ جب کسی قوم سے معاہدہ ہو اور ان کی طرف سے خیانت کا ڈر ہو اور اس کے ختم کرنے میں مصلحت ہو تو پہلے یہ بتادیں کہ ہمارا عہد باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد کوئی نئی کارروائی کرسکتے ہیں جو معاہدہ کی شرطوں کے خلاف ہو سورۂ انفال میں ارشاد فرمایا: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاۤءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَاۤئِنِيْنَ (اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو آپ وہ عہد ان کو اس طرح واپس کر دیجئے کہ آپ اور وہ برابر ہو جائیں۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنیوالوں کو پسند نہیں فرماتے) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی ایسے شخص کو قتل کیا جس سے (امان اور حفاظت جان کا وعدہ تھا) تو وہ جنت کی خوشبو نہ سُونگھے گا۔ (صحیح بخاری)

صابرین کی فضیلت: پھر صبر والوں کی تعریف فرمائی اور فرمایا: وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَاۤءِ وَالضَّرَّاۤءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اس میں سختی اور تکلیف کے زمانہ میں صبر کرنے کو نیکی اور تقویٰ والا کام بتایا ہے اور جنگ کے وقت جب کافروں سے مقابلہ ہو اُس وقت جم کر ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرنے کو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں شمار فرمایا ہے سورۂ انفال میں فرمایا۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (اے ایمان والو! جب تم کسی جماعت سے مقابلہ کرو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو۔ اُمید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ)۔

سورۂ صف میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (بے شک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو اسکی راہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ ایک عمارت ہے جس میں سیسہ پلایا گیا ہو)

آخر میں فرمایا: اُولٰۤئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰۤئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (کہ یہ حضرات جن کی صفات اُوپر مذکور ہوئیں وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان میں سچے ہیں (کیونکہ ایمان قلبی کے ساتھ ایمان کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں) اور

یہ لوگ تقویٰ والے بھی ہیں (کیونکہ حرام سے بچتے ہیں اور گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں۔)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ

اے ایمان والو! تم پر قصاص فرض کیا گیا مقتولین کے بارے میں آزاد کو آزاد کے بدلہ۔ اور غلام کو غلام کے بدلہ

وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ

اور عورت کو عورت کے بدلہ، سو جس شخص کے لئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی کردی جائے تو بھلائی کے ساتھ اس کا مطالبہ ہو اور اچھے طریقہ پر اس کی

بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ

ادائیگی ہو۔ یہ تخفیف ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت ہے۔ پھر جس نے اس کے بعد زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب

اَلِیْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَ لَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

ہے اور تمہارے لئے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقل والو! تاکہ تم پرہیز کرتے رہو

قصاص اور دیت کے بعض احکام

تفسیر: جب کوئی شخص کسی کو قتل کردے تو اُسکی جان کا بدلہ جو جان سے دیا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کو قصاص کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ قصاص قتل عمد (یعنی قصداً جان کو قتل کرنے) میں ہوتا ہے۔ جس کی تفصیلات کتب فقہ میں مرقوم ہیں۔ لفظ قصاص مماثلت یعنی برابر پر دلالت کرتا ہے چونکہ جان کا بدلہ جان سے رکھا گیا ہے اس لئے اس میں حاکم محکوم و صغیر کبیر اور امیر و غریب میں کوئی فرق نہیں اور قبیلوں اور قوموں کے اعتبار سے جو دُنیا میں امتیاز سمجھا جاتا ہے قصاص کے قانون میں اسکا کوئی اعتبار نہیں اگر مقتول کے اولیاء سب یا کوئی ایک وارث جان کے بدلہ مال لینے پر راضی ہو جائے تو اس مال کو دیت (خون بہا) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو خطاءً قتل کردے (جس کی کئی صورتیں ہیں اور جس کے احکام سورۂ نساء میں مذکور ہیں) تو اس کے عوض مال واجب ہوتا ہے اس مال کو بھی دیت کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے اعضاء میں سے کسی عضو کو کاٹ دے تو اس میں بھی بعض صورتوں میں قصاص اور بعض صورتوں میں دیت واجب ہوتی ہے۔ اعضاء کی دیت کو ارش بھی کہا جاتا ہے۔ اعضاء کے قصاص کا ذکر سورۂ مائدہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہاں قصاص نفس کے بعض احکام ذکر فرمائے ہیں۔ لباب النقول میں حضرت سعد بن جبیرؓ سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں عرب کے دو قبیلے آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے اور اُن میں کُشت و خون کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ غلام اور عورتوں تک کو قتل کر بیٹھتے تھے ابھی تک ان کے آپس کے قصاص یا دیت کے فیصلے نہ ہونے پائے تھے کہ دونوں قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اُن میں سے ایک قبیلہ دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو زیادہ صاحب عزت اور رفعت سمجھتا تھا اس لئے اُنہوں نے قسم کھائی کہ ہم راضی نہ ہوں گے جب تک کہ ہمارے غلام کے بدلہ آزاد کو قتل نہ کیا جائے اور ہماری عورت کے بدلہ دوسرے قبیلہ کا مرد قتل نہ کیا جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جس میں ارشاد فرمایا کہ آزاد آزاد کے بدلہ اور غلام، غلام کے بدلہ اور عورت، عورت کے بدلہ قتل کی جائے۔ اس شانِ نزول سے معلوم ہو گیا کہ اَلْعَبْدُ بِالْعَبْدِ اور

اَلْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ غلام کے بدلہ آزاد قتل نہ ہو اور عورت کے بدلہ مرد قتل نہ ہو۔ سورۂ مائدہ میں جو اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ فرمایا ہے۔ اس میں ہر جان کو دوسری جان کے برابر قرار دیا ہے۔ مفسر ابن کثیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اہل عرب مرد کو عورت کے بدلہ قتل نہیں کرتے تھے بلکہ مرد کو مرد کے بدلہ اور عورت کو عورت کے بدلہ قتل کرتے تھے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ کا حکم نازل فرمایا۔

قصاص اور وارثوں کا حق

قتل عمد (جس میں قصاص ہے) اس پر قصاص لینا مقتول کے وارثوں کا حق ہے۔ مقتول کے جتنے بھی شرعی وارث ہوں وہ سب قصاص کے مستحق ہیں لیکن چونکہ قصاص قابل تقسیم نہیں ہے اس لئے اگر کوئی بھی ایک وارث اپنا حق قصاص معاف کر دے تو اب دوسرے وارث بھی قصاص نہیں لے سکتے اور اب وہ دیت ہی لے سکتے ہیں۔ اور جس نے قصاص معاف کر دیا اب وہ بھی دیت لے گا۔ یہاں اگر اس نے اپنے حصہ کی دیت بھی معاف کر دی تو وہ بھی معاف ہو جائے گی۔ ایک جان کی دیت سو اُونٹ ہیں۔ جس کی تفصیل ان شاء اللہ سورۂ نساء کی آیت وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً کی تفسیر میں بیان ہوگی۔ اگر قاتل اور مقتول کے ورثاء آپس میں مال کی کسی مقدار معلوم پر صلح کر لیں تب بھی قصاص ساقط ہو جاتا ہے اور جو مال مصالحت یا دیت کے طور پر وصول ہو مقتول کے وارث شرعی میراث کے حصوں کے مطابق اس کے مالک اور وارث ہوں گے۔ یہ دیت کے طور پر یا مصالحت کے ذریعہ مال لینا فریقین کی رضامندی سے ہو سکتا ہے۔

قصاص کے عوض مال لینے کی مشروعیت اُمت محمدیہ ﷺ کے لئے تخفیف اور رحمت ہے

قتل عمد کی صورت میں باہمی رضامندی سے قصاص کے عوض مال دے کر قاتل کی جان بچا دینا اور دیت کا حلال ہونا یا بطور مصالحت کے کچھ مال لے لینا یہ اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف ہے اور خاص رحمت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل پر قصاص ہی فرض تھا۔ دیت اُن کے لئے مشروع نہ تھی۔ حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر رحم فرمایا کہ اُن کو دیت لینے کا حق دیا۔ اور اس اُمت سے پہلے دیت حلال نہیں تھی۔ اہل توریت پر صرف قصاص فرض تھا اور دیت مشروع نہ تھی اور اہل انجیل کو معاف کر دینے ہی کا حکم تھا۔ اس اُمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے قصاص اور معافی اور دیت تینوں چیزیں مشروع فرما دیں۔ (ابن کثیر)

جب کوئی ایک وارث یا سب وارث خون معاف کر دیں یا دیت پر راضی ہو جائیں اور دیت کا دینا واجب ہو جائے یا مصالحت کے ذریعہ آپس میں کچھ مال دینا طے ہو جائے تو اب مقتول کے ورثاء کو چاہئے کہ حسن مطالبہ کریں اور سختی اور تشدد سے کام نہ لیں فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ میں اسی کا حکم فرمایا ہے اور قاتل پر لازم ہے کہ بغیر ٹال مٹول کے اور بغیر تقاضوں کے وارثوں کو طے شدہ مال ادا کر دے وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ میں اسی کا حکم دیا ہے۔ جب آپس میں معاملات طے ہو گئے۔ تو دونوں فریقوں میں سے جو شخص بھی زیادتی کرے گا وہ آخرت میں عذاب الیم میں گرفتار ہوگا۔ اُسے سخت عذاب دیا جائے گا۔ مثلاً قاتل اگر دیت پر معاملہ کر کے دیت دینے سے انکاری ہو جائے کہیں چھپ جائے' فرار ہو جائے تو یہ اسکی طرف سے ظلم اور زیادتی ہے اور مثلاً مقتول کے اولیاء دیت لیکر بھی قتل کر دیں تو یہ اُن کی طرف سے ظلم اور زیادتی ہوگی۔ ہر

فریق کے لئے عذاب دوزخ ہے۔ حضرت ابو شریح خزاعی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سُنا ہے کہ جس شخص کا کوئی خونی نقصان ہو جائے (یعنی اُس کا کوئی عزیز عمداً قتل کر دیا جائے یا زخم پہنچ جائے) تو اُسے تین چیزوں کا اختیار ہے قصاص لے لے یا معاف کر دے یا دیت لے لے اس کے سوا اگر کوئی چوتھا کام کرنا چاہے تو اس کے ہاتھ پکڑ لو ان میں سے کسی چیز کو اختیار کرنے کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لئے دوزخ ہے اس میں ہمیشہ رہے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

قانونِ قصاص میں بڑی زندگی ہے

قصاص کا قانون جاری کرنے اور اس کو عملاً نافذ کرنے میں بہت بڑی زندگی ہے۔ اس مضمون کو وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ۔ میں بیان فرمایا ہے۔ قصاص میں بظاہر قاتل کی موت ہے لیکن اُسے اُمت کے حق میں بڑی حیات فرمایا۔ کیونکہ جب قصاص کا قانون نافذ ہو گا تو قاتل بھی قتل کرنے سے بچے گا اور ہر شخص کے کنبہ اور قبیلے کے لوگ اس بات کے فکر مند رہیں گے کہ ہمارے کسی فرد سے کوئی شخص قتل نہ ہو جائے۔ مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں ائمہ اربعہ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اگر ایک شخص کو چند آدمی مل کر قتل کر دیں تو اُن سب کو اُس ایک مقتول کے عوض قتل کیا جائے گا۔

حضرت سعید بن المسیبؒ نے بیان فرمایا کہ پانچ یا سات آدمیوں نے کسی ایک شخص کو تنہائی میں پوشیدہ طور پر قتل کر دیا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پانچوں یا ساتوں کو ایک شخص کے قصاص میں قتل کر دیا اور فرمایا کہ اگر شہر صنعا کے سارے آدمی مل کر بھی شخص واحد کو قتل کرتے تو میں ان سب کو قتل کر دیتا۔ (رواہ مالک وروی البخاری عن ابن عمرؓ نحوہ کما فی المشکوٰۃ)

قصاص عین عدل ہے، اس کو ظلم کہنا ظلم ہے

قصاص کا قانون نافذ ہونے سے اور اس پر عمل کرنے سے بہت سی جانیں بچتی ہیں اور لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے باز رہتے ہیں اس لئے قصاص کو بڑی حیات کا ذریعہ بتایا۔ بہت سے جاہل قصاص کے قانون کو ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ ظلم کا معنی بھی نہیں جانتے، ظلم کرنے والا تو قاتل ہے جس نے ناحق قصداً و عمداً کسی کو قتل کیا قتل کے بدلہ میں قاتل کو قتل کر دینا عین انصاف ہے اس کو ظلم سے تعبیر کر دینا جہالت اور حماقت ہے یہ جاہل کہتے ہیں کہ قاتل کو قتل نہ کیا جائے بلکہ جیل میں ڈالدیا جائے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے تو اور زیادہ قتل پر جرأت ہو جاتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ قتل تو کر ہی دوں، تھوڑی بہت جیل بھگت لوں گا۔ جن کا مزاج قتل اور غارت گری اور ڈکیتی اور فتنہ فساد کا ہے وہ جیل سے بالکل نہیں ڈرتے۔ جیل کی دیواریں پھاند کر اور کھڑکیاں توڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کے نزدیک انسان کی جانوں کی قیمت نہیں ہے وہ لوگ قصاص کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اُنہیں قاتل پر رحم آتا ہے۔ عامۃ الناس کی جانوں پر رحم نہیں آتا۔ سُنن ابوداؤد میں ہے کہ جس نے قصداً قتل کیا تو اس میں قصاص ہے۔ اور جو شخص قصاص نافذ کرنے کے بارے میں آڑے آجائے تو اس پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی لعنت ہے اور سب انسانوں کی لعنت ہے۔ (آخر حدیث من کتاب الدیات)۔

قصاص یا دیت معاف کرنا سَربراہ مملکت کے اختیار میں نہیں ہے

دنیا میں ایک یہ جاہلانہ قانون نافذ ہے کہ ملک کا سربراہ قاتل کی درخواست پر اپنے ذاتی و جماعتی فائدہ کو سامنے رکھ کر قاتل کو معاف کر دیتا ہے۔ یہ شریعت اسلامیہ کے بالکل خلاف ہے مقتول کے وارثوں کو حق ہے کہ معاف کریں یا قصاص

لیں یا دیت لیں، کسی امیر یا وزیر یا صدر یا بادشاہ کو معافی دینے کا اور وارثوں کا حق معاف کرنے کا بالکل اختیار نہیں ہے۔ جو بھی کوئی سربراہ ایسا کرے گا۔ وہ قانون قرآن کا باغی ہوگا۔ اور اسکی سزا کا مستحق ہوگا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ

تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے کسی کو موت حاضر ہو جائے تو اپنے والدین اور قرابت داروں کے لئے وصیت کرے۔

وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا

بشرطیکہ مال چھوڑا ہو۔ یہ حکم لازم ہے اُن لوگوں پر جو خدا کا خوف رکھتے ہیں پھر جو شخص سننے کے بعد اُس کو بدل دے

إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ

اُس کا گناہ انہیں لوگوں پر ہوگا جو اُس کو تبدیل کر دیں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔ سو جو شخص وصیت کرنے والے کی جانب سے کسی

جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

جانب داری یا گناہ کا خوف کھائے پھر ان کے درمیان صلح کرا دے سو اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے

وصیت کے احکام

تفسیر: اس آیت کریمہ میں والدین اور قرابت داروں کے لئے مال کی وصیت کرنا فرض قرار دیا ہے جب کسی کی موت کے آثار معلوم ہونے لگیں تو وہ وصیت کر دے۔ مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس وصیت کی فرضیت میراث کے حصے مقرر ہونے کے بعد منسوخ ہو چکی ہے۔ والدین وارثوں میں شامل ہیں۔ جن کے حصے سورہ نساء کے دوسرے رکوع میں مذکور ہیں۔ اور وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے جب تک کہ دوسرے ورثاء کی اجازت نہ ہو لما ورد فی الحدیث لا وصیة لوارث اخرجه الترمذی و ابوداؤد اجازت وصیت کرنے والے کی موت کے بعد معتبر ہوگی۔ اگر دوسرے ورثاء اجازت دیں تو کسی وارث کے لئے وصیت نافذ ہو سکتی ہے۔ البتہ غیر وارث رشتہ داروں کے لئے وصیت کرنا جائز ہے بلکہ مستحب ہے لیکن وصیت کا اُصول یہ ہے کہ وہ صرف تہائی مال میں نافذ ہو سکتی ہے بہتر یہ ہے کہ مرنے والا تہائی مال سے کم میں وصیت کرے اور بہت سے بہت تہائی مال تک وصیت کرنے کی گنجائش ہے۔ جتنی بھی وصیتیں ہوں گی وہ قرضوں کی ادائیگی کے بعد جو مال بچے اسکے تہائی میں نافذ ہوں گی۔

اگر تہائی سے زیادہ مال کی وصیت ہو تو وہ بھی بالغ ورثاء کی اجازت سے مرنے والے کی موت کے بعد نافذ ہو سکتی ہے۔ اس کی زندگی میں جو کوئی وارث اجازت دے دے وہ معتبر نہیں ہے۔ اگر وارثوں نے اسکی زندگی میں تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کی اجازت دی تھی تو اسکی موت کے بعد منسوخ کر سکتے ہیں۔ اور وصیت کرنے والا جو کچھ وصیت کر دے وہ بھی اپنی زندگی میں منسوخ کر سکتا ہے۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی میں اللہ کے لئے خرچ کرتا رہے۔ اہل و عیال پر بھی خرچ کرے اور دوسرے اعزہ اور اقربا پر بھی اور یتامیٰ اور مساکین پر بھی۔ مساجد و مدارس کے لئے وقف کرے مسجدیں بنوائے۔ مدرسے کھولے۔

وصیت نافذ کرنے سے پہلے قرضے ادا کئے جائیں گے

وصیت کے بارے میں اول تو یہ قانون ہے کہ قرضوں کی ادائیگی کے بعد باقی تہائی مال میں نافذ ہو سکتی ہے۔ دوسرے وصیت کے مطابق خرچ کرنے کا تعلق وارثوں سے ہو جاتا ہے۔ وہ دیانتداری سے خرچ کریں یا نہ کریں اس لئے جو کچھ فی سبیل اللہ خرچ کرنا چاہئے زندگی میں خرچ کر دے۔ البتہ ایسا نہ ہو کہ گھر والے ضرورت مند ہوں۔ ان کی ضروری حاجتیں رُکی رہیں۔ اور یہ باہر خرچ کرتا رہے اور ایسا بھی نہ ہو کہ لوگوں کے قرضے چڑھے ہوئے ہوں اور سخاوت کے جوش میں ثواب کے کاموں میں خرچ کرتا رہے اور قرضوں کی ادائیگی رُکی رہے۔ اگر زندگی میں نیک کاموں میں خرچ نہ کر سکا اور موت سے پہلے وصیت کر دی کہ فلاں فلاں جگہ اتنا مال خرچ کر دیا جائے۔ اور قرض خواہوں کے قرض کا ذکر چھوڑ دیا تب بھی پہلے قرضے ہی ادا کئے جائیں گے اگر اتنا زیادہ قرض ہے کہ جتنا مال ہے وہ سب انکی ادائیگی میں ختم ہو جاتا ہے تو نہ وصیت نافذ ہو گی نہ میراث میں کسی کو کچھ ملے گا۔

مسئلہ: وصیت کرنے میں پہلے فرائض کو مقدم کیا جائے۔ مثلاً اگر وصیت کرنیوالے نے حج فرض نہیں کیا تھا یا اس کے ذمہ زکوٰتیں فرض ہوئی تھیں اور اُس نے نہیں دیں یا کفارات واجبہ ہیں جن کی ادائیگی باقی ہے۔ ان چیزوں کی ادائیگی کو وصیت میں مقدم کرے۔ اگر اس نے فرائض اور واجبات کے ساتھ غیر فرض اور غیر واجب کاموں کی وصیت کر دی تب بھی اُن لوگوں پر لازم ہے جن کے قبضے میں اُس کا مال آ جائے کہ فرائض اور واجبات کو مقدم کریں۔ اگر چہ اُس نے وصیت میں ان کا ذکر بعد میں کیا ہو۔

حج بدل کی وصیت:

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ قرضوں کی ادائیگی کے بعد تہائی مال میں وصیت نافذ ہو سکتی ہے (اگر چہ فرائض اور واجبات کی ادائیگی کی وصیت ہو) پس اگر حج بدل کی وصیت کی ہو اور اس کے لئے کسی کو بھیجنا چاہیں اور تہائی مال اس کے لئے کافی نہ ہو اور بالغ ورثاء اپنے پاس سے بقدر ضرورت تہائی سے زائد مال دے دیں تو بہتر ہے لیکن یہ ان پر واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: یہ حج مرنے والے کے شہر سے کسی شخص کو بھیج کر کرائیں جو سواری پر جا کر اس کی طرف سے حج کرلے اگر اسکی وصیت کے مطابق اس کے شہر سے کسی کو بھیج کر حج کرانا چاہیں اور اس کے لئے وصیت کی رقم کافی نہیں ہو رہی ہے اور ورثاء اپنے پاس سے بھی نہیں دیتے تو جس کسی شہر سے بھی آدمی بھیج کر حج کرایا جا سکتا ہو وہیں سے کسی کو بھیج دیا جائے اور وصیت کی رقم اس پر خرچ کر دی جائے۔

گناہ کی وصیت کرنا گناہ ہے:

کسی بھی گناہ کی وصیت کرنا حلال نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص گناہوں میں مال خرچ کرنے کی وصیت کر دے تو وہ نافذ نہ ہو گی۔ شرک اور بدعت کے کاموں کے لئے کوئی شخص وصیت کر دے تو وہ بھی نافذ نہ ہو گی۔ اس کے متعلقین اور ورثاء پر لازم ہے کہ اسکی اسطرح کی وصیت کو نافذ نہ کریں۔

وارثوں کے لئے مال چھوڑنا بھی ثواب ہے

وارثوں کے لئے مال چھوڑ کر جانا بھی ثواب ہے۔ صحیح بخاری (ص ۳۸۳ ج ۱) میں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ

عنہ نے بیان فرمایا کہ میں فتح مکہ کے سال ایسا مریض ہوا کہ یہ محسوس ہونے لگا کہ ابھی موت آنیوالی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لئے تشریف لائے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس بہت سا مال ہے اور (فرائض میراث کے اعتبار سے) صرف میری بیٹی کو میراث کا حصہ پہنچتا ہے تو کیا میں اپنے پورے مال کی وصیت کر دوں۔ آپ نے فرمایا نہیں میں نے عرض کیا دو تہائی مال کی وصیت کر دوں' فرمایا نہیں' میں نے عرض کیا آدھے مال کی وصیت کر دوں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا تہائی مال کی وصیت کر دوں۔ آپ نے فرمایا "ہاں" تہائی مال کی وصیت کر سکتے ہو اور تہائی (بھی) بہت ہے۔ بلاشبہ اگر تم اپنے وارثوں کو (جن کو عصبہ ہونے کے اعتبار سے میراث پہنچتی ہے) مال دار ہونے کی حالت میں چھوڑ دو تو یہ اُس سے بہتر ہے کہ تم انہیں تنگدستی کی حالت میں چھوڑ و جو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا کریں اور اس میں شک نہیں کہ تم جو بھی کوئی خرچہ کرو گے جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تمہیں ضرور اس کا ثواب ملے گا۔ یہاں تک کہ ایک لقمہ اُٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دے دو گے تو اس کا بھی ثواب ملے گا۔

وصیت میں دیر نہ کی جائے

انسان دنیا میں رہتا ہے تو لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے کسی سے لینا کسی کو دینا حقوق واجبہ ہوتے ہیں۔ قرضے لئے ہوئے ہوتے ہیں امانتیں رکھی ہوئی ہوتی ہیں اور موت کا کچھ پتہ نہیں کب آجائے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ وصیت لکھی ہوئی ہر وقت تیار رہے۔ جس جس کا جو کچھ حق ہے یا قرضہ ہے یا امانتیں ہیں یا دینی فرائض اور واجبات ہیں جن کی ادائیگی باقی ہے ان سب کو کسی کاپی وغیرہ میں لکھ کر رکھے۔ اور وصیت تیار رہے تا کہ اچانک موت آ جائے تو وارثین ان سب کو ادا کر دیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کسی مسلمان کے پاس کوئی چیز ہو جسکی وصیت کرنا ہو اس کے لئے یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ دو راتیں گزر جائیں اور اسکی وصیت اُس کے پاس لکھی ہوئی نہ ہو۔ (صحیح بخاری)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو وصیت پر موت آئی (یعنی وصیت کر کے مرا) وہ صحیح راستہ پر اور سنت پر مرا اور تقویٰ اور شہادت پر مرا اور بخشا ہوا ہونے کی حالت میں مرا۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۹۴)

وصیت کے بدلنے کا گناہ

جب وصیت کرنے والا وصیت کر کے وفات پا جائے تو اس کے ورثاء اور جس کو اُس نے وصی یا مختار بنایا ہو اسی طرح حاکم اور قاضی ان لوگوں پر ضروری ہے کہ مرنے والے نے جو وصیت کی اس کے مطابق شرعی اُصول پر نافذ کر دیں۔ وصیت کرنے والا تو دنیا سے چلا گیا اس کے اختیارات ختم ہو گئے۔ اب مال دوسروں کے قبضہ میں ہے۔ ان لوگوں پر لازم ہے کہ وصیت کو صحیح طریقہ پر نافذ کریں۔ جس کو جتنا دینا ہے اُس کو دینے سے دریغ نہ کریں۔ فقراء اور مساکین کے لئے وصیت کی ہے انہیں معلوم بھی نہیں کہ ہمارے لئے کوئی وصیت کی گئی ہے۔ اور بعض رشتہ دار جو دور رہتے ہیں اُن کے لئے وصیت کی اور انہیں اس کا پتہ نہیں ہے یہ لوگ خود سے تقاضا کریں گے نہیں۔ اب جن کے قبضہ میں مال ہے وہ دیں یا نہ دیں' کم دیں زیادہ دیں' وصیت کو چھپائیں یا ظاہر کریں۔ یہ سب اُن کے اختیارات کو سامنے رکھتے ہوئے سارا کام انجام دیں۔ وصیت کو اَدل بدل نہ کریں۔ اگر وصیت میں تبدیلی کریں گے تو گنہگار رہوں گے اور آخرت میں باز پُرس ہوگی۔ فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى

الَّذِیْنَ یُبَدِّلُوْنَهٗ میں اس مضمون کو بیان فرمایا ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص وصیت کر کے مر جائے (اور ادائیگی کے لئے مال بھی چھوڑا ہو) تو اس کی آخرت کی ذمہ داری ختم ہوگئی اب ذمہ داری وارثوں پر آگئی۔ اگر انہوں نے ادائیگی نہ کی تو وہ لوگ گنہگار ہوں گے ان کا ادا نہ کرنا تبدیل وصیت کی ایک صورت ہے۔ نیز علامہ جصاص لکھتے ہیں کہ جس کسی پر زکوٰۃ فرض ہوئی اور اسکی ادائیگی کے بغیر مر گیا۔ تو وہ گناہگار ہوگا اور زکوٰۃ روکنے والوں کے حکم میں داخل ہوگا اگر اس نے ادائیگی زکوٰۃ کی وصیت کر دی اور ورثا نے وصیت نافذ نہ کی تو وہ گناہ سے بری ہوگیا اور اب وصیت بدلنے والے گنہگار ہوں گے۔ علامہ جصاص نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر وصیت میں ظلم کیا گیا ہو مثلاً پورے مال کی وصیت کر دی یا ورثاء کی اجازت کے بغیر تہائی مال سے زائد کی وصیت کر دی تو اس کا بدل دینا واجب ہے۔

آخر میں فرمایا: فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ۔ (سو وہ شخص وصیت کرنے والے کی جانب سے کسی جانبداری کا یا گناہ کا خوف کھائے پھر اُن کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے) بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ وصیت کرنیوالا خطأً یا عمداً وصیت میں کوئی ایسا طریقہ اختیار کر لیتا ہے جس میں کسی وارث یا دوسرے کسی رشتہ دار کی طرف میلان ہو جاتا ہے اور وصیت میں عدل باقی نہیں رہتا اگر ایسی کوئی صورت ہو جائے اور کسی کو معلوم ہو جائے کہ ایسی وصیت کی ہے یا ایسی وصیت کرنے کا ارادہ کیا ہے اور وہ بیچ میں پڑ کر موصی (وصیت کرنے والا) اور موصیٰ لهم (جن کے لئے وصیت کی جائے) کے درمیان اصلاح کر دے اور اُن کو صحیح طریقہ بتا دے جو شرعاً درست ہو۔ یا صاحب اقتدار اس کو بدل دے تو اس کو بدلنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ جو شخص ایسا کرے گا اللہ اسکی مغفرت فرمائے گا یہ وہ تبدیلی نہیں ہے جس کی مذمت فَمَنْ بَدَّلَهٗ میں کی گئی ہے۔ جو وصیت عادلانہ نہ ہو اسکی کئی صورتیں مفسرین نے لکھی ہیں۔ اس میں سے ایک یہ ہے کہ دُور کے رشتہ داروں کے لئے وصیت کر دے اور قریب کے رشتہ داروں کو چھوڑ دے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ چونکہ بیٹوں کے ہوتے ہوئے پوتوں کو میراث نہیں مل سکتی اور کسی ایک بیٹے کو زیادہ مال پہنچانا چاہتا ہے تو پوتوں کے غیر وارث ہونے کا بہانہ بنا کر پوتوں کے لئے وصیت کر دے تا کہ اُن پوتوں کے باپ کو مال زیادہ پہنچ جائے اور ایک صورت یہ ہے کہ کل مال کی وصیت کر دے یا تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کر دے، جو شخص بھی اس قسم کی وصیت پر واقف ہو کر صحیح طریقہ بتائے گا۔ اور راہ صحیح پر ڈالے گا اسکو تبدیل وصیت کا گناہ نہ ہوگا۔

بعض لوگ بیٹوں کو میراث سے محروم کرنے کے لئے زندگی ہی میں بیٹوں کے نام یا کسی ایک بیٹے کے نام جائیداد کر دیتے ہیں تا کہ دوسری اولاد محروم ہو جائے۔ اور بھی طرح طرح کی غیر شرعی وصیتیں کر جاتے ہیں جس سے گنہگار ہوتے ہیں۔ وارث کو میراث سے محروم کرنے کے لئے کسی کو مال ہبہ کر دینا جائز نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ کوئی مرد اور کوئی عورت ساٹھ سال تک اللہ کی فرمانبرداری میں لگے رہیں۔ پھر ان کو موت حاضر ہو جائے اور وصیت کرنے میں کسی کو ضرر پہنچانے کا پہلو اختیار کر لیں تو ان کے لئے دوزخ واجب ہو جاتی ہے۔ حدیث بیان کر کے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سورۃ نساء کی آیت مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصٰی بِهَآ اَوْ دَیْنٍ غَیْرَ مُضَآرٍّ تلاوت کی اور وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ تک پڑھی۔ (رواہ احمد کمافی المشکوٰۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے وارث کی میراث

سے کوئی حصہ کاٹ دیا۔ اللہ تعالیٰ جنت سے اُس کی میراث کاٹ دیں گے (سُنن ابن ماجہ)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے ایمان والو! فرض کئے گئے تم پر روزے جیسا کہ فرض کئے گئے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ

تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ چند دن کے روزے رکھ لو سو جو شخص تم میں سے مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں کی گنتی

مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ

کر کے روزے رکھ لے۔ اور جن لوگوں کو روزہ رکھنے کی طاقت ہے ان کے ذمہ ہے فدیہ ایک مسکین کے کھانے کا۔ پس جو شخص اپنی خوشی سے کوئی خیر کا کام کرلے تو وہ

خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

اس کے لئے بہتر ہے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو

رمضان کے روزوں کی فرضیت اور انکے ضروری احکام

تفسیر: ان آیات میں رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت کا اعلان اور اظہار فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ (حضرت) محمد (مصطفیٰ ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ ادا کرنا (۴) حج کرنا (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔ (صحیح بخاری)

نماز اور روزہ دونوں بدنی عبادتیں ہیں اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے اور حج میں مال بھی خرچ ہوتا ہے بدنی محنت بھی ہوتی ہے اس لئے وہ بدنی عبادت بھی ہے اور مالی عبادت بھی ہے۔ نماز تو نبوت کے پانچویں ہی سال مکہ معظمہ ہی میں فرض ہو گئی تھی جو شب معراج میں عطاء کی گئی۔ اور رمضان شریف کے روزے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ۲ھ میں فرض ہوئے۔ جس طرح نماز اور زکوٰۃ پہلی اُمتوں پر فرض تھی۔ اس طرح سے روزے بھی اُن پر فرض تھے كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ میں یہ بتایا ہے کہ روزے کوئی نئی چیز نہیں ہیں یہ پہلی اُمتوں پر بھی فرض ہوئے تھے انہوں نے بھی روزے رکھے تھے تم بھی رکھو۔

روزہ سے صفت تقویٰ پیدا ہوتی ہے

پھر روزہ کی حکمت اور فائدہ بتاتے ہوئے فرمایا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ روزے رکھنے سے نفس کے تقاضوں پر زد پڑتی ہے اور قوی شہوانیہ میں ضعف آتا ہے اور تقویٰ صغیرہ کبیرہ ظاہرہ اور باطنہ گناہوں سے بچنے کا نام ہے۔ آیت کریمہ میں بتایا کہ روزہ کی فرضیت تقویٰ حاصل کرنے کے لئے ہے بات یہ ہے کہ انسان کے اندر بہیمیت کے جذبات ہیں نفسانی خواہشات ساتھ لگی ہوئی ہیں جن سے نفس کا اُبھار معاصی کی طرف ہوتا رہتا ہے۔ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس سے بہیمیت کے جذبات کمزور ہوتے ہیں اور نفس کا اُبھار کم ہو جاتا ہے اور شہوات ولذّات کی اُمنگ گھٹ جاتی ہے۔ پورے رمضان کے

روزے رکھنا ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ ایک مہینہ دن میں کھانے پینے اور جنسی تعلقات کے مقتضٰی پر عمل کرنے سے اگر باز رہے تو باطن کے اندر ایک نکھار اور نفس کے اندر سدھار پیدا ہو جاتا ہے اگر کوئی شخص روزے اُن احکام و آداب کی روشنی میں رکھ لے جو احادیث میں وارد ہوئے ہیں تو واقعۃً نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔ جو گناہ انسان سے سرزد ہو جاتے ہیں ان میں سب سے زیادہ یہ چیزیں گناہ کا باعث بنتی ہیں۔ ایک منہ دوسری شرمگاہ۔ حضرت امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے زیادہ کون سی چیز دوزخ میں داخل کرانے کا ذریعہ بنے گی۔ آپ نے جواب دیا۔ الفم و الفرج، یعنی منہ اور شرمگاہ (ان دونوں کو دوزخ میں داخل کرانے میں زیادہ دخل ہے) روزہ میں منہ اور شرمگاہ دونوں پر پابندی ہوتی ہے۔ اور مذکورہ دونوں راہوں سے جو جو گناہ ہو سکتے ہیں روزہ ان سے باز رکھنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے اسی لئے تو ایک حدیث میں فرمایا کہ: اَلصِّیَامُ جُنَّۃٌ یعنی روزہ ڈھال ہے (گناہ سے اور آتش دوزخ سے بچاتا ہے (بخاری ص ۲۵۴ ج ۱)

اگر روزہ کو پورے اہتمام اور احکام و آداب کی مکمل رعایت کے ساتھ پورا کیا جائے تو بلا شبہ گناہوں سے محفوظ رہنا آسان ہو جاتا ہے۔ خاص روزہ کے وقت بھی اس کے بعد بھی اگر کسی نے روزہ کے آداب کا خیال نہ کیا روزہ کی نیت کر لی کھانے پینے اور خواہش نفسانی سے باز رہا مگر حرام کمانے اور غیبت کرنے میں لگا رہا تو اس سے فرض تو ادا ہو جائے گا۔ مگر روزہ کی برکات و ثمرات سے محرومی رہے گی۔ جیسا کہ سُنن نسائی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلصِّیَامُ جُنَّۃٌ مَا لَمْ یَخْرِقْھَا (یعنی روزہ ڈھال ہے جب تک کہ اُس) کو پھاڑ نہ ڈالے)۔ اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ: من لم یدع قول الزور و العمل به فلیس لله حاجة فی ان یدع طعامه و شرابه (جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹی بات اور غلط کام نہ چھوڑے تو اللہ کو کچھ حاجت نہیں کہ وہ (گناہوں کو چھوڑے بغیر) محض کھانا پینا چھوڑ دے۔ (بخاری)

معلوم ہوا کہ کھانا پینا اور جنسی تعلقات چھوڑنے ہی سے روزہ کامل نہیں ہوتا بلکہ روزہ کو فواحش و منکرات اور ہر طرح کے گناہوں سے محفوظ رکھنا لازم ہے روزہ منہ میں ہو اور آدمی بدکلامی کرے یہ اس کے لئے زیب نہیں دیتا۔ اسی لئے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وَاِذَا کَانَ یَوْمُ صَوْمِ اَحَدِکُمْ فَلَا یَرْفُثْ وَلَا یَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّہٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَہٗ فَلْیَقُلْ اِنِّی اِمْرُءٌ صَائِمٌ (یعنی جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو گندی باتیں نہ کرے۔ شور نہ مچائے، اگر کوئی شخص گالی گلوچ یا لڑائی جھگڑا کرنے لگے تو (اس کو گالی گلوچ سے جواب نہ دے بلکہ) یوں کہہ دے کہ میں روزہ دار آدمی ہوں۔ (گالی گلوچ کرنا یا لڑائی کرنا میرا کام نہیں) (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا فخر بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بہت سے روزے دار ایسے ہیں جن کے لئے (حرام کھانے یا حرام کام کرنے یا غیبت کرنے کی وجہ سے) پیاس کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور بہت سے تہجد گزار ایسے ہیں جن کے لئے (ریا کاری کی وجہ سے جاگنے کے سوا کچھ نہیں) (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۷۷)

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فرما کر یہ بتایا کہ یہ چند دن کے روزے ہیں۔ ان روزوں کو رکھ لینا کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ اس کے بعد مریض اور مسافر کیلئے آسانی بیان فرمائی کہ وہ اپنے ایام مرض اور ایامِ سفر میں روزہ نہ رکھیں تو رمضان گزر جانے کے بعد

دوسرے دنوں میں اپنی ہی گنتی کر کے روزے رکھ لیں۔ یعنی چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کر لیں۔ اسکی توضیح آئندہ آیت کے ذیل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ!

یہ جو فرمایا وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کے کھانے کا) یہ ابتدائی حکم تھا۔ سُنن ابو داوٗد میں ص ۷۴ ج ا پر ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو (ہر ماہ) تین دن کے روزے رکھنے کا حکم فرمایا پھر رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہو گیا۔ لوگوں کو روزہ رکھنے کی عادت نہ تھی۔ اور روزہ رکھنا اُن کے لئے بھاری کام تھا۔ لہٰذا یہ اجازت تھی کہ طاقت ہوتے ہوئے بھی جو شخص روزہ نہ رکھے وہ ہر روزہ کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ پھر آیت کریمہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی (اور طاقت ہوتے ہوئے روزہ نہ رکھنے کی اجازت منسوخ ہو گئی) اور سب کو روزہ رکھنے کا حکم ہوا۔ البتہ مریض اور مسافر کے لئے اجازت باقی رہی کہ وہ رمضان میں روزہ نہ رکھیں اور بعد میں روزہ رکھ لیں۔ مسند امام احمد میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث نقل کی ہے جس میں یہ ہے۔

روزوں کے احکام میں تین انقلاب

کہ نماز کے احکام میں تین چیزوں میں انقلاب ہوا ہے اور روزوں کے احکام میں تین چیزوں میں انقلاب ہوا ہے۔ اسکے بعد نماز کے تین انقلاب ذکر کرنے کے بعد روزہ کے تین انقلاب یوں ذکر کئے۔ (۱) رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہر ماہ تین دن کے روزے رکھتے تھے اور عاشورا کے دن کا روزہ بھی رکھتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض فرما دیئے اور آیت کریمہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ نازل فرمائی جس میں رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم بھی ہے اور یہ بھی ہے کہ جو لوگ روزہ رکھ سکتے ہوں۔ انہیں اختیار ہے کہ چاہیں تو روزہ رکھ لیں اور چاہیں، تو ایک روزہ کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، یہ کھانا کھلا دینا روزہ رکھنے کے عوض کفایت کرے گا۔

(۲) پھر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اس کے بعد والی آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (آخر تک) نازل فرمائی اس آیت میں یہ بھی ہے کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (کہ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان میں موجود ہو اس کا روزہ رکھے اس آیت سے مقیم اور تندرست پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا اور طاقت رکھنے والے کو روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کی جو اجازت تھی وہ منسوخ کر دی گئی) اور مریض اور مسافر کے لئے رُخصت باقی رہی (کہ وہ رمضان میں روزہ چھوڑ سکتے ہیں بعد میں روزہ رکھ لیں) اور روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ایسے بوڑھے کے لئے باقی رہا جو روزہ رکھنے سے عاجز ہو۔

(۳) روزے کی راتوں میں کھاتے پیتے تھے اور عورتوں کے پاس جاتے تھے۔ جب تک کہ سو نہ جائیں۔ اگر کوئی شخص سو گیا (اگر چہ رات باقی ہوتی) تو ان کاموں میں سے کوئی کام کرنا جائز نہ تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک انصاری صحابیؓ جن کا نام صِرمَہ تھا وہ روزہ کی حالت میں دن بھر کام کرتے رہے شام کو گھر آئے تو عشاء پڑھ کر سو گئے۔ اور اب سونے کی وجہ سے کچھ کھا پی نہ سکے کیونکہ سو جانے والے کو اجازت نہ تھی کہ باقی رات میں کھائے پیئے۔ ان کو اسی حال میں صبح ہو گئی اور روزہ بھی رکھ لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کو دیکھا کہ اُن کے جسم میں تکلیف کے آثار محسوس ہو رہے ہیں آپ

نے فرمایا کیا بات ہے میں تمہیں سخت تکلیف میں دیکھ رہا ہوں۔ اُنہوں نے اپنا سارا واقعہ سُنایا اور ایک یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوجانے کے بعد آنکھ کھلنے پر کسی باندی سے یا بیوی سے جماع کر لیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا واقعہ سُنایا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت شریف: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ نازل فرمائی۔ (جس صحابی نے نیند آجانے کی وجہ سے کھائے پیئے بغیر دوسرے دن روزہ رکھ لیا تھا۔ ان کا واقعہ صحیح بخاری میں ہے)

صحیح بخاری میں حضرت ابن ابی لیلیٰ تابعی سے نقل کیا ہے کہ حضرت سرورِ عالم محمد ﷺ کے صحابہ نے ہم سے بیان کیا کہ رمضان کے روزے نازل ہوئے تو روزہ رکھنا ان پر شاق گزرا۔ لہٰذا جو شخص روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا وہ باوجود طاقت ہونے کے روزہ چھوڑ دیتا تھا اور ان کو اسکی اجازت دی گئی تھی، پھر اس حکم کو وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ نے منسوخ کر دیا۔ اور سب کو روزے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت ابن عمرؓ نے بھی فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کی تلاوت کی اور فرمایا کہ یہ اجازت منسوخ ہو چکی ہے ان روایات سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ روزہ رکھنے کی طاقت ہوتے ہوئے بھی روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کی اجازت منسوخ ہے۔ اب تو روزہ رکھنا ہی ہوگا۔ اور اس میں جو تکلیف اور مشقت ہوگی وہ برداشت کرنی ہوگی البتہ جو شخص بالکل ہی عاجز ہو جو روزہ رکھ ہی نہیں سکتا اس کے لئے فدیہ کا حکم باقی ہے اور احادیث شریفہ کی تصریحات کے بعد اب اس تاویل کی ضرورت نہیں رہی کہ يُطِيْقُوْنَ سے قبل حرفِ نفی "لا" مقدر ہے۔ یا یہ کہ بابِ افعال کا ہمزہ سلبِ مأخذ کے لئے ہے۔ پھر فرمایا: فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ (کہ جو بھی شخص اپنی خوشی سے کوئی نیک کام کرے گا تو یہ اس کے لئے بہتر ہے)۔

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پورے ماہ رمضان کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔ ان فرض روزوں کے علاوہ اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے نفل روزے رکھ لے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے جیسا کہ صحیح بخاری ص ۲۵۴ ج ۱ میں ہے کہ جب ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے اسلام کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اس کے لئے پانچ نمازوں کی فرضیت بتادی اس پر اس نے کہا کہ اس کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ ہے آپ نے فرمایا کہ ان کے علاوہ اور کوئی نماز فرض نہیں الّا یہ کہ اپنی خوشی سے نفل نمازیں پڑھ لو۔ پھر آپ نے رمضان کے روزوں کی فرضیت ذکر فرمائی اس نے وہی سوال کیا "کیا ان کے علاوہ مجھ پر اور روزے بھی ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ان کے علاوہ اور کوئی روزہ فرض نہیں الّا یہ کہ اپنی خوشی سے نفلی روزے رکھ لو۔ الفاظ کے عموم میں ہر نیک کام کی ترغیب ہے۔ ایک نماز روزہ ہی کیا جو بھی کوئی شخص اپنی خوشی سے نیک کام کرے گا۔ نفلی عبادات میں لگے گا۔ وہ اس کا صلہ پائے گا اور اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔ جو اسکی آخرت کے لئے بہتر ہوگا اور دوسرا مطلب علمائے تفسیر نے یہ لکھا ہے کہ ایک روزہ کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا دینا ہے اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے زائد دیدے تو وہ بہتر ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا: وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کو شروع میں تندرست اور گھر پر مقیم ہوتے ہوئے روزہ نہ رکھنے اور اسکی جگہ فدیہ دینے کی اجازت دی گئی تھی۔ باوجود روزہ نہ رکھنے اور فدیہ دینے کی اجازت کے یہ فرمایا کہ روزہ رکھنا بہتر ہے۔ روزے کی جو خیر و برکت ہے اور اس کا جو روحانی نفع ہے۔ روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے میں وہ نفع نہیں ہے۔ علامہ جصاص فرماتے ہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا تعلق اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَ سے بھی ہو اور مسافروں سے بھی ہو کیونکہ اس سے پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ مسافر اور مریض رمضان میں روزہ نہ رکھ کر بعد میں قضا کر سکتے ہیں ان کے لئے بھی فرمایا کہ وہ بھی رمضان ہی میں روزہ

رکھ لیں تو بہتر ہے۔ کیونکہ عموماً مسافروں کو بغیر کسی ضرر کے روزہ رکھنے کی طاقت ہوتی ہے۔ اور اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ سفر میں روزہ رکھنا نہ رکھنے سے بہتر ہے۔ علامہ جصاص نے اس سے ایک اور دقیق مسئلہ کا استنباط کیا ہے اور وہ یہ کہ جب ایک روزہ کے عوض ایک مسکین کو کھانا دینے کی اجازت دی گئی تھی۔ (اور یہ ایک مسکین کا کھانا نصف صاع کے برابر ہوتا ہے) تو اس سے معلوم ہو گیا کہ ایک نفلی روزہ نصف صاع صدقہ کرنے سے افضل ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى
رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور ہدایت کے بارے میں اس کے بیانات خوب واضح ہیں
وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۗ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ
اور حق و باطل کے درمیان فرق ظاہر کرنیوالے ہیں سو جو شخص تم میں سے اس ماہ میں موجود ہے وہ اس میں روزہ رکھے اور جو شخص مریض ہو یا سفر پر ہو
فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ
تو دوسرے دنوں کی گنتی کر کے روزے رکھ لے۔ اللہ تمہارے لئے آسانی کا ارادہ فرماتا ہے۔ دشواری کا ارادہ نہیں فرماتا اور تاکہ تم گنتی پوری کیا کرو۔
وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾
اور تاکہ تم اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو

قرآن مجید رمضان المبارک میں نازل کیا گیا

تفسیر: اس آیت شریفہ میں ان دنوں کی تعیین فرما دی گئی جن میں روزے رکھنا فرض ہے پہلی آیت میں اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فرمایا اور اس آیت میں ماہِ رمضان کا صاف نام لے کر بیان فرما دیا کہ جو شخص اس ماہ میں موجود ہو وہ روزے رکھے اور ساتھ ہی رمضان المبارک کی ایک دوسری فضیلت بھی بیان فرما دی اور وہ یہ کہ اس ماہ میں قرآن مجید نازل ہوا۔ اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ قرآن مجید ماہِ رمضان میں نازل کیا گیا اور سورہ قدر میں فرمایا کہ لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ لیلۃ القدر رمضان المبارک میں ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ قرآن مجید تو تھوڑا تھوڑا کر کے تیئس سال میں نازل ہوا۔ پھر اس کا کیا مطلب ہے کہ رمضان المبارک میں نازل ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شبِ قدر میں لوح محفوظ سے پورا قرآن جملۃ واحدۃ (اکٹھا) آسمان دنیا پر نازل کیا گیا اور بیت العزت میں رکھ دیا گیا۔ پھر وہاں سے حضرت جبرئیل علیہ السلام تھوڑا تھوڑا حسب الحکم لاتے رہے۔ (تفسیر قرطبی)

یہ جو فرمایا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ اس میں ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد عورت پر رمضان کے روزوں کی فرضیت کی تصریح فرما دی۔ البتہ مسافر اور مریض اور حمل والی عورت اور دودھ پلانے والی عورت کو اجازت دی گئی کہ وہ رمضان میں روزہ نہ رکھیں اور بعد میں اسکی قضا رکھ لیں۔ اور حیض و نفاس والی عورت کو حکم ہے کہ وہ رمضان میں روزے نہ رکھیں اور بعد میں رکھ لیں۔ ان مسائل کی تفصیلات حدیث اور فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ جن میں سے بعض مسائل ان شاء اللہ ابھی نقل کریں گے۔

دنیا میں جب سے سلسلہ مواصلات کی آسانی ہو گئی ہے اور تیز رفتار طیارے گھنٹوں میں مہینوں کی مسافت پر پہنچا دیتے

ہیں اس وقت سے یہ سوال سامنے آنے لگا کہ کوئی شخص کسی ملک میں تھا وہاں اس نے تین روزے رکھ لئے پھر وہ کسی ایسے ملک میں پہنچ گیا جہاں ایک دو دن ابھی رمضان کے ختم ہونے میں باقی ہیں تو وہ ان دنوں میں کیا کرے۔ احقر کے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ جہاں پہنچا ہے وہاں چونکہ رمضان موجود ہے اس لئے ان دنوں کے روزے رکھے۔ آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ کا عموم اسی کو متقاضی ہے۔ اور فقہاء نے یہ جو لکھا ہے کہ رمضان کے دن میں بے روزہ نابالغ، بالغ ہو جائے یا کوئی حیض والی عورت پاک ہو جائے تو وہ رمضان کے احترام میں شام تک نہ کھائے پیئے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو آدمی ایسے علاقہ میں پہنچ گیا جہاں ابھی رمضان باقی ہے وہ رمضان کا احترام کرے احترام کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ روزہ نہ رکھے اور کھائے پیئے بھی نہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ روزہ سے رہے۔ اور یہ روزہ رکھنا آیت کے عموم کے مطابق ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو روزہ ہی رکھنا چاہئے۔ مطلق نیت صوم سے روزہ رکھ لینا چاہئے۔ مطلق نیت سے نفل روزہ ادا ہو جاتا ہے اور رمضان کا فرض روزہ بھی۔ لہٰذا اگر مطلق روزہ کی نیت کر لی اور خدائے تعالیٰ کے نزدیک ان دنوں کے روزے فرض ہوئے تو فرض ادا ہو جائے گا۔ ورنہ نفل کا ثواب مل جائے گا اور رمضان کا احترام بھی ہو جائے گا۔

مریض اور مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت اور بعد میں قضا رکھنے کا حکم

یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ "جو شخص ماہِ رمضان میں موجود ہو اس کے روزے رکھے" مریض اور مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جتنے دنوں کے روزے رمضان المبارک میں مسافر اور مریض نے نہیں رکھے وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں اتنی ہی گنتی کرے جتنے روزے چھوٹے اور ان کی قضا رکھ لے۔ علامہ جصاص فرماتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً اتنے دنوں کی گنتی کر کے قضا کرنے کا حکم فرمایا ہے جتنے دن کے روزے رہ گئے ہیں اور لگا تار قضا رکھنے کی کوئی قید اور شرط نہیں لگائی اس لئے روزوں کی قضا کرنے والا متفرق طور پر رکھ لے یا لگا تار رکھ لے دونوں طرح درست ہے۔ اور يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ۔ سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر دوسرا رمضان آنے تک پہلے رمضان کے قضا روزے نہ رکھے تو اب اس موجودہ رمضان کے روزے رکھ لے اور گذشتہ رمضان کے روزوں کی قضا بعد میں کر لے البتہ جلد سے جلد قضا رکھ لینا بہتر ہے اس میں مسارعت اِلی الخیر ہے اور چونکہ موت کا کچھ پتہ نہیں اس لئے ادائیگی فرض کا اہتمام بھی ہے۔

مسئلہ: ہر مریض کو اجازت نہیں ہے کہ بعد میں قضا رکھنے کے لئے رمضان کے روزے چھوڑے بلکہ یہ رخصت و اجازت ایسے مریض کو دی ہے جسکو روزہ رکھنے سے سخت تکلیف میں مبتلا ہونے یا کسی عضو کے تلف ہونے کا قوی اندیشہ ہو یا ایسے مرض میں مبتلا ہو جس میں روزہ رکھنے کی وجہ سے مرض کے طول پکڑ جانے کا غالب گمان ہو جو تجربہ سے یا ماہر مسلم معالج کے قول کی بنیاد پر ہو اور یہ ماہر مسلم معالج ایسا ہو جس کا فاسق ہونا معلوم نہ ہو۔ قال فی الدر المختار او مریض خاف الزیادة لمرضه وصحیح خاف المرض بغلبة الظن بامارة او بتجربة او باخبار طبیب حاذق مسلم مستور اہ وفی الشامی اما الکافر فلا یعتمد علی قوله لا حتمال ان غرضه افساد العبادة (فصل فی العوارض) اس بارے میں لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ معمولی سے مرض میں روزہ چھوڑ دیتے ہیں گو اس مرض کے لئے روزہ مضر بھی نہ ہو۔ بلکہ بعض امراض میں روزہ مُفید ہوتا ہے پھر بھی مرض کا بہانہ بنا کر روزہ نہیں رکھتے اور بہت سے لوگ

ڈاکٹروں کے کہہ دینے سے روزہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اس بارے میں ہر ڈاکٹر کا قول معتبر نہیں ڈاکٹر بے دین فاسق بلکہ کافر بھی ہوتے ہیں۔ اُنہیں نہ مسئلہ کا علم ہوتا ہے۔ نہ روزہ کی قیمت جانتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو تو خواہ مخواہ روزہ چھڑوانے میں مزہ آتا ہے اور کافر ڈاکٹر کا قول تو اس بارے میں بالکل ہی معتبر نہیں۔

مریض کو اپنے تجربہ اور اپنی ایمانی صوابدید سے اور کسی ایسے معالج سے روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ کرنا چاہئے جو مسلمان ہو روزے کی اہمیت سمجھتا ہو اور خوفِ خدا رکھتا ہو۔ اور مسئلہ شرعیہ سے واقف ہو۔ اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بہت سے لوگ بیماری کی وجہ سے رمضان کے روزے چھوڑ دیتے ہیں اور پھر رکھتے ہی نہیں اور بہت بڑی گنہگاری کا بوجھ لے کر قبر میں چلے جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی محبت اور آخرت کی بے فکری کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ یہ ان مریضوں کا بیان ہوا جو عموماً تندرست رہتے ہیں۔ اور عارضی طور پر مریض ہو گئے۔ یہ لوگ صحت یاب ہو کر بعد میں قضا رکھ لیں۔ لیکن ایسا مرد یا عورت جو مُستقل مریض ہو جسے روزہ رکھ سکنے کی زندگی بھر اُمید نہ ہو۔ اور ایسے مرد یا عورت جو بہت بوڑھے ہوں نہ اب روزہ رکھنے کی طاقت ہے نہ پھر کبھی روزہ رکھ سکنے کی اُمید ہے تو یہ لوگ روزوں کے بجائے فدیہ دیں۔ لیکن اگر کبھی بعد میں روزہ رکھنے کے قابل ہو گئے تو روزے رکھنا فرض ہوگا اور فدیہ جو دیا ہے نفلی صدقہ ہو جائے گا۔ جس طرح کہ ہر مریض کو روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں اسی طرح ہر مسافر کو بھی روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ رمضان المبارک کا روزہ بعد میں قضا رکھنے کی نیت سے اس مسافر کو روزہ نہ رکھنا جائز ہے جو مسافت قصر کے ارادہ سے اپنے شہر یا بستی سے نکلا ہو جب تک سفر میں رہے گا مرد ہو یا عورت اُسے رمضان کا روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ جب گھر آ جائے تو روزوں کی قضا کر لے۔ ہاں اگر سفر میں کسی جگہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کر لی تو اب شرعاً مسافر کے حکم میں نہیں رہا۔ ان دنوں میں رمضان المبارک ہو تو روزے رکھنا فرض ہوگا اور نماز میں قصر کرنا جائز نہ ہوگا۔ مسافت قصر ۴۸ میل ہے (کلو میٹر کا حساب کر لیا جائے) اتنی مسافت کے لئے خواہ پیدل سفر کرے یا بس سے یا ہوائی جہاز سے شرعی مسافر مانا جائے گا۔ وہ نمازوں میں قصر بھی کرے اور اُسے یہ بھی جائز ہے کہ رمضان شریف کے روزے نہ رکھے اور بعد میں جب گھر آ جائے تو چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا رکھ لے۔

جو شخص مسافت قصر سے کم سفر کے لئے گیا ہو اُسے روزہ چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ شرعی مُسافر کو (جس کی مسافتِ سفر اُوپر بتا دی گئی ہے) سفر میں روزہ چھوڑنے کی اجازت تو ہے۔ لیکن رمضان میں روزہ رکھ لینا بہتر ہے۔ اور وجہ اسکی یہ ہے کہ اول تو رمضان کی برکت اور نورانیت سے محرومی نہ ہوگی۔ دوسرے سب مسلمانوں کے ساتھ مل کر روزہ رکھنے میں آسانی ہوگی اور بعد میں تنہا روزہ رکھنا مشکل ہوگا۔

مسئلہ: مسافر اور مریض (جنہیں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے) وہ اگر اپنے زمانہ عذر ہی میں مر گئے۔ تو چونکہ انہوں نے قضا رکھنے کا وقت ہی نہیں پایا۔ اس لئے ان پر اپنے چھوٹے ہوئے روزوں کی طرف سے فدیہ دینے کی وصیت کرنا واجب نہیں۔ اور اگر مریض نے اچھا ہو کر اور مسافر نے گھر آ کر روزے نہیں رکھے یا کچھ رکھے کچھ نہ رکھے۔ تو جتنے دن مرض کے بعد پائے ہیں ان کی طرف سے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کرنا واجب ہے۔ وصیت کے بعد اُس کا ولی قرضوں کی ادائیگی کے بعد اس کے تہائی مال سے ہر روزہ کے عوض بقدرِ صدقہ فطر کے صدقہ کر دے۔ اور اگر اس نے وصیت نہ کی اور اُس کے وَلی نے اپنی خوشی سے اپنے ذاتی مال سے اس کی طرف سے فدیہ دے دیا تو ان شاء اللہ یہ بھی مفید ہوگا۔

17

مثلاً اگر دس دن کے روزے چھوڑے تھے اور اس قدر ایامِ صحت اور ایام اقامت پالئے اور قضا روزے نہ رکھے اور موت آنے لگی تو پورے دس دن کے روزوں کی طرف سے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کرے۔ اور اگر ایامِ صحت اور ایام اقامت میں صرف پانچ دن ملے تھے اور ان میں قضا روزے نہ رکھے تو صرف پانچ دن کے روزوں کی طرف سے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کرے۔ (من الدر المختار)

حاملہ اور مرضعہ کے لئے رُخصت

سنن نسائی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسافر کے لئے روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی ہے اور اسکی نماز کا ایک حصہ معاف فرما دیا ہے (کہ چار رکعات والی فرض نماز کی دو رکعتیں مسافر کے ذمہ رہ جاتی ہیں) اور دودھ پلانے والی عورت اور حمل والی عورت کو بھی رمضان میں روزے نہ رکھنے کی اجازت ہے کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ نہ رکھیں اور بعد میں ان روزوں کی قضا رکھ لیں جس حاملہ کو روزہ رکھنے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہو یا زیادہ تکلیف میں پڑ جانے یا اپنی جان یا بچے کی جان کا اندیشہ ہو تو وہ عورت رمضان کے روزے چھوڑ کر بعد میں رکھ لے اسی طرح دُودھ پلانے والی عورت کے لئے بھی اسی وقت رمضان المبارک کا روزہ چھوڑنا جائز ہے جبکہ روزہ رکھنے سے بچے کو دودھ سے محرومی ہوتی ہو اور بچہ دودھ پلانے والی کے دودھ کے علاوہ دوسری غذا کے ذریعہ گزارہ نہ کرسکتا ہو اُوپر کا دودھ پلانے سے (جیسا کہ آج کل رواج ہے) یا دلیہ یا چاول وغیرہ کھانے سے بچہ کی غذا کا کام چل سکتا ہو تو پھر دودھ پلانے والی کو رمضان المبارک کے روزے چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ جب بچہ کی عمر دو سال ہو جائے تو اس کو عورت کا دودھ پلانا ہی منع ہے۔ جب بچہ کی عمر دو سال ہو جائے اس کے دودھ پلانے کے لئے روزہ چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حیض اور نفاس والی عورت کا حکم

جس عورت کو رمضان المبارک میں ماہواری کے دن آ جائیں یا ولادت کے بعد کا خون آ رہا ہو جسے نفاس کہتے ہیں یہ دونوں عورتیں رمضان المبارک کے روزے نہ رکھیں اگرچہ روزہ رکھنے کی طاقت ہو لیکن بعد میں ان روزوں کی قضا رکھ لیں۔ اور حیض نفاس کے زمانہ کی نمازیں بالکل معاف ہیں۔ ان دونوں پر انکی قضا نہیں۔

اللہ نے دین میں آسانی رکھی ہے

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے کسی ایسی بات کا حکم نہیں دیا جو بندوں کی طاقت سے باہر ہو قرآن میں کئی جگہ اس کا ذکر ہے آیت بالا میں مریض اور مسافر کا حکم بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرماتا ہے اور تمہارے لئے مشقت کا ارادہ نہیں فرماتا) نمازوں کے بارے میں بھی مریض کے لئے آسانی ہے کہ کھڑے ہو کر لیٹ کر بیٹھ کر رکوع اور سجدہ یا اشارہ کے ساتھ اپنی طاقت کے مطابق جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لے زکوٰۃ میں بھی مطلق مال ہونے پر زکوٰۃ فرض نہیں کی گئی بلکہ صاحب نصاب پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اور اسکی ادائیگی اس وقت فرض ہے جب ناپ پر چاند کے حساب سے ایک سال گزر جائے اور پھر زکوٰۃ میں جو کچھ واجب ہوتا ہے وہ بہت قلیل ہے یعنی کل مال کا چالیسواں حصہ دینا واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح حج ہر شخص پر فرض نہیں جو شخص مکہ معظمہ تک سواری پر آنے جانے کی طاقت رکھتا ہو اور ساتھ ہی سفر خرچ بھی ہو اور بال بچوں کا ضروری خرچہ پیچھے چھوڑ جانے کے لئے موجود ہو تب حج فرض ہوتا ہے اور وہ بھی زندگی

میں صرف ایک بار فرض ہے۔ روزہ رمضان فرض ہونے کے باوجود مریض اور مسافر اور شیخ فانی حاملہ اور دودھ پلانے والی کے لئے جو آسانیاں ہیں وہ اوپر ابھی بیان ہو چکی دیگر احکام میں جو آسانیاں ہیں وہ بھی عام طور پر معلوم اور مشہور ہیں۔

قوله تعالیٰ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ. (الاية) اس کے بارے میں صاحب روح المعانی (ص ۶۲ ج ۲) فرماتے ہیں ای و شرع لکم جملة ما ذکر من امر الشاهد بصوم الشهر المستفاد من قوله تعالیٰ : فمن شهد منکم الشهر فلیصمه وامر المرخص له بالقضاء کیف ما کان متواترا او متفرقا وبمراعاة عدة ما افطر من غیر نقصان ومن الترخیص المستفاد من قوله عزّوجل (یرید الله بکم الیسرا ومن قوله تعالیٰ فعدة من ایام اُخر) لتکملوا الخ.

مطلب یہ کہ ولتکملوا میں واؤ عاطفہ ہے جو فعلِ محذوف پر عطف ہے مطلب یہ کہ تمہارے لئے جو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم مشروع فرمایا کہ جو شخص ماہِ رمضان میں موجود ہو وہ روزے رکھے اور مریض اور مسافر کو رمضان میں روزے چھوڑ کر بعد میں چھوٹے ہوئے روزوں کی گنتی کے موافق قضا روزے متواتر یا متفرق طریقے پر رکھنے کی جو اجازت دی یہ اس لئے ہے کہ تم ٹھیک اچھی طرح گنتی کا دھیان رکھ کر تکمیل کرو تا کہ اداء و قضاء کوئی روزہ رہ نہ جائے اور تا کہ تم اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور یہ جو فرمایا: وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی یعنی اسکی حمد و ثنا بیان کرنے کا حکم ہے۔ حضرت زید بن اسلمؓ نے فرمایا کہ اس سے یوم عید کی تکبیریں مراد ہیں اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے چاند دیکھنے کے وقت اللہ اکبر کہنا مراد ہے۔

اور لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ میں تسہیل اور تیسیر کی علت بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حالت سفر اور مرض میں روزہ چھوڑ کر بعد میں قضا رکھنے کی جو آسانی دی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو یہ آسانی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اس نعمت کی قدر دانی کرو۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ

اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں سو بلاشبہ میں قریب ہوں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرے سو وہ میرے احکام کو قبول کریں

وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

اور مجھ پر یقین رکھیں تا کہ وہ نیک راہ پر رہیں

دعا کی فضیلت اور آداب

تفسیر: درمنثور میں ذکر کیا ہے کہ ایک شخص حضور انور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارا رب قریب ہے جس سے ہم آہستہ طریقے پر مناجات کریں یا دور ہے جسے ہم زور سے پکاریں۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آیت وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ آخر تک نازل فرمائی اور حضرت عطاء بن ابی رباح نے بیان فرمایا کہ آیت وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض

کیا کہ اگر ہمیں معلوم ہوجاتا کہ ہم کس وقت دعا کریں تو اچھا تھا اس پر آیت وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ اخیر تک نازل ہوئی۔

گزشتہ آیات میں روزے کے احکام بیان ہوئے۔ رمضان المبارک کا مہینہ آخرت کمانے کا سیزن ہے اس میں کمائی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری ص ۲۵۵ ج ۱) اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر رات ایک منادی ندا دیتا ہے کہ اے خیر کی تلاش کرنے والے آگے بڑھ اور اے شر کے تلاش کرنے والے رُک جا (سنن الترمذی ص ۱۴۲ ج ۱) اور اہل ایمان کی طبیعتیں نیکیوں کی طرف بہت زیادہ راغب ہوجاتی ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں۔ نمازوں کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ فرضوں کے علاوہ مزید نمازیں پڑھتے ہیں ذکر و تلاوت میں لگتے ہیں۔ دعاؤں میں مشغول ہوتے ہیں۔ شب قدر کو زندہ رکھتے ہیں۔ رمضان میں دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ (سُنن ترمذی ابواب الدعوات) لہٰذا یہ مناسب ہوا کہ احکام رمضان کے درمیان دعا کی قبولیت کا ذکر کر دیا جائے۔ آیت بالا میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہے وہ سب کی دُعا سنتا ہے اور قبول بھی فرماتا ہے۔ آہستہ سے دعا کرو یا زور سے وہ ہر دُعا سنتا ہے۔ جو دُعا زبان سے نہ ہو اور صرف دل سے ہو وہ اسکو بھی جانتا ہے اور قبول فرماتا ہے۔ اِسی لئے اَسْمَعُ نہیں فرمایا بلکہ اُجِیْبُ فرمایا تاکہ قلبی دعا کو بھی شامل ہوجائے۔ سورۂ ق میں فرمایا۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (اور البتہ تحقیق ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے نفس میں جو خیالات آتے ہیں۔ ہم اُن کو جانتے ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اسکی شہ رگ سے بھی زیادہ)۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے جب ہم کسی اُونچائی پر چڑھتے تو بلند آواز سے اللہ اکبر کہتے تھے آنحضرت سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ اے لوگو! اپنی جانوں پر رحم کرو کیونکہ تم کسی ایسے کو نہیں پکار رہے ہو جو بہرہ ہے اور غائب ہے۔ تم تو سمیع اور بصیر کو پکار رہے ہو۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک تمہارا رب شرمیلا ہے کریم ہے وہ اس بات سے شرماتا ہے کہ بندہ جب اسکی طرف ہاتھ اُٹھائے تو وہ ان ہاتھوں کو بغیر کسی خیر کے واپس کر دے۔ (اخرجہ الترمذی فی ابواب الدعوات وحسنہ اخرجہ الحاکم فی المستدرک وقال علی شرط الشیخین واقرہ الذہبی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہاری دعا قبول کی جاتی ہے جب تک کہ دعا کرنے والا جلدی نہ کرے وہ کہتا ہے کہ میں نے دعا کی وہ قبول نہ ہوئی۔ (صحیح بخاری)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ کی دعا برابر قبول ہوتی رہتی ہے جب تک کہ گناہ کی اور قطع رحمی کی دُعا نہ کرے بشرطیکہ جلدی نہ مچائے عرض کیا گیا کہ جلدی مچانے کا کیا مطلب ہے فرمایا جلدی مچانا یہ ہے کہ یوں کہنے لگے میں نے دعا کی اور لیکن مجھے قبول ہوتی نظر نہیں آتی یہ سمجھ کر تھک کر بیٹھ جائے اور دعا کو چھوڑ دے (صحیح مسلم)

دعا برابر کرتے رہیں۔ رغبت کے ساتھ دل کو حاضر کر کے دعا کریں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لیس شیء اکرم علی اللہ من الدعاء کہ اللہ کے نزدیک دعا سے بڑھ کر کوئی چیز فضیلت والی نہیں ہے اور ایک حدیث میں ہے الدعاء مخ العبادۃ کہ دعا عبادت کا مغز ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جس شخص کو یہ خوشی ہو کہ اللہ تعالیٰ سختیوں اور بے چینیوں کے وقت اسکی دعا قبول کرے سو چاہئے کہ وہ اچھے

حالات میں کثرت سے دعا کرے۔ دعا قبول ہونے کا کیا مطلب ہے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کوئی شخص کوئی دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سوال کے مطابق اسے عطا فرما دیتا ہے یا اس جیسی آنے والی کسی مصیبت کو روک دیتا ہے جب تک کہ گناہ گاری اور قطع رحمی کی دُعا نہ کرے۔ (أخرج الاحادیث الاربعۃ الترمذی فی ابواب الدعوات)

اور مسند احمد میں ایک بات کا اضافہ ہے اور وہ یہ کہ یا اسکی دعا کو اللہ تعالیٰ آخرت کے لئے ذخیرہ بنا کر رکھ دے گا (جو اُسے آخرت میں کام دے گی) (مشکوٰۃ المصابیح)

لوگ کہتے ہیں دُعا قبول نہیں ہوتی حقیقت میں مانگنے والے ہی نہیں رہے۔ اول تو حضور قلب سے دعا نہیں کرتے۔ دوسرے حرام سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص لمبے سفر میں ہو۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہوں، جسم پر گرد و غبار اُٹا ہوا ہے۔ وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے یارب یارب کہہ کر دُعا کرتا ہو اور حال یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے پینا حرام ہے اور اس کو حرام سے غذا دی گئی ہے۔ پس ان حالات میں اسکی دُعا کیوں کر قبول ہوگی۔ (صحیح مسلم)

نیز سُنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دُعا ان مصیبتوں کے دُور ہونے کے لئے بھی نافع ہے جو نازل ہو چکیں اور ان مصیبتوں کو روکنے کے لئے بھی جو نازل نہیں ہوئیں۔ سوائے اللہ کے بندو! تم دُعا کو لازم پکڑلو۔ (ابواب الدعوات)

سُنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سے تم اس طرح دُعا کرو کہ قبولیت کا یقین ہو اور یہ جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ غافل اور لاپرواہ دل کی دُعا قبول نہیں فرماتا۔ آیت کریمہ کے آخیر میں فرمایا: فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ. کہ میرے تمام احکام کو قبول کریں اور میری ذات وصفات پر ایمان لائیں مجھ پر یقین اور بھروسہ رکھیں۔ ایسا کریں گے تو ہدایت پر ثابت قدم رہیں گے اور مزید ہدایت پائیں گے۔ قال صاحب الروح ای فلیطلبوا اجابتی لهم اذا دعوتهم للایمان والطاعة كما انی اجيبهم إذا دعونی لحوائجهم۔

وقال القرطبی قال الهروی الرُشد والرشَد والرشاد الهُدى والاستقامة ومنه قوله تعالیٰ لعلهم يرشدون.

وقال البیضاوی فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي اذا دعوتهم للایمان والطاعة كما اجيبهم اذا دعونی لمهما تهم وَلْيُؤْمِنُوا بِي امر بالثبات والمداومة عليه لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ راجين اصابة الرشد وهوا صابة الحق.

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ

حلال کیا گیا تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں بیویوں میں مشغول ہونا، وہ لباس ہیں تمہارے لئے اور تم ان کا لباس ہو۔

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ

اللہ نے جان لیا کہ بلاشبہ تم اپنے نفسوں کی خیانت کرتے ہو سو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تم کو معاف فرما دیا۔ سو اب اُن سے میل ملاپ کرو

وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ

اور تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اور کھاؤ اور پیئو یہاں تک کہ تمہارے لئے سفید تاگہ سیاہ تاگہ سے ممتاز ہو کر ظاہر ہو

الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي

جائے۔ یعنی فجر کا تاگہ پھر تم روزے پورے کرو رات تک۔ بیویوں میں میل ملاپ نہ کرو اس حال میں کہ تم اعتکاف کئے ہوئے ہو

الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

مسجدوں میں۔ یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں لہٰذا ان کے پاس نہ پھٹکو اسی طرح اللہ بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے اپنی آیات تاکہ لوگ پرہیز گار بنیں

تکملہ احکام صیام

تفسیر: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ روزوں کی فرضیت کے ابتدائی زمانہ میں (قانون کے مطابق) رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اس پر عمل کرتے تھے کہ جس شخص کا روزہ ہوتا اور افطار کا وقت آجاتا اور وہ افطار سے پہلے سو جاتا تو اب پوری رات اور اگلے پورے دن نہیں کھا سکتا تھا جب تک کہ شام نہ ہو جائے۔ اور یہ واقعہ پیش آیا کہ قیس بن صرمہ انصاری رضی اللہ عنہ کا روزہ تھا افطار کا وقت ہوا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آئے اُن سے کہا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے کہا میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن میں کہیں سے جا کر تمہارے لئے انتظام کر کے لاتی ہوں۔ انہوں نے دن بھر کام کیا تھا ابھی اُن کی بیوی واپس نہ آئی تھی کہ ان کی آنکھ لگ گئی پس جب وہ آئیں اور ان کو دیکھا کہ سو چکے ہیں تو کہنے لگیں ہائے تیری محرومی (کھانے کا وقت ختم ہوا اور کل کو روزہ بھی رکھنا ہے) انہوں نے اسی طرح (بغیر کھائے پیئے) روزہ رکھ لیا جب آدھا دن ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ نازل فرمائی جس سے مسلمان بہت خوش ہوئے اور آیت وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری) قال فی فتح الباری بعد ذکر الاختلاف فی اسم الصحابی الذی وقع له ذلک أنه أبو قیس صرمة بن أبی أنس قیس بن مالک فمن قال قیس بن صرمه قلبه۔

سو جانے کے بعد رمضان المبارک میں جیسے کھانا پینا ممنوع ہو جاتا تھا اسی طرح بیویوں سے ہمبستر ہونا بھی ممنوع ہو جاتا تھا۔ صحابہ کو اس میں بہت دُشواری پیش آئی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب رمضان کے روزوں کا حکم ہوا تو (افطار کے بعد نیند آجانے کی صورت میں) عورتوں کے قریب نہ جاتے تھے اور پورے رمضان کا یہی قانون تھا اور بہت سے لوگ اپنے نفسوں کی خیانت کرتے تھے (اور قانون کی خلاف ورزی کر بیٹھتے تھے) لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ نازل فرمائی۔ سنن ابوداؤد باب کیف الاذان میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی سے جماع کرنے کا ارادہ کیا انہوں نے کہا میں تو سو گئی تھی (اب یہ کام جائز نہیں رہا) اُنہوں نے سمجھا کہ یہ بہانہ کر رہی ہے لہٰذا جماع کر بیٹھے۔ تفسیر در منثور میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ رات کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے اور باتیں کرتے رہے جب گھر آئے تو دیکھا کہ بیوی سو چکی ہے اُسے جگایا اور مخصوص کام کا ارادہ کیا وہ کہنے لگی کہ میں تو سو گئی تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ تم سوئی نہیں ہو (غلط کہہ رہی ہو) پھر اس سے جماع کر لیا اور کعب بن مالکؓ کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا صبح کو حضرت عمرؓ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سُنایا اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ نازل فرمائی۔ نفس کے اُبھار کی وجہ سے جو نفسوں کا تقاضا پورا کر لیا اس میں بظاہر نفس کی موافقت ہے لیکن قانون شرعی کی خلاف ورزی کی وجہ سے یہ نفسوں کی خیانت ہے کیونکہ اُحکام کی خلاف ورزی مواخذہ کی چیز ہے اور تختانون کا یہ

معنی بھی ہوسکتا ہے کہ غلبۂ شہوت کی وجہ سے تمہارے نفسوں کا تقاضا بیویوں کے پاس جانے کا ہوتا تھا لیکن تم اجازت شرعی نہ ہونے کی وجہ سے تقاضے کو پورا نہ کرتے تھے اس میں نفسوں کی خواہش کی خیانت تھی اگر چہ ایمانی تقاضوں کی موافقت تھی۔ اب مُباشرت کی اجازت دے دی گئی تو نفسوں کی خیانت بھی ختم ہوئی۔ آیت شریفہ اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ۔ آخر تک نازل ہونے سے پوری رات کھانا پینا اور بیویوں سے مباشرت کرنا جائز ہوگیا۔ جو کچھ کسی سے خلاف ورزی ہوئی تھی وہ اس پر نادم ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انکی توبہ قبول فرمائی اور اُن کو معاف فرمادیا۔

زن و شوہر کے تعلقات کا لطیف انداز میں بیان

رمضان المبارک کی راتوں میں بیویوں سے مباشرت کی اجازت دیتے ہوئے میاں بیوی کے تعلق کو ایک لطیف انداز میں بیان فرمایا۔ اور وہ یہ کہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں یعنی وہ تمہارے لئے سکون اور دل جمعی کا باعث ہیں اور تم اُن کے لئے سکون اور دل جمعی کا باعث ہو۔

کما فی سُورۃ الاعراف لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا وفی سُورۃ الروم لِتَسْکُنُوا اِلَیْھَا۔ عورت اور مرد چونکہ معانقہ کرتے ہیں اور ہر ایک دوسرے سے لپٹ جاتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو ایک دوسرے کے لئے لباس سے تعبیر فرمایا اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے پردہ بن جاتے ہیں اور فسق و فجور سے روکتے ہیں۔ اس لئے بھی ہر ایک کو دوسرے کا لباس بتایا۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب کسی بندہ نے نکاح کرلیا تو اس نے آدھا دین کامل کرلیا۔ لہٰذا وہ باقی آدھے دین کے بارے میں اللہ سے ڈرے۔ (مشکوٰۃ عن البیہقی فی شعب الایمان)

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ پہلے جملہ یعنی ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ سے یہ واضح ہورہا ہے کہ تم عورتوں سے صبر نہیں کر سکتے اور دوسرا جملہ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ یہ بتا رہا ہے کہ تمہارے لئے ان سے پرہیز کرنا مشکل ہے اور چونکہ مَرد کا احتیاج خوب واضح ہے اس لئے پہلے جملہ کو مقدم کیا گیا۔ (من روح المعانی ص ۱۶۵ ج ۲)

ابتغائے اولاد کا حکم

یہ جو فرمایا وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ (یعنی طلب کرو تم جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے اولاد طلب کرنا مقصود ہے یعنی جماع کرنے میں نیت رکھو کہ اللہ تعالیٰ اولاد نصیب فرمائے گا۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ نکاح کرنے میں نسل بڑھنے کی نیت رکھنی چاہئے صرف قضائے شہوت مقصود نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شہوتِ جماع کو بنی نوع انسان کی بقا کے لئے انسانوں میں رکھ دیا ہے۔ جیسا کہ کھانے کی خواہش انسانوں کے زندہ رہنے کے لئے پیدا فرمادی ہے صرف قضا شہوت جانوروں کا مقصود ہے بعض مُفسرین نے یہ بھی فرمایا کہ جب جماع کو اولاد طلب کرنے کا ذریعہ بنادیا گیا تو اس سے عورتوں سے غیر فطری طریقے سے قضاء شہوت کرنے کی ممانعت ثابت ہوگئی کیونکہ وہ جگہ طلب ولد کی نہیں ہے۔

صبح صادق تک کھانے پینے کی اجازت

پھر فرمایا: وَکُلُوا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (اور کھاؤ

اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے سفید تاگہ سیاہ تاگہ سے ممتاز ہو کر ظاہر ہو جائے یعنی فجر کا تاگہ) اس میں اجازت دی گئی ہے کہ روزوں کی راتوں میں صبح صادق ہونے تک کھا پی سکتے ہو۔ سفید تاگے سے بیاض النہار (یعنی دن کی سفیدی جو صبح صادق سے شروع ہوتی ہے) مراد ہے۔ اور سیاہ تاگے سے سواد اللیل (یعنی رات کی تاریکی) مراد ہے۔ یہ تفسیر خود آنحضرت سرور عالم ﷺ سے مروی ہے۔ (کمافی صحیح البخاری)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آیت وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ نازل ہوئی اور ابھی لفظ مِنَ الْفَجْرِ نازل نہ ہوا تھا تو بعض لوگوں نے اپنے پاؤں میں سفید اور کالا تاگہ باندھ لیا اور برابر کھاتے پیتے رہے یہاں تک کہ ان دونوں میں فرق ظاہر ہو جائے (وہ زمانہ بتی اور بجلی کا تو تھا نہیں چھوٹے چھوٹے گھروں میں اندر بیٹھ کر کھاتے رہے صبح صادق ہو جانے اور باہر روشنی پھیل جانے پر بھی دونوں تاگوں میں امتیاز نہ ہوا۔ ان حضرات نے خَيْطِ اَبْيَض اور خَيْطِ اَسْوَد کا معروف معنیٰ سمجھا) پھر اللہ تعالیٰ نے لفظ مِنَ الْفَجْرِ نازل فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ خیطِ ابیض اور خیط اسود سے دن اور رات مراد ہے۔ (صحیح بخاری)

معلوم ہوا کہ سحری کھانے کا آخری وقت صبح صادق تک ہے اور چونکہ پوری رات میں جماع کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی اس لئے جماع بھی صبح صادق ہونے تک جائز ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جنابت روزہ کے منافی نہیں ہے کیونکہ جب رات کے آخر حصے تک جماع کرنے کی اجازت ہے تو جماع کرنے والا لامحالہ فجر طلوع ہونے کے بعد ہی غسل کرے گا اور غسل کرنے میں جو وقت خرچ ہو گا اس وقت میں روزہ بھی ہو گا جو صبح صادق سے شروع ہو چکا ہو گا۔ حضرت عائشہؓ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو حالت جنابت میں فجر ہو جاتی تھی، پھر آپ روزہ رکھ لیتے تھے اور یہ جنابت احتلام نہیں بلکہ جماع کرنے کی وجہ سے ہوتی تھی۔ (صحیح بخاری) چونکہ جنابت روزہ کے منافی نہیں ہے اس لئے اگر روزہ میں احتلام ہو جائے تو اس سے بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

روزہ کا ابتدائی وقت حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمْ میں بتا دیا پھر روزے کی انتہا بتانے کے لئے فرمایا: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (پھر روزوں کو رات تک پورا کرو) رات غروب شمس ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے جیسے ہی سورج غروب ہو جائے روزہ افطار کرنے کا وقت ہو جاتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب مشرق کی طرف سے رات آ گئی اور دن مغرب کی طرف چلا گیا اور سورج چھپ گیا تو روزہ دار کے افطار کا وقت ہو گیا۔ (صحیح بخاری ص ۲۶۲ ج ۱)

مسئلہ: غروب ہوتے ہی فوراً روزہ افطار کر لینا مستحب ہے جیسا کہ سحری کھانا آخر رات میں مستحب ہے۔ (کمافی صحیح مسلم) البتہ سحری میں اتنی تاخیر نہ کرے کہ صبح صادق ہونے کا اندیشہ ہو جائے۔

اعتکاف کے فضائل اور مسائل

پھر فرمایا وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ (اور بیویوں سے میل ملاپ نہ کرو اس حال میں کہ تم اعتکاف کئے ہوئے ہو مسجدوں میں) اعتکاف مسنون ہے جو صرف مسجدوں ہی میں ہوتا ہے اور اس کے لئے نیت کرنا بھی ضروری ہے۔ اعتکاف کی نیت کے بغیر مسجد میں جتنا بھی وقت گزارے اعتکاف میں شمار نہ ہو گا۔ اعتکاف کے دنوں میں ایک تو شب قدر میں بیدار رہنے

اور نمازوں میں قیام کرنے کی آسانی ہو جاتی ہے۔ دوسرے مخلوق سے تعلق کم سے کم ہو جاتا ہے۔ اور خالق تعالیٰ شانہ ہی کی طرف پوری توجہ رہتی ہے۔ دل و جان سے جسم اور زبان سے عبادت اور تلاوت میں مشغولیت رہتی ہے۔ یہ دَر پر جا پڑنے والی بات ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رمضان میں دس دن کا اعتکاف فرماتے تھے اور جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال بیس دن کا اعتکاف کیا۔ (صحیح بخاری) حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے پھر ایک سال کا اعتکاف نہیں کیا تو آئندہ سال بیس دن کا اعتکاف کیا۔ (سنن ابوداؤد) اور ایک سال آپ نے ماہِ شوال میں بھی بیس دن کا اعتکاف فرمایا (ایضاً)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعتکاف کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ گناہوں سے روکتا ہے اور اس کے لئے اس شخص کا ثواب لکھا جاتا ہے جو تمام نیکیاں کرنے والا ہو (سُنن ابن ماجہ) رات ہو یا دن اعتکاف میں جماع کرنا یا شہوت کے ساتھ بیوی کو چھونا جائز نہیں ہے۔ اگر جماع کر لیا تو اعتکاف فاسد ہو جائے گا اگر شہوت کے بغیر ہاتھ لگایا تو اسکی گنجائش ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ حالت اعتکاف میں (مسجد میں بیٹھے ہوئے) اپنا سَر مبارک میری طرف کو نکال دیتے تھے اور میں آپ کا سَر دھو دیتی تھی' اور ایک رِوایت میں ہے کہ آپ کے سَر میں کنگھی کر دیتی تھی۔ (صحیح بخاری) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بھی بیان فرمایا کہ آپ اعتکاف کی حالت میں صرف انسانی حاجت کے لئے گھر میں داخل ہوتے تھے۔ (صحیح بخاری)

حاجت انسانی سے پیشاب پاخانہ مراد ہے۔ کھانا پینا چونکہ مسجد ہی میں ہوتا ہے اس لئے معتکف کو اس کے لئے مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ جب کوئی شخص اعتکاف کرے گا اور راتوں میں بیدار رہے گا۔ تو جس رات میں بھی شب قدر ہوگی وہ اُسے پالے گا اور اسکی خیر و برکت سے محرومی نہ ہوگی۔ قرآن شریف میں فرمایا ہے۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ (کہ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے) لہٰذا شب قدر کی تلاش میں رہنا چاہئے اور خاص کر آخر عشرہ کی طاق راتوں میں اسے تلاش کریں ہزار مہینے کے ۸۳ سال چند ماہ ہوتے ہیں چند گھنٹے عبادت میں گزار کر اتنا بڑا ثواب لے لینا عظیم نفع ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وَيحرم خَيرَها اِلّا كل محروم یعنی شب قدر کی خیر سے وہی محروم ہوگا۔ جو پورا محروم ہے۔ (جسے ذرا بھی عبادت کا ذوق نہیں) (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۷۳ ج ۱) ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ جس شخص نے ایمان کے ساتھ ثواب کی امید رکھتے ہوئے شب قدر کی رات میں نماز میں قیام کیا (یعنی نفل نمازیں پڑھتا رہا) اُس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ (صحیح بخاری)

نفل روزوں کا بیان

گزشتہ آیت میں جو فرمایا فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ اس میں نوافل کی ترغیب دی ہے بیان تو روزوں کے ذیل میں آیا ہے۔ لیکن الفاظ کے عموم میں ہر نفلی عبادت آ گئی۔ یہاں نفل روزوں کے کچھ فضائل لکھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے۔ ہر نیکی کم از کم دس نیکیوں کے برابر ہوتی ہے۔

شش عید کے روزے

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد چھ روزے شوال کے مہینے میں رکھ لئے تو (پورے سال کے روزے رکھنے کا ثواب ہوگا اگر ہمیشہ ایسا ہی کرے گا تو) گویا اس نے ساری عمر روزے رکھے۔ (رواہ مسلم)

جب کسی نے رمضان کے تیس روزے رکھے اور پھر چھ روزے اور رکھ لئے تو یہ چھتیس روزے رکھنے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین سو ساٹھ روزے شمار ہوں گے۔ اس طرح سے پورے سال کے روزے رکھنے کا ثواب ملے گا۔ اگر کوئی شخص ہر سال ایسا ہی کر لیا کرے تو وہ ثواب کے اعتبار سے ساری عمر روزہ رکھنے والا شمار ہوگا۔ اگر رمضان کے روزے چاند کی وجہ سے ۲۹ ہی رہ جائیں تب بھی شوال میں چھ روزے رکھنے سے ان شاء اللہ مذکورہ بالا ثواب ملے گا کیونکہ ہر مسلمان کی نیت یہی ہوتی ہے کہ چاند نظر نہ آیا تو تیسواں روزہ بھی ضرور رکھے گا۔

پیر اور جمعرات کا روزہ:

پیر اور جمعرات کو بھی روزہ رکھنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پیر اور جمعرات کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال پیش ہوتے ہیں لہٰذا میں پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل اس حال میں پیش ہو کہ میں روزہ دار ہوں۔ (رواہ الترمذی)

ایام بیض کے روزے

ایامِ بیض کے روزے رکھنے کی بھی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ ۱۳-۱۴-۱۵ کو ایام بیض کہا جاتا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تو مہینے سے تین روزے رکھے تو تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخ کے روزے رکھ لے۔ (رواہ الترمذی ص ۱۴۳ ج ۱) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایامِ بیض کے روزے رکھنے کا حکم فرماتے تھے۔ (رواہ النسائی ص ۳۲۹ ج ۱)

عاشوراء کا روزہ: صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ جاہلیت کے زمانہ میں قریش عاشوراء (محرم کی دس تاریخ) کا روزہ رکھتے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو اس دن کا روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا پھر جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو عاشوراء کا روزہ (بحیثیت تاکیدی حکم کے) باقی نہ رہا پھر جو چاہتا اس دن کا روزہ رکھتا تھا اور جو چاہتا چھوڑ دیتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یوم عاشوراء کا روزہ رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت سے پہلے مشروع تھا اور اس کا روزہ رکھنا مؤکد تھا۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد تاکد ختم ہو گیا اور استحباب کا درجہ رہ گیا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے پوری پوری اُمید رکھتا ہوں کہ یوم عرفہ (بقرعید کی نویں تاریخ) کا روزہ رکھنے پر ایک سال قبل اور ایک سال بعد کے گناہ معاف فرمادیگا اور یومِ عاشوراء کے روزہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے پوری پوری امید رکھتا ہوں کہ ایک سال پہلے کے گناہوں کا کفارہ فرمادیگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ رمضان کے بعد سب سے

زیادہ افضل محرم (یعنی اُس کی دس تاریخ) کا روزہ ہے جو شہر اللہ ہے۔ اور سب نمازوں میں فرض نمازوں کے بعد رات کی نماز (یعنی نماز تہجد) افضل ہے۔ (صحیح مسلم)

قال الطیبی أرادبصیام شهر الله صیام یوم عاشوراء اه ویکون من باب ذکر الکل وارادة البعض ویمکن ان یقال أفضلیته لما فیه من یوم عاشوراء ولکن الظاهر ان المراد جمیع شهر المحرم (کذافی المرقاة)

محرم کو شہر اللہ یعنی اللہ کا مہینہ فرمایا۔ یہ اضافت تشریفی ہے۔ کیونکہ سب مہینے اللہ ہی کے ہیں۔ محرم الحرام کی فضیلت بتانے کے لئے شہر اللہ فرمایا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نویں اور دسویں محرم کا روزہ رکھو اور یہودیوں کی مخالفت کرو۔ (سنن الترمذی)

اور شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ دسویں تاریخ کا روزہ رکھنا مستحب ہے اور یہ بھی مستحب ہے' کہ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد روزہ رکھے۔ صرف یوم عاشوراء کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ کیونکہ اس میں یہود کی مشابہت ہے۔ (ذکرہ فی المرقاۃ)

عشرہ ذی الحجہ کے روزے:

بقرعید کی نویں تاریخ کے روزہ کی فضیلت اُوپر معلوم ہوئی۔ اُس سے پہلے جو آٹھ دن ہیں اُن میں بھی روزہ رکھنا چاہئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ذوالحجہ کے اول کے دس دنوں میں عمل صالح سب دنوں کے اعمال سے افضل ہے۔ صحابہ نے عرض کیا۔ اور جہاد فی سبیل اللہ سے بھی؟ فرمایا (ہاں) جہاد فی سبیل اللہ بھی ان دنوں کے اعمال صالحہ سے بڑھ کر نہیں ہے۔ الا یہ کہ کوئی شخص اللہ کی راہ میں نکلا (اور اس نے جان اور مال کی بازی لگادی) پھر کچھ بھی لیکر واپس نہ ہوا۔ (صحیح بخاری)

ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عاشوراء کا روزہ اور ذوالحجہ کے عشرہ اولیٰ کے روزے (باستثناء یوم الاضحیٰ) اور مہینے کے تین روزے نہیں چھوڑتے تھے۔ (سنن نسائی)

فائدہ: بقرعید کی نویں تاریخ کو حج ہوتا ہے۔ اس دن حج کرنے والے عرفات میں ہوتے ہیں۔ ظہر کی نماز کے بعد سے غروب آفتاب تک دعاؤں میں مشغولیت ہوتی ہے اس لئے حجاج کے لئے افضل ہے کہ اس تاریخ کا روزہ نہ رکھیں۔ حضور اقدس ﷺ نے بھی حج کے موقعہ پر اس دن روزہ نہیں رکھا تھا (کمافی صحیح البخاری ص ۲۶۷ ج ۱، صحیح مسلم ص ۳۹۷ ج ۱)

فائدہ: نفلی عبادت روزہ ہو یا نماز ذکر ہو یا تلاوت' حج ہو یا عمرہ جس قدر بھی کوئی شخص ادا کرے گا اُس کا ثواب پائے گا۔ لیکن ہر عمل میں شریعت کے اصول وقوانین کا خیال رکھنا لازم ہے۔ ایک نفلی روزہ کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے فی سبیل اللہ ایک روزہ رکھ لیا اللہ تعالیٰ اسکی ذات کو دوزخ سے اتنی دور کردیں گے جتنی دُور کوئی شخص ستر سال میں چل کر پہنچے۔ (یعنی وہ دوزخ میں نہ جائے گا)۔ (صحیح بخاری)

لفظ فی سبیل اللہ کا متبادر معنی تو یہ ہے کہ جہاد کے موقع پر روزہ رکھنے کی یہ فضیلت ہے اور اس لئے امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الجہاد میں ذکر کیا ہے۔ اور بعض شراح حدیث نے اس کا ترجمہ لوجہ اللہ بھی کیا ہے۔ یعنی جو شخص اللہ کی رضا کے لئے روزہ رکھے۔ اس کا یہ ثواب ہے۔ فتح الباری میں دونوں معنی لکھے ہیں۔ نفل روزے بقدرِ طاقت (جس سے دوسری فرض عبادتوں میں ضعف نہ آجائے اور اپنے لئے اور اہل وعیال کے لئے ضروری حلال کسب معاش میں فرق نہ

آئے) رکھتے رہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور راتوں رات نفل نماز میں قیام کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ایسا نہ کرو روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو اور رات کو نماز میں بھی قیام کرو اور سوؤ بھی۔ کیونکہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے اور بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے پاس آنے جانے والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ اور فرمایا کہ سب سے افضل روزہ داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن بے روزہ رہتے تھے۔ (صحیح البخاری)

سال بھر میں پانچ دن ایسے ہیں جن میں روزہ رکھنا حرام ہے

وہ پانچ دن یہ ہیں۔ عید الفطر کا دن اور ذی الحجہ کی ۱۰-۱۱-۱۲-۱۳ تاریخوں میں۔ ذوالحجہ کے ان دنوں کو ایام تشریق کہا جاتا ہے۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ ایام تشریق کھانے پینے اور اللہ کا ذکر کے دن ہیں۔ رواہ المسلم (بخاری) میں حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ ذکر اللہ میں تو ہمیشہ ہی مشغول رہنا چاہئے۔ لیکن ایام تشریق میں خصوصیت کے ساتھ ذکر اللہ کا اہتمام کیا جائے۔

مسئلہ: جس عورت کا شوہر گھر میں موجود ہو وہ شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے البتہ فرض روزوں میں شوہر کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ وہ منع بھی کرے تب بھی رکھے کیونکہ اللہ کے فرائض سب کے حقوق سے مقدم ہیں۔

روزانہ نفلی روزہ رکھنا محمود نہیں

فائدہ: بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ روزانہ روزہ رکھتے ہیں۔ روزانہ روزہ رکھنا محمود نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **لا صام من صام الأبد** (یعنی جس نے ہمیشہ روزے رکھے اُس نے روزے رکھے ہی نہیں)۔ صحیح بخاری۔

اور آپ نے روزانہ روزہ رکھنے والے کیلئے یہ بھی فرمایا کہ **لا صام و لا افطر** کہ اس نے روزے رکھے نہ افطار کیا۔ (صحیح مسلم)

اور وجہ اسکی یہ ہے کہ روزانہ روزہ رکھنے سے نفس کو عادت ہو جاتی ہے۔ صرف کھانے پینے کے اوقات بدل جاتے ہیں۔

افضل الصیام: سب سے افضل روزہ یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن بے روزہ رہے حضرت داؤد علیہ السلام اسی طرح نفلی روزے رکھتے تھے۔ آنحضرت سرور عالم ﷺ نے فرمایا **لا صوم فوق صوم داؤد** (صحیح بخاری) (یعنی داؤد علیہ السلام کے روزہ سے بڑھ کر کوئی روزہ نہیں) اور ایک روایت میں ہے۔ **لا افضل من ذلک** (بخاری ص ۲۶۵ ج ۱) یعنی اس روزے سے افضل کوئی روزہ نہیں ہے۔

حدود اللہ سے آگے بڑھنے کی ممانعت:

آخر میں فرمایا **تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا** الآیۃ (یعنی یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں لہٰذا ان کے پاس نہ پھٹکو) گزشتہ آیات میں جو روزہ کی فرضیت اور مریض و مسافر کے لئے رخصت اور روزہ کی ابتداء اور انتہاء کے اوقات بیان ہوئے اور اعتکاف والوں کے لئے ارشاد ہوا کہ اعتکاف میں مباشرت نہ کریں۔ ان سب کے بیان کرنے کے بعد ارشاد ہے کہ یہ احکام اللہ کی حد بندیاں ہیں۔ حدود سے آگے مت بڑھو جو حکم جس طرح ہوا ہے اس کو اُسی طرح پورا کرو اور ایسی صورت اختیار نہ کرو

جس سے روزہ یا اعتکاف فاسد ہو جائے رمضان کا روزہ بلا عذر شرعی چھوڑو بھی نہیں اور توڑو بھی نہیں۔ حد بندیوں کے قریب جانے کی ممانعت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے روزہ ضائع ہو جائے۔ نہ سحری میں اتنی دیر کریں کہ صبح صادق ہو جائے نہ افطار میں اتنی جلدی کریں کہ سورج چھپنے سے پہلے ہی کھا کے فارغ ہو جائیں حالت روزہ میں منہ میں ایسی کوئی چیز نہ لیں جس کا اندر جانے کا اندیشہ ہو اور وضو کرتے وقت ناک میں پانی دینے میں مبالغہ نہ کریں (کما فی الحدیث و بالغ في الاستنشاق الا ان تكون صائما' رواہ ابوداؤد) روزے میں مسواک کرنا تو احادیث شریفہ سے ثابت ہے لیکن دوسری چیزوں سے روزے میں دانت صاف کرنے کو فقہاء نے اسی لئے مکروہ لکھا ہے کہ تھوڑا بہت اندر چلے جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ
اور آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل ذریعہ سے مت کھاؤ۔ اور نہ لے جاؤ اُن کو حاکموں کی طرف تا کہ کھا جاؤ ایک حصہ
النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾
لوگوں کے مالوں میں سے گناہ کے ساتھ حالانکہ تم جانتے ہو

باطل طریقوں سے مال کھانے کی ممانعت

تفسیر: اس آیت میں باطل طریقہ پر کسی کا مال حاصل کرنے اور اپنے استعمال میں لانے کی ممانعت فرمائی۔ رمضان میں دن کے اندر حلال کھانے کی ممانعت فرمائی گئی۔ اور اب اُحکام رمضان کے متصل ہی یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ حرام کبھی نہ کھاؤ۔ نہ رمضان میں نہ رمضان کے علاوہ کسی دوسرے مہینہ میں۔ لفظ "بالباطل" بڑھا کر یہ بتا دیا کہ جو مال شرعاً جائز ہو مثلاً طیب نفس کے ساتھ کوئی ہدیہ دے دے یا شریعت کے مطابق تجارت کرنے سے نفع کی صورت میں کچھ مال مل جائے یا میراث میں حلال مال مل جائے تو یہ حلال ہے۔ باطل کے ذریعہ مال حاصل کرنے کی بہت صورتیں ہیں۔ جن میں سے متعدد صورتیں آیت کریمہ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا کے ذیل میں بیان کر دی گئی ہیں۔ یہاں قرآن کریم نے ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعہ لوگوں کے مالوں پر باطل طریقہ سے قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ حکام وقت کو ذریعہ بنا کر لوگوں کے مالوں کو اپنا مال بنا لیتے ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔

حاکم کے فیصلہ کر دینے سے کسی کا مال حلال نہیں ہو جاتا

ایک صورت یہ ہے کہ کسی کے مال پر دعویٰ کیا کہ یہ میرا ہے اور حاکم کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرا لیا اور ایک طریقہ یہ ہے کہ جھوٹی تحریر لکھ کر یا جھوٹے گواہ بنا کر حاکم کے ہاں پیش کر کے کسی غیر کے مال اور جائداد کے بارے میں اپنے حق میں فیصلہ کرا لیا۔ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ شرعی قانون کے خلاف حکومت وقت کے رائج قوانین کے مطابق کسی کا مال دبا لیا۔ مثلاً کسی حکومت نے یہ قانون بنا دیا کہ مرنے والے کے مال میں صرف لڑکوں کا حصہ ہوگا۔ اور اس قانون کے پیش نظر لڑکوں نے حاکم سے اپنے حق میں میراث تقسیم کرانے کا فیصلہ کرا لیا۔ اور بہنوں کو محروم کر دیا۔ یا جیسے کسی حکومت نے قانون بنا دیا کہ فلاں فلاں اشخاص کا مال زبردستی لے کر فلاں فلاں قسم کے آدمیوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ تو ان میں سے کسی بھی صورت میں کسی شخص کا

مال ہرگز حلال نہیں ہوگا اور بھی اس کی بہت سی صورتیں ہیں جنہیں مقدمہ باز جانتے ہیں اور مکروفریب کے ذریعہ حکام کو استعمال کرکے دوسروں کے مالوں پر قبضہ کرتے رہتے ہیں۔ حاکم سے فیصلہ کرا کر جو شخص کسی کا مال لے لے گا۔ وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگا۔ دنیا و آخرت میں اس کا بہت بڑا وبال ہے اور سخت عذاب ہے دنیاوی حکام کے فیصلوں کے ذریعہ کسی کا مال اپنا بنا کر مطمئن نہ ہو جائیں۔ یہ یاد رکھیں کہ مالک یوم الدین قاضی روز جزاء جل مجدہ کے حضور میں بھی پیش ہونا ہے۔ حضرت اُم سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں انسان ہی ہوں اور تم میرے پاس جھگڑے لیکر آتے ہو اور ممکن ہے کہ تم میں سے ایک آدمی دوسرے کے مقابلہ میں اپنی حجت کو بڑھ چڑھ کر بیان کردے اور میں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں جو کچھ میں نے اس سے سُنا (اور یہ فیصلہ حقیقت میں غلط ہو) سو جس کے لئے میں اُس کے بھائی کے مال میں سے کسی چیز کا کوئی فیصلہ کردوں تو اُسے ہرگز نہ لے کیونکہ میں اُس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔ (صحیح بخاری)

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی پر جھوٹا مقدمہ دائر کیا اور جس کا حق نہیں ہے اُس کے زور بیان پر میں نے اس کو دوسرے کا حق دلا دیا یا تو میرے دلانے سے وہ اس کے لئے حلال نہ ہو جائے گا۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ اللہ کے رسول (ﷺ) نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا۔ لہٰذا میرے لئے دوسرے کا مال حلال ہوگیا۔ باوجود فیصلہ کر دینے کے دوسرے کا مال مدعی کے لئے حلال نہ ہو جائے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو اُس کی نہیں ہے تو وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے اور وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔ (رواہ مسلم)

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے جھوٹی قسم کھائی جس کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال اپنے حق میں کر لینا چاہتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غصہ ہوگا۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

لفظ فَرِيقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ جو فرمایا ہے۔ اس میں یہ بتا دیا کہ صرف آپس میں مسلمان ہی کا مال ناحق لے لینا حرام نہیں ہے بلکہ غیروں کا مال ناحق لے لینا بھی حرام ہے جو کافر مسلمانوں کی عملداری میں رہتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں اُن کو ذمی کہا جاتا ہے۔ تمام مسلمانوں پر ان کی جان و مال کی حفاظت لازم ہے۔ اور خیانت کرکے یا کسی بھی طرح سے ان کا مال ناحق رکھ لینا جائز نہیں ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ

وہ آپ سے چاندوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ یہ اوقاتِ مقررہ ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے اور نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں

مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ

میں ان کے پچھواڑوں کی طرف سے آؤ لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے۔ اور آجاؤ تم گھروں میں ان کے دروازوں سے۔ اور اللہ سے ڈرو

تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ

چاندوں میں کمی بیشی کیوں ہوتی ہے

تفسیر: تفسیر در منثور (ص ۲۰۳ ج ۱) میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبل اور ثعلبہ بن عنمہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ چاند چھوٹا بڑا کیسے ہو جاتا ہے۔ اوّل باریک تاگہ کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے بڑا ہو جاتا ہے۔ اور گول ہو جاتا ہے۔ پھر گھٹتے گھٹتے باریک ہو جاتا ہے۔ اور شروع میں جیسا تھا ویسا ہی آخر میں ہو جاتا ہے۔ اس کے سوال پر آیت بالا نازل ہوئی اور ان کو جواب دیا گیا کہ یہ چاند لوگوں کے لئے اوقاتِ مقررہ بتانے والے ہیں اور حج کا وقت بھی ان کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روزے کب رکھنا شروع کریں گے۔ عورتوں کی عدت کے اوقات ان کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور خرید و فروخت کے معاملات میں جو کوئی اَجل اور میعاد مقرر ہوتی ہے چاندوں کے ذریعہ ان کے ختم ہونے کا علم بھی ہوتا ہے۔

شریعت اسلامیہ میں قمری مہینوں کا اعتبار ہے

شریعت اسلامیہ میں چاند کے مہینوں کا اعتبار کیا گیا ہے صاحب نصاب پر چاند کے اعتبار سے بارہ مہینے گزر جانے پر زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہوتی ہے (اگر کوئی شخص شمسی مہینوں کے اعتبار سے سال گزر جانے پر زکوٰۃ ادا کرتا رہے گا تو چھتیس سال کے بعد ایک سال کی زکوٰۃ کی ادائیگی میں کمی رہ جائے گی۔ کیونکہ شمسی سال قمری سال سے دس دن بڑا ہوتا ہے) جس عورت کا شوہر وفات پا جائے اسکی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اور جس عورت کو ابتک حیض نہیں آیا اُس کو طلاق ہو جائے تو اس کی عدت تین مہینہ ہے۔ یہ مہینے قمری مہینوں کے اعتبار سے معتبر ہوں گے۔ اور رمضان کے روزے بھی چاند ہی کے حساب سے رکھے جاتے ہیں کیونکہ رمضانِ چاند کے بارہ مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے پھر عید بھی چاند دیکھ کر کی جاتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چاند دیکھ کر (رمضان کے) روزے رکھنا شروع کرو اور چاند دیکھ کر رمضان کے روزے رکھنا ختم کر دو۔ اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس (روزوں کی) گنتی پوری کر لو۔ (صحیح مسلم)

حج بھی ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو ہوتا ہے اور قربانیاں ذوالحجہ کی دس۔ گیارہ۔ بارہ کی تاریخوں میں ہوتی ہیں۔ ان سب احکام میں چونکہ چاند ہی کا مہینہ معتبر ہے اور چاند ہی کے حساب سے مہینوں کی ابتدا اور انتہاء ہوتی ہے اس لئے چاند کے مہینوں کا محفوظ رکھنا اور انکی ابتداء اور انتہاء جاننا فرض کفایہ ہے۔

دینی اُمور کو قمری مہینوں سے متعلق کرنے میں آسانی ہے

چاند کے مہینوں سے دینی امور کو متعلق کرنے میں عوام اور خواص کے لئے اور پورے عالم کے انسانوں کے لئے آسانی بھی ہے۔ چاند شروع میں مغرب کی طرف چھوٹا سا نظر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب مہینہ شروع ہے پھر چند دن کے بعد پوری رات روشن رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ایام بیض کا زمانہ ہے پھر اخیر میں مشرق کی طرف چھوٹا ہو کر نظر آنے لگتا ہے اور ایک دو دن بالکل ہی نظر نہیں آتا اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب مہینہ اخیر ہو رہا ہے۔ اگر شمسی مہینوں سے عبادات کا تعلق ہوتا تو اُسے صرف حساب دان ہی سمجھ سکتے تھے اور ہر شخص کے پاس کیلنڈر اور جنتری ہونا ضروری تھا اور یہ یاد رکھنا ضروری تھا کہ کونسا مہینہ کتنے دن کا ہوتا ہے یہ سب باتیں عوام کے لئے سمجھنا اور یاد رکھنا مشکل تھا

پھر کیلنڈر وغیرہ اب ترقی یافتہ دنیا میں چھپنے لگے ہیں وہ بھی ہر بستی اور ہر گھر میں نہیں ہوتے۔ اور احکام اسلام چودہ سو سال سے نافذ ہیں پھر کیلنڈر اور جنتریوں پر عبادات کیسے موقوف رکھی جاسکتی ہیں۔ عوام اور خواص کے لئے یہ آسانی ہے کہ چاند دیکھا اور مہینے کی ابتداء اور انتہا سمجھ لی۔ سورج روزانہ ایک ہی طرح نکلتا اور چھپتا ہے۔ سردی گرمی میں اس کا طلوع غروب ایک ہی طرح ہے اسے دیکھ کر مہینوں کی ابتداء اور انتہا سمجھنے کا کوئی راستہ نہیں۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہؓ نے جو سوال کیا تھا وہ یہودیوں کے سوال کرنے پر تھا۔ یہودیوں نے حضرات صحابہؓ سے چاند کے بارے میں سوال کیا تو ان حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیا۔ الفاظ سوال میں احتمال ہے کہ اُنہوں نے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت معلوم کی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کے گھٹنے بڑھنے کی علت اور سبب معلوم کیا ہو۔ اگر چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت معلوم کی تھی تب تو جواب سوال کے مطابق ہو گیا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں عبادات کے اوقات اور معاملات کی میعادیں معلوم کرنے کا فائدہ ہے۔ اگر چاند آفتاب کی طرح ایک ہی حالت پر ہوتا تو اوقات کا سمجھنا اور معلوم کرنا مشکل ہو جاتا۔ اور اگر حضرات صحابہؓ کا سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علت جاننے کے متعلق تھا تو جواب من قبیل اسلوب الحکیم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں وہ معلوم کرنا چاہئے جس کی تمہیں ضرورت ہے۔ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے اسباب تکوینیہ جاننے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں، تمہیں تو یہ پوچھنا چاہئے کہ اس کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت کیا ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے چنانچہ ان کو اسی سوال کا جواب دے دیا گیا جو سوال انہیں کرنا چاہئے تھا۔ چاند کا گھٹنا بڑھنا یعنی چھوٹا بڑا نظر آنا اس کے اسباب تکوینیہ ریاضی کی کتابوں میں لکھے ہیں کچھ پرانے فلاسفہ کے تخیلات ہیں اور کچھ نئے سائنس کے تصورات ہیں ان میں سے کسی بھی چیز کی قرآن وحدیث سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اور نہ کوئی دینی مسئلہ ان کے جاننے پر موقوف ہے۔ بہت سے لوگ فلکیات اور اجرام سماویہ کے احوال جدید آلات کے ذریعہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور مروجہ علوم میں ماہر بھی ہو جاتے ہیں۔ اور اپنے کو بڑا عالم بھی سمجھتے ہیں دنیا کے ادارے اور ملکوں کے سربراہ اُن کو اعزازی ڈگریاں بھی دیتے ہیں لیکن یہ سب لوگ ان چیزوں کے خالق و مالک کی نہ صرف عبادت کرنے سے اور اُس کی معرفت سے محروم ہیں بلکہ اس ذات پاک پر ایمان بھی نہیں لاتے جس نے یہ چیزیں پیدا فرمائیں۔ قرآن مجید کے طرزِ جواب میں ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے اسباب تکوینیہ کے جاننے میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان پر سب سے زیادہ خالق جل جلالہٗ کے احکام کی طرف متوجہ ہونا فرض ہے۔

گھروں میں دروازں سے آنے کا حکم

چاندوں کے متعلق سوال کا جواب دینے کے بعد جاہلیت کی ایک رسم کی تردید فرمائی۔ صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جاہلیت میں عرب کے لوگ جب احرام باندھ لیتے تھے تو (احرام کے زمانہ میں) گھر کی پشت سے داخل ہوتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور فرمایا وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا اور صحیح بخاری ابواب العمرہ (ص ۲۴۲ ج ۱) میں یوں نقل کیا ہے کہ انصار (اوس اور خزرج کے قبیلے) جب حج کر کے واپس ہوتے تھے تو اپنے گھروں میں دروازوں سے نہیں بلکہ پچھواڑوں کی طرف سے داخل ہوتے تھے ایک انصاری جو حج کر کے آئے تو

وہ گھر کے دروازہ سے داخل ہو گئے ان کو عار دلائی گئی (گویا انہوں نے کوئی برا کام کیا ہے) اس پر آیت بالا نازل ہو گئی۔

اپنی طرف سے کسی کام میں ثواب یا گناہ سمجھ لینا بدعت ہے

گھروں کے پچھواڑوں سے داخل ہونے کو وہ لوگ ثواب سمجھتے تھے اور اس کو نیک کام جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے انکی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ یہ نیکی نہیں ہے کہ اپنے گھروں میں ان کی پشتوں کی طرف سے آؤ۔ نیکی اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع فرمایا ان سے پرہیز کیا جائے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی رہے اور اپنی طرف سے تراشے ہوئے احکام اور اعمال کی پابندی کی جائے اور اس میں ثواب سمجھا جائے یہ گمراہی کی بات ہے۔ جس چیز کو شریعت نے ضروری نہیں قرار دیا یا ثواب کا کام نہیں بتایا اسکو اپنی طرف سے ضروری قرار دے دینا یا ثواب کا کام سمجھ لینا بدعت ہے اور گناہ ہے جیسا کہ جو چیز شرعاً جائز ہوا سے گناہ سمجھنا گناہ ہے، گھر کے دروازوں سے داخل ہونا شرعاً جائز تھا اسکو گناہ قرار دیا اور مکان کی پشتوں کو توڑ کر داخل ہونے کو ضروری سمجھا اور ثواب کا کام جانا اس لئے ان کے عقیدہ اور عمل کی تردید فرمائی اور آخر میں فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ کہ تم اللہ سے ڈرو تا کہ کامیاب ہو جاؤ۔ اس کے اُحکام پر عمل پیرا ہو اور اس کے احکام میں تغیر تبدل نہ کرو۔

علامہ جصاص کا ایک استنباط

علامہ جصاص احکام القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ قانون معلوم ہوا کہ جس عمل کو اللہ تعالیٰ نے ثواب کا کام نہیں بتایا اور جس کی ترغیب نہیں دی وہ کسی شخص کے ثواب بنا لینے سے ثواب کی چیز نہ بنے گا۔ نہ دین کا جزو ہو گا۔ اس کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ نہ سمجھ لیا جائے۔ اور یہ عقیدہ نہ رکھا جائے کہ وہ دین ہے پھر لکھتے ہیں کہ اُس کی نظیر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دن بھر خاموش رہنے سے منع فرمایا۔ (چونکہ شریعت محمدیہ میں خاموش رہنے کا روزہ نہیں ہے) اور ایک شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ دھوپ میں کھڑا ہے آپ نے فرمایا اس کو کیا ہوا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ اس نے دھوپ میں کھڑے ہونے کی نذر مانی ہے۔ آپ نے اس کو حکم دیا کہ سایہ میں چلا جا۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اُن لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی مت کرو، بے شک اللہ تعالیٰ

الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ

زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا، اور تم اُن کو قتل کرو جہاں بھی پالو اور نکال دو ان کو جہاں سے اُنہوں نے تم کو نکالا

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ

اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اور اُن سے جنگ مت کرو مسجد حرام کے پاس جب تک کہ وہ تم سے اُس میں خود نہ لڑیں۔

فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

سو اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم اُن کو قتل کر دو۔ ایسی ہی جزا ہے کافروں کی۔ سو اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ غفور

رَّحِيْمٌ ﴿١٩٢﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا

رحیم ہے۔ اور اُن سے یہاں تک جنگ کرو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور ہو جائے دین اللہ ہی کے لئے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو

عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩٣﴾

زیادتی نہیں ہے مگر ظالموں پر

اللہ کی راہ میں قتال کرنیکا حکم اور ظلم و زیادتی سے پرہیز کرنیکی تاکید

تفسیر: حضرت سید المرسلین علیہ ﷺ ہجرت کے چھٹے سال اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے جب مکہ معظمہ قریب آیا تو مقام حدیبیہ پر مشرکین مکہ نے آپ کو روک دیا۔ اور مکہ معظمہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ بڑی رد و کد کے بعد انہوں نے اس سال کے لئے چند شرطوں پر صلح کر لی اُن میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس سال عمرہ نہیں کر سکتے آئندہ سال عمرہ کے لئے تشریف لائیں۔ اور اُس وقت مکہ معظمہ میں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ یہ ذی قعدہ کا مہینہ تھا۔ پھر آپ آئندہ سال ماہ ذی قعدہ ہی میں عمرہ کی قضا کے لئے تشریف لائے اس زمانہ میں چار مہینوں میں قتال اور جنگ کرنا ممنوع تھا۔ اُن چار مہینوں میں ذیقعدہ کا مہینہ بھی شامل تھا۔

لباب النقول میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ مذکورہ بالا آیت اس موقعہ پر نازل ہوئی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے لئے اپنے صحابہ کے ساتھ ۷ھ میں تشریف لے گئے تھے حضرات صحابہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ ممکن ہے کہ قریش مکہ صلح کی شرطوں کی خلاف ورزی کر بیٹھیں اور اس مرتبہ بھی مسجد حرام تک نہ پہنچنے دیں اور جنگ پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہمیں بھی جنگ کا اقدام کرنا پڑے گا اور یہ اس مہینہ میں ہوگا جس میں جنگ کرنا حرام ہے اور ہم جوابی کارروائی نہ کریں تو مغلوب ہوں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی اور قتال کرنے کی اجازت دے دی۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ تم سے قتال کرتے ہیں اُن سے قتال کرو اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ زیادتی مت کرو بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنیوالوں کو پسند نہیں فرماتا۔ شریعت اسلامیہ میں ہر چیز کی حدود ہیں۔ اصول ہیں آداب ہیں اور اخلاق عالیہ ہیں۔ قتل اور قتال کے بھی کچھ اُصول ہیں۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ لَا تَعْتَدُوْا کے عموم میں وہ سب باتیں داخل ہوگئیں جو جنگ کے موقعہ پر ممنوع ہیں مثلاً مُثلہ کرنا (کسی مقتول کے ناک کان کاٹ دینا صورت بگاڑ دینا) مال غنیمت میں خیانت کرنا، عورتوں بچوں اور اُن بوڑھوں کو قتل کرنا جو نہ جنگ کرتے ہوں نہ جنگ کے معاملات میں کوئی رائے یا مشورہ دیتے ہوں اور مثلاً راہبوں کو قتل کرنا اور بغیر کسی مصلحت کے درختوں کو جلانا اور حیوانات کو قتل کرنا (تفسیر ابن کثیر) صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی لشکر یا کسی فوجی دستہ کا کسی کو امیر بنا کر بھیجتے تو خاص کر اُس کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی اور جو مسلمان اس کے ساتھ جا رہے ہوں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی وصیت فرماتے تھے۔ پھر فرماتے تھے کہ اللہ کا نام لے کر اللہ کی راہ میں جہاد کرو جو شخص اللہ کو نہ مانتا ہو اُس سے جنگ کرنا مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا اور غدر نہ کرنا اور کسی کا مثلہ نہ کرنا اور کسی بچہ کو قتل نہ کرنا۔

بعض روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ جہاد کے موقعہ پر ایک عورت مقتولہ پائی گئی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا

آپ نے عورتوں اور بچوں کے قتل کرنے کی ممانعت فرمائی۔ (صحیح مسلم)

پھر فرمایا وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ۔ (کہ اُن کو قتل کرو جہاں بھی پاؤ) وَاَخْرِجُوْهُمْ مِنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ (اور ان کو نکال دو جہاں سے اُنہوں نے تم کو نکالا) یعنی تمہیں مکہ معظمہ چھوڑ کر ہجرت پر مجبور کیا۔

فتنہ گری قتل سے زیادہ سخت ہے:

اور فرمایا وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے) فتنہ سے مراد شرک ہے۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ صحابہ کے دلوں میں جو یہ بات آرہی تھی کہ حرم میں اُن کو کس طرح قتل کریں گے۔ جبکہ حرم کا احترام ضروری ہے۔ ان کے اس وسوسہ کا جواب دیا گیا ہے کہ جس کام میں یہ لوگ خود لگے ہوئے ہیں یعنی شرک باللہ اور وہ بھی حرم میں وہ قتل کرنے سے بہت زیادہ سخت ہے۔ لہٰذا تم اسکی پرواہ نہ کرو کہ حرم میں قتل وقتال واقع ہو جائے گا۔

دفاع کے لئے قتال کرنا

پھر فرمایا: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (اور اُن سے جنگ مت کرو مسجد حرام کے پاس جب تک کہ وہ تم سے اُس میں خود نہ لڑیں۔ سو اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم ان کو قتل کر دو ایسی ہی جزا ہے کافروں کی) اسمیں مسلمانوں کو ابتداء بالقتال کی ممانعت فرمائی کہ مسجد حرام کے قریب خود قتل وقتال کی ابتداء نہ کرنا جب تک کہ وہی تم سے قتال شروع نہ کریں، اگر وہ حرم کی حرمت کی پاسداری ترک کر دیں تو تم بھی اُن کو قتل کر دو۔

قال صاحب الروح نفی للحرج عن القتال فی الحرم الذی خاف منه المسلمون و کرهوه ای ان قاتلوکم هناک فلا تبالوا بقتالهم لا نهم الذین هتکوا الحرمة وأنتم فی قتالهم دافعون القتل عن انفسکم.

اس کے بعد فرمایا: فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یعنی اگر مشرکین کفر اور شرک سے باز آجائیں اور اسلام قبول کرلیں گے تو (اہل اسلام سے قتال بھی نہ کریں گے) اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (وہ سب کی توبہ قبول فرماتا ہے)۔

قتال کب تک ہونا چاہیے

پھر فرمایا: وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ (یعنی کافروں سے یہاں تک جنگ کرو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور سارا دین اللہ ہی کے لئے ہو جائے) اس میں قتال کی ضرورت اور غرض وغایت بیان فرمائی ہے شرک اور کفر بدترین گناہ ہے۔ خالق و مالک کی بغاوت ہے۔ دنیا میں اسکو مٹانے کے لئے کافروں اور مشرکوں سے جنگ کرتے رہیں اور یہاں تک جنگ کریں کہ سارا دین اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔ (صحیح بخاری ص ۸ ج ۱) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے یہ حکم ہوا کہ لوگوں سے اُس وقت تک قتال کرتا رہوں جب تک کہ وہ لا اله الا الله کو نہ مانیں۔ جب انہوں نے اس کو کہہ لیا تو وہ مجھ سے اپنے خونوں اور مالوں کو بچالیں گے۔ ہاں اگر اسلام کا قانون ان کے خونوں اور مالوں کے بارے میں جاری کرنا ضروری ہوا تو وہ اور بات ہے اور اُن کا حساب اللہ پر ہے۔

(یعنی کوئی شخص اگر ظاہراً اسلام قبول کرے گا تو ہم اُس کو قتل نہ کریں گے۔ آگے اس کا حساب اللہ کے سپرد ہے دل سے اسلام قبول نہ کیا ہوگا تو آخرت کے دائمی عذاب میں مبتلا ہوگا۔ دلوں کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ ہم ظاہر کے پابند ہیں)

قتال کرنے میں کیا نیت ہو؟

آیت سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ قتال کی ضرورت کفر اور شرک کو مٹانے کے لئے ہے وہاں قتال کرنے والوں کو یہ بھی بتا دیا کہ قتال اور جہاد میں یہ نیت رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کا بول بالا ہو اس کا دین بلند ہو۔ دنیا سے اس کے باغی ختم ہوں اور حقیقۃً اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا وہی ہے جو اللہ کی بات بلند کرنے کے لئے قتال کرے ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے سوال کیا کہ ایک آدمی مال غنیمت کے لئے قتال کرتا ہے ایک شہرت کے لئے لڑتا ہے اور ایک اس لئے لڑتا ہے کہ لوگ اسکی بہادری کے قائل ہو جائیں سو اُن میں فی سبیل اللہ لڑنے والا کون ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ کی بات اُونچی ہو تو وہ فی سبیل اللہ لڑنے والا ہے۔ (صحیح بخاری ص ۳۹۴ ج ۱)

فائدہ: عرب کے مشرکوں کے لئے یہی قانون ہے کہ یا تو اسلام قبول کریں یا قتل کر دیئے جائیں ان کے علاوہ دوسرے انسانوں کے لئے جان و مال محفوظ کرنے کا یہ بھی طریقہ ہے کہ وہ جزیہ دینا منظور کر لیں وہ مسلمانوں کے ملک میں مغلوب ہو کر رہیں اور اُصولِ شریعت کے مطابق ان سے جزیہ وصول کیا جاتا رہے۔ سورۃ برأت میں ادائے جزیہ کی صورت میں جنگ بند کر لینے کا ذکر ہے۔ یہاں چونکہ مشرکین عرب کا ذکر ہے اس لئے جزیہ کا ذکر نہیں فرمایا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جزیہ کا قانون بعد میں نازل ہوا ہو۔

فتنوں کو دبانے کے لئے جنگ کرنا

یہ جو فرمایا: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ اس میں واضح طور پر فرمادیا کہ قتال فتنہ ختم کرنے کے لئے ہے۔ لفظ فتنہ عام ہے سب سے بڑا فتنہ کفر اور شرک ہے۔ اور اس کے علاوہ فسق و فجور کے فتنے بھی اُٹھتے رہتے ہیں کبھی مسلمان بھی آپس میں لڑتے ہیں اس میں بہت سی مرتبہ واضح طور پر کسی جماعت کے بارے میں حق اور ناحق کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور بعض مرتبہ جنگ میں شریک ہونے پر موجودہ فتنہ میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لئے دین دار سمجھ دار آخرت کے فکر مند حضرات اس میں حصہ نہیں لیتے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں دو آدمی آئے۔ یہ حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے جنگ و جدال کرنے کا زمانہ تھا۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ لوگ ضائع ہو رہے ہیں۔ اور آپ حضرت عمرؓ کے بیٹے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ آپ جنگ میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان دونوں سے کہا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے (مسلمان) بھائی کا قتل کرنا حرام قرار دیا ہے۔ (پھر میں کیسے شرکت کروں؟ ممکن ہے مجھ سے کوئی ناحق قتل ہو جائے) اُن دونوں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (کہ اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے) حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ہم نے دشمنانِ دین سے یہاں تک جنگ کی کہ فتنہ باقی نہ رہا اور دین اللہ ہی کے لئے ہو گیا اور تم چاہتے ہو کہ یہاں تک جنگ کرو کہ فتنہ وجود میں آجائے اور دین غیر اللہ کیلئے ہو جائے (لہٰذا تمہاری جنگ اللہ کیلئے نہیں ہے میں اس میں کیسے شرکت کروں؟)

آج کل قتل و قتال کی کثرت ہے اسلام کا دعویٰ کرنے والے افراد اور جماعتیں طرح طرح کی عصبیتوں کی وجہ سے اور دُشمنانِ دین کے اُبھارنے کے باعث آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو مسلمان بے تحاشہ قتل کر ڈالتے ہیں اول تو قتل

مسلم حرام ہے اور بہت بڑا گناہ ہے جس کی سزا آخرت میں بہت سخت ہے پھر اس سے کفر اور اہل کفر کی تقویت ہوتی ہے اور دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں میں کمزوری آتی ہے۔ یہ وہی فتنہ ہے جس کے پیش نظر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما قتال میں حصہ لینے سے باز رہے اور فرمایا کہ قرآن نے تو یہ فرمایا ہے کہ یہاں تک جنگ کرو کہ فتنہ نہ رہے اور تم اس لئے لڑتے ہو کہ فتنہ ہو۔ تمام مسلمان حضرت ابن عمرؓ کی بات کو سمجھیں اور باہمی قتل وقتال کر کے دنیا و آخرت کے عذاب اور وبال کے مستحق نہ بنیں۔

جو مشرک اسلام قبول کرلیں ان کو قتل کرنا جائز نہیں

یہ فرمایا: فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ. اس میں یہ بتایا کہ کافر اور مشرک اگر اسلام قبول کرلیں تو پھر ان کا قتل کرنا جائز نہیں۔ اگر اسلام قبول کرنے کے بعد تم نے ان کو قتل کیا تو تم ظالم ہو جاؤ گے اور پھر تم گرفت اور سزا کے مستحق ہو گے کیونکہ ظالم ہی گرفت کے مستحق ہوتے ہیں اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو ان پر سختی کرنے کا موقعہ نہ رہا۔ سختی تو ظالموں پر ہوتی ہے جو لوگ کفر و شرک پر مصر ہیں اُن پر سختی کرنا درست ہے۔ مفسر بیضاوی (ص ۱۴۴) پر لکھتے ہیں۔

ای فلا تعتدوا علی المنتهین اذلا یحسن ان یظلم الا من ظلم أوأنکم إن تعرضتم للمنتهین صرتم ظالمین وینعکس الأمر علیکم اور معالم التنزیل میں ہے: أی فان اسلموا فلا نهب ولا أسر ولا قتل الّا علی الظالمین الذین بقوا علی الشرک۔

لفظ عدوان کا ترجمہ زیادتی کیا گیا ہے۔ جو اس کا لفظی ترجمہ ہے تعدی اور اعتداء کا مادہ بھی یہی ہے جو لوگ اسلام قبول نہ کریں ان سے قتال کرنے کو عدوان سے جو تعبیر فرمایا ہے۔ یہ مشاکلۃً ہے یعنی اُنہوں نے جو کفر پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اور اس طرح سے زیادتی کر رکھی ہے تم ان کو اس زیادتی کی سزا دے سکتے ہو انہوں نے زیادتی کی ہے تو تم بھی زیادتی کر سکتے ہو یعنی انکی زیادتی پر اُن کو قتل کر سکتے ہو۔ مسلمانوں کی طرف سے جو اُن پر قتل اور غارت گری کی صورت میں سزا ہو گی اُسے عدوان فرمایا۔ جیسے محاورات میں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں زیادتی کرے تو تم بھی زیادتی کرو حالانکہ زیادتی کا جواب زیادتی نہیں ہوتا۔ وفی التنزیل العزیز وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (من البغوی والبیضاوی)

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے عوض، اور حرمتیں معاوضہ کی چیزیں ہیں۔ سو جو شخص تم پر کوئی زیادتی کرے تو اس پر اتنی ہی زیادتی

عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

کرو جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کرو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مشرکین کی زیادتی کا جواب

تفسیر: صلح کی شرطوں کے مطابق جب نبی اکرم ﷺ اپنے صحابہؓ کے ساتھ ۷ھ میں عمرۃ القضا کے لئے تشریف لے گئے تو یہ ماہ ذی قعدہ تھا۔ مشرکین مکہ سے مسلمانوں کو خطرہ تھا کہ معاہدہ کی پاسداری نہ کریں اور حملہ کر دیں اگر انہوں نے حملہ کیا تو حرمت والے مہینہ میں اور حرم میں جنگ کرنی پڑے گی اور ایسے مکان و زمان دونوں کی حرمت میں فرق آئے

گا۔ حرم کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ۔ اور مہینہ کی حرمت کے بارے میں اس آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر جنگ کرنی پڑے تو تم جنگ کر لینا اور حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے عوض ہو جائے گا یعنی مشرکین حرمت والے مہینہ کا احترام کریں تو تم بھی احترام کرو اور خود سے جنگ نہ کرو وہ بے حرمتی کر بیٹھیں تو تم بھی جوابی کارروائی کرو۔ اور یہ جو فرمایا وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ اس کا مطلب یہ ہے کہ حُرمت عوض اور معاوضہ کی چیزیں ہیں جو لوگ تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کریں تم بھی انکی رعایت کرو جس ذات پاک نے حرم اور ماہ حرام میں جنگ کرنے کو حرام قرار دیا اسی کی طرف سے جواب کارروائی کرنے اور دفاع کرنے کی اجازت مل گئی تو اب حیرانی پریشانی کا کوئی موقعہ نہ رہا۔

پھر فرمایا: فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (یعنی جو شخص تم پر زیادتی کرے تو اُس پر اُتنی ہی زیادتی کرو جتنی زیادتی اُس نے تم پر کی ہے) جس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی (یعنی عمرۃ القضا جس میں دشمنوں کے حملے کا خطرہ تھا)۔

اس کے بارے میں بتادیا کہ زیادتی کرنے والے پر اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو جتنی وہ زیادتی کرے آیت کا نزول اگرچہ خاص موقعہ پر تھا لیکن الفاظ کے عموم میں مستقل قانون بتادیا کہ زیادتی کا جواب بقدر زیادتی ہی دے سکتے ہو اور جتنی زیادتی کسی نے کی ہو اُس سے اُسی قدر بدلہ لے سکتے ہو اگر اس سے زیادہ کچھ کیا تو پھر تم زیادتی کرنے والے ہو جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے

آخر میں فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (یعنی بدلہ لینے میں اور ہر موقعہ پر گناہ سے بچو اور اللہ سے ڈرو۔ جس چیز کی اجازت نہیں اُسے نہ کرو اور یہ بھی سمجھ لو کہ تقویٰ اختیار کرنیوالوں کا بہت بڑا مقام ہے) اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے۔ اگر کسی موقعہ پر نفس کے اُبھار کی وجہ سے زیادتی کرنے کا تقاضا ہوا' اور شرعی ممانعت کی وجہ سے اس سے پرہیز کیا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کا بدلہ دیں گے۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ
اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور نہ ڈالو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں' اور خوبی کے ساتھ کام کیا کرو' بے شک اللہ تعالیٰ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾
خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے

اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت

تفسیر: مستدرک حاکم (ص ۲۷۵ ج ۳) میں ابو عمران سے روایت نقل کی ہے اُنہوں نے بیان کیا کہ ہم قسطنطنیہ میں تھے اور امیر المومنین کی طرف سے مصر پر عقبہ بن عامر جہنی اور شام پر فضالہ عامل تھے رومیوں کی ایک بہت بڑی صف (جنگ کرنے کے لئے) سامنے آئی۔ مسلمانوں نے بھی انکے سامنے بہت بڑی صف بنالی ایک مسلمان نے رومیوں کی صف پر حملہ کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اُن میں گھس گئے پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر وہاں سے نکلے۔ لوگ کہنے لگے کہ اس نے تو

اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں ڈال دیا اس پر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس آیت کا مطلب غلط لیتے ہو (اس کا یہ مطلب نہیں کہ دشمنوں سے قتال نہ کرو اور اُن پر حملہ آور نہ ہو) یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غلبہ دے دیا اور اُس کے مددگار بہت ہو گئے تو بعض انصار نے یوں کہا کہ ہمارے مال ضائع ہو گئے۔ لہٰذا اب اگر ہم مالوں کی دیکھ بھال کے لئے گھروں میں مقیم رہیں (تو شاید کچھ حرج نہ ہو) اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ہمارے ارادوں کی تردید فرمائی اور آیت کریمہ وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (الآیۃ) نازل فرمائی۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ مالوں کی دیکھ بھال کے لئے گھروں میں بیٹھنے میں ہلاکت ہے۔ پس ہم کو جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت ابو ایوبؓ موت آنے تک برابر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے سُنن ترمذی کتاب التفسیر (تفسیر سورۃ البقرہ) میں بھی یہ واقعہ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ مروی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: فلو اقمنا فی اموالنا و اصلحنا ما ضاع منھا۔ (کہ اگر ہم اپنے مالوں میں قیام کرتے اور اُن میں جو خرابی و خستگی آ گئی ہے اُسے ٹھیک کر لیتے تو اچھا تھا) اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی جس سے واضح ہوا کہ ہلاکت مالوں کی دیکھ بھال اور اُن کی اصلاح کے لئے گھروں میں مقیم ہونے اور جہاد چھوڑنے میں ہے۔ آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوا کہ کافروں کے ساتھ جہاد کرتے رہنے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے رہنے میں اسلام اور مسلمان کی عزت اور غلبہ ہے اور اُس کو چھوڑنے میں ہلاکت ہے۔

جہاد کی اہمیت اور ضرورت

درحقیقت جہاد بہت بڑی چیز ہے اس میں بہت بڑی عزت ہے اس سے اللہ کی مدد آتی ہے اور اسلام اور مسلمان کا غلبہ رہتا ہے۔ تاریخ الخلفاء (ص ۸۷) میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مرویات میں بحوالہ طبرانی (فی المعجم الاوسط) حدیث نقل کی ہے: ما ترک قوم الجھاد الا عمھم اللہ بالعذاب (جس قوم نے جہاد کو چھوڑ دیا اس پر اللہ تعالیٰ عام عذاب بھیج دیں گے) جب سے مسلمانوں نے فی سبیل اللہ جہاد کرنا چھوڑ دیا ہے اسکی وجہ سے عمومی عذاب بھی دیکھ رہے ہیں۔ مسلمان جہاد کی طرف متوجہ نہیں' یا تو آپس میں لڑتے ہیں یا دشمن کی شہہ پر جنگ کرتے ہیں اور جنگ میں بھی وطن یا زبان کی عصبیتیں پیش نظر ہوتی ہیں اللہ کی رضا کے لئے اور اللہ کی بات اُونچی کرنے کے لئے جنگ کرنے کا دھیان بھی نہیں ہوتا۔ لامحالہ دشمن پیٹ دیتا ہے۔ اور جب ایک دشمن دُوسرے دشمن کو مسلمان کا ملک دلواتا ہے تو اُسی کے پاس فریاد لے کر چلے جاتے ہیں اور اُسی کے فیصلوں پر راضی ہو جاتے ہیں اس طرح ہلاکت میں پڑ رہے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جو جان و مال خرچ کرنے کا حکم ہے مسلمانوں کا کوئی ملک اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں۔ فالی اللہ المُشتکی وھو المستعان.

یہ جو فرمایا: وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ اسکی ایک تفسیر تو وہی ہے جو شان نزول سے معلوم ہوئی اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی لیکن مفسرین نے اس کا مصداق بناتے ہوئے اور بھی کئی چیزیں ذکر کی ہیں اور الفاظ کے عموم کے اعتبار سے بہت سی صورتیں اس میں شامل ہیں۔ مال کے خرچ کرنے میں اسراف کرنا' حلال ذریعہ معاش کو ضائع کرنا۔ خودکشی کرنا۔ قصداً و عمداً ایسے کام کرنا جس میں ہلاکت ہو۔ جن مواقع میں مال خرچ کرنا فرض یا واجب ہے وہاں خرچ کرنے سے جان چرانا۔ گناہوں میں مبتلا رہنا توبہ نہ کرنا۔ اور اس طرح کی بہت سی صورتیں ہیں جو جان کو ہلاکت میں ڈالنے کے ذیل میں آتی ہیں وہ سب ممنوع ہیں۔

صفت احسان اختیار کرنے کا حکم

آیت کے آخر میں فرمایا: وَاَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ لفظ اَحۡسِنُوۡا باب افعال سے امر کا صیغہ ہے۔ اور احسان حسن سے ماخوذ ہے۔ حُسن خوبی اور اچھائی کو کہتے ہیں اور احسان کسی کام کو عمدہ طریقے پر انجام دینے کو کہا جاتا ہے۔ جو کام کئے جائیں۔ اُن کی شرائط اور آداب کا خیال رکھا جائے۔ تاکہ اُن میں صفتِ احسان پیدا ہو جائے اور خوبی کے ساتھ انجام دینا صادق آجائے۔ حدیث جبریل میں ہے کہ انہوں نے آنحضرت سرور عالم ﷺ سے جب سوال کیا کہ احسان کیا چیز ہے تو آپ نے عبادت کا احسان بتا دیا اور فرمایا: ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا اُسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے) زکوٰۃ کو صفتِ احسان کے ساتھ ادا کریں دکھاوا مقصود نہ ہو۔ ردی مال نہ دیں۔ جس کو دیں اُس پر احسان نہ دھریں۔ خوش دلی کے ساتھ دیں۔ پوری زکوٰۃ نکالیں۔ حج میں جنایات نہ کریں۔ جنگ وجدال سے پرہیز کریں۔ حج کر کے نام کرنا مقصود نہ ہو۔ روزہ رکھیں۔ غیبت اور سب وشتم سے روزہ کی حفاظت کریں یہ سب صفت احسان میں شامل ہے انسانی ضرورت کے لئے جانوروں کے ذبح کرنے کی اجازت دی گئی لیکن اس میں بھی صفتِ احسان ملحوظ رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے بارے میں خوبی اختیار کرنے کا حکم فرمایا سو جب تم (کسی کو شریعت کی اجازت سے) قتل کرو تو قتل کرنے میں خوبی کو اختیار کرو (مثلاً ہاتھ پاؤں نہ کاٹ دو۔ چہرہ نہ بگاڑ دو) اور جب تم ذبح کرنے لگو تو خوبی کے ساتھ ذبح کرو اپنی چھری کو تیز کر لو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔ (صحیح مسلم)

وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَۃَ لِلّٰہِ ؕ فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا اسۡتَیۡسَرَ مِنَ الۡہَدۡیِ ۚ وَلَا تَحۡلِقُوۡا

اور پورا کرو حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے۔ پس اگر تم کو روک دیا جائے تو قربانی کا جانور جو میسر ہو ذبح کر دو اور اپنے

رُءُوۡسَکُمۡ حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡہَدۡیُ مَحِلَّہٗ ؕ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ بِہٖۤ اَذًی مِّنۡ

سروں کو اس وقت تک نہ مونڈو جب تک کہ قربانی کا جانور اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔ سو جو شخص تم میں سے مریض ہو یا اس کے

رَّاۡسِہٖ فَفِدۡیَۃٌ مِّنۡ صِیَامٍ اَوۡ صَدَقَۃٍ اَوۡ نُسُکٍ ۚ

سر میں تکلیف ہو تو فدیہ دیدے روزوں سے یا صدقے سے یا قربانی کے جانور سے

حج اور عمرہ کے احکام

تفسیر: جہاد کا حکم بیان فرمانے کے بعد اب حج اور عمرہ کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ جو شخص مکہ معظمہ تک سواری پر آجا سکتا ہو اور سفر کے اخراجات اس کے پاس ہوں اور بال بچوں کے لئے ضروری اخراجات بھی موجود ہوں اس پر حج کرنا فرض ہے اور حج زندگی میں ایک ہی مرتبہ فرض ہے اس سے زیادہ جو کوئی شخص حج کرے گا تو وہ نفل ہوگا۔ حج کے احکام آٹھ ذوالحجہ سے شروع ہوتے ہیں۔ اور بارہ۔ تیرہ ذوالحجہ تک ختم ہو جاتے ہیں۔ البتہ طواف وداع اس وقت ہوگا جب مکہ

معظمہ سے واپس آنے لگیں اگرچہ اس سے پہلے بھی جائز ہے (بشرطیکہ اس سے پہلے طواف زیارت کر چکا ہو) چونکہ افعالِ حج کے لئے ایام مقرر ہیں۔ اس لئے حج میں یہ بات نہیں ہے کہ جب چاہے کر لیں۔ اور عمرہ پورے سال میں جس وقت چاہے کر سکتا ہے اسکی کوئی تاریخ مقرر نہیں البتہ ایام حج میں یعنی ۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳ ذوالحجہ کو عمرہ کرنا فقہاء نے مکروہ لکھا ہے (کیونکہ یہ ایام حج کی مشغولیت کے ہیں) عمرہ زندگی میں ایک مرتبہ کر لینا سنت ہے اگر کسی کو مقدور ہو تو عمرہ کی فضیلت سے محروم نہ ہو۔ عمرہ میں احرام اور طواف دو چیزیں فرض ہیں اور صفا مروہ کی سعی اور حلق یا قصر (سر منڈانا یا کاٹنا) جس سے احرام سے نکل جائے یہ دونوں چیزیں واجب ہیں حج اور عمرہ دونوں کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک درمیانی گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور (جس میں گناہ نہ کیے ہوں) اسکی جزا جنت ہی ہے (صحیح بخاری) اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے اللہ کے لئے حج کیا اور ایسی باتیں نہ کیں جو مرد و عورت کے درمیان ہوتی ہیں اور گناہ نہ کیے وہ (حج سے) ایسا واپس ہوگا جیسا کہ اس دن (بے گناہ) تھا، جس دن اسکی ماں نے اسے جنا تھا۔ (صحیح بخاری)۔ اور رمضان المبارک میں عمرہ (ثواب میں) حج کے برابر ہے (صحیح بخاری ص ۲۳۹ ج ۱) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حج و عمرہ کے درمیان متابعت کرو (کہ ایک کے بعد دوسرے کو ادا کرو) کیونکہ وہ دونوں تنگدستی اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جیسے بھٹی سونے چاندی اور لوہے کے میل کچیل کو دور کر دیتی ہے۔ (مشکوٰۃ)

جو لوگ حج کے لئے جاتے ہیں وہ حج سے پہلے یا حج کے بعد عمرہ کر ہی لیتے ہیں لیکن جو لوگ غیر ایام حج میں مکہ مکرمہ جا کر عمرہ کر کے چلے آتے ہیں اور پھر زندگی بھر حج فرض کیلئے نہیں جاتے وہ لوگ ترک حج کر کے گنہگار ہوتے ہیں جس کی وعید بہت شدید ہے۔

حج نہ کرنے پر وعید

مکہ معظمہ پہنچنے کی قدرت ہوتے ہوئے حج کئے بغیر مر جانا سخت گناہ ہے حدیث شریف میں ہے کہ جسے مجبوری نے یا ظالم بادشاہ نے یا روکنے والے مرض نے حج سے نہ روکا اور مر گیا اور حج نہ کیا تو چاہے تو یہودی ہونے کی حالت میں مر جائے یا نصرانی ہونے کی حالت میں مر جائے۔ (مشکوٰۃ عن الدارمی)

حج اور عمرہ احرام کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ حج یا عمرہ کی نیت کر کے تلبیہ (یعنی لبیک اللّٰھم لَبیک اخیر تک) پڑھنے سے احرام میں داخل ہو جاتا ہے ممنوعات اور محظورات دونوں احراموں کے ایک ہی ہیں۔ ان کی خلاف ورزی پر بعض صورتوں میں دم (یعنی حرم مکہ میں ایک سال کی بکری یا بکرا ذبح کرنا) اور بعض صورتوں میں صدقہ (بقدر صدقہ فطر) واجب ہوتا ہے۔

احرام کے ممنوعات

احرام کے ممنوعات یہ ہیں (۱) خوشبو استعمال کرنا۔ (۲) جسم سے بال دور کرنا۔ (۳) ناخن کاٹنا۔ (۴) خشکی کا شکار کرنا (۵) میاں بیوی والے خاص تعلق کو کام میں لانا اور شہوت کے کام کرنا (۶) مرد کو ایسا کپڑا پہننا جو پورے بدن یا کسی ایک عضو کی ہیئت اور ساخت پر سی کر یا بُن کر یا چپکا کر تیار کیا گیا ہو (۷) مرد کو سر یا چہرہ کو کپڑا لگانا اور عورت کو چہرہ پر کپڑا لگانا (اجنبی مردوں سے پردہ کرنے کے لئے چہرہ سے ہٹا کر چادر وغیرہ لٹکا لے پردہ احرام میں بھی لازم ہے)

ان چیزوں کی خلاف ورزی کرنے پر جو دم یا صدقہ واجب ہوتا ہے اسکی تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں اور حج کی معتبر کتابوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ مرض کی مجبوری سے اگر بال دور کرے یا ناخن کاٹے یا مرد سلا ہوا کپڑا پہنے یا سر ڈھانکے یا چہرہ ڈھانکے یا عورت چہرہ ڈھانکے تو اُس کے لئے رعایت ہے جو ابھی عنقریب ان شاء اللہ تعالیٰ مذکور ہوگی۔ جب حج یا عمرہ کے احرام سے نکلنے کا شرعاً موقعہ آجائے اس وقت بال مونڈ کر یا بال کاٹ کر احرام سے نکل جائے۔ اس وقت سے پہلے بالوں کے مونڈنے پر تراشنے سے جزا لازم ہوگی۔ عورتوں کو احرام سے نکلنے کے لئے سر مونڈنا حرام ہے۔ وہ پورے سر کے بال بقدر ایک پورے کے کاٹ کر احرام سے نکل جائے۔ اگر کسی مرد نے بقدر ایک پورے کے چوتھائی سر کے بال کاٹ دیئے یا عورت نے چوتھائی سر کے بال اپنی چوٹی سے بقدر ایک پورے کے کاٹ دیئے تو احرام سے نکل جائیں گے بشرطیکہ احرام سے نکلنے کا وقت ہو چکا ہو۔

احصار کے احکام

اگر کسی مرد یا عورت نے حج یا عمرہ کا احرام باندلیا اور کسی مرض یا دشمن یا درندہ کی وجہ سے آگے بڑھنے سے روک دیا گیا کہ حج کا احرام والا نہ عرفات جاسکتا ہے نہ طواف کرسکتا ہے۔ اور عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد طواف سے روک دیا گیا تو اس کو احصار کہتے ہیں اور جس محرم کو روک دیا گیا ہو اُسے محصر کہتے ہیں۔ محصر اگر انتظار نہیں کرسکتا اور احرام سے نکلنا چاہتا ہے تو وہ حدود حرم میں ایک سال کی بکری ذبح کردے ایسا کرنے سے احرام سے نکل جائے گا۔ اور اس کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہو جائیں گی اگر حدود حرم میں خود موجود نہیں ہے تو جس جگہ بھی ہے وہاں سے کم از کم ایک سال کی بکری یا بکرا یا اُس کی قیمت بھیج دے اور جس کے ذریعہ بھیجے اُس سے وقت مقرر کرلے کہ فلاں دن فلاں وقت ذبح کردے۔ جب وہ وقت آجائے اور غالب گمان ہو جائے کہ اب جانور ذبح ہو چکا ہوگا تو احرام سے نکل جائے۔ اب اگر اُن کاموں میں سے کوئی کام کرے گا جو احرام کی وجہ سے ممنوع تھے تو جزاء لازم نہ ہوگی اور صرف جانور ذبح ہو جانے سے احرام سے نکل جائیگا مگر بہتر یہ ہے کہ مرد محصر ہو تو سر بھی منڈادے۔ اگر کوئی شخص قارن تھا یعنی اُس نے حج اور عمرہ کا ایک ساتھ احرام باندھا تھا تو وہ حدودِ حرم میں دو جانور ذبح کرائے۔ جب یہ دونوں جانور ذبح ہو جائیں گے تو وہ دونوں احراموں سے نکل جائے گا۔

حج وعمرہ کا احرام باندھنے کے بعد پورا کرنا لازم ہے

اس ساری تفصیل کو سامنے رکھ کر اب آیت کی تفسیر غور سے پڑھئے۔ اول تو یہ فرمایا: وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ (کہ حج وعمرہ کو پورا کرو اللہ کے لئے) اس سے معلوم ہوا کہ جو بھی کوئی مرد یا عورت حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے تو اب احرام کے کپڑے اتار دینے سے یا نیت بدل دینے سے احرام سے نہ نکلے گا اور حج یا عمرہ پورا کرنا ہی ہوگا۔ حج فرض ہو یا نفل، عمرہ سنت ہو یا نفل، اپنا حج ہو یا حج بدل۔ بہر حال پورا کرنا ہی لازم ہے۔ اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ حج یا عمرہ کا احرام تو باندھ لیا لیکن احصار ہو گیا کسی دشمن یا مرض کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور احرام میں رہنے میں دقت ہے اور جلد حلال ہونا چاہتا ہے تو حرم میں قربانی کا جانور ذبح کرادے جس کی تفصیل اُوپر گزر چکی۔ حرم میں جانور ذبح کرائے بغیر احرام سے نہیں نکل سکتا۔ اسی کو فرمایا: فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کہ اگر تم روک دیئے جاؤ تو جو جانور میسر ہو ذبح کردو۔ یا دوسرے سے ذبح کرادو آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب ۶ھ میں عمرہ کرنے کیلئے اپنے صحابہ کیساتھ تشریف لے

گئے تھے اور دشمنوں نے مکہ معظمہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اور آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہؓ جانور ذبح کر کے احرام سے نکل گئے تھے۔ یہ مقام حدیبیہ کا قصہ ہے جو مکہ معظمہ سے دس میل ہے اور جدہ کے پرانے راستہ پر ہے۔ آج کل اس کو شمیسہ کہتے ہیں۔ یہ جو فرمایا: وَلَا تَحْلِقُوْا رُؤُسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ (اور اپنے سروں کو مت مونڈو یہاں تک کہ قربانی کا جانور اپنی جگہ پہنچ جائے) جگہ سے مراد حرم ہے اس سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ احصار کا جانور حرم میں ذبح کیا جائے وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ احرام میں سر مونڈنا ممنوع ہے۔

سُنن ترمذی (باب ماجاء فی الذی یھل بالحج فیکسر او یعرج) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کا کوئی عضو ٹوٹ گیا یا لنگڑا ہو گیا تو اس کو حلال ہونے کی اجازت ہے اور اس پر آئندہ ایک حج کرنا لازم ہے (وقال الترمذی ہذا حدیث حسن واخرجہ الحاکم فی المستدرک وقال صحیح علی شرط الشیخین واقرہ الذھبی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب مُحصر قربانی کا جانور ذبح کرا کر حلال ہو جائے تو اس کے ذمہ قضاء بھی لازم ہوتی ہے۔

احصار زائل ہو جانے کے بعد:

اگر کسی شخص نے حج کا احرام باندھا تھا اور احصار ہو جانے کی وجہ سے حرم میں جانور ذبح کرا کے حلال ہو گیا پھر احصار دور ہو گیا اور ابھی اسی سال حج کا وقت باقی ہے لہٰذا اس نے دوبارہ احرام باندھ کر اسی سال حج کر لیا تو حج ادا ہو گیا۔ اور اب اسکی قضاء واجب نہیں (المحصر بالحج اذا تحلل ثم زال الاحصار عنه وحج من عامه فليس عليه نية القضاء ولا عمرة عليه) اور اگر اسی سال حج نہ کر سکا تو حج کی قضا واجب ہے آئندہ سال یا جب بھی موقع ہو قضا کی نیت سے حج کرے اور اس کے ساتھ ایک عمرہ کرنا بھی واجب ہو گا اگر قارن تھا اور اسی سال احرام کے مطابق حج وعمرہ نہ کر سکا تو اس پر قضا میں ایک حج اور دو عمرے واجب ہوں گے۔

مسئلہ: اگر حج فرض کے احرام میں احصار ہوا تھا۔ اور حرم میں قربانی کرا کر احرام سے نکل گیا تھا تو جب بھی حج کرے قضا کی نیت واجب نہیں خواہ اسی سال حج کرے یا اس کے بعد۔

مسئلہ: ہر محصر پر قضا واجب ہے خواہ حج فرض ہو یا نفل، اپنا حج ہو یا حج بدل، اگر عمرہ کے احرام میں احصار ہوا تھا تو اسکی قضاء بھی واجب ہے۔ اور اس پر صرف ایک ہی عمرہ کی قضا لازم ہے۔ جب چاہے عمرہ کر سکتا ہے۔ عمرہ کے ساتھ دوسرا عمرہ کرنا واجب نہیں (جبکہ حج قضا کرنے کی صورت میں اس کے ساتھ ایک عمرہ کرنا بھی واجب ہے)

فائت الحج کا حکم: اگر کسی شخص کو احصار ہو گیا اور وہ حرم میں قربانی کرا کے احرام سے نہ نکلا حتیٰ کہ حج کے دن گزر گئے یعنی احرام باندھنے کے بعد نو ذوالحجہ کو زوال سے لیکر صبح صادق ہونے تک عرفات میں نہ پہنچ سکا تو اس کا حج فوت ہو گیا اور یہ شخص فائت الحج ہو گیا۔ جب حج فوت ہو جائے۔ عذر سے یا بلا عذر تو اسی احرام سے عمرہ کے افعال ادا کر کے یعنی طواف اور سعی کر کے بال مونڈا کر احرام سے نکل جائے پھر آئندہ سال یا جب موقعہ مل جائے اس حج کی قضا کر لے۔ اس قضا کے ساتھ عمرہ کرنا لازم نہیں۔

مسئلہ: عمرہ میں احصار تو ہو سکتا ہے لیکن عمرہ فوت نہیں ہوتا۔ عمرہ کا احرام باندھ لینے کے بعد جتنے دن بھی گزر جائیں جب بھی عمرہ کرے گا ادا ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ پورے سال میں ادا ہو سکتا ہے۔ اگر عمرہ کے احرام کے بعد محصر ہو گیا اور ابھی قربانی کرا کے احرام سے نہیں نکلا تھا کہ احصار زائل ہو گیا تو اب جا کر عمرہ کر لے۔

عذر کی وجہ سے ارتکاب جنایت کا حکم

اگر کسی نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا اور وہ سر منڈانے پر دکھ تکلیف کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ مثلاً سر میں جوئیں زیادہ پڑ گئیں یا پورے سر یا آدھے سر میں درد ہے تو ایسے شخص کو اختیار ہے کہ سر منڈا دے اور چونکہ یہ احرام پر جنایت ہو گی اس لئے یا تو حرم میں ایک سال کی بکری ذبح کر دے یا تین صاع گیہوں چھ مسکینوں کو دے دے۔ ہر مسکین کو آدھا صاع دے (آدھا صاع صدقہ فطر کے برابر ہوتا ہے) یا تین روزے رکھ لے اگر مالدار ہو تب بھی اختیار ہے کہ ان تینوں کاموں میں سے جو صورت چاہے اختیار کرے۔

آیت شریفہ میں یہ جو فرمایا ہے۔ فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ (یعنی جو شخص تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو فدیہ دے دے روزوں سے یا صدقے سے یا قربانی کے جانور سے) اس میں یہی مسئلہ بیان کیا ہے۔

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام حدیبیہ میں میرے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت میرے سر سے جوئیں گر رہی تھیں آپ نے فرمایا کیا یہ جانور تجھے تکلیف دے رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا جی ہاں! آپ نے فرمایا کہ سر مونڈ لو۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنا سر مونڈ لو اور تین دن کے روزے رکھ لو یا چھ مسکینوں کو کھانا دے دو یا ایک بکری ذبح کر دو۔ تیسرے روایت میں اسکی تصریح ہے کہ ہر مسکین کو آدھا صاع دے دینا۔ یہ سب روایات صحیح بخاری میں مذکور ہیں۔ آیت شریفہ میں جو فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ۔ وارد ہوا ہے اسکی تفسیر حدیث شریف سے معلوم ہو گی۔

مسئلہ: مرض کی معذوری اور سر میں تکلیف ہونے کی مجبوری سے سر منڈانے کا فدیہ اُوپر مذکور ہوا اگر کوئی شخص احرام میں ہو اور سخت بخار یا سخت سردی یا سخت گرمی میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے سلا ہوا کپڑا پہن لے اور بقدر ایک دن یا ایک رات کے پہنے یا بقدر ایک دن ایک رات کے سر یا چہرہ ڈھانک لے یا علاج کی مجبوری سے زخم پر خوشبو دار دوا استعمال کر لے تو اس صورت میں ایک دم واجب ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ عذر کی وجہ سے جنایت کا ارتکاب کیا ہے اس لئے مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ اگر بلا عذر ان جنایات کا ارتکاب کرے تو دم ہی دینا لازم ہے۔

مسئلہ: اگر بیماری کی مجبوری کی وجہ سے کوئی ایسا کام کیا جسے بلا عذر کرنے میں صدقہ واجب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک دن یا ایک رات سے کم سلا ہوا کپڑا پہنا تو اس صورت میں اختیار ہے کہ ایک مسکین کو آدھا صاع گیہوں دے دے یا اس کے عوض ایک روزہ رکھ لے۔

فَإِذَا أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَن لَّمْ يَجِدْ

پھر جب تم امن کی حالت میں ہو سو جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر متمتع ہو تو قربانی کا جانور جو میسر ہو ذبح کر دے سو جو شخص نہ پائے

فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذَٰلِكَ لِمَن

تو تین دن کے روزے ہیں حج میں اور سات دن کے روزے ہیں جب کہ تم لوٹ آؤ۔ یہ پورے دس ہوئے۔ یہ اس کے لئے ہے

لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

جس کے گھر والے مسجد حرام میں حاضر نہ ہوں۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بلا شبہ اللہ سخت عذاب والا ہے

تمتع اور قِران کا بیان

تفسیر: جو شخص صرف حج سے پہلے کوئی عمرہ نہ کرے اُس کا حج، حج افراد ہوگا۔ اور جو شخص حج سے پہلے حج کے مہینوں میں عمرہ کرے اور پھر اُسی سال حج بھی کرے اسکی دو صورتیں ہیں اول یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھ کر جائے پھر عمرہ کرنے کے بعد سر مونڈ کر یا قصر کر کے احرام سے نکل جائے اور ایام حج کا انتظار کرتا رہے پھر ذوالحجہ کی آٹھ تاریخ کو مکہ معظمہ سے حج کا احرام باندھ لے اور حج کے سب کام پورے کرلے جیسا کہ حج افراد والا کرتا ہے۔ اسکو فقہاء کی اصطلاح میں حج تمتع کہا جاتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ میقات سے حج اور عمرہ کا اکٹھا احرام باندھے اس کے بعد مکہ معظمہ آ کر عمرہ کر لے پھر حلق یا قصر کئے بغیر احرام ہی میں رہے اور ایام حج میں حج کرے، اور دس تاریخ کو جمرہ کبریٰ کی رمی کرنے کے بعد حلق یا قصر کر کے احرام سے نکل جائے۔ اس کو فقہاء کی اصطلاح میں قِران کہا جاتا ہے جو صرف حج کرے وہ مفرد ہے اور جو شخص حج اور عمرہ دونوں کو جمع کرنے کی پہلی صورت اختیار کرے وہ متمتع ہے اور جو شخص دوسری صورت اختیار کرے، وہ قارن ہے۔

متمتع اور قارن پر قربانی واجب ہے

متمتع اور قارن پر جمرہ کبریٰ کی رمی کرنے کے بعد حلق یا قصر سے پہلے قربانی کرنا بھی واجب ہے اس کو دم شکر کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ دونوں عبادتیں جمع کرنے کی سعادت نصیب فرمائی، اسی کو فرمایا: فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر متمتع ہوا ہو جو قربانی کا جانور میسر ہو ذبح کر دے) قربانی حرم ہی میں ہونا ضروری ہے منٰی میں ہونا اُفضل ہے۔ اور بارھویں تاریخ کا سورج چھپنے سے پہلے پہلے قربانی کر دینا واجب ہے۔ متمتع اور قارن جب تک قربانی نہیں کرے گا اُس وقت تک حلق یا قصر کرنا جائز نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جو لفظ تَمَتَّعَ فرمایا ہے یہ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے اصطلاحی تمتع اور قِران دونوں کو شامل ہے تمتع اور قِران کی قربانی میں ایک سال کا بکرا یا بکری یا پانچ سالہ اونٹ یا دو سالہ گائے کا ساتواں حصہ بھی کافی ہو سکتا ہے بشرطیکہ تمام شرکاء کی نیت ثواب کی ہو۔

تمتع اور قِران کی قربانی کا بدل

اگر کسی متمتع یا قارن کے پاس قربانی کا جانور نہیں اور پیسے بھی نہیں تا کہ جانور خرید کر قربانی کرے تو اس کے لئے یہ آسانی ہے کہ عمرہ کا احرام باندھ لینے کے بعد ذوالحجہ کی دسویں تاریخ سے پہلے پہلے تین روزے رکھ لے چاہے متفرق طور پر رکھے چاہے متواتر (لگاتار) رکھے۔ مگر لگاتار رکھنا مستحب ہے۔ اور افضل ہے کہ ذوالحجہ کی ساتویں، آٹھویں اور نویں کو رکھ لے اور اگر اندیشہ ہو کہ نویں کا روزہ رکھنے سے وقوف عرفات کے موقعہ پر ضعف ہو جائے گا تو اس سے پہلے ہی تینوں روزے رکھ کر فارغ ہو جائے۔ تین روزے تو یہ ہوئے جو حج سے پہلے رکھ لئے اور سات روزے تیرھویں تاریخ کے بعد رکھ لے۔ خواہ مکہ مکرمہ ہی میں مقیم ہو خواہ اپنے گھر یا اور کسی جگہ چلا گیا ہو۔ ان روزوں کو بھی متفرق طور پر رکھ سکتا ہے اور

لگاتار رکھنا افضل ہے۔ یہ کل دس روزے ہو گئے جو قربانی کا بدل ہیں۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا: فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْکَ عَشَرَةٌ کَامِلَةٌ۔

مسئلہ: اگر کسی نے دس ذوالحجہ سے پہلے تین روزے نہ رکھے اور نویں تاریخ گزر گئی تو اب روزے رکھنے سے متمتع اور قران کی قربانی کا بدل نہیں ہو سکتا بلکہ اب قربانی ہی کرنا متعین ہو گیا۔ اگر قربانی کرنے پر قدرت نہیں ہے تو حلق یا قصر کرا کر حلال ہو جائے پھر اگر بارہ تاریخ کے اندر قربانی کرنے پر قادر ہو گیا تو قربانی کر دے اور ایک دم ذبح سے پہلے حلق یا قصر کرنے کا دے اور اگر بارہ تاریخ کے بعد قربانی پر قادر ہو تو تین دم دینے ہوں گے۔ ایک دم شکر (یعنی تمتع یا قران کی قربانی) اور ایک ذبح سے پہلے حلق یا قصر کرنے کا' اور ایک ایام نحر سے ذبح کو مؤخر کرنے کا۔

مسئلہ: تمتع کی ایک صورت یہ ہے کہ محرم اپنے ساتھ قربانی کا جانور بھی لایا ہو ایسے محرم کو سائق الھدی کہتے ہیں۔ جو متمتع سائق الھدی ہو مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کر لے لیکن حلق اور قصر نہ کرے ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ آنے تک احرام ہی میں رہے پھر آٹھ تاریخ کو حج کا احرام باندھ لے اور حج افراد کرنے والوں کی طرح حج کرے اور دسویں تاریخ کو جمرہ کبریٰ کی رمی اور ذبح کے بعد حلق یا قصر کر کے دونوں احراموں سے ایک ساتھ نکل جائے۔

مسئلہ: جو شخص مفرد ہو اس پر حج کی قربانی واجب نہیں ہے۔ بلکہ مستحب ہے کہ وہ قربانی کر دے۔ اگر قربانی کرے تو افضل یہ ہے کہ ۱۰ ذی الحجہ کو جمرہ کبریٰ کی رمی کے بعد پہلے ذبح کرے پھر حلق یا قصر کرے البتہ رمی سے پہلے حلق یا قصر جائز نہیں ہے۔ اگر مفرد نے قربانی سے پہلے حلق یا قصر کر دیا تو افضل کے خلاف ہو گا۔

مسئلہ: دم قران یا تمتع کی قربانی عیدالاضحیٰ کی قربانی کے قائم مقام نہیں ہے۔ عیدالاضحیٰ کی قربانی مقیم پر واجب ہے مسافر پر واجب نہیں۔ جو لوگ مکہ مکرمہ میں حج سے پہلے پہنچ کر پندرہ روزہ قیام کرنے کی نیت کر چکے ہیں اُن پر عیدالاضحیٰ کی قربانی بھی واجب ہے مگر اس کے لئے حرم میں ہونا شرط نہیں۔ وطن میں بھی خط بھیج کر یا پہلے سے کہہ کر کرائی جا سکتی ہے۔ پھر فرمایا: ذٰلِکَ لِمَنْ لَّمْ یَکُنْ اَھْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (یہ اس کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام میں حاضر نہ ہوں) اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ ذٰلک کا مشار الیہ کیا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے یہ اشارہ مَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْھَدْیِ کی طرف ہے اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ اشارہ جمع بین النسکین کی طرف ہے جو مَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَی الْحَجِّ۔ میں مذکور ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے فرمایا ہے کہ تمتع اور قران اُن لوگوں کے لئے جائز نہیں ہے جو مکہ معظمہ میں یا حرم میں یا حل میں رہتے ہیں بلکہ جو شخص مکہ مکرمہ میں اس وقت موجود ہو جب عید کا چاند ہوا تو اس کے لئے بھی تمتع اور قران جائز نہیں ہے ہاں اگر یہ لوگ حج کے مہینوں سے پہلے میقات سے باہر کہیں چلے جائیں پھر اشہر حج میں احرام باندھ کر مکہ مکرمہ آئیں تو قران اور تمتع کر سکتے ہیں۔

آخر میں فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ کہ اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ سخت عذاب والا ہے چونکہ ہر کام اُسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اللہ کا خوف دل میں ہو اس لئے بار بار تقویٰ کا حکم دیا جاتا ہے حج کے متعدد احکام بیان فرما کر یہاں بھی وَاتَّقُوا اللّٰهَ فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ شدید العقاب ہے۔ نافرمانی پر عذاب ہونے کا قانون ہے۔ لہٰذا ہر نافرمانی سے بچو۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي

حج کا وقت چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں، سو جس شخص نے ان میں حج کو اپنے ذمہ لازم کر لیا تو نہ کوئی فحش بات ہے نہ فسوق ہے نہ کسی قسم کا

الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ

جھگڑا ہے۔ اور جو بھی کوئی نیک کام کرو گے تو اللہ تعالیٰ اُس کو جانتا ہے اور زادِ راہ ساتھ لے لیا کرو چونکہ بہتر زادِ راہ بچا رہنا ہے اور اے

يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

عقل والو! مجھ سے ڈرتے رہو

حج کے مہینوں کا تذکرہ اور حج کے بعض احکام

تفسیر: حج کا وقت چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حج کے چند مہینے اللہ پاک کی طرف سے مقرر ہیں جو معروف و مشہور مہینے ہیں۔ ان میں ماہِ شوال اور ماہ ذیقعدہ اور شروع کے دس دن ذوالحجہ کے ہیں افعال حج تو ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ سے شروع ہوتے ہیں لیکن شوال اور ذیقعدہ کو حج کے مہینوں میں اس لئے شمار کیا گیا کہ ان میں اگر کوئی شخص عمرہ کرے اور اس کے بعد اسی سال حج بھی کرے تو وہ عمرہ مل کر حج تمتع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے قربانی واجب ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص شوال سے پہلے عمرہ کرے تو وہ عمرہ مفردہ ہوگا اور اسکی وجہ سے حج تمتع نہ بنے گا۔ اسی طرح اگر کسی کو تمتع یا قران کی قربانی کے عوض روزے رکھنے ہیں تو وہ حج کے کسی بھی مہینہ میں عمرہ کے احرام کے بعد تین روزے رکھ سکتا ہے جو ھدی کے عوض حج سے پہلے رکھے جاتے ہیں اگر کوئی شخص حج کے مہینوں سے پہلے حج کا احرام باندھ لے تو احرام تو منعقد ہو جائے گا لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے۔ یہ سب اُحکام اس پر متفرع ہیں کہ حج کے مہینے شوال کا چاند دیکھنے سے شروع ہو جاتے ہیں۔ حج اُن لوگوں پر فرض ہے جو حج کی استطاعت رکھتے ہوں اور جب حج کی استطاعت ہو جائے تو حج کرنے میں جلدی کرنی چاہئے۔ لیکن اگر کسی نے دیر لگائی اور زندگی بھر میں کبھی بھی حج کر لیا تو وہ حج ادا ہی ہوگا۔ فرض ہوتے ہی پہلے سال نہ کرنے سے یہ نہ کہا جائے گا کہ حج قضا ہو گیا۔ جب کسی سال حج کا احرام باندھ لیا تو احرام باندھنے والے نے اپنے ذمہ حج کرنا فرض کر لیا اب حج کرنا ہی ہوگا اور بغیر حج کئے احرام سے نہیں نکل سکتا۔ (ہاں اگر احصار کی صورت پیش آ جائے تو اور بات ہے) احرام کی ممنوعات چند صفحات پہلے بیان ہو چکی ہیں ان ممنوعات میں وہ چیزیں بھی ہیں جو غیر احرام کی حالت میں جائز ہیں۔ مرد کو سلے ہوئے کپڑے پہننا سر اور چہرہ ڈھکنا بال اور ناخن کاٹنا میاں بیوی والے تعلقات کو کام میں لانا (جماع بوس و کنار اور اس سلسلے کی بے تکلفی والی باتیں کرنا) یہ چیزیں غیر احرام کی حالت میں جائز ہیں لیکن احرام میں جائز نہیں۔ وقوف عرفات سے پہلے جماع کر لے تو حج فاسد ہو جاتا ہے۔ اور شہوت سے بوس و کنار کرے تو دم واجب ہوتا ہے۔

حج میں گناہوں سے بچنے کی تاکید

آیت بالا میں جو فَلَا رَفَثَ فرمایا۔ اُس میں ان سب چیزوں کی ممانعت فرما دی جو شوہر اور بیوی کے درمیان زوجیت کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ بھی فرمایا۔ فسوق نافرمانی کو کہا جاتا ہے۔ لفظ فاسق اسی سے نکلا

ہے۔حج میں نافرمانی نہیں اس کا عموم ان سب نافرمانیوں کو شامل ہے جو احکام احرام کی خلاف ورزی کی صورت میں ہوں اور جو باتیں احرام میں بھی گناہ ہیں اور غیر احرام میں بھی گناہ ہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد تلف کرنا وہ بھی سب اس کے عموم میں داخل ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ بہت سے لوگ حج کرنے نکلتے ہیں تو فرض نمازیں تک چھوڑ دیتے ہیں اور بہت سے لوگ حرام مال ہی سے حج کرنے کو چل دیتے ہیں۔ عورتیں بغیر محرم کے حج کے لئے روانہ ہو جاتی ہیں۔ عین احرام کے وقت غیبتیں بھی جاری رہتی ہیں اور احرام میں بدنظری کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں اس سے بھی احتیاط نہیں برتی جاتی حالانکہ لَا فُسُوْقَ کے عموم کا تقاضا ہے کہ احرام میں ہر گناہ سے خصوصیت کے ساتھ پرہیز کریں گو گناہوں سے بچنا ہمیشہ ہی لازم ہے۔ حجاج کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مبارک ایام میں مقدس سرزمین میں حدود حرم میں جہاں صرف عبادت ہی کے لئے آئے ہیں اور بار بار تلبیہ پڑھ رہے ہیں احرام کے لباس میں ہیں۔ پھر بھی چھوٹے بڑے گناہوں میں ملوث رہتے ہیں۔ ڈاڑھی مونڈنے کا گناہ تو ہزاروں حجاج کرتے ہیں۔ احرام سے نکلنے کے لئے ذرا بہت بال کاٹ دیتے ہیں جس سے احرام سے نکلتے بھی نہیں۔ سر کے بال تو مونڈاتے نہیں جس میں حضور اقدس ﷺ کا اتباع ہے اور جو قصر سے افضل ہے لیکن وہیں منیٰ میں بیٹھ کر ڈاڑھی ضرور مونڈ دیتے ہیں عین وقوف عرفات کے موقعہ پر گانے سننے میں مشغول رہتے ہیں۔ حالانکہ قبولیت حج کی شرط یہ ہے کہ رفث اور فسوق کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ اس بارے میں حدیث صریح آیت وَاَتِمُّوا الْحَجَّ کے ذیل میں گذر چکی ہے۔

لڑائی جھگڑے سے بچنے کا حکم

فسوق کی نفی کے بعد جدال کی نفی فرمائی۔ جدال عربی زبان میں لڑنے جھگڑنے کو کہتے ہیں۔ سفر حج میں اول سے اخیر تک بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں۔ جہاں رفقاء سفر سے اور حجاج سے لڑنے کو جی چاہتا ہے کہیں جگہ کی تنگی کی وجہ سے اور کہیں پانی لینے کی بھیڑ میں دوسرے سے آگ بڑھ جانے کی وجہ سے ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ حجاج لڑ پڑتے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ معمولی سی باتیں جن پر ہمیشہ اپنے گھروں میں آپس میں مسامحت کر لیتے ہیں اُن میں سے کوئی صورت حج میں پیش آجائے تو دل کھول کر لڑائی لڑتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ایک ابتلاء ہوتا ہے بعض حجاج نے بتایا کہ اندر سے بار بار نفس میں لڑائی کے لئے اُبھار ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سنیچر کے دن بنی اسرائیل کے لئے مچھلیاں سمندر کی تہہ سے اوپر آجاتی تھیں لیکن اس دن پکڑنا منع تھا اور دوسرے دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ ابتلاء کے موقعہ پر ہر مسلمان اپنے نفس پر قابو کرے اور شریعت کو سامنے رکھے' قرآن و حدیث کی ہدایت کا اتباع کرے۔

جو بھی خیر کا کام کرو اللہ کو معلوم ہے

یہ جو فرمایا: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ اس میں یہ بتا دیا ہے کہ جو کچھ خیر کا کام کرو گے۔ اللہ اُسے جان لے گا اور اُس کا ثواب دے گا۔ احرام کی ممنوعات سے بچو اور ان دنوں کو غنیمت جانو' عبادت تلاوت' ذکر اور اعمالِ صالحہ میں لگاؤ۔ یہ چیزیں ضائع ہونے والی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان سب کا ثواب ملے گا۔

مخلوق سے سوال کرنے کی ممانعت

پھر فرمایا: وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ کہ زادِراہ ساتھ لے لیا کرو کیونکہ بہتر زادِراہ بچا رہنا ہے (بچے رہنے کا

مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے سوال نہ کیا جائے) اسباب النزول (ص ۵۵) میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یمن کے لوگ حج کو آتے تھے لیکن سفر کے لئے انتظام کر کے نہیں چلتے (زادِراہ پاس نہ ہوتا تھا) اور کہتے تھے کہ ہم توکل والے ہیں جب مکہ معظّمہ پہنچ جاتے تھے تو لوگوں سے سوال کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ توشہ ساتھ لیا کرو کیونکہ بہتر توشہ یہ ہے کہ لوگوں سے سوال نہ کیا جائے۔ (صحیح بخاری)

چونکہ ایام حج میں عموماً مال والے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان دنوں میں سوال کرنے والوں کو خوب مواقع ملتے ہیں اور بہت سے لوگ حج اور عمرہ کا سفر ہی حجاج سے مانگنے کیلئے کرتے ہیں بہت سے مرد اور عورتوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وقوف عرفات میں سارا وقت خیمہ خیمہ گھومنے اور لوگوں سے سوال کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ مشکوٰۃ المصابیح میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا جو عرفات میں لوگوں سے مانگ رہا ہے۔ حضرت علیؓ نے اس کو ایک درہ مارا اور فرمایا کیا تو آج کے دن میں اور اس جگہ میں غیر اللہ سے سوال کرتا ہے۔

آخر میں تقوے کا حکم دیا اور فرمایا: وَاتَّقُوْنِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (کہ اے عقل والو! مجھ سے ڈرو) درحقیقت اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، گناہوں سے بچنا ہر کام میں ضروری ہے اور اس طرح ہر کام خوبی کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔

(کما فی الحدیث علیک بتقوی اللہ فانہ ازین لامرک کلہ، مشکوٰۃ)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ
تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ معاش تلاش کرو جو تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ پھر جب تم عرفات سے
فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ
واپس ہو تو اللہ کو یاد کرو مشعر حرام کے نزدیک۔ اور اس کو یاد کرو جیسا کہ اُس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔ اور حقیقت میں بات یہ ہے کہ تم اس سے پہلے
الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾
محض ناواقف تھے

حج میں خرید و فروخت کی اجازت اور مشعر حرام میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنیکا حکم

تفسیر: اس آیت میں اول تو حج کے موقعہ پر کسب معاش کی اجازت دی اور فرمایا کہ اپنے رب کا فضل تلاش کرو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فضل تلاش کرنے میں تجارت اور محنت مزدوری سب داخل ہیں۔ صحیح بخاری (ص ۶۴۸ ج ۲) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ عکاظ مجنہ اور ذوالمجاز جاہلیت میں لوگوں کی تجارت گاہیں تھیں۔ جب اسلام کا زمانہ آیا تو مسلمانوں نے اُن میں تجارت کرنے کو گناہ سمجھا۔ یہاں تک کہ آیت لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ نازل ہوگئی جس میں موسم حج میں تجارت کرنے کی اجازت دی گئی۔

مستدرک میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے سوال کیا کہ میں حج کے موقعہ پر (اونٹ وغیرہ) کرائے پر لے جاتا ہوں اور لوگ یوں کہتے ہیں کہ تیرا کوئی حج نہیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کیا تو احرام نہیں باندھتا، تلبیہ نہیں

پڑھتا' طواف نہیں کرتا' عرفات جا کر واپس نہیں آتا' رمی جمار نہیں کرتا؟ اُس شخص نے جواب دیا کہ میں یہ تو سب کام کرتا ہوں۔ فرمایا پھر تو تیرا حج ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے یہی سوال کیا تھا جو سوال تو نے مجھ سے کیا ہے آپ نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ آیت لَیْسَ عَلَیْکُمْ (الآیۃ) نازل ہوگئی اور آپ نے اس شخص کو بُلا کر یہ آیت سُنادی اور فرمایا کہ تیرا حج ہوگیا۔ (قال الحاکم هذا حدیث صحیح الاسناد و لم یخرجاه أقره الذهبی)

فتح الباری میں لکھا ہے کہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ ذی قعدہ کی پہلی تاریخ کی صبح سے بیس دن تک مقام عکاظ میں میلہ لگاتے اور تجارت کرتے تھے پھر دس دن مقام مجنہ میں بازار لگاتے تھے پھر یکم ذوالحجہ سے آٹھ ذی الحجہ تک مقام ذی المجاز میں قیام کرتے اور کاروبار جاری رکھتے تھے۔ عکاظ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نخلہ اور طائف کے درمیان واقع تھا اور مجنہ کے بارے میں بتایا ہے یہ مرظہران کے قریب تھا اور ذوالمجاز کے بارے میں لکھا ہے کہ عرفات کے قریب ذرا ایک جانب کو ہٹ کر تھا۔ آیت بالا میں حج کے موقعہ پر کسب معاش کی جو اجازت دی گئی ہے۔ اس میں انداز بیان ایسا اختیار فرمایا ہے کہ اگر کوئی تجارت کرے تو اسکی اجازت ہے ایسی کوئی ترغیب نہیں دی گئی کہ اس کو حج کا جزو ہی بنالیں اور تجارت کو حج کے کاموں میں داخل کرلیں کوئی شخص اپنی نیت اصلیہ کے اعتبار سے حج ہی کے لئے گیا اور موقعہ پا کر خصوصاً ضرورت کے وقت تجارت بھی کرلی تو اسکی گنجائش آیت شریفہ سے معلوم ہوتی ہے۔ سفر حج ہی کے لئے ہونا چاہئے۔ اصل سفر تجارت کا ہو اور حج نمبر دو پر ہو۔ ایسا نہ کیا جائے۔

قال الحافظ فی الفتح و استدل بهذا الحدیث علی جواز البیع و الشراء للمعتکف قیاسا علی الحج و الجامع بینهما العبادة وهو قول الجمهور' وعن مالک کراهة مازاد علی الحاجة کا لخبز اذا لم یجد ما یکفیه و کذاکرهه عطاء و مجاهد و الزهری وَلا ریب انه خلاف الاولی و الآیة انما نفت الجناح ولا یلزم من نفیه نفی اولویة مقابله والله اعلم اهـ.

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ چونکہ پہلی آیت میں جدال سے منع فرمایا اور تجارت میں کچھ جھگڑا ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ قیمت کی کمی بیشی کے سلسلہ میں نزاع ہوسکتا ہے۔ اسلئے ممکن تھا کہ بعض اذہان جدال کی ممانعت سے تجارت کی ممانعت کی طرف چلے جاتے اس لئے تجارت کی اجازت دے دی۔ تجارت چاہے تو کرے لیکن جدال اور نزاع سے بچے۔ پھر فرمایا: فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَـرَامِ (پھر جب تم عرفات سے واپس ہو تو اللہ کو یاد کرو مشعر الحرام کے نزدیک) اس میں عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ میں اللہ کا ذکر کرنے کا حکم فرمایا۔ عرفات مزدلفہ سے تین میل مشرق کی طرف ہے یہ ایک بہت بڑا میدان ہے۔ یہاں پر ٹھہرنا حج کا سب سے بڑا رکن ہے حج کے احرام کے ساتھ کوئی شخص ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو زوال کے بعد سے لیکر آنیوالی رات کی صبح صادق تک عرفات میں پہنچ جائے تو اس کا حج ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فرائض حج میں سے صرف طواف زیارت باقی رہ جاتا ہے۔ عرفات میں ذکر اور دعا میں مشغول رہتے ہیں۔ ظہر و عصر کی نماز بھی اسی وقفہ میں پڑھتے ہیں۔ سورج چھپ جانے کے بعد مزدلفہ کے لئے واپس ہوتے ہیں (جب عرفات گئے تھے تو مزدلفہ سے ہوتے ہوئے گئے تھے۔ کیونکہ مِنٰی سے عرفات کو جاتے ہوئے درمیان میں مزدلفہ آتا ہے) مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز اکٹھی پڑھی جاتی ہے۔ عرفات میں یا راستہ میں نماز مغرب پڑھنا جائز نہیں۔ سورج چھپ جانے کے باوجود قصداً نماز مغرب کو مؤخر کرنا واجب ہے۔ مزدلفہ میں پہنچ کر عشاء کے وقت

میں مغرب پڑھی جائے۔ اگر کسی نے مزدلفہ میں پہنچنے سے پہلے مغرب کی نماز پڑھ لی تو دوبارہ پڑھنا لازم ہوگا۔ مغرب عشاء دونوں نمازیں اکٹھی پڑھ کر رات کو مزدلفہ میں رہنا سنت ہے۔ اور صبح صادق کے بعد تھوڑی دیر مزدلفہ میں وقوف کرنا واجب ہے۔ اور سنت یہ ہے کہ دیر تک وقوف کرے۔ یہاں تک کہ سورج نکلنے میں تھوڑی دیر رہ جائے تو منیٰ کے لئے روانہ ہو جائے۔ المشعر الحرام مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہے جس کا نام جبل قزح ہے رسول اللہ ﷺ نے عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ میں مغرب و عشاء کی نماز اکٹھی پڑھی۔ پھر آرام فرمایا اس کے بعد صبح صادق ہوتے ہی نماز فجر اندھیرے میں پڑھ کر المشعر الحرام کے پاس تشریف لے گئے اور قبلہ رخ ہو کر خوب زیادہ روشنی پھیل جانے تک دعا اور تکبیر و تہلیل میں اور توحید باری تعالیٰ ذکر کرنے میں مشغول رہے۔ پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے منیٰ کے لئے روانہ ہو گئے۔ (صحیح مسلم)

مزدلفہ سارا وقوف کی جگہ ہے۔ البتہ المشعر الحرام کے قریب وقوف کرنا افضل ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ووقفت ھھنا و جمع کلھا موقف۔ (صحیح مسلم)

چونکہ سارا ہی مزدلفہ وقوف کی جگہ ہے اور المشعر الحرام اسی میں ہے اس لئے بعض حضرات نے پورے مزدلفہ کو المشعر الحرام سے تعبیر کر دیا ہے۔ (کما ذکر فی الدر المنثور عن عبداللہ بن عمرو و عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم) مزدلفہ میں رات کا وقت گزاریں اور صبح صادق کے بعد منیٰ کے لئے روانہ ہونے سے پہلے جو وقت ہے اُس میں خوب اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں اور دعائیں مانگیں پھر ارشاد فرمایا: وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ (اور اس کو یاد کرو جیسا کہ اُس نے تم کو ہدایت دی) یعنی جس طرح اُس نے تم کو ہدایت سے نوازا ہے اور راہ حق پر ڈالا ہے تم بھی اُسے خوب اچھی طرح سے یاد کرو اور بعض مفسرین نے اس کا یہ معنیٰ بتایا ہے کہ اللہ کا ذکر اُسی طریقے پر کرو جو طریقے اس نے سکھائے اور بتائے ہیں۔ دونوں معانی صاحب روح المعانی نے لکھے ہیں اور تیسرا معنیٰ یہ لکھا ہے کہ: اذکروہ وعظموہ لأجل ھدایتہ السابقۃ منہ تعالیٰ لکم یعنی تم اُس کا ذکر کرو اور عظمت کے ساتھ اُسے یاد کرو اس وجہ سے کہ اُس نے تم کو پہلے سے ہدایت دی ہے۔ پھر فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ (اور حقیقت میں بات یہ ہے کہ تم اس سے پہلے محض ناواقف تھے) یعنی ایمان کو اور طاعات کو نہیں جانتے تھے اور جاہلیت میں جو حج کرتے تھے اس میں جو ذکر کرتے تھے اول تو آباؤ اجداد کا ذکر ہوتا تھا اور تھوڑا بہت جو اللہ کا نام لے لیتے تھے آخرت میں وہ بھی مفید نہ ہوگا۔ کیونکہ کفر کے ساتھ کوئی نیکی کام نہیں دیتی۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؀

پھر تم اسی جگہ واپس آؤ جہاں سے دوسرے لوگ واپس آئیں اور اللہ سے مغفرت طلب کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے

تفسیر: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان فرمایا کہ قریش اور وہ لوگ جو انکے دین پر تھے (بنو عامر، بنو ثقیف بنو خزاعہ) یہ لوگ زمانہ جاہلیت میں حج کرتے تھے تو عرفات میں نہیں جاتے تھے۔ یہ لوگ مزدلفہ میں ہی ٹھہر جاتے تھے اور وہیں سے واپس ہو جاتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم فرمایا کہ عرفات میں پہنچیں اور وہاں وقوف کریں پھر وہاں سے واپس آئیں۔ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ میں یہی حکم مذکور ہے۔ (صحیح بخاری ص ۶۴۸ ج ۲)

تفسیر معالم التنزیل میں ہے کہ قریش اور ان کے حلفاء اور جو اُن کے دین پر تھے مزدلفہ ہی میں ٹھہر جاتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ ہم اللہ والے اور اس کے حرم کے رہنے والے ہیں۔ لہٰذا ہم حرم کو پیچھے نہ چھوڑیں گے اور حرم سے نہ نکلیں

گے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے برتر سمجھتے تھے کہ تمام لوگوں کے ساتھ عرفات میں ٹھہریں۔ جب دوسرے قبائل عرفات میں وقوف کر کے واپس آتے تھے تو قریش اور اُن کے حلفاء مزدلفہ سے ان سب لوگوں کے ساتھ واپس آ جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ عرفات میں وقوف کریں پھر وہاں سے سب لوگوں کے ساتھ مزدلفہ میں آئیں۔

حضور اقدس ﷺ بھی قریشی تھے اس لئے حجۃ الوداع کے موقعہ پر قریش کو اس میں کچھ بھی شک نہ تھا کہ آپ ہماری طرح مزدلفہ ہی میں ٹھہر جائیں گے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ مزدلفہ کو چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے یہاں تک کہ عرفات پہنچ گئے۔ (کما فی صحیح مسلم)

آپ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان پر عمل کیا اور سب صحابہ بھی آپ کے ساتھ عرفات پہنچے اور پھر وہاں سے آفتاب غروب ہونے پر واپس ہوئے۔

لفظ ثم جو اس آیت میں وارد ہوا ہے اسکی وجہ سے بعض اہل تفسیر نے یوں کہا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں مزدلفہ سے منیٰ کو واپس ہونے کا ذکر ہے۔ کیونکہ عرفات سے واپس ہونے کا ذکر گزشتہ آیت میں ہو چکا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ثم واؤ کے معنی میں ہے۔ صاحب معالم التنزیل نے یہ تینوں قول لکھے ہیں بظاہر یہ تیسرا قول زیادہ مناسب ہے اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ثم ترتیب ذکری کے لئے ہے ترتیب عملی کے لئے نہیں ہے۔

(قال ابن کثیر) **ثم ھھنا لعطف خبر علی خبر و ترتیبه علیه کانه تعالٰی امر الواقف بعرفات ان یدفع الی المزدلفة لیذکر اللہ تعالٰی عند المشعر الحرام و امرہ ان یکون وقوفه مع جمهور الناس بعرفات الخ.**

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ

سو جب تم پورا کر لو اپنے حج کے کاموں کو سو اللہ کو یاد کرو جیسے تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھ کر ذکر کرو، سو بعض لوگ ایسے ہیں

مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ

جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں دے دیجئے اور ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ

اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں بہتری عطا فرمایئے اور آخرت میں بہتری عنایت کیجئے اور ہم کو دوزخ کی آگ سے بچایئے۔ یہ لوگ ایسے ہیں کہ اُن کے لئے بڑا حصہ ہے

مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

ان کے اعمال کی وجہ سے اور اللہ جلدی حساب لینے والا ہے

ایام منیٰ میں ذکر اللہ میں مشغول ہونے کا حکم

تفسیر: دسویں ذوالحجہ کو مزدلفہ سے واپس آ کر جمرہ کبریٰ کو کنکریاں ماری جاتی ہیں اور پھر حلق یا قصر کر کے احرام سے نکل جاتے ہیں اس کے بعد طواف زیارت اور دو یا تین دن کی رمی یعنی کنکریاں مارنا باقی رہ جاتا ہے۔ زمانہ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ حج سے فارغ ہو کر اپنے باپ دادوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے اور مقابلہ میں اشعار پڑھتے تھے اور اپنے قبیلوں کی بڑائی بیان کرتے تھے۔

اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ حج کے کاموں سے فارغ ہو کر اللہ کو یاد کرو جیسا کہ تم اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھ کر اللہ کو یاد کرو۔ (روح المعانی)

صاحب معالم التنزیل نے مَنَاسِكَكُمْ کا ترجمہ نَسَائِكَكُمْ کیا ہے۔ اور آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ جب تم حج سے فارغ ہو جاؤ اور قربانی کے جانور ذبح کر لو تو اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جاؤ۔

وذلک بعد رمی جمرة العقبة والاستقرار بمنی۔

پھر دعا کرنے والوں کا تذکرہ فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے صرف دنیا ہی طلب کرتے ہیں۔ یہ لوگ حج میں بکریاں۔ اُونٹ۔ گائیں اور غلام مانگا کرتے تھے۔ صرف طالب دنیا تھے۔ آخرت کا اُنہیں کچھ بھی دھیان نہ تھا۔ یہ لوگ یوں دُعا کرتے تھے۔ اے اللہ میرے باپ کا عظیم قبہ تھا' بڑا پیالہ تھا اور وہ کثیر المال تھا مجھے بھی اسی قدر مال عطا فرما جتنا اُس کو دیا تھا۔ (معالم التنزیل)

ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے آخرت میں ذرا سا بھی حصہ نہیں ہے۔ پھر اہل ایمان کی دعا کا تذکرہ فرمایا کہ وہ یوں دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں بھی بہتری عطا فرما اور آخرت میں بھی عطا فرما' اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا' اہل ایمان دونوں جہاں کی کامیابی' خوشحالی اور خوبی و بہتری کے لئے دعا کرتے ہیں۔ لفظ حَسَنَةً حَسَنٌ کی تانیث ہے۔ جو ہر خوبی اور ہر بہتری کو شامل ہے مذکورہ دعا میں دنیا کی ہر خوبی اور آخرت کی ہر خوبی اور بہتری کا سوال ہے اور اس میں بڑی جامعیت ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ اکثر یہ دعاء کیا کرتے تھے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ حضرت اُنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی کی عیادت کی جن کی آواز بہت ہی زیادہ کمزور ہو گئی تھی اور وہ چوزہ کی طرح دُبلے ہو گئے تھے۔ آپ نے فرمایا کیا تم اللہ سے کوئی دعاء کرتے رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ جی ہاں میں یہ دعا کرتا تھا کہ یا اللہ مجھے جو کچھ سزا آخرت میں دینی ہو وہ دنیا ہی میں دیدیجئے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! تم میں اسکی طاقت نہیں ہے تم نے دعا میں یوں کیوں نہ کہا۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ راوی حدیث حضرت اُنس فرماتے ہیں کہ ان صاحب نے اس کے بعد یہ دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا عطاء فرما دی۔ (صحیح مسلم) سنن ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان طواف کرتے وقت ربنا آتنا فی الدنیا (آخر تک) پڑھتے تھے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ

اور اللہ کا ذکر کرو چند دنوں میں پھر جو شخص دو دن میں تعجیل کرے اس پر کچھ گناہ نہیں' اور جو شخص تاخیر کرے اس پر کچھ گناہ نہیں

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

اس شخص کے واسطے جو تقویٰ اختیار کرے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے

ایام تشریق میں ذکر اللہ اور رمی جمار کی مشغولیت

تفسیر: آیت بالا میں اول تو یہ فرمایا کہ چند دنوں میں اللہ کا ذکر کرو۔ ان دنوں سے ایام تشریق مراد ہیں جن میں قربانیاں کی

جاتی ہیں اور حجاج کا منٰی میں قیام ہوتا ہے۔ اور جمرات کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ اس سے پہلے مزدلفہ میں ذکر کرنے کا حکم فرمایا اور عرفات میں تو ذکر اور دعا ہی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جمرات کو کنکریاں مارنا اور صفا مروہ کی سعی کرنا اللہ کا ذکر قائم کرنے کے لئے شروع کیا گیا ہے۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ مؤمن بندوں کو ہر وقت اس میں لگا رہنا چاہئے' بعض خاص ایام اور خاص اوقات میں ذکر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ سب سے بڑی عبادت نماز ہے اس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (نماز میرے ذکر کے لئے قائم کرو) جیسا کہ سب جانتے ہیں نماز اول سے آخر تک ذکر ہی ہے' نماز سے پہلے اذان واقامت ہے وہ بھی ذکر ہے۔ نماز کے بعد تسبیحات اور دعائیں ہیں یہ بھی ذکر ہے۔ حج سراپا ذکر ہے' تلبیہ ذکر ہے' طواف میں ذکر ہے' سعی میں ذکر ہے۔ عرفات میں ذکر ہے۔ مزدلفہ میں ذکر ہے۔ ایام منٰی میں ذکر ہے۔ رمی کرتے وقت ذکر ہے۔ قربانی کرتے وقت ذکر ہے۔ سید المرسلین خاتم النبیین علیہ السلام نے زندگی کے تمام احوال واشغال میں اذکار وادعیہ کی تعلیم دی۔ درحقیقت ذکر ہی اس دنیا کی رُوح ہے جس دن اللہ کا ذکر نہ ہوگا یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ صحیح مسلم (ص ۸۴ ج ۱) میں ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک ایسا وقت نہ آجائے کہ زمین میں اللہ اللہ نہ کہا جائے۔ سید المرسلین علیہ السلام ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ کان یذکر اللہ فی کل احیانہ (صحیح مسلم) منٰی کے مقام کے دوران خوب اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہیں۔ تفسیر روح المعانی میں ہے: واذکروا اللہ ای کبروہ أدبار الصلوات وعند ذبح القرابین وعند رمی الجمار وغیرھا۔ یعنی اللہ کی بڑائی بیان کرو نمازوں کے بعد اور قربانی کرتے وقت اور رمی جمار وغیرہ کے وقت۔ پھر فی ایام معدودات کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: وھی ثلثۃ ایام التشریق وھو المروی فی المشھور عن عمر وعلی وابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھم

اور تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے: ومن الذکر فی أیام التشریق التکبیر۔ (یعنی ان دنوں کے ذکر میں سے یہ بھی ہے کہ ان میں تکبیر کہی جائے) پھر لکھا ہے کہ حضرت عمر اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نمازوں کے بعد منٰی میں تکبیر کہتے تھے اور مجلس میں بھی اور بستر پر ہوتے ہوئے بھی اور راستہ میں بھی اھ تکبیر تشریق بھی ان ایام میں مشروع ہے۔ منٰی میں موجود ہوں یا اپنے وطن میں مقیم ہوں فرض نمازوں کے بعد اس کا پڑھنا واجب ہے۔ مرد زور سے تکبیر تشریق پڑھیں اور عورتیں آہستہ کہیں۔ یہ تکبیر نویں تاریخ کی فجر سے لیکر تیرھویں تاریخ کی عصر تک پڑھی جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح منقول ہے۔ ایام تشریق میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام کرنا چاہئے۔ ان دنوں میں روزہ رکھنا ممنوع ہے فرمایا حضور علیہ السلام نے لا تصوموا فی ھذہ الأیام فانھا ایام أکل و شرب و ذکر اللہ۔ (صحیح مسلم) یعنی ان دنوں میں روزہ نہ رکھو' کیونکہ یہ دن کھانے پینے کے اور اللہ کا ذکر کرنے کے ہیں۔

رمی جمار کے بعض مسائل

ذکر کا حکم فرمانے کے بعد رمی جمار کے بعض مسائل بیان فرمایا جس کی تفریع یہ ہے کہ دسویں ذی الحجہ کو صرف جمرہ کبریٰ کی رمی کی جاتی ہے۔ اس کا وقت سورج نکلنے کے بعد سے لیکر آنیوالی صبح صادق تک ہے۔ لیکن رات میں کنکریاں

مارنا قوت اور صحت والوں کے لئے مکروہ ہے۔ گیارہ اور بارہ تاریخ کی کنکریاں مارنے کا وقت زوال آفتاب کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور وہ بھی آنیوالی صبح صادق تک رہتا ہے' قوت وصحت والوں کے لئے رمی کرنا ان دنوں کی راتوں میں بھی مکروہ ہے۔ گیارہویں اور بارہویں تاریخ کو تینوں جمرات کی رمی کی جاتی ہے۔ دس' گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کی رمی کرنا واجب ہے۔ منٰی میں چھوٹے چھوٹے تین منارے سے بنائے ہوئے ہیں ان کو جمرات کہتے ہیں جو جمرۃ کی جمع ہے پہلا جمرہ مسجد خیف کے قریب ہے اس کو جمرہ اولیٰ اور جمرہ صُغریٰ کہتے ہیں۔ اس کے بعد جو جمرہ ہے اُسے جمرہ وسطیٰ کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد جو جمرہ ہے اس کو جمرہ کبریٰ اور جمرہ اُخریٰ اور جمرۃ العقبہ کہتے ہیں۔ اس کے قریب منٰی کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ ان تینوں جمرات کے نیچے جڑ میں دائرے بنے ہوئے ہیں۔ ان دائروں میں کنکریاں گرنا ضروری ہے۔ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان تینوں جگہ شیطان نے وسوسہ ڈال کر ورغلانے کی کوشش کی تھی آپ نے اس کو کنکریاں ماری تھیں۔ کنکریاں مارنا اسی کی یادگار ہے ہر کنکری کے ساتھ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ رَغْمًا لِلشَّیْطَانِ وَرِضًی لِلرَّحْمٰنِ پڑھے (میں اللہ کا نام لے کر رمی کرتا ہوں' اللہ سب سے بڑا ہے' یہ رمی شیطان کو ذلیل کرنے کے لئے اور رحمٰن کو راضی کرنے کے لئے ہے)۔

۱۳ ذی الحجہ کی رمی چھوڑ دینا جائز ہے

ان دو دنوں (گیارہ بارہ تاریخ) کی رمی کرنے کے بعد اگر کوئی شخص چاہے کہ منٰی سے چلا جائے اور تیرھویں تاریخ کی رمی نہ کرے تو اسکی اجازت ہے۔ اسی کو فرمایا فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ لیکن افضل یہ ہے کہ منٰی میں ٹھہرا رہے۔ اور تیرھویں تاریخ کی رمی کر کے منٰی سے روانہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر تیرھویں تاریخ کی رمی بھی کی تھی جیسا کہ گیارہ بارہ تاریخ کو زوال کے بعد رمی کی' تیرھویں تاریخ کی رمی کا وقت صرف غروب آفتاب تک ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ بارہویں تاریخ کو اگر منٰی میں ہوتے ہوئے سورج غروب ہو جائے تو تیرھویں کی رمی چھوڑ کر جانا مکروہ ہے۔ اور اگر منٰی میں ہوتے ہوئے تیرھویں کی صبح ہو جائے تو تیرہویں کی رمی کرنا بھی واجب ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص گیارہ بارہ کی رمی کر کے چلے جانے کی اجازت ہوتے ہوئے منٰی میں ٹھہرا رہے اور تیرہویں کی رمی کر کے جائے۔ اُس کے بارے میں فرمایا: وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ لِمَنِ اتَّقٰی (اور جو شخص تاخیر کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے)

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ لفظ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ جو دو جگہ وارد ہوا ہے اس سے دونوں باتوں میں اختیار دینا مقصود ہے کہ دسویں تاریخ کے بعد دو دن کی رمی کر کے چلا جائے تو اس کا بھی اختیار ہے اور تیسرے دن کی رمی کے لئے ٹھہر جائے اور منٰی سے روانگی میں تاخیر کرے تو اس کا بہت اختیار ہے۔ اس پر یہ جو اشکال ہوتا ہے کہ جب تیرھویں تاریخ کی رمی کر کے جانا افضل ہے تو اس کے بارے میں فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ کے بجائے ایسا لفظ ہونا چاہئے تھا۔ جو فضیلت پر دلالت کرتا۔ اس کے جواب میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس سے افضلیت کی نفی نہیں ہوتی (کیونکہ جو چیز افضل ہوتی ہے فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ اس پر بھی صادق آتا ہے) لیکن یہ بات پھر بھی قابل توجہ ہے کہ نفی الاثم کو دونوں جگہ کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کے بارے میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اہل جاہلیت کی تردید کرنے کے لئے یہ طرز اختیار فرمایا ہے کیونکہ وہ آپس میں اختلاف رکھتے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے تعجیل گناہ ہے اور بعض کہتے تھے کہ تاخیر گناہ ہے۔ اھ

علامہ قرطبی نے بھی یہ بات لکھی ہے کہ اہل عرب کی تردید کے لئے یہ لفظ اختیار کیا گیا ہے حیث قال فمعنی

الآیة أن کل ذلک مباح وعبر عنه بهذا التقسیم اهتماما و تاکیدا اذ کان من العرب من یذم المتعجل وبالعکس، فنزلت الآیة رافعة للجناح فی کل ذلک. اھ۔

صاحب معالم التنزیل نے (ص ۱۷۹ ج ۱) آیت کی تفسیر میں بعض حضرات سے یوں نقل کیا ہے کہ حج کرنے والے پر کوئی گناہ باقی نہیں رہے گا۔ خواہ بارہ تاریخ کو رمی کر کے چلا جائے خواہ تیرھویں کی رمی کے لئے ٹھہر جائے۔ اور اس معنی کی تائید کے لئے حدیث من حج لله ولم یرفث فلم یفسق پیش کی ہے۔ اور پھر یہ فرمایا ہے کہ یہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے۔ اس معنی کو لینے سے لمن اتقی کا تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ تعجیل کرے یا تاخیر کرے کوئی گناہ باقی نہ رہے گا بشرطیکہ اس حج میں تقویٰ اختیار کیا ہو اور گناہوں سے بچا ہو صاحب معالم التنزیل نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول انما جعلت مغفرة الذنوب لمن اتقی الله تعالٰی فی حجه اس معنی کی تائید کے لئے نقل کیا ہے۔ اور حضرت ابو العالیہ سے لمن اتقی کی تفسیر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ذهب اثمة لمن اتقی فیما بقی من عمره (یعنی بعض ائمہ نے لمن اتقی کا معنی یہ کیا ہے کہ حج کرنے کے بعد باقی عمر میں گناہوں سے بچتا رہے) والله تعالٰی أعلم بالصواب۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ
لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جس کی گفتگو آپ کو دنیاوی زندگی میں پسند آتی ہے اور وہ اللہ کو گواہ بناتا ہے اُس بات پر جو اس کے دل میں ہے۔
وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ
حالانکہ وہ سخت ترین جھگڑالو ہے۔ اور جب وہ پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے تو زمین میں دوڑ دھوپ کرتا ہے تاکہ اس میں فساد کرے اور کھیتی کو
وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ
اور نسل کو برباد کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ تو اللہ سے ڈر تو اس کا غرور نفس اس کو گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے۔ سو اس کے لئے
جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾
جہنم کافی ہے اور بلاشبہ وہ برا بچھونا ہے

میٹھی باتیں کرنیوالے منافقوں اور مفسدوں کا تذکرہ

تفسیر: معالم التنزیل (ص ۱۷۹ ج ۱) میں لکھا ہے کہ یہ آیت اخنس بن شُریق کے بارے میں نازل ہوئی یہ شخص میٹھی باتیں کرنے والا تھا۔ دیکھنے میں بھی اچھا لگتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتا تھا اور پاس بیٹھ کر اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور اس پر قسمیں کھاتا تھا اور اندر سے منافق تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اسکی ظاہری باتوں کی وجہ سے) اسے قریب بٹھاتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اخنس بن شُریق کی حرکت

لباب المنقول میں بحوالہ ابن جریر مفسر سُدی سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اخنس بن شریق کے بارے میں نازل ہوئی وہ آپ کی خدمت میں

آیا اور اپنا مسلمان ہونا ظاہر کیا۔ آپ کو اسکی باتیں پسند آئیں۔ پھر وہ آپ کے پاس سے چلا گیا اور مسلمانوں کی کھیتیوں پر گزرا جہاں گدھے بھی (چر رہے) تھے۔ اس نے کھیتوں کو آگ لگادی اور گدھوں کے پاؤں کاٹ کر چلا گیا۔ اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔

(یُھْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ میں اسی کو بیان فرمایا) علامہ مناوی نے فیض القدیر شرح الجامع الصغیر (ص ۱۴۵ ج ۲) میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اللّٰھم إنی أعوذبک من خلیل ماکر (الحدیث) میں یہ اُخنس بن شریق مراد ہے جو میٹھی زبان والا تھا' جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتا تھا' تو نرم نرم باتیں کرتا تھا اور یوں کہتا تھا کہ اللہ جانتا ہے کہ میں سچا ہوں۔

لباب النقول میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک یہ بات نقل کی ہے کہ جس جماعت میں حضرت عاصم اور حضرت مرثد تھے اس جماعت کے شہید ہونے کا جب علم ہوا تو دو منافقوں نے یہ کہا کہ افسوس ہے ان لوگوں پر جو فتنے میں پڑ گئے اور ہلاک ہو گئے۔ نہ تو اپنے گھروں میں ہی بیٹھے اور نہ تبلیغی ذمہ داری کو پورا کر سکے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی۔

بہر حال آیت کا سبب نزول جو بھی ہو الفاظ کا عموم ان تمام لوگوں کو شامل ہے جو دنیاوی زندگی میں میٹھی میٹھی اور چکنی چپڑی باتیں کر کے مسلمانوں کے عوام اور خواص میں اپنا مقام پیدا کرنا چاہتے ہیں اندر سے منافق ہوتے ہیں اور اپنے مسلمان ہونے کے جھوٹے دعوے ثابت کرنے کے لئے بار بار قسم کھاتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ اللہ گواہ ہے ہم سچے مسلمان ہیں' ان لوگوں کا مقصد چونکہ اول سے آخر تک دنیا اور دنیا کا جاہ و مال ہی ہوتا ہے اور اندر سے مسلمان نہیں ہوتے اس لئے جب بھی کوئی موقعہ دیکھتے ہیں مسلمانوں کو زک دینے اور نقصان پہنچانے اور انکی حکومتوں کے خلاف منصوبے بنانے میں اور انکی حکومتوں کو برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا کر نہیں رکھتے۔ جو کام اخنس بن شریق نے کیا کہ خدمت عالی میں حاضر ہو کر مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا اور اللہ کو اپنے دعوے کی سچائی پر گواہ بنایا اور پھر وہاں سے نکل کر مسلمانوں کی کھیتیوں کو آگ لگا دی اور مویشیوں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ وہی کام ہمیشہ سے منافقین کرتے آئے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ قتادہ اور مجاہد اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ آیت ہر ایسے شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو کفر کو چھپائے ہوئے ہو نفاق اور جھوٹ کو اپناتے ہوئے اپنی زبان سے اپنے دل کے خلاف ظاہر کرتا ہو۔ نیز علامہ قرطبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ دینی اور دنیاوی اُمور میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ (الجامع الاحکام القرآن)

لفظ فی الحیاۃ الدنیا کے بارے میں مُفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ امور دنیا اور اسباب معاش میں آپکو اسکی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ دنیاوی مقصد حاصل کرنے کے لئے وہ ایسی باتیں کرتا ہے۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ دنیاوی باتوں میں اس کی حلاوت اور فصاحت آپکو پسند آتی ہے لیکن آخرت میں اسکی کوئی بات قابل التفات نہیں ہوگی۔ وہاں جو اس کو وحشت سوار ہوگی اسکی وجہ سے وہ بولنے بھی نہ پائے گا۔ (ص ۱۳۹ ج ۱)

جھگڑالو اور چرب زبان کی مذمت

اَلَدُّ الْخِصَامِ یہ دونوں کلمے آپس میں مضاف مضاف الیہ ہیں۔ پہلا لفظ لدد سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے بہت زیادہ جھگڑالو' اور خصام بھی جھگڑے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ شخص بہت زیادہ جھگڑالو ہے' مفسر

بیضاوی نے اس کا ترجمہ شدید العداوہ (سخت دشمنی والا) کیا ہے جو اس کا لازمی معنی ہے۔ منافقوں کی یہ صفت بیان فرمانے سے ہر جھگڑالو کی مذمت معلوم ہوئی جو باطل کے لئے جھگڑتا ہو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ مبغوض وہ ہے جو زیادہ جھگڑالو ہو (صحیح بخاری ص ۶۴۹ ج ۲ ص ۱۰۶۶ ج ۲)

میٹھی میٹھی باتیں کر کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنا اور دل میں جو کچھ ہے اس کے خلاف ظاہر کرنا آج کی دنیا میں اسکو بڑی ہوشیاری سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ چیز سیاست حاضرہ کا جزو بن چکی ہے' سنن ترمذی' ابواب الزہد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آخر زمانہ میں ایسے لوگ نکلیں گے جو دین کے ذریعہ دنیا حاصل کریں گے اور تواضع ظاہر کرنے کے لئے بھیڑوں کی کھالوں کے کپڑے پہنیں گے انکی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی۔ اور ان کے دل بھیڑوں کی طرح ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کیا یہ لوگ میرے حلم سے دھوکہ کھاتے ہیں یا مجھ پر جرأت کرتے ہیں میں اپنی قسم کھاتا ہوں کہ میں ان لوگوں پر اُن ہی میں سے ایسا فتنہ بھیجوں گا۔ جو اُن میں ہوشمند عقل والا ہوگا اسے (بھی) حیران کر دے گا۔

تکبر کی مذمت: جن لوگوں میں خالص دنیاوی جاہ اور مال کی طلب ہوتی ہے۔ ان کے دلوں میں جھکاؤ نہیں ہوتا۔ وہ غرور نفس کی وجہ سے یہی سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے کسی حق کہنے والے کی بات قبول کر لی تو ہماری ہیٹی ہو جائے گی اور ناک کٹ جائے گی' کفر و شرک پر اور گناہوں پر اصرار کرتے رہتے ہیں اور حق کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا نفس انہیں حق قبول کرنے نہیں دیتا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا: وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ۔ (کہ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اپنے طور طریق اور طرزِ عمل میں اللہ سے ڈر تو اسکی حمیت اسے پکڑ لیتی ہے اور گناہ پر آمادہ رکھتی ہے)۔

تکبر کیا ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا الکبر بطر الحق وغمط الناس یعنی کہ حق کو ٹھکرانے اور لوگوں کو حقیر جاننے کا نام تکبر ہے' بہت سے اسلام کے دعویدار بھی حق کو ٹھکرا دیتے ہیں' جب کوئی شخص دین کی بات کرتا ہے اور گناہ چھوڑنے کو کہتا ہے یا کسی بات کی خیر خواہانہ نصیحت کرتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ تو کون ہے ہمیں نصیحت کرنے والا' تو ہماری سامنے کا بچہ ہے فلاں قوم کا فرد ہے' فلاں ملک کا رہنے والا ہے' یہ سب کبر ہے اور حق کو جھٹلانے کی باتیں ہیں۔ اوپر منافقوں اور مفسدوں کا طرزِ عمل بیان فرمایا اور اخیر میں فرمایا کہ ایسے شخص کو دوزخ کافی ہے اور دوزخ بُرا بچھونا ہے۔ مہاد عربی میں بستر کو کہتے ہیں' دوزخ میں اہل نفاق کا جو ٹھکانا بنے گا اسے مہاد سے تعبیر فرمایا کیونکہ وہ ان کا مستقل ٹھکانا ہے۔ جو اُن کو دنیا کے بستروں کے بجائے ملے گا۔ یہاں نرم بستروں پر سوتے تھے اور وہاں آگ کا بستر ہوگا اور آرام و راحت و نیند کا نام و نشان نہ ہوگا۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جو خرید لیتا ہے اپنے نفس کو اللہ کی رضا تلاش کرنے کے لئے اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے

اللہ کی رضا کیلئے جان و مال خرچ کرنیوالوں کی فضیلت

تفسیر: حلیۃ الاولیاء (ص ۱۰۱ ج ۱) میں حضرت سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ

مدینہ منورہ ہجرت کرنے کی نیت سے (مکہ معظمہ سے) نکلے تو قریش کے چند افراد ان کے پیچھے لگ گئے تا کہ ان کو واپس کریں۔ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ اپنی سواری سے اُترے اور اپنے ترکش سے تیر نکالے اور اُن سے کہا کہ اے قریش کے لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے بڑھ کر تیر انداز ہوں اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ میں اپنے سارے تیر تمہاری طرف نہ پھینک دوں جو میرے ترکش میں بھرے ہوئے ہیں اس کے بعد میں اپنی تلوار سے لڑوں گا جب تک میرے ہاتھ میں سکت رہے گی اب تم جو چاہو کر لو اور ایک صورت یہ ہے کہ میرا مال اور میرے کپڑے جہاں مکہ میں رکھے ہیں میں تمہیں انکا پتہ بتا دیتا ہوں تم ان کو لے لو اور میرا راستہ چھوڑ دو، وہ کہنے لگے ہاں یہ ٹھیک ہے ہم اس پر راضی ہیں وہ لوگ تو اُدھر چلے گئے اور حضرت صہیبؓ سفر قطع کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا ربح البیع ابایحی ربح البیع ابا یحیی' (اے ابو یحییٰ یہ بیع نفع والی ہے اے ابو یحییٰ یہ بیع نفع والی ہے) جس کا مطلب یہ ہے کہ تھوڑی سی دنیا خرچ کر کے جو اپنی جان اور دین کو بچالیا یہ نفع کا سودا ہے۔ (ابو یحییٰ حضرت صہیب کی کنیت ہے) ان کے پہنچنے سے پہلے ہی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ کی خبر دیدی تھی۔ مستدرک حاکم ص ۳۹۸ ج ۳ میں بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ یہ قصہ مذکور ہے اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ آیت شریفہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ حضرت صہیبؓ کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے ہی نازل ہوگئی تھی۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابو یحییٰ نفع کا سودا ہوا اور آپ نے انہیں آیت بالا پڑھ کر سنائی۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ جب میں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو قریش نے کہا کہ اے صہیب تم یہاں آئے تھے تو تمہارے پاس کچھ بھی مال نہ تھا اور اب تم یہاں کا کمایا ہوا مال اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔ اللہ کی قسم ایسا نہ ہوگا۔ میں نے ان سے کہا کہ تم مناسب جانو تو میں تمہیں اپنا مال دیدوں اور تم مجھے چھوڑ دو۔ وہ اس پر راضی ہوگئے اور میں نے اُن کو اپنا مال دیدیا اور مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ کی خبر مل چکی تھی آپ نے فرمایا: رَبِحَ صُهَيْبٌ رَبِحَ صُهَيْبٌ (صہیب نے نفع کا سودا کیا صہیب نے نفع کا سودا کیا)۔

بعض مفسرین نے يَشْرِىْ کا ترجمہ يَبِيْعُ سے کیا ہے یعنی بعض آدمی ایسے ہیں کہ اللہ کی رضا تلاش کرنے کے لئے اپنے نفس کو بیچ دیتے ہیں مفسر ابن کثیر (ص ۲۴۷ ج ۱) لکھتے ہیں کہ اکثر حضرات نے آیت کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ ہر ایسے شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے' قرآن پاک کی آیت اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (الآیۃ) سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا۔ اس اعتبار سے مجاہدین اپنے جان و مال کو فروخت کرنے والے ہوگئے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ حضرت صہیب کے قصے میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ وہ مشرکین مکہ سے قتال کے لئے تیار ہوگئے اُس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے نفس کو بیچ دیا' اس اعتبار سے ان کے قصہ کو سامنے رکھ کر بھی يَشْرِىْ کا ترجمہ يَبِيْعُ (بیچتا ہے) کیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت آیت کا جو شان نزول ہے (یعنی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ) اس کو سامنے رکھتے ہوئے بھی آیت کا عموم ہر اُس شخص کو شامل ہے جو بھی اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال خرچ کرے اور اللہ کی رضا کے لئے اپنی جان پر کھیل جائے' معالم التنزیل میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا مصداق ایسے شخص کو

بتایا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وجہ سے قتل کر دیا جائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ' اور شیطان کے قدموں کے پیچھے نہ چلو' بے شک وہ تمہارا

عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

کھلا دشمن ہے' سو اگر تم لغزش کھا جاؤ اس کے بعد کہ تمہارے پاس واضح دلیلیں آچکی ہیں تو جان لو کہ بلاشبہ اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے

اسلام میں پورے پورے داخل ہونے کا حکم

تفسیر: آیت کے شان نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ بعض صحابہؓ جو پہلے یہودی تھے انہوں نے سنیچر کے دن کی تعظیم کو باقی رکھنا چاہا جو شریعت موسوی میں تھی اور اونٹ کا گوشت کھانے سے پرہیز کرنا چاہا کیونکہ یہودیت کے زمانہ میں نہیں کھاتے تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ توریت بھی تو اللہ کی کتاب ہے' ہم اس کو تہجد کی نماز میں پڑھ لیا کریں (جیسا کہ قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے) اس پر آیت بالا نازل ہوئی اور حکم فرمایا کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ (من الدر المنثور والبیضاوی) شریعت محمدیہ کے آنے کے بعد اب کوئی شریعت باقی نہیں رہی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ میں تمہارے پاس خوب روشن اور صاف شریعت لے کر آیا ہوں اگر موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو اُن کے لئے بھی اس کے سوا کوئی گنجائش نہ تھی کہ وہ میرا اتباع کریں۔ (معالم التنزیل ص ۱۸۳ ج ۱) حضرت جابرؓ کی روایت مسند احمد اور شعب الایمان للبیہقی میں بھی ہے (کمافی المشکوٰۃ ص ۳۰)

زندگی کے تمام شعبوں میں ہر شخص اسلام کے احکام کا پابند ہے

اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اسلام کے احکام کو پورا پورا قبول کرو اور اس کے جملہ احکام پر عمل کرو' حاکم ہو یا محکوم بڑا ہو یا چھوٹا شہری ہو یا دیہاتی' تاجر ہو یا کاریگر' کارخانہ دار ہو' مزدور ہو یا کسان' سب اسلام پر پوری طرح چلیں اور اب دوسرے کا منہ نہ دیکھے کہ وہ چلے تو میں بھی چلوں۔ ہر ایک اپنی ذمہ داری کو سامنے رکھے۔ بہت سے لوگوں نے یہ طریقہ بنا رکھا ہے کہ نماز روزہ اور انکے علاوہ دو چار کاموں تک ہی اسلام کو محدود رکھتے ہیں اس کے علاوہ معیشت اور معاشرت' تجارت اور سیاست اور زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں اسلام کے احکام کی پاسداری نہیں کرتے جس طرح چاہیں تجارت کر لیں اور جو بھی چیز سامنے آجائے خرید لیں' یا بیچ دیں۔ جس محکمہ میں چاہیں ملازم ہو جائیں۔ حرام حلال کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔ بیاہ شادی میں غیر شرعی طریقہ کار اختیار کرتے ہیں۔ سراسر گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ خوشی کے موقعہ پر ہم پر شرعی کوئی پابندی نہیں۔ حرام حلال کی بحثوں کو فضول سمجھتے ہیں' کوئی عالم اگر بتا دے کہ تمہاری ملازمت حرام ہے یا تجارت میں سُود ہے تو کہتے ہیں کہ مولوی ترقی سے روکتا ہے۔ جن قوموں کے دین میں چند تصورات اور توہمات اور چند اعمال کے علاوہ اور کوئی بھی پابندی نہیں ہے۔ اپنے دین کو انہیں کے دین پر قیاس کر لیتے ہیں۔ (العیاذ باللہ) ہمارا دین جامع ہے' کامل ہے مکمل ہے اور زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے' انسانی

زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے احکام تفصیل کے ساتھ اسلام میں نہ بتائے ہوں۔ بعض اُحکام پر عمل کرنا اور بعض کو چھوڑ دینا یہ وہی چیز ہے جس کو سورۂ بقرہ کے رکوع (۱۰) میں یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: (کیا کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے ہو اور بعض حصہ کے منکر ہوتے ہو) بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مسلمان ہونے کے صرف دعوے دار ہی ہیں۔ اسلام کے فرائض تک پر عمل نہیں کرتے' اور کچھ لوگوں کو دینداری کا خیال ہے لیکن اُنکی دینداری نماز تک یا ایک دو اعمال تک محدود ہے۔ اگر توجہ دلائی جائے کہ حرام ملازمت چھوڑ دو تو تیار نہیں اگر یوں کہا جائے کہ سود کا لین دین نہ کرو تو آمادہ نہیں اگر یوں کہو کہ حرام چیزیں فروخت نہ کرو تو کہتے ہیں کہ یہ روزی کا معاملہ ہے۔ اس کو کیسے چھوڑیں؟ انکی جاہلانہ بات کا مطلب یہ ہے کہ روزی کمانے میں گویا پورے آزاد ہیں' (العیاذ باللہ)

اصحاب حکومت کی بے راہی

جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں وہاں کے ذمہ دار انہی طریقوں پر حکومتیں چلاتے ہیں جو کافروں سے سیکھے ہیں کچہریوں میں کافرانہ اور ظالمانہ قوانین کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔ اسلام کے قانون کا نام آجائے تو کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ کافرانہ اُقوال اور افعال کے باوجود اس کے دعوے دار ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اسلام پر پوری طرح عمل نہ کرنا بعض اُحکام کو ماننا بعض کو چھوڑنا یہ سب شیطانی حرکات ہیں۔ اسلام میں پورا پورا داخل ہونے کا حکم دینے کے بعد یہ بھی فرمایا کہ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ کہ شیطان کے قدموں کے پیچھے نہ چلو' اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے) لوگ شیطان کو برا بھی کہتے ہیں اور اُس پر لعنت بھی بھیجتے ہیں۔ اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں کو بھی اختیار کرتے ہیں۔ یہ عجیب طریقہ ہے۔ پھر فرمایا: فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (سو اگر تم لغزش کھا جاؤ اس کے بعد کہ تمہارے پاس واضح دلیلیں آ چکی ہیں' تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے)۔

اس آیت میں بتایا کہ واضح دلائل آجانے کے بعد پھر بھی اسلام میں داخل نہ ہوتے تو اس کو معمولی بات نہ سمجھنا یہ اللہ تعالیٰ کی بغاوت ہے۔ وہ غالب ہے اس کے عذاب اور انتقام سے بچ نہیں سکتے' اور وہ حکیم بھی ہے اپنی حکمت کے موافق وہ سزا دینے میں جلدی نہ کرے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا اور یہ نہ سمجھنا کہ گرفت نہ ہوگی اور انتقام سے محفوظ رہیں گے۔

قال صاحب الروح غالب علی أمرہ لا یعجزہ شئ من الانتقام منکم حکیم لا بترک ما تقتضیه الحکمة من مؤاخذة المجرمين.

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ
یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ اللہ اور فرشتے بادلوں کے سائبانوں میں ان کے پاس آجائیں اور سارا قصہ
الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾
ختم ہو جائے۔ اور اللہ ہی کی طرف اُمور لوٹائے جائیں گے

حق قبول نہ کرنے پر وعید

تفسیر: جو لوگ واضح دلائل کے بعد بھی دین اسلام میں داخل نہیں ہوتے انہیں کیا انتظار ہے ان کے طور طریق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بس اُسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ اور اس کے فرشتے بادلوں کے سائبانوں میں آ جائیں اور انکو ان کے کفر کی سزا مل جائے اور سارا فیصلہ ہو جائے پھر آگے اسلام قبول کرنے کا موقعہ ہی نہیں ہے۔ کیونکہ عذاب سامنے آنے کے بعد اسلام قبول نہیں ہوتا' پھر فرمایا کہ تمام اُمور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے وہ قاضی روزِ جزا ہے۔ اس دن مجازی صاحب اختیار بھی کوئی نہ ہوگا۔ وہ حق کے ساتھ فیصلے فرمائے گا' اہل کفر کے بارے میں دائمی عذاب کا فیصلہ ہوگا۔ لہٰذا اپنا انجام سوچ لیں۔

فائدہ: لفظ یاتیھم اللہ میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف اتیان (یعنی آنے) کی نسبت کی ہے اس پر ایمان لائیں۔ مفہوم کے سمجھنے اور معنی کریدنے میں نہ لگیں۔ سلف کا بھی طریقہ ہے' اور بعض حضرات نے مضاف مقدر مانا ہے۔ **قال القرطبی (ص ۲۵ ج ۳) وقیل لیس الکلام علی ظاهره فی حقه سبحانه وانما المعنیٰ یأتیهم امر الله وحکمه وقیل ای بما وعدهم من الحساب والعذاب.** مطلب یہ ہے کہ یأتیھم اللہ سے اللہ کا اُمر اور اس کا حکم اور عذاب آنا مراد ہے۔ **واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔**

سَلْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ كَمْ ءَاتَيْنَٰهُم مِّنْ ءَايَةٍۭ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعْدِ مَا
آپ بنی اسرائیل سے دریافت فرمائیے ہم نے ان کو کتنی واضح دلیلیں دیں۔ اور جو شخص اللہ کی نعمت کو بدل دے اس کے بعد کہ
جَآءَتْهُ فَإِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾
نعمت اس کے پاس آ جائے تو بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے

بنی اسرائیل کی ناشکری اور اس پر عذاب

تفسیر: بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی واضح دلیلیں عنایت فرمائی تھیں۔ وہ ان دلائل سے کام لیتے اور حق پر جمتے تو ان کے حق میں اچھا تھا۔ لیکن انہوں نے اُلٹی ہی چال چلی ہدایت کے بجائے گمراہیوں کو پسند کیا' اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو نقمت سے بدل دیا۔ جسکی وجہ سے دنیا و آخرت میں مستحق عذاب و عقاب ہوئے۔ بنی اسرائیل کو جو دلائل واضحہ دیئے گئے تھے ان کے بارے میں صاحب معالم التنزیل لکھتے ہیں کہ اس سے وہ دلائل مراد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے بارے میں عطا کئے گئے تھے۔ مثلاً عصا موسوی اور ید بیضاء اور سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کو پار کرنا وغیر ذلک' اور ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے وہ صاف اور واضح بیانات مراد ہیں جو توراۃ وانجیل میں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں تھے' یہودیوں نے جو ان آیات سے انحراف کیا اور حق واضح ہو جانے کے باوجود گمراہی کا راستہ اختیار کیا اس کے بیان کرنے کے لئے ایک ایسا اسلوب اختیار فرمایا جس سے ہر نعمت کے بدلنے کی شناعت اور قباحت معلوم ہو جائے اور عمومی طور پر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جو بھی کوئی شخص اللہ کی کسی بھی نعمت کو بدلے گا وہ مستحق عذاب و عقاب ہوگا۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا

مزین کی گئی ان لوگوں کے لئے دنیاوی زندگی جنہوں نے کفر کیا اور وہ ہنسی کرتے ہیں ان لوگوں سے جو لوگ ایمان لائے حالانکہ جن لوگوں نے پرہیزگاری کو

فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

اختیار کیا وہ قیامت کے دن اُن سے بالا ہوں گے اور اللہ جسے چاہے بلا حساب رزق عطا فرماتا ہے

کافروں کے لئے دنیا کا مزین ہونا اور انکا ایمان والوں پر ہنسنا

تفسیر: اس آیت میں کافروں کے کفر پر جمنے اور کفر اختیار کرنے کا سبب بتایا ہے اور وہ یہ کہ دنیاوی زندگی اور اس سے متعلقہ ساز و سامان آرائش اور زیبائش انکی نظروں میں بھایا ہوا ہے۔ اسی حسن ظاہر کو دیکھ کر وہ دنیا پر ملے پڑے ہیں۔ چونکہ ایمان اور اعمال صالحہ اختیار کرنے میں انہیں دنیا اور اسباب دنیا میں کمی ہوتی نظر آتی ہے اس لئے کفر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ دنیا کے ساز و سامان مال اور جائیداد ہی کو کامیابی سمجھے ہوئے ہیں اس لئے اہل ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں اور ان سے تمسخر کرتے ہیں کیونکہ ان کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں یہ دنیا چند روزہ ہے اس کے بعد اہل کفر کے لئے عذاب ہی عذاب ہے اور اہل ایمان کے لئے جنت ہے۔ اہل ایمان قیامت کے دن بلند و بالا ہوں گے۔ جنت کے بالا خانوں میں ہوں گے اور اہل کفر دوزخ میں پڑے ہوں گے۔ اس وقت اہل ایمان ان پر ہنسیں گے جیسا کہ سورہ مطففین میں فرمایا: فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ، عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (سو آج ایمان والے کافروں سے ہنسیں گے۔ مسہریوں پر بیٹھے ہوئے دیکھتے ہونگے) علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ یہ آیت مشرکین عرب ابوجہل وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ لوگ اپنے مالوں میں مست تھے۔ تنعم کی زندگی گزارتے تھے اور آخرت کی تکذیب کرتے تھے اور فقرائے مومنین مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ عمار بن یاسرؓ اور صہیبؓ اور بلالؓ اور خبابؓ جیسے حضرات کا مذاق بناتے تھے ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آیت منافقین (عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں) کے بارے میں نازل ہوئی یہ لوگ دنیا میں مزے کی زندگی گزارتے تھے اور فقرائے مہاجرین پر پھبتیاں کستے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو محمد (علیہ السلام) کا کہنا ہے کہ ان (مسکینوں) کو ساتھ لے کر لوگوں پر غلبہ پائیں گے۔ حضرت عطاء نے فرمایا کہ یہ آیت رؤساء یہود کے بارے میں نازل ہوئی جو فقرائے مہاجرین پر ہنستے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے وعدہ فرمایا کہ بنی نضیر اور بنی قریظہ کے اموال تم کو بغیر جنگ کے مل جائیں گے چنانچہ الحمد للہ ایسا ہی ہوا۔ (معالم التنزیل)

آیت کے ختم پر فرمایا کہ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (اور اللہ جسے چاہے بلا حساب رزق عطا فرماتا ہے) بعض مفسرین نے اس کا مطلب بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے دنیا میں بغیر کسی محنت اور تکلیف کے جس قدر چاہے عطا فرما دے اور اسے اعمال صالحہ کی توفیق دیدے پھر آخرت میں اس مال کا حساب نہ لے اور بعض حضرات نے بِغَيْرِ حِسَابٍ کا یہ معنی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو جتنا چاہے دے کم دے زیادہ دے اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ اس سے کوئی حساب لینے والا نہیں، اور ایک معنی یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے حساب خرچ فرماتا ہے اسے خرچ کرنے میں حساب کرنے کی ضرورت نہیں اس کے خزانے بے انتہا ہیں۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ

سب لوگ ایک جماعت تھے پھر اللہ نے نبی بھیجے تو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور

مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ

ان کے ساتھ کتاب اُتاری حق کے ساتھ تا کہ فیصلہ فرمائے لوگوں کے درمیان اُس بات کا جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور یہ اختلاف

اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ

ان ہی لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی، اور انہوں نے یہ اختلاف باہمی ضدا ضدی کے باعث اسکے بعد کیا جبکہ ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں آ چکی تھیں، پھر اللہ نے اپنے فضل سے

اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

ان لوگوں کو جو ایمان لائے اس امر حق کی ہدایت دی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے اور اللہ جس کو چاہے سیدھے راستہ کی ہدایت دیتا ہے

سارے انسان اُمت واحدہ تھے حق واضح ہونے کے بعد عناد اور ضد کی وجہ سے مختلف فرقے ہو گئے

تفسیر: تفسیر در منثور میں حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے۔ کہ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان جو قرنیں تھیں یہ سب ہدایت پر اور حق شریعت پر تھے، پھر لوگوں نے اختلاف کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا جو اس اختلاف کے بعد سب سے پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا اور ایسے وقت میں بھیجا جب کہ لوگوں میں اختلاف ہو چکا تھا اور حق کو چھوڑ چکے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کے بعد رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں جو مخلوق پر حجت ہیں۔

اور تفسیر قرطبی میں کلبی اور واقدی سے نقل کیا ہے۔ اُمت واحدہ سے وہ مسلمان مراد ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں تھے (اس وقت دنیا میں صرف یہی لوگ اہل ایمان تھے دوسری کوئی جماعت نہ تھی) حضرت نوح علیہ السلام کی وفات کے بعد لوگوں میں اختلاف ہو گیا (اور اہل ایمان کے مقابلہ میں مشرکوں اور کافروں کی جماعتیں پیدا ہو گئیں)

اُمۃ واحدہ کا مصداق بیان کرنے کے سلسلے میں اور بھی اقوال ہیں۔ بہر صورت آیت شریفہ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب اور ملت اور ایک ہی عقیدہ پر تھے اور یہ وہ دین تھا جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول تھا، پھر لوگوں میں (شیطان کے بہکانے سے اور رائے و فکر کے اختلاف سے) بہت سے فرقے پیدا ہو گئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے راہ حق بتانے کے لئے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں۔ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے راہِ حق بتانے اور اصلاح حال کرنے کے لئے اپنی پوری پوری کوششیں کیں، یہ حضرات حق قبول کرنے والے کو جنت کی بشارت دیتے تھے۔ اور حق سے منہ موڑنیوالوں کو آخرت کے عذاب سے ڈراتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر کتابوں کے ذریعہ امور اختلافیہ میں فیصلہ فرمایا، اور حق اور ناحق کو ممتاز کر کے بتا دیا، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم و تبلیغ سامنے ہوتے ہوئے بھی لوگوں نے اپنی نفسانیت اور ضد و عناد کی وجہ سے حق سے منہ موڑا، اور باہمی

اختلاف کرتے رہے، جن کو علم دیا گیا واضح دلائل سامنے ہوتے ہوئے حق سے منحرف ہوئے۔ اللہ جل شانہ نے اپنے فضل سے اہل ایمان کو راہ حق کی ہدایت دی اور جو چیز حق تھی وہ انکو بتادی۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے صراط مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔

تفسیر درمنثور میں وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت اُبی بن کعب سے نقل کیا ہے کہ جن کو کتاب اور علم دیا گیا ان سے بنی اسرائیل مراد ہیں۔ اور بَغْيًا بَيْنَهُمْ کے بارے میں فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی حرص اور ملک کی طلب اور اسکی ظاہری زیب و زینت کی وجہ سے بعض نے بعض پر بغاوت کر دی اور آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں ماردیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ہدایت دی جو اختلاف کے وقت اس دین پر قائم رہے جو دین حق تھا وہ خدائے وحدہ لاشریک کے لئے اخلاص کے ساتھ دین میں لگے اور اختلاف والوں سے علیحدہ ہو کر رہے لہٰذا یہ لوگ قیامت کے دن دوسری قوموں یعنی قوم نوح اور قوم ہود اور قوم صالح اور قوم شعیب (وغیرہم) کے مقابلہ میں گواہی دیں گے اور یہ بتائیں گے کہ ان کے رسولوں نے ان کو تبلیغ کی تھی لیکن انہوں نے ان کو جھٹلایا تھا اس عالم میں اللہ جل شانہ کی طرف سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہے ہیں اور کتب الٰہیہ نازل ہوتی رہی ہیں۔ حق پر چلنے والے بھی رہے اور مخالفین بھی رہے اب اہل ایمان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اہل کفر ہماری مخالفت کرتے رہیں گے اور حق ظاہر ہونے کے باوجود اسے اختیار نہ کریں گے اور جب اختلاف ہوگا تو ان سے تکلیفیں بھی پہنچیں گی، اور قتل و قتال کی نوبت بھی آجائے گی۔ صبر بھی کرنا ہوگا اور اللہ کی راہ میں جان و مال بھی خرچ کرنا ہوگا کافر اپنے عناد پر جمے رہیں گے۔ اہل ایمان کو ایمانی تقاضوں پر ثابت قدم رہنا لازم ہوگا۔ اس تقریر سے آیت اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کا ربط بھی سمجھ میں آ گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ
کیا تم نے خیال کیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ اُن لوگوں جیسے واقعات تمہیں پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔
مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ
ان کو پہنچی سختی اور تکلیف اور وہ لوگ جھنجھوڑ دیئے گئے یہاں تک کہ رسول نے اور ان مؤمنین نے جو رسول کے ساتھی تھے
مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾
کہہ دیا کہ کب ہوگی اللہ کی مدد، خبردار بلاشبہ اللہ کی مدد قریب ہے

مصائب میں مسلمانوں کو صبر کی تلقین اور امم سابقہ کے مسلمانوں سے عبرت حاصل کرنے کی تعلیم

تفسیر: مسلمانوں کو مشرکین اور یہود و منافقین سے برابر تکلیفیں پہنچتی رہتی تھیں۔ مکہ معظمہ میں جب تک رہے مشرکین برابر تکلیفیں پہنچاتے رہے پھر جب مدینہ منورہ ہجرت کر کے آگئے تو یہودیوں سے اور منافقوں سے واسطہ پڑا اور مشرکین مکہ نے یہاں بھی چین سے نہ رہنے دیا۔ ان کی دشمنی کی وجہ سے بدر اور اُحد اور خندق کے غزوات پیش آئے۔ دشمنوں کی

ایذا رسانیوں کے علاوہ بھوک پیاس وغیرہ کی تکلیفیں بھی پہنچتی رہتی تھیں۔

اسباب النزول میں ہے کہ یہ آیت غزوۂ خندق کے موقعہ پر نازل ہوئی جبکہ مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچی، دشمنوں کا خوف بھی تھا، اور سردی بھی سخت تھی اور کھانے پینے کی چیزیں بھی مہیا نہ تھیں۔ اور کئی طرح سے تکالیف کا سامنا تھا جس کو اللہ جل شانہ نے سورۂ احزاب میں یوں بیان فرمایا ہے کہ: بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (اور کلیجے منہ کو آ گئے تھے) نیز اللہ جل شانہٗ نے غزوہ احزاب کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ: هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ (کہ اس موقع پر مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالا گیا اور ان کو سختی کے ساتھ جھنجھوڑا گیا) منافقین اس حال کو دیکھ کر طرح طرح کی باتیں کرنے لگے حتیٰ کہ کفریہ کلمات تک کہہ گئے اللہ رب العزت تعالیٰ شانہٗ نے آیت بالا نازل فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تم جنت کی آرزو لئے بیٹھے ہوئے حالانکہ جسے جنت میں جانے کا ارادہ ہو اُسے آزمایا جاتا ہے۔ تکلیفوں میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ تم سے پہلے جو اہل ایمان تھے اُن کو دُکھ پہنچا، مصیبتوں نے گھیرا، تکلیفوں نے دبوچا، اور ان کو اس قدر سختی کے ساتھ جھنجھوڑا گیا کہ ان کے زمانہ کے رسول نے اور ان کے ساتھیوں نے مدد میں دیر محسوس کی تو یوں کہہ دیا کہ اللہ کی مدد کب ہو گی۔ جب وہ اس حال پر پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری دی گئی کہ خبردار اللہ کی مدد قریب ہے۔

اس میں جہاں منافقین کو جواب دیا گیا (جنہوں نے غزوہ اُحد میں مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا کہا تھا) وہاں مسلمانوں کو بھی تسلی دی گئی ہے یہ مصائب اور تکالیف کوئی نئی نہیں ہیں۔ تمہارے ساتھ نیا معاملہ نہیں کیا جا رہا ہے تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں۔ ان کو بھی آزمایا گیا ہے۔ جب ان کو بہت زیادہ تکلیف پہنچی اور اُنہوں نے مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (کب ہو گی اللہ کی مدد) کہا تو اللہ پاک کی طرف سے اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ کا اعلان کیا گیا اور جلد ہی مدد آ گئی، تمہاری تکلیف بھی اس مرحلہ پر پہنچ چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے دنیا میں بھی مدد ہو گی اور جنت کا داخلہ بھی ہو گا۔ قال ابن کثیر قال اللّٰہ تعالٰی الا ان نصر اللّٰہ قریب کما قال فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا و کما تکون الشدۃ ینزل من النصر مثلھا ولھذا قال تعالٰی الا ان نصر اللّٰہ قریب۔ اھ.

یہ آزمائش پہلے نبیوں (علیہم السلام) پر اور ان کی امتوں پر آئی ہمارے رسول سرورِ عالم ﷺ پر آئی آپ کے صحابہؓ پر آئی، تابعین پر آئی ان کے بعد مسلمانوں پر آتی رہی اور آتی رہے گی۔ سورہ عنکبوت میں فرمایا۔ الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا اور بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو آزمایا جو اُن سے پہلے تھے۔ سو اللہ تعالیٰ ضرور ضرور جان لے گا۔ ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور ضرور جان لے گا جھوٹوں کو) حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے اُن تکلیفوں کی شکایت کی جو مشرکین مکہ سے پہنچتی رہتی تھیں۔ اس وقت آپ کعبہ کے سایہ میں چادر سے تکیہ لگائے ہوئے تشریف فرما تھے۔ ہم نے عرض کیا کیا آپ اللہ سے دعا نہیں فرماتے؟ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو مسلمان تھے۔ ان میں سے بعض کو زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کر دیا جاتا تھا پھر آرہ لا کر سر کے اُوپر سے لیکر (نیچے تک) چیر دیا جاتا تھا جس سے دو ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ یہ تکلیف بھی اُن کو ان کے دین سے نہیں روکتی تھی۔ اور ان کے سروں میں لوہے کی کنگھیاں کی جاتی تھیں

جو گوشت سے گزر کر ہڈی اور پٹھے تک پہنچ جاتی تھی اور یہ چیز انہیں ان کے دین سے نہیں روکتی تھی۔ (مشکوٰۃ عن البخاری ص ۵۲۵)

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کیا خرچ کریں؟ آپ فرما دیجئے کہ جو مال تم خرچ کرو اس کا مصرف والدین اور قرابت دار

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

اور یتیم اور مسکین لوگ ہیں۔ اور جو بھی خیر کا کوئی کام تم کرو گے سو اللہ اسکو خوب جاننے والا ہے

کن مواقع میں مال خرچ کیا جائے

تفسیر: اسباب النزول (ص ۶۰) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت عمرو بن جموح انصاریؓ کے بارے میں نازل ہوئی' وہ بوڑھے آدمی تھے اور بہت مال والے تھے' انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم کیا صدقہ کریں اور کس پر خرچ کریں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی' تفسیر درمنثور (ص ۲۴۳ ج ۱) میں ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ اس آیت میں نفلی صدقات کا ذکر ہے اور زکوٰۃ اس کے علاوہ ہے۔

سبب نزول کے بارے میں جو روایت نقل کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ دو باتوں کا سوال کیا گیا تھا' اول یہ کہ کیا خرچ کریں' دوم یہ کہ کس پر خرچ کریں' اللہ جل شانہٗ نے اولاً دوسرے سوال کا جواب دیا کہ والدین پر اور دیگر رشتہ داروں پر' اور یتیموں پر' اور مسکینوں پر خرچ کرو۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نفس پر اور بیوی بچوں پر چونکہ انسان اپنے ذاتی تقاضے سے خرچ کرتا ہے اس لئے سوال ان کے علاوہ دوسروں پر خرچ کرنے کے متعلق تھا۔ لہٰذا اخراجات کی تفصیل بتاتے ہوئے پہلے والدین کا ذکر فرمایا پھر ماں باپ کے بعد دوسرے رشتہ داروں کا اجمالی ذکر فرمایا جو اپنے کنبہ کے لوگ ہیں۔ پھر یتیموں اور مسکینوں کا ذکر فرمایا جو رشتہ داروں میں ہوتے ہیں اور رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے خاندانوں میں بھی ہوتے ہیں۔

سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں کس کے ساتھ حسن سلوک کروں؟ فرمایا اپنی ماں کے ساتھ! عرض کیا پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا اپنے باپ کے ساتھ' پھر جو تجھ سے زیادہ قریب ہو' پھر اس کے بعد جو تجھ سے زیادہ قریب ہو۔

پھر وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔ فرما کر پہلے سوال کا جواب دیدیا کہ جو مال بھی تھوڑا یا بہت خرچ کرو گے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا خوب علم ہے وہ اس سب کی جزا عطا فرماوے گا اور مال کو خیر سے تعبیر فرمایا اس میں یہ بتادیا کہ مال حلال ہو (کیونکہ مال حرام خیر نہیں ہے) اور رضائے الٰہی کے لئے خرچ ہو (کیونکہ جس خرچہ سے ریاکاری اور شہرت مقصود ہو وہ خیر نہیں ہے)۔

مفسرین نے فرمایا ہے کہ دوسرے سوال کے جواب کو اس لئے اہمیت دی گئی کہ کوئی شخص کتنا ہی مال خرچ کرے جب تک صحیح مصرف میں خرچ نہ ہو ثواب کا استحقاق نہ ہوگا یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی فضیلت سے متعلق بعض روایات حدیث آیت کریمہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ کے ذیل میں گزر چکی ہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ

فرض کیا گیا تم پر جنگ کرنا اور وہ تمہیں ناگوار ہے، اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو،

وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۱۶﴾

اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بری ہو، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے

جہاد کی فرضیت اور ترغیب

تفسیر: مکہ مکرمہ کے زمانۂ قیام میں مسلمان بہت ہی ضعیف تھے، تھوڑے سے تھے کافروں کا تسلط تھا ان سے لڑنے اور جنگ کرنے کا کوئی موقعہ نہ تھا اور نہ جنگ کرنے کی اجازت تھی، بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ قیام پذیر ہو گئے، یہاں قیام کرنے کے بعد ان لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت دی گئی جو لڑنے کے لئے آمادہ ہو جائیں جیسا کہ سورۂ حج میں فرمایا: **اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔** اس کے بعد وہ وقت بھی آیا کہ عام مشرکین سے قتال کرنے کا حکم ہو گیا اگرچہ وہ ابتداء نہ کریں (قرطبی)

آیت بالا کے عموم سے بظاہر یہی مستفاد ہوتا ہے کہ کفار سے جنگ کرنا ہر مسلمان پر نماز روزہ کی طرح فرضِ عین ہے لیکن سورہ براءت کی آیت **وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ** (الآیۃ) سے اور بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قتال کرنا ہر مسلمان پر ہر وقت فرض عین نہیں ہے اسی لئے فقہاء نے اس بارے میں تفصیل لکھی ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ بعض حالات میں فرض عین اور عام حالات میں فرضِ کفایہ ہے کافروں سے جنگ کرنا جارحانہ بھی مشروع ہے اور دافعانہ بھی جیسا کہ قرآن وحدیث کے نصوصِ عامہ سے ثابت ہے۔ عام طور سے کافروں سے جنگ کرنے کو جہاد کہا جاتا ہے لفظ جہاد جُہد سے لیا گیا ہے جو محنت اور کوشش کے معنی میں ہے یہ اپنے عمومی معنی کے اعتبار سے ہر اس محنت اور کوشش کو شامل ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے ہو، سورۂ براءت میں فرمایا: **اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔** (نکل کھڑے ہو ہلکے ہو یا بھاری اور جہاد کرو اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو)۔

اس آیت میں مال اور جان دونوں سے جہاد کرنے کا حکم فرمایا ہے اور سنن ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **جاهدوا المشركين بأموالكم وانفسكم والسنتكم** (باب كراهية ترك الغزو)

اس حدیث میں زبانوں سے جہاد کرنے کا حکم بھی فرمایا ہے۔ زبان سے جہاد کرنے میں بہت باتیں آ گئیں، کافروں سے مناظرہ کرنا، ان کے خلاف تقریریں کرنا، مسلمانوں کو جہاد کے لئے ترغیب دینا اور آمادہ کرنا وغیرہ، مسلمانوں پر ہر قسم کا جہاد باقی رکھنا لازم ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف اور امام محمد اور امام مالک اور تمام فقہاء امصار کا قول ہے کہ جہاد قیامت تک فرض ہے، لیکن اس میں اتنی تفصیل ہے کہ عام حالات میں فرض کفایہ ہے مسلمانوں کی ایک جماعت اس میں مشغول رہے گی تو باقی مسلمانوں کو اس کے ترک کرنے کی گنجائش ہوگی، اور یہ بھی لکھا

ہے کہ تمام مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مسلمانوں کے ممالک کی سرحدوں کے رہنے والے مسلمان اگر طاقت ور نہ ہوں اور ان میں کافروں سے مقابلہ کی طاقت نہ ہو جس کی وجہ سے انہیں اپنے شہروں اور اپنی جانوں اور اپنے بال بچوں پر دشمنوں کی طرف سے خوف ہو تو ساری اُمت پر فرض ہوگا کہ وہ اپنے گھروں سے نکلیں اور کافروں کے حملہ سے مسلمانوں کی حفاظت کریں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اُمت میں کسی کا بھی یہ قول نہیں ہے کہ جب (کسی علاقہ میں) مسلمانوں کو اپنی جانوں کے قتل ہونے کا اور بچوں کے قید ہونے کا خطرہ ہو تو دوسرے (علاقہ کے) مسلمانوں کو انکی مدد چھوڑ کر گھر میں بیٹھنا جائز ہو۔

پھر لکھا ہے کہ امام المسلمین پر اور عامۃ المسلمین پر لازم ہے کہ ہمیشہ کافروں سے جنگ کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ اسلام قبول کریں یا جزیہ ادا کریں۔ (ثم قال: وهو مذهب أصحابنا ومن ذكرنا من السلف المقداد بن الأسود و أبى طلحة فى آخرين من الصحابة والتابعين وقال حذيفة بن اليمان: الأسلام ثمانية أسهم وذكر سهما منها الجهاد)

علامہ جصاص نے جہاد کی فرضیت پر متعدد آیاتِ قرآنیہ نقل کی ہیں۔ مثلاً: (وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ) اور (قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيكُمْ .الآية) اور (قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. الآية) اور (فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ) اور (فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ) اور (وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً) وغیرھا من الآیات صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ جہاد فرض کفایہ ہے، مسلمانوں کی ایک جماعت اگر اس فریضہ پر قائم رہے تو باقی مسلمانوں سے ساقط ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی بھی جہاد میں مشغول نہ رہے تو سب گناہ گار ہوں گے۔ پھر لکھتے ہیں کہ کافروں سے قتال کرنا واجب ہے اگر چہ وہ خود سے جنگ میں پہل نہ کریں، اور اگر مسلمانوں کے کسی شہر پر دشمن چڑھ آئیں تو تمام مسلمانوں پر انکا دفاع لازم ہوگا۔ اس صورت میں عورت بھی شوہر کی اجازت کے بغیر نکل کھڑی ہو اور غلام بھی آقا کی اجازت کے بغیر میدان میں آ جائے، اس لئے کہ اس صورت میں دشمنوں سے جنگ کرنا فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ (ہدایہ کتاب السیر) جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا۔ جہاد اور قتال اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے اور اللہ کا دین پھیلانے کے لئے ہے اور جنگ برائے جنگ نہیں ہے اور جہاد کے لئے مستقل احکام ہیں جو حدیث اور فقہ کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں۔

جہاد کے بعض احکام:

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ جب مسلمان کافروں کے ملک میں داخل ہوں اور انکے کسی شہر یا قلعہ کا محاصرہ کر لیں تو ان کو اسلام کی دعوت دیں اگر وہ دعوت قبول کر لیں اور اسلام لے آئیں تو جنگ کرنے سے رُک جائیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی دیں (اور مجھ پر اور میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائیں کما زادہ مسلم فی روایۃ)۔ اور اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کریں تو ان کو جزیہ ادا کرنے کی دعوت دیں اگر وہ جزیہ ادا کرنا منظور کر لیں تو پھر انکے وہی حقوق ہونگے جو مسلمانوں کے ہیں اور انکی وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو (ملک کی حفاظت کے سلسلے میں) مسلمانوں پر عائد ہوں گی (لیکن جزیہ کی دعوت مشرکین عرب کو نہیں دی جائیگی ان کیلئے اسلام ہے یا تلوار ہے) جن لوگوں کو دعوت اسلام نہیں پہنچی ان کو دعوت دیئے بغیر جنگ کرنا جائز نہیں۔ اور جن لوگوں کو دعوت اسلام پہنچ

چکی ہے۔ ان کے بارے میں مستحب ہے کہ پہلے ان کو دعوت دی جائے پھر قتال کیا جائے' اگر کفار قبول اسلام سے بھی انکاری ہوں اور جزیہ دینے پر بھی راضی نہ ہوں تو اللہ سے مدد طلب کر کے ان سے جنگ کی جائے اور عورتوں کو اور بچوں کو اور بہت بوڑھے کو اور اپاہج کو اور اندھے کو قتل نہ کیا جائے۔ ہاں اگر ان میں سے کوئی شخص امور حرب میں رائے رکھنے والا ہو یا عورت بادشاہ بنی ہوئی ہو تو انکو قتل کر دیا جائے (من الهداية باب كيفية القتال) مسلمانوں نے جب سے جہاد چھوڑا ہے دشمنوں نے ان پر قابو پایا ہوا ہے۔ اور ایسے معاہدوں میں جکڑ دیا ہے جن کی وجہ سے وہ کافروں پر حملہ نہ کر سکیں' اور کافروں کا اپنا یہ حال ہے کہ معاہدوں کی پاسداری کے بغیر جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ سراسر خیر ہی ہے اس سے اسلام پھیلتا ہے کافروں پر حجت قائم ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں قوت آتی ہے دشمن مغلوب ہوتے ہیں اور مغلوب رہتے ہیں مسلمان باعزت زندہ رہتے ہیں۔ اللہ کی مدد نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ کرنا دشمنان دین کے مشوروں پر چلنا اور ان سے دبنا اسی نے تو عالم میں مسلمانوں کی ساکھ خراب کر رکھی ہے۔

مسلمانوں نے خدمت اسلام کے جذبہ کو چھوڑ دیا۔ حُبِ جاہ' حُبِ اقتدار نے ان کے چھوٹے چھوٹے ملک بنا دیئے' ہر ایک اپنے اقتدار کی ہوس میں ہے اور اقتدار باقی رکھنے کے لئے دشمنوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ اس طوائف الملوکی نے مسلمانوں کی طاقت کو منتشر کر رکھا ہے۔ آپس میں لسانی عصبیتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے کی جانوں کے پیاسے بنے ہوئے ہیں۔ دشمنوں کی شہ پر اپنی وحدت ختم کر رکھی ہے۔ سارے عالم کے مسلمانوں کا اگر ایک ہی ملک ہوتا اور ایک ہی امیر المومنین ہوتا سارے مسلمان اسلام ہی کے لئے سوچتے اور اسی کے لئے جیتے اور اسی کے لئے مرتے تو کسی دشمن کی ہمت نہ تھی کہ آنکھ اُٹھا کر دیکھتا' دشمنوں نے عصبیتیں سمجھا کر بہت سارے چھوٹے چھوٹے ملک بھی بنوا دیئے اور جہاد سے بھی دور کر دیا۔ لہٰذا اپنے قابو میں کچھ نہ رہا' ہمت کر کے آپس میں ایک ہوں تو اب بھی ان شاء اللہ حال ٹھیک ہو جائے گا۔

مجاہدین کے فضائل:

حضرت ابو ہریرہ' حضرت سہیل بن سعد اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی راہ میں ایک صبح یا ایک شام کو نکلنا ساری دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے اس سب سے بہتر ہے۔ (صحیح بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور میری خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ (صحیح بخاری ص ۳۹۲ ج ۱)

حضرت عبدالرحمٰن بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی بندے کے قدم اللہ کی راہ میں غبار آلودہ ہو گئے اُسے دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی۔ (بخاری)

حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ جو بھی کوئی شخص جنت میں داخل ہو گا وہ دنیا میں واپس آنے کی آرزو نہ کرے گا۔ خواہ اس کو وہ سب کچھ مل جائے جو دنیا میں ہے سوائے شہید۔ وہ وہاں جو اپنا اعزاز دیکھے گا۔ اسکی وجہ سے آرزو کرے گا کہ دنیا میں واپس چلا جاتا اور دس مرتبہ قتل کیا جاتا۔ (صحیح بخاری ص ۳۹۵ ج ۱)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک دن ایک رات اسلامی ملک کی سرحد کی حفاظت میں گزارنا ایک ماہ کے روزے رکھنے اور راتوں رات ایک ماہ نمازوں میں قیام کرنے سے بہتر ہے اگر یہ شخص اسی حالت میں وفات پا گیا تو (ثواب کے اعتبار سے) اُس کا وہ عمل جاری رہے گا جو عمل وہ کیا کرتا تھا اور اُس کا رزق جاری رہے گا اور (قبر میں) فتنہ ڈالنے والوں سے پُر امن رہے گا۔ (صحیح مسلم ص ۱۴۲ ج ۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس حال میں مر گیا کہ اس نے جہاد نہیں کیا اور اس کے نفس میں جہاد کا خیال بھی نہ آیا تو وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مر گیا۔ (صحیح مسلم ص ۱۴۱ ج ۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کی راہ میں زخمی ہوا اور اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اسکی راہ میں کون زخمی ہوتا ہے تو وہ شخص قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا۔ رنگ تو خون کا ہوگا اور خوشبو مشک کی ہوگی۔ (صحیح بخاری ص ۳۱۳ ج ۲، صحیح مسلم ۱۲۳ ج ۲)

جہاد میں مال خرچ کرنے کا ثواب

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا بھی بڑا ثواب ہے۔ ایک شخص نے جہاد کے لئے ایک اُونٹنی پیش کر دی جس کو مہار لگی ہوئی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تیرے لئے اس کے عوض قیامت کے دن سات سو اونٹنیاں ہوں گی ہر ایک کی مہار لگی ہوئی ہوگی۔ (صحیح مسلم ص ۱۳۷ ج ۲) (یعنی مہار لگی ہوئی سات سو اونٹنیاں خرچ کرنے کا ثواب ملے گا)

جہاد میں شرکت کے لئے جانے والے کو سامان دے دینا جس سے وہ جنگ کرے اور کھائے پیے اس کا بھی بہت بڑا ثواب ہے۔ حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جس نے کسی فی سبیل اللہ جہاد کرنے والے کو سامان دیا اُس نے (بھی) جہاد کیا اور جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے گھر والوں کی خدمت میں خیر کے ساتھ رہا اس نے بھی جہاد کیا۔ (صحیح بخاری ص ۳۹۹ ج ۱)

جہاد پر دشمنان اسلام کا اعتراض اور اس کا جواب

دشمنان اسلام نے جہاد کو بہت مکروہ طریقہ پر پیش کیا ہے اول تو اسلام کی دشمنی میں اسلام کی دعوت کو نہیں سمجھتے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ سارے انسان اللہ کو وحدہٗ لاشریک مانیں اس کے سب رسولوں اور سب کتابوں پر ایمان لائیں۔ خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا نبی اور رسول مانیں، قرآن پر ایمان لائیں اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی طرف سے جو شریعت پیش کی ہے اس کو مانیں، جو شخص یہ سب قبول کرے گا وہ مسلم ہوگا۔ اللہ کا فرمانبردار ہوگا مستحق جنت ہوگا اور جو شخص اس دین و شریعت کو قبول نہ کرے گا۔ وہ کافر ہوگا، مستحق دوزخ ہوگا۔ ہمیشہ ہمیش آگ کے دائمی عذاب میں رہے گا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے جب مسلمان کافروں سے جنگ کریں تو اُنہیں پہلے اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو کوئی لڑائی نہیں، جنگ نہیں۔ قتال نہیں، اگر اسلام کو قبول نہ کریں تو اُن سے جزیہ دینے کو کہا جائے گا۔ پھر اگر جزیہ دینا بھی قبول نہ کریں تو جنگ کی جائے۔ جہاد کا مقصود اعلیٰ کافروں کو دین حق کی طرف بلانا ہے تاکہ وہ جنت کے مستحق ہو جائیں اگر جنگ کر کے کسی قوم کو دوزخ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا تو اس میں ان کے ساتھ احسان ہی کیا، کسی قوم کے تھوڑے

سے افراد جنگ میں کام آگئے اور اکثر افراد نے اسلام قبول کرلیا تو مجموعی حیثیت سے اُس قوم کا فائدہ ہی ہوا اگر کوئی قوم اسلام قبول نہ کرے اور جزیہ دینے پر راضی ہو جائے اور اس طرح مسلمانوں کی عملداری میں رہنا قبول کرے تو اس میں بھی اس قوم کا فائدہ ہے کہ دنیاوی اعتبار سے انکی جانیں محفوظ ہو گئیں اور آخرت کے اعتبار سے یہ فائدہ ہوا کہ انہیں دین اسلام کے بارے میں غور کرنے کا موقعہ مل گیا۔ مسلمانوں کی اذانیں سُنیں گے۔ نمازیں دیکھیں گے۔ مسلمانوں کا جو اللہ سے تعلق ہے اور جو مخلوق کے ساتھ ان کے معاملات ہیں وہ سامنے آئیں گے۔ مسلمانوں کے زہد و تقویٰ سے متاثر ہوں گے۔ اس طرح سے اقرب ہے کہ وہ اسلام قبول کرلیں اور کفر سے بچ جائیں اور آخرت کے عذاب سے محفوظ ہو جائیں۔ رہا جزیہ تو وہ انکی جانوں کی حفاظت کا بدلہ ہے اور وہ بھی سب پر نہیں ہے۔ اور زیادہ نہیں ہے۔ اس ساری تفصیل سے سمجھ لینا چاہئے کہ جہاد میں کافروں کی خیر خواہی پیش نظر ہے اگر کافروں کی کوئی جماعت اسلام بھی قبول نہ کرے اور جزیہ دینا بھی منظور نہ کرے تو اُن کے ساتھ جنگ اور قتل و قتال کا معاملہ ہوگا' کافر اللہ کا باغی ہے۔ کفر بہت بڑی بغاوت ہے۔ مجازی حکومتوں میں سے کسی حکومت کی کوئی فرد یا جماعت بغاوت کرے تو اس کو سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے اللہ کے باغی جو اسکی زمین پر بستے ہیں اس کا دیا کھاتے ہیں اسکی عطا کی ہوئی نعمتیں کام میں لاتے ہیں اللہ پر ایمان نہیں لاتے اگر اللہ کو مانتے ہیں تو اس کے ساتھ غیر اللہ کی بھی عبادت کرتے ہیں۔ بتوں کو پوجتے ہیں اور بہت سے خدا مانتے ہیں ایسے لوگ اس قابل کہاں ہیں کہ خدا کی زمین پر زندہ رہیں' اللہ کے وفادار بندے جنہوں نے اللہ کے دین کو قبول کرلیا اللہ کے دین کی دعوت دیتے ہیں پھر ان باغیوں کے منکر ہونے کے بعد اللہ کے وفادار بندے ان کو قتل کردیں تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ دنیا سے کفر و شرک مٹانے کے لئے اور خالق و مالک جل مجدہٗ کے باغیوں کی سرکوبی کے لئے جو اسلام میں جہاد شروع کیا گیا ہے اس پر تو دشمنوں کو اعتراض ہے لیکن صدیوں سے دُشمنانِ اسلام خاص کر یورپ کے لوگ جو ایشیاء کے ممالک پر قبضہ کرتے رہے ہیں اور اس سلسلہ میں جو لاکھوں کروڑوں خون ہوئے ہیں۔ اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) میں جو انگریزوں نے ہندوستانیوں کا قتل عام کیا ہے اور ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں جو عالمی جنگیں ہوئی تھیں اور ہیروشیما پر جو بم پھینکا گیا اور ایک طویل زمانہ تک جو صلیبی جنگیں ہوئی ہیں جن میں لاکھوں انسان تہ تیغ ہوئے یہ سب کچھ کونسی خیر پھیلانے کے لئے ہوا؟ کیا اس میں ملک گیری کی ہوس اور کفر و شرک پھیلانے کے عزائم اور دین اسلام کو مٹانے کے ارادے نہیں تھے؟ یہ ان لوگوں کی حرکتیں ہیں جو سیدنا حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے نسبت رکھنے کے جھوٹے دعوے دار ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم یہ تھی کہ کوئی شخص تمہارے رخسار پر ایک طمانچہ مارے تو دوسرا رخسار بھی اس کے سامنے کردو اور مشرکین ہند کو دیکھو جن کے یہاں ہتھیار رکھنا بہت بڑا پاپ ہے جو چوہا مارنے کو بُرا جانتے ہیں وہ مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں اور برابر فساد کرتے ہیں اور قتل و خون کا بازار گرم کرتے رہتے ہیں۔

اسلامی جہاد پر اعتراض کرنے والے اپنے آئینہ میں اپنا منہ نہیں دیکھتے اور جو لوگ اللہ کے باغی ہیں انکی بغاوت کو کچلنے والوں کے جہاد اور قتال پر اعتراض کرتے ہیں' سچ ہے ؎

اپنے عیبوں کی کہاں آپ کو کچھ پرواہ ہے؟ غلط الزام بھی اوروں پر لگا رکھا ہے!
یہ ہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے؟

ممکن ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو

آیت بالا میں جہاد کی فرضیت بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (کہ ممکن ہے تمہیں کوئی چیز ناگوار ہو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تمہیں کوئی چیز محبوب ہو اور وہ تمہارے لئے بری ہو)

سیاق کلام کے اعتبار سے تو اس کا تعلق جہاد اور قتال سے ہے کہ طبعی طور پر جہاد ناگوار معلوم ہوتا ہے لیکن نتائج اور ثمرات کے اعتبار سے تمہارے لئے بہتر ہے اور جہاد چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ جانا اور کاروبار میں لگنا تمہاری محبوب چیز ہے لیکن حقیقت میں اس کا چھوڑ دینا تمہارے حق میں شر ہے اور اس کے چھوڑ دینے سے بہت سی خیر سے محرومی ہے اور بُرے نتائج سامنے آنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن انداز بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ جہاد کے علاوہ بھی بہت سے اُمور کو شامل ہے، عموماً انسان بعض چیزوں کو مکروہ جانتا ہے لیکن اس کے لئے وہ بہتر ہوتی ہیں اور بہت سی چیزوں کو پسند کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اس کے لئے مُضر ہوتی ہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا رات دن تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا خیر اسی میں ہے کہ اللہ کے احکام مانیں اور ان ہی پر چلیں۔

آخر میں ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کہ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے، کیونکہ حقیقی علم اللہ ہی کو ہے۔ اسے اپنی مخلوق کا نفع وضرر اور مصلحت سب کچھ معلوم ہے وھو بکل شیء علیم۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ

آپ سے شہر حرام کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا جرم ہے، اور

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ

اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام کے ساتھ کفر کرنا اور اہل مسجد حرام کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک

وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ

اس سے بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ پردازی قتل کرنے سے بڑا جرم ہے۔ اور کافر لوگ برابر تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں پھیر دیں

دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ

تمہارے دین سے اگر اُن سے ہو سکے، اور وہ شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے پھر حالت کفر میں مر جائے،

فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

سو دنیا و آخرت میں ایسے لوگوں کے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور یہ لوگ دوزخ والے ہیں،

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جنہوں نے

سَبِيلِ اللّٰهِ ۙ أُولٰٓئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۲۱۸﴾

اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہ لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں' اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

اللہ تعالیٰ کی راہ سے اور مسجد حرام سے روکنا اور فتنہ پردازی کرنا جرم کے اعتبار سے قتل سے بڑھ کر ہے

تفسیر: رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن جحشؓ کی امارت میں چند مہاجرین سے فرمایا کہ مقام بطن نخلہ میں پہنچ کر قریش کے قافلہ کا انتظار کرنا ممکن ہے کوئی خیر کی خبر لے آؤ بطن نخلہ مکہ اور طائف کے درمیان ہے' یہ حضرات وہاں پہنچے تو قریش کا قافلہ گزرتا ہوا نظر آیا جو طائف سے سامان تجارت کشمش وغیرہ لے کر آ رہا تھا' یہ قافلہ عمرو بن الحضرمی اور حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور نوفل بن عبداللہ پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں نے حضرات صحابہ کرام کو دیکھا تو ڈر گئے' حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ لوگ خوف زدہ ہو گئے لہٰذا ان پر حملہ کر دینا چاہئے جب مشورہ سے یہ بات طے ہو گئی تو واقد بن عبداللہ تمیمیؓ نے عمرو بن الحضرمی کو تیر مار کر قتل کر دیا' یہ پہلا مشرک تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا' نیز حضرات صحابہؓ نے حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ کو قید کر لیا۔ یہ دونوں سب سے پہلے قیدی تھے جنہیں مسلمانوں نے قید کیا۔ قافلہ کا ایک فرد نوفل بن عبداللہ قابو میں نہ آیا اور فرار ہو گیا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اس قافلہ کے سامان کو اور دونوں قیدیوں کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ واقعہ جمادی الاُخریٰ کی انتیس تاریخ گزرنے کے بعد آنے والے دن میں پیش آیا۔ اس کے بارے میں یہ طے نہ کر سکے کہ یہ جمادی الاُخریٰ کی تیس تاریخ ہے یا رجب کی پہلی ہے۔

رجب کا مہینہ ان چار مہینوں میں شمار ہوتا تھا جن میں جنگ کرنا ممنوع تھا (زمانۂ جاہلیت میں ذی قعدہ' ذی الحجہ' محرم اور رجب میں قتال نہیں کرتے تھے اور ابتدائے اسلام میں بھی ان میں قتال کرنے کی ممانعت تھی) حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو یہ حملہ کر دیا تھا اس میں رجب کا شروع ہونا متحقق نہیں تھا لیکن قریش مکہ نے اس کو اپنے اعتراض کا نشانہ بنا لیا' اور کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) نے اس مہینہ میں قتال حلال کر لیا جو شہر حرام ہے۔ اس مہینہ میں لوگ امن کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں اور اپنی روزیوں کے لئے منتشر ہو جاتے ہیں۔ اور انہوں نے اس ماہ کی بے حرمتی کی ہے۔ اس اعتراض کو انہوں نے بہت اہمیت دی۔ مسلمانوں کی جس جماعت نے حملہ کیا تھا ان کو قریش مکہ نے عار دلائی۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی ان کا حملہ آور ہونا پسند نہ آیا اور آپ نے فرمایا کہ میں نے تو تمہیں شہر حرام میں قتال کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ آپ نے یہ سامان اور دونوں قیدیوں کا معاملہ موقوف رکھا' اور اس مال میں سے کچھ بھی نہیں لیا' جس جماعت نے یہ کارروائی کی تھی انہیں بڑی ندامت ہوئی انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جس دن ہم نے عمرو بن حضرمی کو قتل کیا ہے اس دن شام کو جو چاند نظر آیا تو اس کے اعتبار سے ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں کہ یہ قتل ہم سے جمادی الاخریٰ میں ہوا یا رجب میں' اس پر اللہ جل شانہ نے آیت بالا نازل فرمائی۔ نزول آیت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے قافلہ کا سامان لے لیا اور اس میں سے خمس علیحدہ کر لیا جو مال غنیمت کا اصول ہے۔ اور باقی مال اسی جماعت پر تقسیم کر دیا جنہوں نے قافلہ سے مال چھین لیا تھا' جو دو قیدی مسلمانوں نے پکڑ لئے تھے مال دے کر ان

کو مکہ والوں نے چھڑا لیا' پھر ان دونوں میں سے حکم بن کیسان تو مسلمان ہو گئے اور مدینہ منورہ میں رہے اور بیئر معونہ کے غزوہ میں شہید ہوئے اور دوسرا قیدی عثمان بن عبداللہ نامی مکہ معظمہ واپس جا کر حالت کفر میں مر گیا۔ (اسباب النزول ص ۶۲ تا ص ۶۴' روح المعانی ص ۱۰۷ ج ۲)

مشرکین نے جو اعتراض کیا تھا۔ اس کے جواب میں اللہ جل شانہٗ نے آیت کریمہ نازل فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ آپ فرما دیجئے شہر حرام میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے لیکن مشرکین کو اپنے کرتوت نظر نہیں آتے۔ اللہ کی راہ سے روکنا دین حق قبول کرنے والوں کو منع کرنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام کے ساتھ کفر کرنا اور اہل مسجد حرام کو وہاں سے نکالنا (جیسا کہ مشرکین مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے اصحاب کو مکہ معظمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا حالانکہ مسجد حرام کے تقدس کو باقی رکھنے والے اور نمازوں سے اسے معمور کرنے والے یہی حضرات تھے) یہ سب چیزیں اللہ کے نزدیک شہر حرام میں قتل کرنے سے گناہ گاری میں بڑھ کر ہیں جن کا ارتکاب کیا ہے (قال القرطبی ص ۴۶ ج ۳) وما تفعلون انتم من الصد عن سبیل اللہ لمن اراد لا سلام ومن کفرتم باللہ واخراجکم اھل المسجد منہ کما فعلتم برسول اللہ ﷺ واصحابہ اکبر جرماً عند اللہ.

پھر فرمایا وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ (فتنہ پردازی جرم میں قتل سے بڑھ کر ہے) مشرکین مکہ شرک و کفر میں مبتلا تھے اور جو لوگ مسلمان ہو جاتے تھے ان کو مارتے پیٹتے تھے اور کفر میں واپس لے جانے کی کوشش کرتے تھے' یہ سب بہت بڑا فتنہ ہے جو اللہ ایک شخص کے قتل سے بہت بڑھ کر ہے جسے بعض صحابہؓ نے چاند کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے قتل کر دیا تھا پھر مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ وہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اس میں مشرکین کے عزائم بتائے ہیں کہ وہ تمہارے ایمان سے کبھی بھی راضی نہ ہوں گے اور اپنے دین میں واپس کرنے کی کوششیں کرتے رہیں گے (وہ اپنے دین میں پختہ ہیں تم اپنے دین میں پختہ رہو' وہ تمہیں اپنے دین میں کھینچنا چاہتے ہیں تم انہیں اپنے دین میں لانے کی کوشش کرتے رہو)

مرتد کے احکام: اسکے بعد فرمایا وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے' پھر حالت کفر میں مر جائے تو دنیا و آخرت میں اُن لوگوں کے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں' وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے)

اس میں مرتد کے بعض احکام بتائے ہیں' دین اسلام قبول کرنے کے بعد جو شخص اس کو چھوڑ کر کوئی سا بھی دین اختیار کرے۔ (اور اسلام کے علاوہ ہر دین کفر ہی ہے) تو اس نے زمانہ اسلام میں جو اعمال کئے تھے وہ سب ضائع ہو گئے۔ کفر کی وجہ سے ان سب کا اجر و ثواب ختم ہو گیا دنیا میں بھی اُن اعمال کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا جو زمانہ اسلام میں کئے تھے اور آخرت میں بھی ان کا کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا' اور دوسرے کافروں کی طرح وہ بھی ہمیشہ دوزخ میں جائے گا۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (اور جو شخص ایمان کا منکر ہو جائے تو اس کے اعمال حبط ہو گئے اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہو گا) جو شخص مرتد ہو جائے (العیاذ باللہ) اس سے بات کی جائے۔ اس کا جو کوئی شبہ ہو دُور کیا جائے' اور تین دن اسے بند رکھا جائے' اگر تین دن گزر جانے پر اسلام قبول نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے اور اگر عورت مرتد ہو جائے (العیاذ باللہ) اور باوجود سمجھانے کے دوبارہ اسلام نہ لائے تو

اسے بند کر دیا جائے یہاں تک کہ مسلمان ہو جائے اگر اسلام قبول نہ کرے تو موت آنے تک جیل ہی رکھی جائے۔ یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اسے بھی تین دن کی مہلت دینے کے بعد قتل کر دیا جائے' جب کسی نے اسلام کے بعد کفر اختیار کر لیا تو اس کے مرتد ہونے کی وجہ سے اس کے تمام اموال اس کی ملک سے نکل گئے' پھر اگر مسلمان ہو گیا تو واپس اس کی ملک میں آ جائیں گے۔ اگر حالت کفر میں مر گیا یا مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کر دیا گیا تو اس کے وہ اموال جو اُس نے زمانہ اسلام میں کسب کئے تھے اس کے مسلمان وارثوں کو مل جائیں گے۔ اور جو مال اس نے مرتد ہونے کی حالت میں کمایا اس پر مال فئی کے احکام جاری ہوں گے۔ (یعنی اس کا مال بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا اور وہ حسب قواعد مسلمانوں کی ضرورتوں میں خرچ کر دیا جائے گا) یہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے۔ اور حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ دونوں قسم کے اموال میں فئی کے احکام جاری ہوں گے۔

اور جیسے ہی کوئی شخص مرتد ہو جائے اسکی بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی۔ اگر کوئی ایسا شخص مر جائے جس کی اسے میراث پہنچتی تھی تو اسکی میراث سے یہ شخص محروم ہوگا۔ مرتد کی نہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ اور اسکا ذبیحہ بھی حرام ہوگا۔ ارتداد سے پہلے جو بھی نیک کام نماز' روزہ' حج' عمرہ وغیرہ کیا تھا یہ سب ضائع ہو گیا۔ آخرت میں اس کا کوئی ثواب نہیں ملے گا اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر یہ شخص دوبارہ مسلمان ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ سو اسکے بارے میں جان لینا چاہئے کہ آخرت میں دوزخ سے بچ جائے گا اور دنیا میں بھی آئندہ احکام اسلام اس پر جاری ہوں گے اور اُسے خود بھی احکام اسلام پر عمل پیرا ہونا لازم ہوگا اور عام مسلمان بھی اس سے مسلمانوں جیسا معاملہ کریں گے۔ رہی یہ بات کہ اس کے گزشتہ اعمال صالحہ کا ثواب پھر سے واپس ملے گا یا نہیں اور جو حج کر لیا تھا اسکی فرضیت دوبارہ عود کرے گی یا نہیں' اس بارے میں حضرات ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مرتد ہو جانے کی وجہ سے جو اس کے اعمال ضبط ہو گئے تھے اب دوبارہ مسلمان ہونے سے ان کا ثواب واپس نہ ہوگا اور جو حج کر لیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اب حج فرض دوبارہ ادا کرنا ہوگا۔ مرتد ہونے کی وجہ سے جو بیوی نکاح سے نکل گئی تھی دوبارہ اسلام قبول کرنے سے پھر باہمی رضامندی سے نکاح کریں تو ہو سکتا ہے دوبارہ نکاح نہ کیا تو اسکی بیوی نہ ہوگی۔

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے عموم میں مُرتد شامل نہیں:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرتد دوبارہ اسلام قبول نہ کرنے سے جو قتل کیا جائے گا یہ تو ایک قسم کا جبر ہے حالانکہ سورۃ بقرہ ہی میں دوسری جگہ (ع ۳۴) لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ فرمایا ہے' جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں ہے۔ درحقیقت یہ سوال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ان کافروں سے متعلق ہے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا' جب کسی نے ایک مرتبہ اسلام قبول کر لیا اور اسکو حق مان لیا دلائل سے سمجھ لیا اسکی برکات دیکھ لیں تو اب اس کے لئے صرف یہی ہے کہ یا اسلام قبول کرے یا قتل کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ (رواہ البخاری ص ۱۰۲۳ ج ۲)

آخر میں یہ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا (الآیۃ) اس کے بارے میں مفسر ابن کثیر (ص ۲۵۴ ج ۱) لکھتے ہیں کہ جب حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور انکے ساتھیوں کا مسئلہ حل ہو گیا اور سرور عالم ﷺ نے انکے لائے ہوئے مال کو جو کافروں سے لے لیا تھا ۱/۵ نکال کر باقی مال انہی پر تقسیم فرما دیا تو اُنہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم اس بات

کی اُمید کریں کہ جو کچھ ہم نے کیا ہے یہ ہمارے لئے جہاد شرعی میں شمار ہو جائیگا اور اس میں ہمیں وہ اجر مل جائے گا جو مجاہد کو ملا کرتا ہے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ شانہٗ نے واضح طور پر بتا دیا کہ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں یہ لوگ رحمت کی اُمید رکھتے ہیں۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ان لوگوں کا اُمید رکھنا صحیح ہے اور ان لوگوں سے جو خطاء اجتہادی کے طور پر ایک آدمی قتل ہو گیا تھا وہ بھی اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔

فائدہ: قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ (آپ فرما دیجئے کہ شہر حرام میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے) اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ شہر حرام میں قتال کرنا ممنوع ہے۔ سورۂ براءۃ کی آیت اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ سے بھی خوب واضح طور پر چار مہینوں میں قتال کرنے کی حرمت معلوم ہو رہی ہے۔ ان چار مہینوں میں قتال کی حرمت اب بھی باقی ہے یا نہیں اس بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت عطاء بن ابی رباح فرماتے تھے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہے لہٰذا اشہر حرم میں قتال کرنا جائز نہیں الا یہ کہ دشمن قتال کرنے لگے تو اس کے جواب میں قتال کرنا جائز ہوگا۔ حضرت سلیمان بن یسار اور سعید بن المسیب فرماتے تھے کہ اشہر حرم میں قتال کی ممانعت منسوخ ہو گئی اور اب اشہر حرم میں قتال کرنا جائز ہے علامہ ابوبکر جصاص لکھتے ہیں: وهو قول فقهاء الأمصار (کہ یہی فقہاء امصار کا قول ہے)۔

پھر لکھتے ہیں کہ پہلا حکم حرمت قتال والا منسوخ ہے۔ آیت کریمہ اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ اور دوسری آیت قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اشہر حرم میں قتال کی ممانعت کے بعد نازل ہوئی۔ (احکام القرآن ص ۳۲۲ ج ۱)

علامہ قرطبی (ص ۴۳ ج ۳) میں لکھتے ہیں کہ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اشہر حرم میں قتال کرنے کی ممانعت منسوخ ہو چکی ہے اور اب ان میں قتال کرنا مباح ہے اس کا ناسخ کون ہے۔ اس میں اختلاف ہے حضرت زہری نے فرمایا کہ آیت کریمہ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (سورۂ توبہ) نے اسے منسوخ کر دیا اور بعض حضرات کا فرمانا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر حرام میں بنی ثقیف سے جہاد فرمایا تھا اور حضرت ابو عامر اشعری کو شہر حرام میں وادی اوطاس میں جہاد کرنے کے لئے بھیجا تھا اھ

بہرحال جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اشہر حرم میں قتال کرنے کی ممانعت منسوخ ہے ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے اور اگر دشمن جنگ کی ابتداء کر دیں تو اس صورت میں وہ حضرات بھی جنگ کرنیکی اجازت دیتے ہیں جو اس حکم کو منسوخ نہیں مانتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ

وہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں اور ان کا گناہ

اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

ان کے نفع سے بڑا ہے اور وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کیا خرچ کریں آپ فرما دیجئے کہ جو زائد ہو وہ خرچ کر دیں اللہ ایسے ہی بیان فرماتا ہے

لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ

آیات، تاکہ تم فکر کرو دنیا میں اور آخرت میں، اور وہ آپ سے سوال کرتے ہیں یتیموں کے بارے میں،

قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ

آپ فرما دیجئے کہ اصلاح کرنا ان کے لئے بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ آپس میں ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ تم میں مفسد کون ہے

الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

مصلح کون ہے اور اللہ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا' بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے

شراب اور جوئے کی حرمت

تفسیر: ان آیتوں میں اول تو شراب اور جوئے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں پھر یہ فرمایا کہ ان کا گناہ ان کے منافع سے بڑا ہے' اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ کسی چیز کے نفع مند ہونے سے اُس کا حلال ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز نفع مند ہو اور حرام بھی ہو۔ حرام حرام ہی رہے گا خواہ اس میں کتنا ہی بڑا نفع ہو۔ اور اس کے ارتکاب میں گناہ ہوگا جو دنیا و آخرت میں باعث وبال ہوگا۔ شراب اور جوئے کے بارے میں تفصیلی کلام ان شاء اللہ تعالیٰ ہم سورۃ مائدہ کی آیت: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ (الآیۃ) کے ذیل میں لکھیں گے۔ یہاں اتنا سمجھ لیں کہ نشہ لانیوالی ہر چیز کا پینا حرام ہے اور ہر ایک جوا حرام ہے جس طرح سے بھی ہو اور جس صورت میں بھی ہو اُس کا جو بھی نام رکھ لیا جائے حرام ہی رہے گا۔

فی سبیل اللہ کیا خرچ کریں؟

پھر ارشاد فرمایا کہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں یہ سوال چونکہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ وہاں یہ جواب دیا تھا کہ جو بھی تم مال خرچ کرو اپنے والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو چونکہ وہاں مصارف بتانے کی اہمیت زیادہ تھی اس لئے وہاں خرچ کے مواقع بتا دیئے اور پھر یہ بتا دیا کہ جو بھی کوئی خیر کا کام کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہوگا (اور وہ اس کا ثواب عطا فرمائے گا) اور یہاں الفاظ سابقہ میں جو دوبارہ سوال مذکور ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ اس پر زور ہے کہ کیا خرچ کریں؟ لہٰذا انہیں اسی سوال کا جواب دے دیا گیا۔

لباب النقول میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہوا تو چند صحابہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے مالوں میں جو مقرر فرمایا گیا ہے وہ کس قدر ہے ہم اس میں کتنا خرچ کریں ان کے سوال کے جواب میں اللہ جل شانہٗ نے آیت کریمہ۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ نازل فرمائی اور سوال کرنے والوں کے جواب میں فرمایا کہ جو مال اپنی ضروریات سے زائد ہو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ کہ تم خرچ کرنے میں غور و فکر سے کام لو' آخرت کی ضروریات دیکھو' اور دنیاوی ضروریات کو بھی سمجھو' ایسا بھی نہ ہو کہ خرچ ہی نہ کرو کہ ضروریات سے جس قدر بھی زائد ہو وہ پڑا ہی رہے اور جمع ہی ہوتا رہے۔ اور ایسا بھی نہ ہو کہ سب خرچ کر کے بیٹھ رہو اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہو کر کل کو دوسروں سے مانگنے کی نوبت آ جائے۔ نیز جوشِ سخاوت میں ایسا بھی نہ ہو کہ اہل

وعیال جن کے حقوق واجب ہیں ان کا کوئی حق ضائع ہو جائے ضرورت سے زیادہ جو مال جمع ہو جائے اگر اس سے فرض زکوٰۃ اور صدقات ونفقات واجبہ ادا ہوتے رہیں تو اس کا جمع کرنا جائز تو ہے لیکن خرچ کر دینا افضل ہے اس میں احوال بھی مختلف ہوتے ہیں کسی میں زہد غالب ہے اور جتنا زائد ہو سب خرچ کر دیتا ہے اسکی بھی گنجائش ہے رسول اللہ ﷺ کل کیلئے کچھ نہیں رکھتے تھے۔ اگر کوئی شخص فرائض اور واجبات ادا کرنے کے بعد زائد مال میں سے للہ فی اللہ کچھ خرچ کر دے اور کچھ رکھ لے تو اسکی بھی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہت زیادہ خرچ کرتے تھے لیکن انکے پاس مال جمع بھی رہتا تھا اور یہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے تھا آپ نے نکیر نہیں فرمائی۔

پھر ارشاد فرمایا: وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى کہ وہ لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں پھر اس سوال کا جواب عنایت فرمایا، جواب سمجھنے سے پہلے آیت کا سبب نزول سمجھ لیا جائے اس سے سوال کا مضمون بھی واضح ہو جائے گا اور پھر جواب بھی سمجھ میں آجائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

درمنثور (ص ۲۵۵ ج ۱) میں بحوالہ سنن ابوداؤد اور مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ جب آیت کریمہ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ (اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو احسن ہو) اور آیت کریمہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا۔ (جو لوگ یتیموں کے مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھرتے ہیں) نازل ہوئی تو وہ صحابہ جن کے پاس کوئی یتیم تھا انہوں نے یتیم کا کھانا پینا الگ کر دیا (یتیم کے لئے الگ پکاتے اور اپنے لئے الگ تیار کرتے) ایسا کرنے سے یتیم کے کھانے میں سے کچھ حصہ بچ جاتا تھا اسے رکھ لیتے تھے پھر بعد میں وہ یتیم کھا لیتا تھا یا خراب ہو جاتا تھا۔ جب یہ صورتحال پیش آئی تو ان حضرات نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پوری کیفیت پیش کی اس پر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (درمنثور)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ مقصود اصلی اصلاح ہے یتیم بچوں کا مال اس طریقہ پر ان پر خرچ کرو کہ ان کا نقصان بھی نہ ہو اور کوئی خراب نیت بھی نہ ہو کہ اس کا مال ساتھ ملا کر پکانے میں اس کے حصہ میں سے اپنے اوپر یا اپنے بچوں پر خرچ ہو جانے کی نیت ہو ان کا مال اپنے مال سے ملا کر پکانے میں چونکہ مصلحت پیش نظر ہے کہ ان کا مال زیادہ خرچ نہ ہو اور ضائع نہ ہو تو اس میں کوئی مؤاخذہ اور محاسبہ کی بات نہیں ہے وہ تمہارے بھائی ہیں۔ بھائیوں کی طرح مل جل کر اصلاح و خیر خواہی مدنظر رکھتے ہوئے کھاؤ اور پیو اللہ تعالیٰ شانہٗ مصلح کو بھی جانتا ہے۔ (جس کی نیت اصلاح کی ہو) اور مفسد کو بھی جانتا ہے جس کی نیت خراب ہو اور فساد اور بگاڑ کا ارادہ رکھتا ہو۔

پھر فرمایا کہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا اور تم کو حکم دیتا کہ یتیموں کا ہر حال میں الگ پکاؤ اور ایسے انداز سے پکاؤ کہ ذرا بھی خراب نہ ہو اور یہ تمہارے لئے مشکل اور دشواری کا باعث ہو جاتا، اللہ تعالیٰ نے آسانی عطا فرمادی آسانی پر عمل کرو اور نیت اچھی رکھو آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ عزیز ہے یعنی غلبہ والا ہے) وہ مؤاخذہ فرمائے تو کوئی اس سے بچ نہیں سکتا اور وہ حکیم بھی ہے اس کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ

اور نکاح نہ کرو مشرک عورتوں سے جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں، اور البتہ ایمان والی باندی بہتر ہے مشرک عورت سے اگرچہ

أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن

وہ تمہیں اچھی لگے اور نہ نکاح کرو اپنی عورتوں کا مشرکین سے جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ البتہ ایمان والا غلام بہتر ہے

مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ

مشرک سے اگرچہ وہ تمہیں اچھا لگے یہ لوگ بُلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے جنت

وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٢١﴾

اور مغفرت کی طرف اپنے حکم سے اور اللہ بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے اپنی آیات تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں

مشرک مردوں اور عورتوں سے نکاح کرنے کی ممانعت

تفسیر: اس آیت شریفہ میں مسلمانوں کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مشرک عورتوں سے نکاح کریں ہاں اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو ان سے نکاح کرنا جائز ہوگا مشرک عورتیں بعض مرتبہ حسن جمال یا اموال کے اعتبار سے اچھی معلوم ہوتی ہیں اور ان سے نکاح کرنے کی خواہش ہوتی ہے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ تم مشرکہ سے نکاح نہ کرو اگر کوئی باایمان لونڈی مل جائے تو اس سے نکاح کرلو۔ وہ تمہارے لئے مشرک عورت سے بہتر ہے۔ پھر دوسرا حکم ارشاد فرمایا کہ مشرکوں سے اپنی عورتوں کا نکاح نہ کرو مشرک کی نسبت مومن غلام بہتر ہے (تم اس سے اپنی عورتوں کا نکاح کرو) ہاں اگر کوئی مشرک مسلمان ہوجائے تو وہ تمہارا دینی بھائی ہوگیا اس سے اپنی عورتوں کا نکاح کرسکتے ہو۔

آخر میں مشرکوں سے بچنے اور ان سے ازدواجی تعلقات قائم نہ کرنے کی علت بتادی کہ مشرکین دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ مشرکین سے مرد ہوں یا عورت ازدواجی میل جول رکھنے میں خطرہ ہے کہ مسلمان مرد ہو یا عورت خدانخواستہ انکے عقائد سے متاثر ہوجائے اور کسی دن ایمان کھو بیٹھے اور مستحق دوزخ ہوجائے پھر مسئلہ اولاد کا بھی پیدا ہوگا مرد مشرک ہو یا عورت وہ اولاد کو ضرور اپنے دین پر لگائیں گے۔ اگر اولاد مشرک ہوگئی تو دوزخی ہوگی۔ لامحالہ مؤمن مرد و عورت مشرک مرد و عورت سے بہتر ہے چاہے وہ مومن غلام یا باندی ہی ہو چونکہ نہ تو وہ اپنے جوڑے کو دوزخ کی دعوت دیتا ہے اور نہ اولاد کو دوزخ کے راستہ پر ڈالتا ہے۔

فائدہ: آیت کے عموم الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی مؤمن عورت کا کسی مشرک مرد سے اور کسی مومن مرد کا کسی مشرک عورت سے نکاح درست نہیں ہے اور اس عموم میں ہر طرح کے کافر داخل ہیں۔ ملحد زندیق دہریئے بھی اس حکم میں آجاتے ہیں۔ ایسے مردوں اور عورتوں سے کسی مرد مومن اور عورت مومنہ کا نکاح دُرست نہیں اگر نکاح کرلیا تو وہ نکاح شرعی نکاح نہ ہوگا اور اسکی بنیاد پر ازدواجی تعلقات حرام ہوں گے البتہ کتابی عورت (یہودیہ ہو یا نصرانیہ) سے مسلمان مرد کا نکاح درست ہے اور اس کا جواز سورۂ مائدہ کے پہلے رکوع میں بیان فرمادیا ہے۔ اس کے بعض احکام ہم وہیں بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہاں اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ اگرچہ یہودیہ و نصرانیہ عورت سے مسلمان کا نکاح درست ہے لیکن اُن سے بچنا افضل ہے خاص کر اس زمانہ میں جبکہ یہ عورتیں مسلمانوں سے نکاح کرتی ہی اس لئے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے دین پر لے آئیں اور اولاد کو بھی اپنے

دین پر ڈالدیں' اور مسلمانوں کی اندرونی خبریں دشمنانِ اسلام کو پہنچایا کریں' حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اس نزاکت کو بھانپ لیا تھا۔ اور اپنے عہد خلافت میں صحابہؓ کو اس سے روکتے تھے۔ (کمافی کتاب الآثار للامام محمد بن الحسن الشیبانی ص ۸۹)

بہت سے ممالک میں جہاں مسلمان مل جل کر رہتے ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہر مذہب اور مسلک کے لڑکے لڑکیاں یکجا ہو کر کلاسوں میں بیٹھتے ہیں وہاں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں مقامی حکومت کے قانون کے مطابق کورٹ میں جا کر نکاح کر لیتے ہیں' اگر لڑکا مسلمان ہو اور لڑکی کتابی ہو تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے بشرطیکہ ایجاب وقبول گواہوں کے سامنے ہوا ہو اور اگر لڑکی کتابی نہیں ہے۔ ہندو' سکھ' بدھسٹ' آتش پرست ہو تو یہ نکاح ہونے ہی کا نہیں' اور کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی کافر سے نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ کافر یہودی ونصرانی ہو۔ بہت سے فرقے ایسے بھی ہیں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں لیکن وہ اپنے عقائد کی وجہ سے کافر ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جو ختم نبوت کے منکر ہیں اور وہ لوگ جو تحریف قرآن کے قائل ہیں اور وہ لوگ جو اپنے امام کے اندر خدائے پاک کا حلول مانتے ہیں یہ سب لوگ بھی کافر ہیں ان سے کسی مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا اور نہ کسی مسلمان مرد کا اس طرح کی کسی عورت سے نکاح ہو سکتا ہے۔

سبب نزول بیان کرتے ہوئے اسباب النزول (ص ۶۶) میں لکھا ہے کہ ابو مرثد غنوی صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عناق نامی عورت سے نکاح کرنے کی اجازت چاہی' یہ عورت قریشیہ تھی اور حسن وجمال میں بڑھ کر تھی لیکن وہ مشرکہ تھی اور ابو مرثد مسلمان تھے' ابو مرثد نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ میرے دل کو بھاتی ہے' اس پر آیت وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ نازل ہوئی اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی ایک سیاہ فام باندی تھی انہوں نے غصہ میں اس کو ایک طمانچہ مار دیا پھر گھبرائے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سنایا' آپ نے فرمایا اے عبداللہ وہ کیسی عورت ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ روزہ رکھتی ہے نماز پڑھتی ہے۔ اور اچھی طرح وضو کرتی ہے اور اللہ کی توحید کی اور آپکی رسالت کی گواہی دیتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبداللہ وہ مومنہ ہے' انہوں نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپکو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں ضرور اُس کو آزاد کر دوں گا اور اس سے نکاح کر لوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا' اس پر بعض مسلمانوں نے ان پر طعن کیا اور کہا کہ اس نے باندی سے نکاح کر لیا۔ جو لوگ چاہتے تھے کہ مشرکین سے مناکحت ہوتی رہے (کیونکہ ان لوگوں میں کچھ مال وجمال نظر آتا تھا) انکی تردید میں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آیت وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ نازل فرمائی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ ۙ

اور وہ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں' آپ فرما دیجئے کہ وہ گندگی ہے' سو تم علیحدہ رہو عورتوں سے حیض کے زمانہ میں'

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ

اور ان کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں' پھر وہ جب پاک ہو جائیں تو انکے پاس آؤ جس جگہ سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے'

اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

بے شک اللہ پسند فرماتا ہے خوب توبہ کرنے والوں کو اور پسند فرماتا ہے خوب پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو

حیض والی عورت سے متعلقہ احکام

تفسیر: اللہ جل شانہٗ نے نوعِ انسانی کو بڑھانے اور باقی رکھنے کے لئے مرد عورت کے درمیان خاص تعلق رکھا ہے اور شرعی قانون کے مطابق نکاح ہو جانے سے قواعد اور اُصول کے مطابق آپس میں ایک دوسرے سے میل ملاپ رکھنے اور قریب تر ہونے کی اجازت دی ہے۔ اور طبعی طور پر مرد عورت میں شہوت رکھی ہے وہ اس شہوت کے تقاضے پر عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہی شہوت اولاد پیدا ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اولاد پیدا ہونے کے لئے شہوت رکھدی اور پھر اسکی پرورش کروانے کے لئے محبت رکھ دی جسے مامتا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور تکوینی طور پر عورتوں کے لئے یہ تجویز فرما دیا کہ ان کے رحم سے خون جاری ہوا کرے یہ خون عموماً بالغ عورتوں کو ہر مہینہ جاری ہوتا ہے۔ اسے حیض اور محیض کہا جاتا ہے، شریعت مطہرہ میں اس کے بھی احکام ہیں ان میں سے ایک حکم یہ ہے کہ وہ ان ایام میں نہ روزہ رکھیں نہ نماز پڑھیں (اور ایامِ حیض گزر جانے کے بعد نمازوں کی قضاء بھی واجب نہیں، البتہ رمضان میں حیض آیا تو پاک ہونے کے بعد ان روزوں کی قضا رکھنا واجب ہے) زمانہ حیض میں مسجد میں داخل ہونا کعبہ شریف کا طواف کرنا، قرآن شریف پڑھنا، اور قرآن شریف چھونا بھی ممنوع ہے۔ (ہاں اگر ایسے غلاف کے ساتھ چھوئے جو قرآن شریف سے الگ ہوتا رہتا ہے تو چھو سکتی ہے)۔

جو احکام حیض سے متعلق ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ ان ایام میں عورت کا شوہر اس سے جماع نہ کرے، حیض کے زمانہ میں جماع کرنا حرام ہے۔ جس کو فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ میں بیان فرمایا ہے، حیض والی عورت کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا سب جائز ہے، اور ناف سے لے کر گھٹنوں تک کے حصہ کو چھوڑ کر شوہر اس سے بوس و کنار کے ذریعہ استمتاع بھی کر سکتا ہے، بہت سی قوموں میں یہ جو رواج ہے کہ حیض کے زمانہ میں عورت اچھوت بنا کر ڈال دی جاتی ہے، شریعت اسلامیہ میں ایسا نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ وہ حیض کے زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کے مبارک سر میں کنگھی کر دیا کرتی تھیں اور انہوں نے یہ بھی بیان فرمایا کہ میرے حیض کے زمانہ میں رسول اللہ ﷺ میری گود میں تکیہ لگا کر قرآن شریف تلاوت فرما لیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ میرے حیض کے زمانہ میں رسول اللہ ﷺ حکم فرماتے تھے کہ تہبند باندھ لو پھر میرے ساتھ لیٹ جاتے تھے۔ (صحیح بخاری ص ۴۳، ۴۴ ج ۱)

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ زمانہ حیض میں پانی پی کر میں نبی اکرم ﷺ کو برتن دے دیتی تھی آپ میرے منہ کی جگہ منہ لگا کر پانی پی لیتے تھے اور میں اپنے دانتوں سے ہڈی کا گوشت چھڑا کر کھا لیتی تھی پھر آپ کو دے دیتی تھی تو آپ ﷺ میرے منہ کی جگہ منہ لگا کر تناول فرما لیتے تھے۔ (صحیح مسلم ص ۱۴۳ ج ۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب عورت کو حیض آ جاتا تھا تو اس کے ساتھ نہ تو کھاتے پیتے تھے اور نہ گھروں میں ان کے ساتھ رہتے سہتے تھے حضراتِ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم کیا کریں تو اس پر اللہ جل شانہٗ نے آیت کریمہ وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ (آخر تک) نازل فرمائی، آیت نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جماع کرنے کے سوا سب کچھ کرو (اس میں ساتھ کھانے پینے، رہنے سہنے اُٹھنے بیٹھنے لیٹنے کی اجازت ہوگئی) یہودیوں کو جو اس بات کی اطلاع ہوئی تو کہنے لگے کہ یہ شخص ہر

چیز میں ہماری مخالفت کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں اُن کی یہ بات سن کر (دو صحابی) اُسید بن حضیر اور عباد بن بشیر حاضر خدمت ہوئے اور اُنہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہودی ایسا ایسا کہتے ہیں تو کیا ہم ایسا نہ کریں کہ حیض والی عورتوں کے ساتھ رہنا چھوڑ دیں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور متغیر ہو گیا۔ (ص ۱۴۳ ج ۱)

ان روایات حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ میں جماع کرنے کی ممانعت ہے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کی ممانعت نہیں ہے یہ جو فرمایا: فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ (پس جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ جس جگہ سے اللہ نے حکم دیا ہے)۔

یعنی عورتوں سے جماع کرنے کے لئے سامنے کے راستہ سے آؤ جو رحم کا راستہ ہے۔ اس میں اس بات کی ممانعت فرمائی کہ کوئی مرد اپنی بیوی سے پیچھے کے راستہ سے شہوت پوری کرے اس بارے میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان شاء اللہ ابھی بیان ہوں گی۔

پھر فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ (کہ بلاشبہ اللہ پسند فرماتا ہے خوب زیادہ توبہ کرنے والوں کو) اس میں باطنی پاکیزگی اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے یعنی گناہوں سے پاک ہونے کا طریقہ بتایا ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ اللہ پاک کے حضور میں توبہ کرنے اور گناہوں کے سوا دوسری تمام گندی چیزوں سے بچنے کی تعلیم اور ترغیب کے لئے۔ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ (اور پسند فرماتا ہے خوب زیادہ پاکی اختیار کرنے والوں کو) فرمایا اس میں ہر قسم کی ظاہری گندگیوں سے بچنے والوں کی مدح فرمائی ہے۔ جسم یا کپڑوں میں ناپاکی کا لگا رہنا، حالت حیض میں جماع کرنا، گندی جگہ پر شہوت پوری کرنا ان سب چیزوں کی بُرائی اور ممانعت اس میں آ گئی۔

نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں، سو تم اپنی کھیتی میں آ جاؤ جس طرف سے ہو کر چاہو اور تم اپنی جانوں کے لئے آگے بھیج دو، اور

اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُّلٰقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۲۳﴾

اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بلاشبہ تم اُس سے ملاقات کرنے والے ہو اور مومنین کو خوشخبری سنا دو

وطی فی الدبر کی حرمت اور یہود کی ایک بات کی تردید

تفسیر: صحیح بخاری (ص ۶۴۹ ج ۲) میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہودی یوں کہتے تھے کہ جو کوئی مرد عورت کے سامنے کی شرم گاہ میں پیچھے کی جانب سے جماع کرے تو بچہ بھینگا پیدا ہو گا۔ ان کے اس خیال کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی، اور فرمایا کہ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ لہٰذا تم اپنی کھیتی میں آ جاؤ جیسے چاہو۔ اس میں اول تو عورتوں کو کھیتی فرمایا اور مرد عورت کے میل ملاپ کی ضرورت اور فائدہ کو واضح طور پر بیان فرمایا کہ اسکی ضرورت اور مشروعیت اولاد طلب کرنے کے لئے ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ (کے رکوع ۲۲) میں وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ فرمایا ہے۔ نکاح کرنے میں جہاں نفس و نظر کی حفاظت ہے۔ وہاں طلب ولد بھی مطلوب ہے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسی عورت سے نکاح کرو جو محبت رکھنے والی ہو اور اس سے اولاد زیادہ پیدا ہونے والی ہو (جس کا اندازہ خاندانی عورتوں کے احوال سے ہو جاتا ہے)

کیونکہ میں (قیامت کے دن) تمہاری کثرت پر فخر کرونگا۔ (سنن ابوداؤد ص ۲۸۰ ج ۱)

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اولاد کی پیدائش پر کوئی پابندی لگانا یا اولاد کی کثرت کے خلاف منصوبے بنانا شریعت اسلامیہ کے مقصد اور مزاج کے خلاف ہے۔

پھر یہ فرمایا کہ تم اپنی کھیتیوں میں آجاؤ جس طرف سے ہو کر چاہو آجاؤ اس میں یہ بتا دیا کہ عورت کے پاس مرد کے آنے کا راستہ صرف ایک ہی ہے، یعنی وہ راستہ جسے اختیار کرنے سے اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اس میں اس بات کی بھی ممانعت فرمائی کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے پیچھے کے راستہ سے شہوت پوری کرے۔ کیونکہ وہ راستہ کھیتی کا نہیں ہے بلکہ اسکی گندگی حیض والی گندگی سے زیادہ ہے پہلے تو فرمایا فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ۔ پھر فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ پھر فرمایا فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ اس میں ایک ہی سیاق میں تین اسلوب اختیار فرما کر عورت کے پیچھے والے راستہ سے شہوت پوری کرنے کی ممانعت فرما دی بعض اکابر نے فرمایا کہ غالباً صریح الفاظ میں اس کا ذکر نہ فرمانا اس لئے ہے کہ صراحۃً ایسے خبیث و بدترین فعل کا تذکرہ بصورت نفی یا بصورت نہی بھی گوارہ نہیں فرمایا گیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے کسی حیض والی عورت سے شہوت پوری کی یا کسی عورت کے پیچھے والے راستہ میں شہوت والا کام کیا' یا کسی ایسے شخص کے پاس آیا جو غیب کی خبریں بتاتا ہو تو وہ اس دین کا منکر ہو گیا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا گیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۶)

تفسیر درمنثور (ص ۲۶۴ ج ۱) میں بحوالہ ابوداؤد والنسائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جس شخص نے کسی مرد یا کسی عورت کے پیچھے والے راستہ میں شہوت کا کام کیا وہ ملعون ہے اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ کوئی شخص اپنی بیوی کے پیچھے والے راستہ میں شہوت کا کام کرے اسکے بارے میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا ایسا کام کافر ہی کر سکتا ہے (درمنثور) معلوم ہوا اغلام کرنا اپنی بیوی کے ساتھ بھی حرام ہے' اور اہل کفر کا طریقہ ہے۔ أعاذ الله منه كل مؤمن.

یہ جو فرمایا: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (کہ تم اپنی کھیتی میں آؤ جیسا چاہو) اس کا مطلب یہ ہے کہ کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے' سامنے سے پیچھے سے اپنی بیویوں سے لذت حاصل کرو' بشرطیکہ کھیتی کی جگہ پر آؤ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت جو نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ (آخر تک) نازل ہوئی ہے۔ اس میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ عورتوں سے جو خاص تعلق ہے اس کے لئے آگے سے آؤ یا پیچھے سے آؤ (دونوں طرح اختیار ہے) اور دبر میں (یعنی پیچھے کے راستہ میں) اور حیض کے زمانہ میں جماع کرنے کی ممانعت فرمائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسکی طرف (رحمت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا جس نے کسی مرد یا عورت کے پیچھے والے راستہ میں شہوت کا کام کیا۔ (رواہ الترمذی)

پھر فرمایا: وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (کہ اپنی جانوں کے لئے خیر آگے بھیج دو اور اللہ سے ڈرو) اس میں ہر خیر کا حکم آ گیا اور ہر شر سے بچنے کی تاکید آ گئی وَاتَّقُوا اللّٰهَ کے عموم میں تمام گناہوں کے چھوڑنے کا حکم فرما دیا۔ چھوٹے

ہوں یا بڑے پھر تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ بتا دیا اور فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (کہ تم جان لو کہ بے شک تم اللہ سے ملاقات کرنے والے ہو) جو شخص یوم القیامہ کی حاضری اور خداوند قدوس کی بارگاہ میں پیشی کا یقین رکھے گا اور بار بار اس کا استحضار کرے گا۔ اُسے ان شاء اللہ تعالیٰ صفتِ تقویٰ حاصل ہوگی۔

آخر میں فرمایا: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (کہ مؤمن بندوں کو کامیابیوں کی اور نعمتوں کی بشارت دے دیجئے)

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ

اور اپنی قسموں کے ذریعہ نیکی کرنے اور تقویٰ اختیار کرنے اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے کے لئے اللہ کو

النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

آڑ نہ بناؤ اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے

اپنی قسموں کو نیکی اور تقویٰ سے بچنے کا ذریعہ نہ بناؤ

تفسیر: اسباب النزول میں ہے کہ یہ آیت شریفہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی' انکے بہنوئی اور بہن کے درمیان کچھ ناراضگی ہوگئی تھی انہوں نے قسم کھائی کہ اس کے پاس کبھی بھی نہیں جائیں گے اور نہ اس سے بات کریں گے اور نہ میاں بیوی کے درمیان صلح کرائیں گے وہ کہتے تھے کہ میں نے تو قسم کھا رکھی ہے۔ اب میں اسکی خلاف ورزی کیسے کروں۔ اس پر اللہ جل شانہٗ نے آیت بالا نازل فرمائی۔

تفسیر در منثور (ص ۲۶۸ ج ۱) میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بعض مرتبہ کوئی شخص قسم کھا لیتا تھا کہ فلاں نیکی اور تقویٰ کا کام نہیں کروں گا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا۔

اگر کوئی شخص قسم کھائے تو خیر کی قسم کھائے یعنی نیکی کے ارادہ کو مؤکد کرنے کے لئے قسم کھائی جا سکتی ہے لیکن نیکی نہ کرنے پر قسم کھانا اور گناہ کرنے پر قسم کھانا شرعاً ممنوع ہے بعض لوگ جو قسم کھا لیتے ہیں کہ میں فلاں عزیز کے گھر نہیں جاؤں گا یا فلاں مسلمان بھائی کی دعوت قبول نہیں کروں گا یا جماعت سے نماز نہیں پڑھوں گا یا فلاں گناہ کروں گا۔ ایسے لوگوں کو آیت بالا میں ہدایت دی گئی ہے اور فرمایا کہ اللہ کے نام کو نیکیوں سے بچنے اور تقویٰ چھوڑنے کا ذریعہ مت بناؤ' قسم کھا بیٹھے اب کہتے ہیں کہ قسم کے خلاف کیسے کریں؟ حالانکہ قسم اس لئے نہیں ہے کہ اس کو خیر سے بچنے کا ذریعہ بنایا جائے' اگر کوئی شخص گناہ کی قسم کھالے تو اس کا توڑنا واجب ہے۔

قطع رحمی کی یا کسی بھی قسم کے گناہ کی قسم کھالے تو اس پر لازم ہے کہ قسم توڑ دے اور اس کے خلاف کرلے اور قسم کا کفارہ دیدے۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے چچا کے بیٹے کے پاس جاتا ہوں اس سے کچھ سوال کرتا ہوں سو وہ مجھے نہیں دیتا اور صلہ رحمی نہیں کرتا' پھر اسے حاجت درپیش ہو جاتی ہے تو مجھ سے آ کر سوال کرنے لگتا ہے حالانکہ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ اسے کچھ نہ دوں گا اور صلہ رحمی نہیں کرونگا' اس کے بارے میں آپکا کیا ارشاد ہے آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں وہ کام کروں جو خیر ہو اور قسم کا کفارہ دیدوں۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

سورہ نور میں ارشاد فرمایا: وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ (اور جو لوگ تم میں بزرگی اور وسعت والے ہیں وہ اہل قرابت کو اور مساکین کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنیوالوں کو دینے سے قسم نہ کھا بیٹھیں اور چاہئے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ بات نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف کر دے۔ بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ایک بھانجہ پر خرچ کیا کرتے تھے اس سے ایک ایسی حرکت سرزد ہو گئی جس کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بہت ناراضگی ہوئی اور انہوں نے قسم کھالی کہ میں اب اس پر خرچ نہیں کیا کروں گا' اس پر سورہ نور کی مذکورہ آیت بالا نازل ہوئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تو کوئی قسم کھالے پھر تو دیکھے کہ جس چیز پر قسم کھائی ہے دوسری چیز اس سے بہتر ہے (جو اس کے مقابل ہے) تو اس بہتر صورت کو اختیار کرلے (اور اس کے اختیار کرنے سے جو قسم ٹوٹ گئی) اس کا کفارہ دیدے۔ (رواہ البخاری و مسلم کما فی المشکوٰۃ)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ

اللہ تعالیٰ تمہارا مؤاخذہ نہیں فرمائے گا تمہاری لغو قسموں کے بارے میں لیکن مؤاخذہ اُس بات پر فرمائے گا جس کا تمہارے

قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۲۲۵﴾

دلوں نے ارادہ کیا اور اللہ غفور ہے حلیم ہے

قسموں کی قِسموں کا بیان اور ان کے احکام

تفسیر: جو قسم کھائی جائے اسکی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ گزشتہ کسی فعل پر جھوٹی قسم کھائی جائے' جو کام نہیں کیا تھا اس کے بارے میں قسم کھالے کہ میں نے کیا' یا جو کام کیا تھا اس کے بارے میں قسم کھالی کہ یہ میں نے نہیں کیا' اس کو یمین غموس کہا جاتا ہے۔ اس کا بہت بڑا گناہ ہے' صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بڑے گناہ یہ ہیں' اللہ کے ساتھ شرک کرنا' والدین کی نافرمانی کرنا' کسی جان کو قتل کرنا اور یمین غموس (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۷)

یہ لفظ غمس سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو پوری طرح کسی دوسری چیز میں داخل کر دیا جائے۔ علماء نے لکھا ہے کہ جھوٹی قسم کو یمین غموس اس لئے کہا گیا کہ یہ اولاً گناہ میں پھر دوزخ میں داخل کر دیتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آئندہ کسی کام کے بارے میں قسم کھائے' مثلاً یوں کہے کہ اللہ کی قسم یہ کام ضرور کروں گا' یا اللہ کی قسم فلاں کام نہیں کروں گا' اسکو یمین منعقدہ کہا جاتا ہے۔ اسکی خلاف ورزی کرنے پر کفارہ واجب ہوتا ہے۔ جو سورۂ مائدہ کے رکوع نمبر ۱۲ میں مذکور ہے کفارۂ قسم کی تفصیلات ان شاء اللہ تعالیٰ وہیں بیان ہونگی۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی گزشتہ کام پر قسم کھالی اور یہ سمجھ کر قسم کھائی کہ سچ بول رہا ہوں سچی قسم کھا رہا ہوں۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہ تھا جیسا اس نے سمجھا تھا اپنے خیال میں اس نے سچی قسم کھائی لیکن اصل واقعہ اس کے خلاف تھا۔ اس قسم کا نام یمین لغو ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس پر مؤاخذہ نہیں فرمائے گا' یمین لغو کی دوسری تفسیر حضرت عائشہؓ سے یوں منقول ہے

کہ باتوں باتوں میں قسم کی نیت کے بغیر جو زبان سے لا واللہ اور بلی واللہ نکل جاتا ہے۔ یہ یمین لغو ہے (رواہ البخاری ص ۹۸۶ ج ۲)

یمین لغو میں کیونکہ ارادہ نہیں ہوتا اس لئے اس پر مؤاخذہ نہیں ہے۔ آیت کے ختم پر فرمایا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے جو یمین لغو پر مؤاخذہ نہیں فرمائے گا۔ اور بُردبار بھی ہے سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے کے بارے میں قسم کھا لیتے ہیں' ان کے لئے چار مہینہ کا انتظار ہے پھر اگر رجوع کر لیں تو اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے

بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کا بیان

تفسیر: جو کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ میں اپنی بیوی سے جماع نہیں کروں گا۔ اس کے لئے شریعت میں کچھ احکام ہیں۔ اگر قسم کھا کر یوں کہا کہ اپنی بیوی سے جماع نہیں کروں گا لیکن کوئی مدت مقرر نہیں کی' یا یوں کہا کہ چار ماہ تک اس سے جماع نہیں کروں گا یا چار ماہ سے زیادہ کا ذکر کر دیا (جس میں ہمیشہ کے لئے قسم کھانا بھی شامل ہے) یا چار مہینے سے کم مدت مقرر کر دی۔ تو ان سب صورتوں میں پہلی تین صورتوں کو ایلاء کہا جاتا ہے۔ ان تینوں صورتوں میں اگر چار مہینے گزر گئے اور اس نے قسم نہیں توڑی یعنی اس مدت میں بیوی سے جماع نہیں کیا تو اس سے ایک بائن طلاق واقع ہو جائے گی۔ جس کا حکم یہ ہے کہ اب بلا نکاح ثانی کے رجوع نہیں ہو سکتا۔ آپس کی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ اور مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں اگر چار ماہ کے اندر اس بیوی سے جماع کر لیا جس سے ایلاء کیا تھا تو قسم ٹوٹ گئی۔ اور اس صورت میں بیوی تو نکاح سے نہیں نکلی لیکن قسم ٹوٹ جانے کی وجہ سے قسم توڑنے کا کفارہ واجب ہو گا جو سورۂ مائدہ میں مذکور ہے۔ اب رہ گئی چوتھی صورت جس میں چار مہینہ سے کم کی مدت مقرر کر کے بیوی سے جماع نہ کرنے کی قسم کھائی تھی اس میں اگر مدت مقررہ کے اندر جماع کر لیا تو قسم توڑنے کا کفارہ واجب ہو گیا اور بیوی نکاح سے نہیں نکلے گی' اور اگر مدت مقرر پوری کر لی تو قسم پوری ہو گئی جس کا کوئی کفارہ نہیں اور نکاح بھی اپنی حالت میں باقی رہا۔ قسم کھانے کے بعد رجوع کرنے کو فَيْئی کہتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ لفظ بھی رجوع کے معنی میں آتا ہے۔

فائدہ اولیٰ: ایلاء کی صورت میں حکم ایلاء اسی وقت ختم ہو گا۔ جبکہ چار مہینہ کے اندر جماع کر لے' یہ رجوع بالعمل ہے لیکن اگر کوئی ایسی مجبوری ہو کہ جماع نہیں کر سکتا مثلاً عورت مریض ہے جماع کے قابل نہیں یا کم عمر ہے تو اس صورت میں رجوع بالقول بھی ہو سکتا ہے' وہ یہ کہ مدت ایلاء میں زبان سے کہہ دے فِئْتُ اِلَيْهَا۔ (یعنی میں نے اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لیا) لیکن گر مدت ایلاء کے اندر پھر جماع پر قادر ہو گیا تو یہ رجوع باللسان باطل ہو جائے گا۔ اور اب لازم ہو گا کہ رجوع بالعمل کرے' یعنی جماع کر لے' اگر جماع نہ کیا اور چار مہینے گزر گئے تو حسب قانون طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔

فائدہ ثانیہ: اگر یوں قسم کھائی تھی کہ کبھی بھی اس سے جماع نہیں کروں گا اور چار مہینہ تک جماع نہیں کیا تو ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور قسم باقی رہے گی' جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اگر پھر اس سے نکاح کر لیا تو قسم باقی رہنے کی وجہ سے ایلاء کا

حکم نافذ ہوگا۔ اگر اس دوسرے نکاح کے بعد چار مہینے کے اندر جماع کر لیا تو قسم ٹوٹ گئی جس کا کفارہ واجب ہوگا اور بیوی پر طلاق واقع نہ ہوگی لیکن اگر نکاح ثانی کی ابتداء سے لے کر چار ماہ پورے ہوجانے تک جماع نہ کیا تو پھر طلاق بائن واقع ہو جائے گی پھر اگر تیسرے نکاح کے بعد سے لے کر چار ماہ گزر جانے تک جماع نہیں کیا تو تیسری طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر اس مدت کے اندر جماع کر لیا تو طلاق واقع نہ ہوگی لیکن قسم ٹوٹ جائے گی اس کا کفارہ دینا ہوگا (من الھدایہ)

فائدہ ثالثہ: یہ چار ماہ جن کا بار بار ذکر ہوا چاند کے حساب سے معتبر ہونگے۔ اس میں شمسی مہینوں کا اعتبار نہیں کیا جائیگا۔

اسباب النزول میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اہل جاہلیت کا ایلاء سال دو سال اور اس سے زیادہ بھی جاری رہتا تھا۔ اللہ جل شانہٗ نے چار مہینہ کی معیاد مقرر فرمائی لہٰذا چار مہینے سے کم پر جو قسم کھائے گا تو وہ ایلاء نہ ہو گا (اگرچہ خلاف ورزی کرنے پر قسم کا کفارہ دینا لازم ہوگا) اور چار ماہ یا اس سے زیادہ کی قسم کھانے پر چار مہینے تک فئی نہ کرے گا تو طلاق واقع ہوجائے گی۔ (مطلق قسم چونکہ چار ماہ کو بھی شامل ہے اس لئے وہ بھی ایلاء ہوگی)۔

حضرت سعید بن المسیبؒ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں نے عورتوں کو تکلیف پہنچانے کے لئے ایلاء کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ جو شخص اپنی بیوی کو نہیں چاہتا تھا اور ساتھ یہ بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ کس دوسرے شخص سے نکاح کرے تو یہ قسم کھا لیتا تھا کہ کبھی بھی اس کے پاس نہیں جائے گا پھر اسکو اسی حال پر چھوڑے رکھتا تھا اور عورت کی زندگی اس طرح گزرتی تھی اور نہ وہ شوہر والی ہے اور نہ بے شوہر والی ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے ایلاء کی ایک مدت مقرر فرما دی اور آیت شریفہ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ (آخر تک) نازل فرما دی۔ (معالم التنزیل)

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا

اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنی جانوں کو روکے رکھیں تین حیض آنے تک، اور ان کے لئے یہ بات حلال نہیں ہے کہ جو کچھ

خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ

اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا فرمایا ہے اسے چھپائیں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور یوم آخرت پر، اور اُن کے شوہر

اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪

ان کے لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں اس مدت کے اندر اگر اصلاح کا ارادہ کریں، اور عورتوں کے لئے اس جیسا حق ہے جو ان کے اُوپر ہے اچھے طریقہ پر،

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں درجہ بڑھا ہوا ہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے

مطلقہ عورتوں کی عدت کا بیان

تفسیر: مرد عورت آپس میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں اس حاجت کے انتظام کے لئے اللہ تعالیٰ نے نکاح کا قانون مشروع فرمایا ہے۔ اور نکاح اس لئے ہے کہ دونوں اطمینان اور سکون کے ساتھ اچھی زندگی گزاریں اور مل جل کر حسن سلوک کے

ساتھ رہیں اور زندگی بھر نباہنے کی کوشش کریں آپس میں کوئی ناگواری کی بات ہو جائے تو اس سے درگزر کرتے رہیں لیکن کبھی ایسے حالات بن جاتے ہیں کہ ساتھ رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف سے یا دونوں طرف سے طبیعت کا جوڑ نہیں کھاتا اور باہمی میل جول کی خوبصورتی کے ساتھ کوئی صورت نہیں بنتی تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے طلاق اور خلع کا قانون مشروع فرما دیا۔ بہت سی قوموں میں نکاح تو ہے لیکن طلاق نہیں ہے۔ یہ لوگ پہلے اسلام پر اعتراض کیا کرتے تھے لیکن جب حالات نے مجبور کیا خود طلاق کا قانون بنا کر اپنے دین میں داخل کر رہے ہیں۔ چونکہ ان کا دین اپنا ہی بنایا ہوا ہے اس لئے اس میں کمی بیشی بھی کرتے رہتے ہیں۔

ہر چند کہ اسلام میں یہاں بیوی کا آپس میں نباہ بہت زیادہ محبوب و مرغوب ہے لیکن اس قدر مجبور بھی نہیں کیا کہ باہمی ساتھ رہنے میں اچھے طریقہ پر زندگی نہ گزار سکیں تو خواہ مخواہ بددلی کے ساتھ نباہتے رہیں اور ایک دوسرے کیلئے سوہان روح بنے رہیں۔

اسلام میں جو طلاق کا قانون ہے اس کے کچھ احکام بھی ہیں۔ ان احکام میں ایک یہ بھی ہے کہ عورت طلاق کے بعد کچھ ایسی مدت گزارے گی۔ جس میں کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکے گی۔ اس مدت کے گزرنے کو عدت کہتے ہیں' عدت لغت میں شمار کرنے کے معنی میں آتا ہے' چونکہ عورت کو یہ مدت گزارنے کے لئے مہینے یا حیض شمار کرنے پڑتے ہیں اس لئے اسکو عدت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے' عدت کے بعض احکام یہاں آیت بالا میں مذکور ہیں اور بعض احکام سورۂ طلاق کے پہلے رکوع میں ذکر فرمائے ہیں۔ جس عورت کو اس کا شوہر طلاق دیدے تو دیکھا جائے گا کہ اس کو حمل ہے یا نہیں' اگر اس کو حمل ہے تو اسکی عدت وضع حمل یعنی ولادت ہو جانے پر ختم ہو جائے گی' سُورۂ الطلاق میں فرمایا ہے: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔ (اور حمل والی عورتوں کا اجل یعنی ختم عدت یہ ہے کہ وضع حمل ہو جائے)۔

اور مطلقہ اگر حمل والی عورت نہیں ہے نابالغ ہے یا بالغ تو ہے لیکن اسے اب تک حیض آیا ہی نہیں یا وہ کبھی حیض والی تھی بوڑھی ہو چکی ہے اور حیض آنے سے نا اُمید ہو چکی ہے تو ان تینوں قسم کی عورتوں کی عدت طلاق یہ ہے کہ تین ماہ گزار دیں' اسکو سورہ طلاق میں یوں ارشاد فرمایا ہے۔ وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ۔ (اور عورتیں حیض آنے سے نا اُمید ہو چکی ہیں تمہاری عورتوں میں سے اگر تم شک میں پڑو تو انکی عدت تین ماہ ہے اور جن کو حیض نہیں آیا انکی عدت بھی یہی ہے)۔

اب ان عورتوں کا حکم جاننا چاہئے جو حمل والی نہیں ہیں اور ان کو حیض آتا ہے اور ایسی عورتوں کو طلاق ہو جائے تو انکی عدت یہ ہے کہ طلاق کے بعد تین حیض گزاریں۔ جب شرعی اصول کے مطابق تین حیض گزر جائیں گے تو عدت پوری ہو جائے گی۔ خواہ کتنے ہی مہینے میں تین حیض آئیں' آیت بالا میں اُنہیں عورتوں کی عدت بیان فرمائی ہے جن کو حیض آتا ہے۔ زمانہ حیض میں طلاق دینا ممنوع ہے جب کسی شخص نے طہر میں یعنی ایسے زمانہ میں طلاق دی جو پاکی کا زمانہ ہے حیض کا زمانہ نہیں تو یہ عورت ایک حیض گزارے پھر ایک طہر گزارے پھر ایک حیض گزارے پھر ایک طہر گزارے پھر ایک حیض گزارے۔ جب تیسرا حیض ختم ہو جائے تو عدت تمام ہو جائے گی۔

ابھی بیان کیا گیا کہ جس عورت کو حمل ہو اسکی عدت وضع حمل تک ہے۔ حمل اور حیض یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق خود عورت کی ذات سے ہے وہ جانتی ہے کہ مجھے حیض ہے یا حمل ہے۔ یا دونوں میں سے کچھ بھی نہیں' اب یہاں عورت کی دیانت پر مسئلہ موقوف ہو جاتا ہے۔ عورت سمجھتی ہے کہ وضع حمل میں تو کئی مہینے لگیں گے لہٰذا میں یوں بیان کر دوں

کہ مجھے حمل نہیں ہے اور حیض والی بھی نہیں ہوں۔ اس طرح عدت مہینوں پر آجائے گی اور تین ماہ گزر جانے پر میرے بارے میں عدت گزر جانے کا فیصلہ کر دیا جائے گا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مہینوں میں طہر کا زمانہ لمبا ہو گیا کئی ماہ سے حیض نہیں آرہا لیکن عدت کا فیصلہ جلد ہو جانے کی وجہ سے دو تین ماہ میں کہہ دیتی ہے کہ مجھے تین حیض آچکے ہیں حالانکہ ابھی تین حیض نہیں آئے اس طرح کی غلط بیانی کرنا حرام ہے' اس بات کو ان الفاظ میں بیان فرمایا: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (اور ان کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا فرمایا ہے اسے چھپائیں اگر اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں)۔

جب کوئی شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور آخرت کے دن کی پیشی کا اعتقاد رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ کوئی نہیں جانتا تو اللہ تو جانتا ہے ایسا شخص امانت و دیانت کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے پھر وہ جھوٹ نہیں بول سکتا اور غلط بیانی نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا: وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (اور انکے شوہر انکے لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں۔ اس مُدت کے اندر اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں)

اس میں طلاق رجعی سے متعلق ایک مسئلہ بیان فرمایا ہے جب کوئی شخص اپنی بیوی کو صاف صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دیدے تو یہ طلاق رجعی ہوتی ہے جس کا حکم یہ ہے کہ عدت کے اندر اندر نکاح ثانی کے بغیر شوہر رجوع کر سکتا ہے۔ اگر عدت گزر جائے تو یہ طلاق رجعی بائن ہو جاتی ہے جس کے بعد رجوع کا حق نہیں رہتا۔

یہ اس صورت میں ہے کہ جب نکاح کے بعد جماع بھی ہوا ہو' اگر نکاح ہوا ہو اور اس کے بعد جماع نہ ہوا اور طلاق دیدے تو یہ طلاق رجعی نہیں بلکہ طلاق بائن ہو گی۔ طلاق رجعی جس کے بعد شوہر کو رجوع کا حق ہے اس طلاق کے بعد عدت کے اندر شوہر رجوع کرنا چاہے تو عورت کے رشتہ دار یا کوئی بھی شخص بلکہ خود عورت بھی اس کو بُرا نہ مانے اور کوئی شخص ایسی صورت حال پیدا نہ کر دے جس سے کہ وہ رجوع کے ارادے کو موقوف کر دے' بلکہ جوڑ لگانے کی اور تعلق استوار ہو جانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ شوہر اگر رجوع کر لے تو عورت اور عورت کے رشتہ داروں کی مرضی کے بغیر رجوع تو ہو ہی جائے گا' لیکن سب کی خوشی اور رضا مندی سے ہو اور آپس کے تعاون کے ساتھ ہو تو زیادہ مستحسن اور مُبارک ہو گا۔

جس طرح عورت اور اس کے رشتہ داروں کو چاہئے کہ رجوع کی فضا بن جائے تو اس میں آڑے نہ آئیں اور ایسی باتیں نہ کریں جن سے شوہر کا دل کھٹا ہو جائے۔ اسی طرح سے شوہر کو بھی لازم ہے کہ اصلاح کی نیت سے رجوع کرے' اس کو اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا میں بیان فرما دیا ہے۔

شوہر اگر یہ سمجھتا ہے کہ آئندہ میں خوش اسلوبی' اور حسن معاشرت اور حسن اخلاق کے ساتھ نباہ کر سکوں گا تو رجوع کر لے' ضرر دینے کا ارادہ نہ کرے' بہت سے لوگ جہالت کی وجہ سے اور نفس کی بھڑاس نکالنے کے لئے رجوع کر لیتے ہیں اور پھر حسن سلوک سے پیش نہیں آتے بلکہ صاف کہہ دیتے ہیں تو یوں ہی پڑی رہے گی۔ نہ تیرا حق ادا کروں گا۔ نہ نکاح سے خارج کرونگا اور بہت سے ڈب رجوع کر کے پھر طلاق دیتے ہیں جس سے عدت لمبی ہوتی جاتی ہے' یہ بھی ضرر پہنچانے کا ایک پہلو ہے۔ یہ سب طریقے غیر اسلامی ہیں۔ اصلاح مقصود ہو تو رجوع کرے ورنہ عدت گزرنے دے' عدت گزرتے ہی رجعی طلاق بائن ہو جائے گی۔ پھر وہ جہاں چاہے اپنی مرضی سے مناسب جگہ نکاح کر لے گی' جب نباہ کرنا نہیں ہے تو

رجوع کر کے تکلیف دینا سمجھداری اور دینداری کی بات نہیں ہے۔ بلکہ ظلم ہے۔

اسلام میں عورت کی حیثیت:

پھر فرمایا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (اور عورتوں کے لئے اس جیسا حق ہے جوان کے اُوپر ہے اچھے طریقہ پر) اس میں یہ بتایا ہے کہ صرف یہی بات نہیں ہے کہ مردوں ہی کے حقوق عورتوں پر ہیں بلکہ جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں اسی طرح مردوں پر بھی عورتوں کے حقوق ہیں۔ عورت کو خدمت گزار سمجھنا اور اس کے حقوق اور حاجات کا دھیان نہ رکھنا' شریعت اسلامیہ کے سراسر خلاف ہے۔

زمانۂ اسلام سے پہلے دنیا کی اقوام میں عورت کی بہت بُری گت بنائی جاتی تھی اب باوجودیکہ زمانہ کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ پھر بھی اسلام کے علاوہ کسی دین یا قانون میں عورت کو وہ مقام حاصل نہیں جو شریعت اسلامیہ نے اس کو دیا ہے۔ ہندوستان کے مشرکین میں تو یہ دستور تھا کہ مرد مر جاتا تھا تو عورت کو اس کے ساتھ زندہ جلنا پڑتا تھا اور عورتوں کا میراث میں کسی بھی مذہب اور قانون میں حصہ نہیں ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ عورت کی حیثیت ایک استعمال کی چیز سے زیادہ نہ تھی' عورت مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی' عورت کسی چیز کی مالک نہ تھی' جب اس کا شوہر مر جاتا تھا تو شوہر کے خاندان والے ہی اس پر قابض ہو جاتے تھے اور اس کی اجازت کے بغیر جہاں چاہتے جبراً نکاح کر دیتے تھے بلکہ شوہر کی اولاد ہی اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتی تھی' عرب کے جاہل لڑکیوں کو زندہ در گور بھی کر دیتے تھے اور پیدا ہوتے ہی قتل کر دیتے تھے اسلام نے عورت کو صحیح مقام عطا فرمایا جو اسکی شان کے لائق ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ اس کو عورت پنے سے نکال کر مردوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہو اور ایسا بھی نہیں کہ وہ محض ایک استعمال کی چیز بن کر رہ جائے نہ اس کا کوئی حق تسلیم کیا جائے اور نہ اس کی کوئی حیثیت مانی جائے۔

اسلام میں عورت گھر کی ملکہ ہے اپنی اولاد کی محترم اور والدہ ہے اپنے شوہر کی چہیتی بیوی ہے باپ ماں شوہر اور اولاد کے مال کی حسب قوانین وارث ہے اور اپنے مال میں تصرف کرنے کا اسے پورا اختیار ہے جس میں شوہر کو ممانعت کا کوئی حق نہیں ہے بشرطیکہ خلاف شرع کاموں میں خرچ نہ کرے۔ عورت کا ایک طرف میراث میں حصہ ہے دوسری طرف شوہروں پر مہر لازم ہوتا ہے' اور یہ مہر عورتوں کی مرضی سے مقرر ہوتا ہے۔ کمی بیشی کرنا انکا اپنا حق ہے' وہ چاہیں اپنی مرضی سے معاف کریں اور چاہیں تو پورا وصول کریں۔ اسلام نے صلہ رحمی کی بھی تعلیم دی ہے ایک عورت کسی کی والدہ ہے کسی کی بہن ہے۔ کسی کی خالہ ہے کسی کی پھوپھی ہے۔ صلہ رحمی کے اصول پر سب کو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ شوہر بھی حسن معاشرت سے پیش آئے۔ نان نفقہ کا خیال کرے اور اُسکی حاجات پوری کرے۔ اولاد بھی اکرام واحترام پیش آئے۔ اس طرح عورت کی برتری ظاہر ہوگی اور معاشرہ میں اس کا مرتبہ اونچا ہوگا۔ اور عزت واکرام کے ساتھ اس کی زندگی گزرے گی۔

یورپین اقوام میں عورت کی بے آبروئی:

یورپین اقوام نے عورت کو بالکل ہی بے آبرو کر کے چھوڑ دیا ہے۔ ان کے یہاں عورت مرد کی نفسانی خواہش پوری کرنے کا محض ایک آلہ ہے۔ اُن کے معاشرہ میں اس سے زیادہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ میراث میں اُسے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ مہر کا بھی کوئی معاملہ نہیں' بلکہ سرے سے نکاح ہی کو ان کے یہاں عیب سمجھا جاتا ہے۔ دوستانہ طریقہ پر برسوں

زندگی گزارتے ہیں اور نفسانی خواہشات پوری کرتے ہیں۔ بعد میں کبھی رسمی نکاح بھی کر لیتے ہیں۔ اس لئے ان میں اولاد بھی ثابت النسب نہیں ہے۔ اولاد کی ولدیت میں ماؤں کے نام لکھے جاتے ہیں اور عورتوں کے اخراجات کی ذمہ داری عموماً چونکہ کسی پر نہیں ہے اس لئے انہیں اپنی آبرو کھو کر ملازمتیں کرنی پڑتی ہیں راہ گیر کے جوتوں پر پالش کرتی ہیں۔ دوکانوں میں مال فروخت کرنے پر ملازمت کرتی ہیں۔ ننگا لباس پہن کر شوروموں کے پاس کھڑی رہتی ہیں تا کہ گاہک متوجہ ہو اور آنے والوں کا نفس انکی طرف مائل ہو جس سے زیادہ خریداری ہو سکے۔

اس آزادی نسواں کو دیکھ کر بہت سے نام نہاد مسلمان بھی اپنی عورتوں کو یورپین اقوام کے عورتوں کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ عورتیں بازاروں میں کاروبار کریں۔ بے پردہ ہو کر رہیں۔ عورتیں ناقص العقل تو ہیں ہی وہ سمجھتی ہیں کہ ہمیں حق دلائے جارہے ہیں' اور بے پردہ گھومنے اور ننگا لباس پہننے اور دوست تلاش کرنے کی آزادی کو اپنے لئے ہنر اور فخر کی بات سمجھتی ہیں۔ افسوس کہ دور حاضر میں عورت کو یہ گوارا نہیں کہ گھر کی ملکہ بن کر گھر میں بیٹھے' گھر کے سب لوگ اس کا احترام واکرام کریں اسے شوہر سے بھی مال ملے۔ میراث میں بھی حصے ملیں اور نفس ونظر کا تعلق صرف شوہر سے رہے۔ اور اپنے مال میں جیسے چاہے تصرف کرے' وہ شیطانوں اور ملعونوں اور ملحدوں اور زندیقوں سے متاثر ہو کر گھر سے باہر نکلنے اور خود کما کر اپنا خرچ اُٹھانے پر اپنے حقوق کی ادائیگی سمجھتی ہیں۔

یورپ کے رِواجی طریقوں میں جب عورت کا کسی پر کوئی حق ہی نہیں ہے تو کوئی شخص ان کا کیا حق ادا کریگا؟ درحقیقت عورت کی یہ کوئی زندگی نہیں ہے جو مذہب اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور قوانین میں ہے۔ دنیا میں ایسے ممالک بھی ہیں جہاں زنا کی کثرت ہے جو بچے پیدا ہوتے ہیں حکومت ان کی پرورش کرتی ہے۔ نہ کوئی ماں ہے نہ باپ نہ چچا ہے۔ نہ ماموں' خالہ نہ پھوپھی' نہ صلہ رحمی ہے' نہ نکاح ہے نہ مہر ہے۔ اس سے زیادہ انسانیت کی مٹی اور کیا پلید ہوگی' ان لوگوں کی نہ سمجھی کی کہاں تک داد دی جائے جو انسانیت ونسوانیت کا خون کر رہے ہیں اور دعویٰ انکا یہ ہے کہ وہ حقوق انسانی کے محافظ ہیں' اور عورتوں کو ان کے حقوق دلا رہے ہیں۔

مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے

پھر فرمایا: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (اور مردوں کو ان پر فضیلت ہے) اس میں یہ بتایا کہ اگرچہ میاں بیوی کے آپس میں ایک دوسرے پر حق ہیں (اور ہر ایک دوسرے کا حق ادا کرے) لیکن مردوں کو عورتوں پر ایک طرح کی برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے مردوں کے ذمہ عورتوں کا خرچہ مقرر فرمایا ہے اور مردوں کو ان پر فضیلت دی ہے وہ ان پر حکمران ہیں۔ امور خانہ داری میں اور دینی پابندی کرانے میں اور عورت کو اس کے ماں باپ کے یہاں آنے جانے میں اور بہت سے امور میں مرد کے حکموں کی فرمانبرداری کرنا لازم ہے اس کے بغیر گھر کا نظام ٹھیک نہیں بیٹھتا' اگر مرد کی برتری عورتوں پر

بالکل ہی نہ رہے۔ تو شریعت اسلامیہ کے مطابق زندگی کا نظام نہیں چل سکتا۔ البتہ مردوں کے لئے بھی اس کی اجازت نہیں ہے کہ سردار بن گئے تو ظلم کیا کریں۔ اور اس کے حقوق ادا نہ کریں اور اس کا مال برباد کردیں۔ عورت یہ سمجھ کر چلے کہ یہ میرا سردار ہے اور مرد یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے میری ضروریات پورا کرنے کے لئے یہ نعمت مجھے عطا فرمائی ہے مجھے خیر وخوبی کے ساتھ نباہنا چاہئے۔ ایسا کریں گے تو ماں باپ اور اولاد سب کی زندگی ان شاء اللہ تعالیٰ عمدہ طریقہ پر گزرے گی۔ سورۃ النساء میں فرمایا: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (کہ خوش اسلوبی کے ساتھ عورتوں کے ساتھ زندگی گزارو) اس میں ہر طرح کی خیر وخوبی ہمدردی اور حقوق کی ادائیگی اور مراعات کا حکم فرمادیا۔

مردوں کو چونکہ سرداری اور بڑائی دی گئی ہے اس لئے وہ اپنے مقام اور مرتبہ کا خیال کریں اور عورتوں کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر صبر کریں اور برداشت کریں، اگر برداشت نہ کیا تو بڑائی ہی کیا رہی؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن مرد کسی مؤمن عورت سے (یعنی ایمان والی بیوی) سے بغض نہ رکھے۔ اگر اسکی ایک بات ناپسند ہوگی تو دوسری بات پسند آجائے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے سب سے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم سب میں بہتر ہوں۔ (رواہ ابن ماجہ ۱۴۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں سب سے زیادہ کامل ایمان والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔ اور جو اپنے گھر والوں کیلئے سب سے زیادہ مہربان ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

آخر میں فرمایا۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے) اس میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی اگر کسی نے کی تو وہ یہ نہ سمجھے کہ میرا کوئی مؤاخذہ نہیں۔ اللہ نے احکام بھیجے ہیں اور عمل پیرا ہونے کا حکم فرمایا ہے۔ جو خلاف ورزی کرے گا اسکی گرفت ہونے لگے تو بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ حکم دینے والا عزیز اور غالب ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس نے جو احکام دیئے ہیں وہ سب حکمتوں پر مبنی ہیں ان میں بندوں کی رعایتیں ملحوظ ہیں بندوں کے لئے اس نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں جو انکے خالق نے انکے لئے حکمت کے مطابق تجویز فرمایا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ

طلاق دو مرتبہ ہے پھر روک لینا ہے بھلائی کے ساتھ، یا، چھوڑ دینا ہے اچھے طریقہ پر، اور تمہارے لئے یہ حلال نہیں ہے۔

تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ

کہ تم کچھ بھی لے لو اس مال میں سے جو تم نے اُنکو دیا ہے مگر اس صورت میں کہ میاں بیوی اس بات سے ڈرتے ہوں کہ حدود اللہ قائم نہ رکھ سکیں گے

اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ

تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر اس بارے میں کہ عورت اپنی جان کا بدلہ دیدے، یہ اللہ کے حدود ہیں۔

اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ

سو تم ان سے آگے مت بڑھو۔ اور جو کوئی شخص اللہ کے حدود سے آگے بڑھ جائے تو ایسے لوگ ظلم کرنے والے ہیں، پھر اگر

طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا

اس کو طلاق دیدی تو اس کے لئے اس کے بعد حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ اس شوہر کے بعد کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔ سو اگر اس نے طلاق دیدی تو

جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ

ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ پھر آپس میں رجوع ہو جائیں۔ اگر دونوں کو اس بات کا گمان ہو کہ اللہ کے حدود قائم رکھیں گے اور یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں

يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

وہ انہیں بیان فرماتا ہے ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں

طلاق اور خلع کے چند احکام

تفسیر: ان دونوں آیتوں میں طلاق کے متعدد مسائل اور متعدد تنبیہات مذکور ہیں جو زن و شوہر سے متعلق ہیں' طلاق رجعی' طلاق بائن' طلاق مغلظہ اور خلع کے مسائل اجمالی طور پر بیان فرمائے ہیں۔

اگر کوئی شخص طلاق دینے کی ضرورت محسوس کرے تو احسن طریقہ یہ ہے کہ کسی ایسے طہر میں (یعنی پاکی کے زمانے میں) ایک طلاق دے دے جس میں جماع نہ کیا ہو پھر عورت کو اپنی حالت پر چھوڑ دے' قانون شرعی کے مطابق یہ طلاق رجعی ہو گی (بشرطیکہ عورت سے نکاح کے بعد جماع بھی کر چکا ہو' اگر صرف نکاح ہوا تھا تو یہ طلاق بائن ہوگی) جب پاکی کے زمانہ میں طلاق رجعی دے دی اور عورت کو اپنے حال پر چھوڑ دیا حتیٰ کہ عدت گزر گئی (جس کی تفصیل پہلے رکوع میں گزر چکی ہے) تو یہی رجعی طلاق بائن طلاق ہو جائے گی۔ عدت سے پہلے پہلے رجوع کرنے کا حق تھا۔ جب طلاق بائن بن گئی تو اب رجوع کا حق ختم ہو گیا۔ اگر عدت کے اندر ایک طلاق اور دیدی تو یہ بھی طلاق رجعی ہوگی اور اس کے بعد بھی عدت ختم ہونے تک رجوع کا اختیار رہے گا۔ عدت ختم ہو جانے پر دونوں طلاقیں بائن ہو جائیں گی اور رجوع کا حق ختم ہو جائے گا۔

طلاق بائن کے بعد آپس کی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ شوہر نے عدت کے اندر تیسری طلاق بھی دیدی تو اب یہ طلاق مغلظ ہو گئی جس کا حکم یہ ہے کہ اب آپس کی رضامندی سے بھی دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔ اب دوبارہ آپس میں نکاح ہونے کی یہی ایک صورت ہے کہ کسی دوسرے مرد سے اس عورت کا نکاح ہو پھر وہ مرد اس سے جماع کرے پھر طلاق دے یا وفات پا جائے اور پھر اسکی عدت گزر جائے اگر دوسرا شوہر جماع کئے بغیر طلاق دے دے تو پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہو گی جس کی تصریح حدیث شریف میں موجود ہے۔ اور یہ طے کر کے کسی سے نکاح کر دینا کہ تو جماع کر کے طلاق دے دینا مکروہ تحریمی ہے اس پر حدیث شریف میں لعنت آئی ہے۔ عن علیؓ قال لعن رسول اللہ ﷺ المحلل والمحلل له (رواه ابن ماجه و رواه الحاكم في المستدرك. وصححه واقره الذهبي)

اللہ جل شانہٗ نے بندوں کی مصلحتوں کی کس قدر رعایت رکھی ہے اول تو حلال چیزوں میں طلاق کو مبغوض ترین چیز قرار دیا کما قال النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم ابغض الحلال الى الله عزوجل الطلاق رواه ابوداؤد (ص ۲۹۶ ج ۲) پھر حالت حیض میں طلاق دینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ بے رغبتی کا زمانہ ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی تھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ انکو حکم دو کہ رجوع کرلیں پھر حالت طہر یا حمل میں طلاق دیں۔ (رواہ مسلم ص ۴۷۶ ج ۱)

صحیح بخاری (ص ۸۰۳ ج ۲) میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حکم دیا کہ زمانہ حیض میں جو طلاق دی ہے اس سے رجوع کرلیں اس کے بعد یہ حیض گزر جائے پھر ایک طہر گزر جائے پھر ایک حیض اور گزر جائے اس کے بعد جو طہر یعنی پاکی کا زمانہ آئے چاہے تو اس میں طلاق دے دے اور یہ طلاق جماع کرنے سے پہلے ہو اگر طلاق دے تو اچھی طرح غور کرلے اگر طلاق کی ضرورت محسوس کرے تو پاکی کے زمانہ میں طلاق دے دے اور ایک طلاق دے کر چھوڑ دے۔ (اگر نکاح کے بعد جماع کیا تھا تو یہ طلاق رجعی ہوگی) عدت گزر جانے سے پہلے ایک طلاق اور دیدی تو وہ بھی رجعی ہوگی۔ اگر عدت کے اندر رجوع نہ کیا تو دونوں طلاقیں بائن ہو جائیں گی۔ لیکن باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہو سکے گا۔ اس تفصیل کو سامنے رکھ کر غور کرلیا جائے کہ شریعت اسلامیہ میں مرد و عورت کی مصلحتوں کی کس قدر رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اگر شوہر تین طلاقیں دیدے خواہ متفرق اوقات میں دے یا بیک وقت تینوں طلاقیں دے تو اس سے طلاق مغلظہ ہو جاتی ہے جس کا حکم اوپر بیان ہوا۔ جب شریعت کی دی ہوئی رعائیتوں کی پاسداری نہ کی تو اب یہ سزا دی گئی کہ اب دوسرے شوہر سے نکاح اور جماع کئے بغیر پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح نہیں ہوسکتا۔ مرد کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے۔ لیکن عورت کو بھی مرد کے نکاح سے نکلنے کے حق سے محروم نہیں کیا گیا ہے اگر کوئی صورت نباہ کی نہ رہے تو وہ مرد سے خلع کرسکتی ہے خلع کا معنی یہ ہے کہ وہ مرد سے یوں کہے کہ میں اپنے مہر کے عوض یا اپنے مال کے عوض آپ سے خلع کرتی ہوں مرد اُسے منظور کرلے تو عورت پر ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور جو مال دینا طے ہوا ہے وہ عورت پر ادا کرنا واجب ہوگا۔

خلع کا یہ مطلب نہیں کہ عورت مرد کو خود سے چھوڑ کر علیحدہ ہو جائے یا حاکم کے یہاں دعویٰ کر کے بغیر کسی شرعی سبب کے جدائی کا فیصلہ کرالے حاکم سے نکاح فسخ کرانے کے کچھ اصول اور قوانین ہیں بعض صورتوں میں قاضی کو شرائط فسخ ملحوظ کرتے ہوئے نکاح فسخ کر دینے کا اختیار ہوتا ہے جس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں اور جن صورتوں میں حاکم کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے ان میں یہ بھی ضروری ہے کہ حاکم مسلمان ہو غیر مسلم حاکموں کے فسخ کرنے سے مسلمان عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوگا خواہ کیسی ہی مجبوری ہو۔

میاں بیوی دونوں جہاں تک ممکن ہو آپس میں نباہ کی کوشش کریں لیکن اگر دونوں کو اس بات کا ڈر ہو کہ اللہ کے حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ عورت مال دے کر اپنی جان چھڑالے اگر مرد کی طرف سے زیادتی ہو تو اس سے کچھ بھی نہ لے اور بلا عوض اسکی جان چھوڑ دے اور اگر عورت کی طرف سے زیادتی اور نافرمانی ہو تب بھی مرد اتنا ہی لے جتنا مہر اسے دے چکا ہے اس سے زیادہ نہ لے اور اگر زیادہ لے لیا تو قضاءً جائز تو ہوگا۔ لیکن مکروہ ہوگا۔ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ثابت بن قیس کی عادت اور خصلت اور دینداری کے بارے میں کوئی ناراضگی نہیں ہے لیکن میں مسلمان ہوتے ہوئے ناشکری کو پسند نہیں کرتی (میرا ان سے دل نہیں ملتا لہٰذا علیحدگی کی کوئی صورت ہو جائے) آپ نے فرمایا کہ کیا تم ان کا باغیچہ واپس کردو گی (جو مہر میں دیا تھا) عرض کیا ہاں میں واپس کردوں گی آپ نے حضرت ثابت بن قیس سے فرمایا کہ تم اپنا باغیچہ قبول کرلو اور اسکو ایک طلاق دیدو۔ (رواہ البخاری ص ۷۹۴ ج ۲)

اس حدیث سے خلع کا جواز معلوم ہوا اور آیت شریفہ فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ کے سیاق سے معلوم ہوا کہ نباہ کی صورت نہ رہے اور حدود اللہ قائم نہ کر سکیں تو خلع کر لینے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ خواہ مخواہ بلاوجہ خلع کرنا اور چھوٹ چھٹاؤ کے درپے ہونا محمود نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چھوٹ چھٹاؤ کا مطالبہ کرنے والی اور خلع چاہنے والی عورتیں نفاق والی عورتیں ہیں۔

(رواہ النسائی ص ۱۰۷ ج ۲ والترمذی ص ۱۹۱ ج ۱)

مسئلہ: لفظ خلع سے طلاق ہو جاتی ہے یعنی شوہر کے قبول کرنے پر عورت پر طلاق واقع ہو جاتی ہے اس کے بعد وہ عدت گزار کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے اور چونکہ طلاق مغلظہ نہیں ہے اس لئے دوبارہ شوہر اوّل سے بھی نکاح ہو سکتا ہے۔ خلع کے علاوہ ایک ''طلاق بالمال'' بھی ہے اور وہ اس طرح سے ہے کہ مرد یوں کہے کہ میں تجھے اتنے مال کے عوض طلاق دیتا ہوں اگر عورت قبول کرے تو طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور عورت کو مقرر مال دینا لازم ہوگا۔

فائدہ: مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں اول دو رجعی طلاقوں کا ذکر ہے اس کے بعد خلع کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ اس کے بعد تیسری طلاق کا ذکر ہے: فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ مِنْۢ بَعْدُ میں چوتھی طلاق مذکورہ نہیں ہے بلکہ دو طلاق کے بعد بطور جملہ معترضہ کے خلع کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد تیسری طلاق کو ذکر فرمایا ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ فَاَمْسِکُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْھُنَّ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو پھر وہ اپنی عدت گزر جانے کے قریب پہنچ جائیں تو ان کو روک لو بھلائی کے ساتھ یا ان کو چھوڑ دو

بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِکُوْھُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ ؕ

خوبی کے ساتھ اور ضرر پہنچانے کے لئے انہیں روک کر کے نہ رکھو تاکہ تم زیادتی کرو اور جو شخص ایسا کریگا سو اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا ۘ وَّاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنَ

اور مت بناؤ اللہ کی آیتوں کو مذاق کی چیز اور یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں اور جو کچھ اللہ نے تم پر نازل فرمایا ہے

الْکِتٰبِ وَالْحِکْمَۃِ یَعِظُکُمْ بِہٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۳۱﴾

کتاب اور حکمت اس کو بھی یاد کرو۔ اللہ اس کے ذریعہ تم کو نصیحت فرماتا ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بے شک ہر چیز کا جاننے والا ہے

مطلقہ عورتوں کو ضرر پہنچانے کی ممانعت

تفسیر: اس آیت میں چند باتوں پر تنبیہ فرمائی۔ اول یہ کہ جو لوگ اپنی عورتوں کو طلاق رجعی دے دیں اگر انہیں رغبت نہیں ہے اور اب بیوی بنا کر رکھنا گوارہ نہیں ہے تو خوش اسلوبی کے ساتھ اسے چھوڑیں، جب عدت گزرنے کے قریب ہو جائے تو رجوع کئے بغیر عدت ختم ہونے دیں تاکہ عدت ختم ہوتے ہی طلاق بائن ہو جائے اور عورت کسی دوسری جگہ اپنا نکاح کر سکے ایسا نہ کریں کہ جب عدت گزرنے کے قریب ہو تو رجوع کر لیں اور اس کے بعد پھر طلاق دے دیں اور جب عدت گزرنے کے قریب ہو پھر لوٹا لیں، ایسا کرنے سے خواہ مخواہ عورت کو تکلیف ہوگی اور ضرر پہنچے گا۔ تفسیر روح المعانی (ص ۱۴۲ ج ۲) میں ہے

کہ انصار میں سے ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ یہی معاملہ کیا حتیٰ کہ اسی طرح نو مہینے گزر گئے اللہ جل شانہٗ نے آیت بالا نازل فرمائی اور فرمایا' فَاَمْسِکُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْسَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ کہ ان کو اگر اپنے نکاح میں رکھنا ہے تو اچھے طریقہ پر روک لو اور نکاح میں نہیں رکھنا تو خوبی کے ساتھ اسے چھوڑ دو اور صرف اسی پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ مزید فرمایا: وَلَا تُمْسِکُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا' کہ ان کو ضرر پہنچانے اور دُکھ دینے کے لئے روک کر نہ رکھو تا کہ ان پر ظلم کرو۔

اور مزید فرمایا: وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ کہ جو شخص ایسا کرے گا اس نے اپنی جان پر ظلم کیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے ایک مومن عورت کو ضرر پہنچانے کی نیت کر کے اپنی جان کو آخرت کے عذاب کے لئے پیش کر دیا اور اللہ کے حکم کی فرماں برداری پر جو ثواب مل سکتا ہے اس سے محروم ہو گیا' کسی بھی مؤمن کو ضرر پہنچانا حلال نہیں ہے حدیث شریف میں ہے۔ مَلْعُوْنٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا اَوْ مَکَرَ بِهٖ (یعنی وہ شخص ملعون ہے جو کسی مومن کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ مکر کرے) (رواہ الترمذی)

اللہ کی آیات کا مذاق بنانے کی ممانعت:

دوسری تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا وَلَا تَتَّخِذُوْا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا کہ اللہ کی آیات کو اور اس کے احکام کو کھیل اور مذاق مخول ٹھٹھہ نہ بناؤ۔ ایسا نہ کرو کہ جی چاہا عمل کیا چاہا نہ کیا اور احکام کی رعایت کا دھیان نہ رکھا' بلکہ آیات قرآنیہ میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں۔ انکی پابندی کرو اور عزم وہمت وارادہ کے ساتھ عمل پیرا ہو حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک شخص کے بارے میں خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دیں' آنحضرت سرور عالم ﷺ غصہ میں کھڑے ہوئے اور فرمایا کیا اللہ عزوجل کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جائے گا حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ آپ کا غصہ دیکھ کر ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں اس شخص کو قتل نہ کر دوں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۴ ج ۱) اکٹھی تین طلاقیں دے دینا شرعاً مذموم ہے۔ ایک سے زیادہ طلاق دے تو الگ الگ کر کے دے' اور ہر طہر میں (پاکی کے زمانے میں) ایک ایک طلاق دے۔ کیونکہ اس شخص نے اکٹھی تین طلاقیں دے دیں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کو سخت ناگواری ہوئی۔ مؤطا مالک میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دیں اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تیری بیوی پر تین طلاقیں واقع ہو گئیں اور ستانوے طلاقوں کے ذریعہ تو نے اللہ کی آیات کا مذاق بنایا (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۴)

اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو: تیسری بات یہ فرمائی کہ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور جو کچھ اس نے تمہارے اوپر کتاب اور حکمت نازل فرمائی ہے اس کو بھی یاد کرو۔ یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا شکر ادا کرو نعمتوں کے ذریعہ گناہ نہ کرو' اور آیات قرآنیہ پر عمل کرو۔ اللہ کے احکام میں بڑی بڑی حکمتیں ہیں۔ ان میں خیر سمجھو۔

پھر فرمایا: يَعِظُکُمْ بِهٖ یہ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا وہ اس کے ذریعہ تم کو نصیحت فرماتا ہے۔ خلاف ورزی کر کے نصیحت سے منہ موڑنے والے نہ بنو۔

پھر فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (اور اللہ سے ڈرو اور یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے) سب کے اعمال کو وہ جانتا ہے ان کے مطابق جزاء سزاء دے گا اور جن چیزوں میں تمہارے لئے مصلحت ہے ان کو

بھی جانتا ہے اس کے حکموں میں تمہاری مصلحت مضمر ہے۔ مخالفت کرکے اپنے لئے خرابی کا راستہ اختیار نہ کرو۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص مذاق میں طلاق دے دے تو اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ اسکی تصریح حدیث شریف میں موجود ہے۔ فقد روی أبوهريرة رضی الله عنه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثَلاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ، اَلنِّكَاحُ وَالطَّلاقُ والرَّجْعَةُ رواه الترمذی (ص۱۹۱ ج۱) وحسنه وأخرجه الحاكم ایضافی المستدرک (ص۱۹۸ ج۲) وصححه.

فائدہ: ارشاد باری تعالیٰ لَا تَتَّخِذُوْا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا اگرچہ مسائل طلاق کے ذیل میں وارد ہوا ہے لیکن الفاظ کا عموم اس بات کو بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور احکام کا مذاق بنانا بدترین گناہ ہے بلکہ قصداً اور ارادۃً اگر آیات و احکام کا مذاق بنایا جائے تو کفر ہے' سورۂ مائدہ میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ. (اے ایمان والو! ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا' یعنی وہ لوگ جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان کے علاوہ دوسرے کافروں کو بھی دوست نہ بناؤ' اور اللہ سے ڈرو' اگر تم مؤمن ہو' اور جب تم نماز کی طرف بلاتے ہو تو نماز کا مذاق اور کھیل بنالیتے ہیں یہ اس لئے کہ وہ لوگ سمجھتے نہیں)

سورۃ الجاثیہ میں اہل دوزخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا. (یہ عذاب اس لئے ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کو مذاق بنالیا تھا۔ اور تم کو دنیا والی زندگی نے دھوکہ میں ڈالا تھا)

بہت سے لوگ مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں لیکن قرآن اور احادیث شریفہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا مذاق بناتے ہیں ایسے لوگ اگرچہ مدعی اسلام ہوں لیکن اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہت سے لوگ حج کے احکام و افعال کو فلماتے ہیں اور سینما میں لہو و لعب کے پردہ پر دکھاتے ہیں اور دیکھنے والے دیکھتے ہیں کعبۃ اللہ شریف کے چاروں طرف جو نماز ہوتی ہے اس کے فوٹو لئے جاتے ہیں۔ حجر اسود کا استلام کرتے ہوئے فوٹو لئے جاتے ہیں۔ منیٰ میں تصویر کشی ہے۔ عرفات میں کیمرے لئے کھڑے ہیں۔ فوٹو کھینچے جارہے ہیں۔ نیک کام کو معصیت کے ساتھ مکدر کیا جارہا ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ٹیلیویژن میں ڈرامے آرہے ہیں۔ ان اکابر دین کی داڑھیاں منڈی اور مونچھیں خوب زیادہ بڑھی ہوئی دکھائی جارہی ہیں۔ ان حضرات کے علم و عمل کو لہو و لعب اور تماشہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سب دین اور دینیات کے ساتھ استہزاء اور تمسخر ہے جو لہو و لعب میں شامل ہے۔ عوام الناس نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ اس سے دین کی تبلیغ ہوگی۔ حالانکہ اس کی حیثیت لہو و لعب سے زیادہ نہیں ہے۔ قراءت قرآن کی مجلسیں ہیں۔ قاریوں کی تصویریں کھینچی جارہی ہیں اور اخبارات میں چھپ رہی ہیں۔ قرآن کے نام پر اجتماعات ہیں۔ فوٹو گرافی ہو رہی ہے۔ فلمیں دکھائی جارہی ہیں کالج یونیورسٹی میں اسلامیات کی کلاسیں ہیں۔ لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ بے پردہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ عین اسلامی عنوان کے پیریڈ میں احکام قرآن کی خلاف ورزی ہو رہی ہے' سودی لین دین ہے بنک کا نام اسلامی ہے۔ حرام مال سے ایصال ثواب کیا جارہا ہے اسی سے حج و عمرہ ہو رہا ہے۔ داڑھی مونڈنے کی دکانیں ہیں۔ اسلامی صالون یا صالون الحرمین کا نام دیا جارہا ہے۔ یہ سب اعمال و افعال ایسے ہیں جن سے احکام اسلام کی توہین اور تضحیک ہوتی ہے۔ اسلام کے نام پر مذاق ہے۔ گناہ کرنا بہت بڑی بدبختی ہے جس کا لوگوں کو بالکل احساس نہیں'

داڑھیوں کا، داڑھی رکھنے والوں کا تمسخر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنتوں پر چلنے والوں پر پھبتیاں ہیں، اور یہ سب کچھ ان لوگوں سے صادر ہو رہا ہے جو مسلمان ہونے کے مدعی ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہ، سب کو صحیح سمجھ دے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ
اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پہنچ جائیں اپنی عدت کو تو ان کو اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کریں
اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ
جبکہ آپس میں خوبی کے ساتھ رضامند ہو جائیں۔ اس کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے
يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ
اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتا ہے۔ یہ تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم
لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٢﴾
نہیں جانتے

مطلقہ عورتیں سابقہ شوہروں سے نکاح کرنا چاہیں تو اس میں رکاوٹ نہ ڈالیں

تفسیر: اس آیت میں عورتوں کے اولیاء اور اقرباء کو ایک خاص نصیحت کی گئی اور وہ یہ کہ جب طلاق کے بعد عورت کی عدت گزر جائے اور وہ اپنے اسی شوہر کے نکاح میں پھر جانا چاہے جس نے طلاق دی تھی تو اس میں رُکاوٹ نہ ڈالو۔ طلاق رجعی کے بعد جب عدت گزر جائے تو یہ طلاق بائن ہو جاتی ہے اور طلاق بائن ہو جانے پر میاں بیوی کی رضامندی سے آپس میں دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ جب دونوں یہ محسوس کریں کہ ہمیں پھر سے زن و شوہر کی طرح رہنا چاہئے اور پھر سے نکاح کر لینے میں مصلحت محسوس کریں تو عورت کے اولیاء و اقرباء رکاوٹ نہ ڈالیں ان کا نکاح آپس میں ہونے دیں۔ البتہ ان دونوں میں آپس میں خیر و خوبی سے اور عمدہ طریقہ پر نباہ کرنے کے جذبات ہونے چاہئیں۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ وقتی جوش میں مرد طلاق دے بیٹھتا ہے اور عورت بھی کبھی غصہ میں طلاق طلب کر لیتی ہے۔ جس سے شوہر کے منہ سے طلاق کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ پھر آپس میں پشیمان ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پھر مل بیٹھیں۔ یعنی دوبارہ نکاح کر لیں۔ جب ایسی صورت حال بن جاتی ہے تو عورت کا باپ یا بھائی یا خاندان کے دوسرے لوگ رکاوٹ ڈالتے ہیں اور اس کو اپنی ہتک عزت سمجھتے ہیں اور بعض مرتبہ رشوت لینے کے پھیر میں ہوتے ہیں اس کے شوہر کو دباتے ہیں تاکہ کچھ مال دینے پر مجبور ہو جائے، ان سب باتوں سے آیت بالا میں منع فرمایا ہے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی۔ میں نے اپنی ایک بہن کا ایک شخص سے نکاح کر دیا تھا پھر اس نے اس کو طلاق دے دی۔ جب عدت گزر گئی تو پھر وہ اس سے نکاح کرنے کے لئے پیغام لے کر آ گیا میں نے کہا کہ میں نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا اور اس کو تیرے پاس بھیج دیا اور تیرا اکرام کیا پھر تو نے طلاق دے دی اب تو دوبارہ نکاح کا پیغام لے کر آیا ہے اللہ کی قسم کبھی بھی تیرے پاس نہ جائے گی۔ یہ آدمی مناسب تھا اور عورت چاہتی تھی کہ واپس چلی جائے۔ اللہ جل شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی آیت سنکر میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ

اب تو میں ضرور وہی کروں گا جس کا حکم ہوا ہے لہٰذا اپنی قسم کا کفارہ دے دیا اور اسی شخص سے اس کا نکاح کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ جب آیت سنی تو حضرت معقل بن یسارؓ نے کہا سَمْعاً لِرَبِّیْ وَطَاعَةً (میں نے اپنے رب کا فرمان سنا اور میں فرمانبرداری کے لئے حاضر ہوں) (تفسیر درمنثور ص ۲۸۷ ج ۱ عن البخاری وابی داؤد والترمذی والحاکم وغیرہم)

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اَزْوَاجَهُنَّ سے پہلے شوہروں کے علاوہ وہ لوگ بھی مراد ہو سکتے ہیں جو پہلے شوہر نہ تھے لیکن طلاق وعدت کے بعد مطلقہ عورتیں بعض مرتبہ بعض مردوں سے رشتہ طے کر لیتی ہیں اور آپس میں دونوں شریعت کے قاعدہ کے مطابق نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو عورت کے اولیاء واقرباء آڑے نہ آئیں اور نہ طلاق دینے والا پہلا شوہر رکاوٹ ڈالے لفظ بالمعروف میں یہ بتادیا کہ وہ شرعی قاعدہ کے مطابق نکاح کرنا چاہیں تو ان کو نکاح کرنے دیں، البتہ خلاف شرع کوئی بات ہو تو اس سے روکنا واجب ہے۔ عورت کو بھی چاہئے کہ اب برابر اور میل کے آدمی سے نکاح کرے اور مہر مثل پر نکاح کرے تاکہ اولیاء کو خفت محسوس نہ ہو اور کسی طرح اعتراض کا موقعہ نہ ملے پھر فرمایا اس میں ان لوگوں کے لئے نصیحت ہے جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ فرمایا کہ اس حکم کے ماننے میں تمہاری بہت بڑی صفائی اور پاکیزگی ہے کیونکہ اسکی خلاف ورزی میں فتنہ فساد اور گناہوں میں مبتلا ہونے کے مواقع نکل سکتے ہیں، اور مرد وعورت کی عفت بھی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔

آخر میں فرمایا وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (کہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) بعض لوگ اپنے خیال سے کچھ مصلحتیں سوچتے ہیں لیکن فکر میں خطاء کرتے ہیں غلط بھی سوچتے ہیں۔ دنیاداری کے جذبات سے سوچتے ہیں مرد وعورت کی مصلحتوں پر نظر نہیں رکھتے، اپنے غور وفکر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کریں، اس نے جو قانون بتایا ہے اس پر چلنے میں خیر ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ط

اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو دو سال پورے اس کے لئے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ج لَا

اور جس کی اولاد ہے اس کے ذمہ ماؤں کا کھانا اور کپڑا ہے قاعدہ کے مطابق، کسی جان کو تکلیف نہیں دی جاتی مگر اس کی برداشت کے مطابق، نہ

تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ق وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ج

تکلیف دی جائے والدہ کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ اس کو تکلیف دی جائے جس کا بچہ ہے اس کے بچہ کی وجہ سے اور وارث کے ذمہ اسی طرح سے لازم ہے۔

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ط وَاِنْ اَرَدْتُّمْ

سو اگر دونوں آپس کی رضامندی اور باہم مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں، اور اگر تم اپنی اولاد کو

اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ط

دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کچھ گناہ نہیں ہے جبکہ تم سپرد کر دو جو کچھ ان کو دینا طے کیا ہے قاعدہ کے موافق،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ ان کاموں کو دیکھتا ہے جنہیں تم کرتے ہو

بچوں کو دودھ پلانے کے احکام

تفسیر: اس آیت میں بچوں کو دودھ پلانے اور پلوانے کے بارے میں چند احکام مذکور ہیں۔ جب میاں بیوی خوشی کے ساتھ آپس میں مل جل کر رہ رہے ہوں اور اولاد پیدا ہو جائے تو چونکہ ماں اور باپ دونوں کو بچہ پر شفقت ہوتی ہے اور دونوں اس کی تربیت کرتے ہیں اور دکھ تکلیف سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے بچے ماں باپ کے سایہ میں خوب اچھی طرح سے پرورش پاتے ہیں اور ایسی صورت میں والدہ اس کے دودھ پلانے یا پرورش کرنے پر اس کے باپ سے کسی طرح کی اُجرت بھی طلب نہیں کرتی' حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بچے کی والدہ جب اپنے شوہر کے نکاح میں ہے اور بحق زوجیت کھانا کپڑا اسے مل رہا ہے تو اس کے لئے یہ دُرست نہیں کہ دودھ پلانے کے سلسلے میں کوئی اُجرت طلب کرے۔ اور بعض مرتبہ ایسا ہو جاتا ہے کہ شوہر طلاق دے دیتا ہے۔ اس میں اول تو یہ اختلاف رونما ہوتا ہے کہ بچہ کون لے۔ اُصول یہ ہے کہ لڑکا جب تک سات برس کا نہ ہو جائے اور لڑکی نو سال کی نہ ہو جائے اس وقت تک والدہ کو پرورش کا حق ہے۔ لڑکا یا لڑکی کی پرورش کا حق مطلقہ عورت کو اُس وقت تک ہے جب تک کہ کسی ایسے شخص سے نکاح نہ کر لے جو بچے کا محرم نہ ہو' والدہ کی پرورش میں بچہ کے رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچہ کے اخراجات بھی والدہ ہی کے ذمہ ہوں بلکہ اخراجات بچے کے والد پر ہی واجب ہوں گے' جب کسی مرد نے کسی عورت کو طلاق دے دی اور ماں نے بچہ کو پرورش کے لئے لے لیا اور ابھی دودھ پلانے کا زمانہ باقی ہے تو جب تک عدت نہ گزر جائے اس وقت تک بچہ کو دودھ پلانے کی اُجرت وہ نہیں لے سکتی کیونکہ اسے طلاق دینے والے شوہر کی طرف سے زمانہ عدت کا نان ونفقہ مل رہا ہے۔ دوہرا خرچہ نہیں دیا جائے گا اور جب عدت گزر جائے اور ابھی دودھ پلانے کا زمانہ باقی ہے تو اب بچہ کی ماں بچہ کے باپ سے دودھ پلانے کی اُجرت لے سکتی ہے۔ بچہ کے دوسرے اخراجات اس کے سوا ہوں گے اور دودھ پلانے کی اُجرت کا مطالبہ بچہ کی عمر دو سال (قمری مہینوں کے اعتبار سے) ہو جانے تک طلب کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد بچہ کا باپ دودھ پلانے کی اُجرت نہ دے تو دودھ پلانے والی والدہ دودھ پلانے کی اُجرت طلب نہیں کر سکتی (حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دودھ پلانے کی مُدت زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال ہے اور دوسرے اماموں کے نزدیک دو سال ہے۔ اور احتیاط اسی میں ہے کہ دو سال سے زیادہ دودھ نہ پلایا جائے البتہ اگر کسی نے دو سال کے بعد بھی ڈھائی سال ہونے تک کی مدت میں پلا دیا تو اس سے حرمت رضاعت کا فتویٰ دیا جائے گا کیونکہ تحریم نکاح کے سلسلہ میں اسی میں احتیاط ہے' سو اگر کوئی عورت دو سال کے بعد بھی دودھ پلائے تو شوہر کے ذمہ دودھ پلائی کا خرچہ نہیں ہے)۔

ماں کو یا باپ کو اولاد کی وجہ سے ضرر نہ دیا جائے:

اُجرت رضاعت اور مدت رضاعت بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا جس میں یہ بتایا کہ بچہ کا باپ جو دودھ پلانے والی کو اُجرت دے گا اس میں اسکی حیثیت سے زیادہ مطالبہ نہ کیا جائے گا وہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق خرچہ دے گا جو خرچہ اس کی استطاعت سے باہر ہو اس کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے پھر ارشاد فرمایا: لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ۔ یعنی کسی ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور کسی باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے ضرر نہ پہنچایا جائے۔ مثلاً طلاق ہو گئی تو بچہ کے ماں باپ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے سے باز رہیں اگر بچہ کی والدہ دودھ پلانے سے معذور ہو یا حق پرورش سے دستبردار ہو جائے اور یوں کہے کہ کسی اور سے دودھ پلوالو تو اس کا باپ زبردستی

نہ کرے کہ تجھے ہی پلانا ہوگا اور مفت پلانا ہوگا ماں کی مامتا سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھائے۔ یہ نہ سوچے کہ جب بچہ کو تڑپتا دیکھے گی خود ہی پلائے گی۔ یا ماں اُجرت پر پلانے کو راضی ہو تو باپ یوں نہ کہے کہ میں تجھ سے نہیں پلواتا میں دوسری عورت کو زیادہ اُجرت دے دوں گا لیکن تجھے ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔

باپ نہ ہو تو وارث ذمہ دار ہے

پھر فرمایا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بچہ کا باپ وفات پا جائے تو اس کے دودھ پلانے کی ذمہ داری وارث پر ہے اگر بچہ کا اپنا مال ہو مثلاً اس کے باپ کی میراث سے اسے ملا ہے اور بچہ کے دودھ پینے کی مُدت ابھی باقی ہے تو بچہ کے مال میں سے بچہ پر خرچ کرے اور دودھ پلوانے کی اُجرت اس مال سے دے اور اگر بچہ کا اپنا مال نہیں ہے تو یہ وارث اپنے مال سے بچہ پر خرچ کرے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وارث سے بچہ کا وارث مراد ہے مثلاً اگر یہ فرض کیا جائے کہ بچہ کی موت ہوگئی تو اس وقت جو لوگ اس کے وارث ہو سکتے ہیں ان پر اس کا خرچ واجب ہے۔ حضرت امام صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے وہ وارث مراد ہے جو محرم ہو اگر اس طرح کا وارث ایک ہی ہو تو پورا خرچ اس ایک ہی پر واجب ہوگا' اور اگر چند افراد ایسے ہوں تو ان سب پر بقدر حصہ میراث بچہ کے اخراجات لازم ہوں گے محرم اس کو کہتے ہیں جس سے کبھی بھی نکاح جائز نہ ہو اگر بچہ اور اس کے رشتہ دار ایک ہی جنس کے ہوں یعنی سب مرد ہوں تو محرم کے پتہ چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ بچہ اور اس کے رشتہ داروں میں سے اگر کسی کو عورت فرض کر لیا جائے تو آپس میں نکاح درست نہ ہو ایسے رشتہ کو رشتہ محرمیت کہتے ہیں۔ چچا بھتیجی کا نکاح تو آپس میں دُرست نہیں ہے لہٰذا چچا اپنی بھتیجی کا محرم ہے' اور چچا اپنے بھتیجہ کا بھی محرم ہے اس لئے کہ اگر دونوں میں سے کسی ایک کو عورت فرض کر لیا جائے تو آپس میں نکاح دُرست نہ ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی بچہ کا والد وفات پا گیا اور بچہ کا مال بھی نہیں ہے اور اسکی والدہ ہے اور دادا ہے تو دونوں پر بقدر اپنے حصہ میراث کے بچہ کا خرچہ واجب ہوگا' لہٰذا ۱/۳ ماں کے ذمہ ہوگا اور ۲/۳ دادا کے ذمہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں محرم بھی ہیں اور بچے کی میراث ان دونوں کو اسی نسبت سے پہنچتی ہے۔

دو سال سے پہلے بھی باہمی مشورہ سے دودھ چھڑا سکتے ہیں

پھر فرمایا: فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا یعنی اگر دو سال سے پہلے ہی والدین بچہ کا دودھ چھڑانا چاہیں اور آپس میں رضامندی اور مشورے سے اس کا فیصلہ کر لیں تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔ مشورے میں بچے کی مصلحت پیش نظر رکھی جائے' کبھی ایسا ہوتا ہے بچہ کی والدہ کا دودھ خراب ہو جاتا ہے۔ وہ بچہ کے لئے مضر ہوتا ہے۔ کبھی بچہ دودھ پینا خود سے چھوڑ دیتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بچہ ماں کے علاوہ نہ کسی اور عورت کا دودھ پینے کو تیار ہے نہ اُوپر کا دودھ پینا گوارا کرتا ہے ایسی صورت میں ماں کا دودھ چھڑائیں گے تو وہ بھوکا رہے گا' دودھ چھڑاتے وقت بچہ کی ہمدردی اور مربیانہ شفقت پیش نظر رکھی جائے۔

اجرت پر دودھ پلوانے کے مسائل

پھر فرمایا: وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ.
جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم بچوں کو ماؤں کے علاوہ کسی دوسری عورت کا دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ ماں زندہ ہے لیکن مناسب یہ سمجھتے ہیں کہ دودھ کسی اور سے پلوائیں۔ تو یہ بھی درست ہے۔ بچہ کی مصلحت پیش نظر

ہوتے ہوئے اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے' البتہ اس میں ایک یہ صورت پیش آ سکتی ہے کہ بچہ کی ماں کو اس کے باپ نے طلاق دے دی ہے اور عدت بھی گزر گئی ہے اور دودھ پلانے کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا تو بچہ کی ماں اگر اُجرت پر پلانا گوارا کرے تو باپ اس سے بچہ کو جدا نہ کرے اس کی والدہ ہی سے پلوائے' ہاں اگر وہ دوسری دودھ پلانے والیوں کے بہ نسبت زیادہ اُجرت مانگتی ہو' یا ماں کے دودھ میں کچھ خرابی ہو تو اس کا باپ دوسری عورت سے دودھ پلوا دے تو یہ بھی جائز ہے۔

مسئلہ: جب بچہ کو ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے اور ماں یوں کہے کہ دودھ خواہ وہ پلائے لیکن رہے میرے ہی پاس تو اس کا یہ مطالبہ صحیح ہے۔ بچہ کے باپ کو یہ مطالبہ پورا کرنا لازم ہے۔

مسئلہ: جب کسی عورت کو دودھ پلانے پر مقرر کریں تو اسکی اُجرت اچھی طرح سے طے کر لیں۔ ایسا نہ کریں کہ اُجرت طے کر کے اسے بالکل ہی نہ دیں یا جو اُجرت طے ہوئی تھی اس سے تھوڑی دیں یا ٹال مٹول کریں۔ جو کچھ طے ہوا تھا ہے قاعدہ کے موافق خوش اسلوبی سے دے دیں' اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ میں اسی کو بیان فرمایا ہے۔

مسئلہ: دودھ پلانے کے علاوہ اگر اس سے اور کوئی خدمت لینا چاہیں تو اسے بھی معاملہ میں طے کر لیں۔

مسئلہ: دودھ پلانے والی کی روٹی کپڑے پر ملازم رکھنا درست ہے۔ البتہ کھانا کپڑا کیسا ہوگا اس کی صاف صاف تصریح کر دے۔ دودھ پلانے والی کے علاوہ اور کسی ملازم کو روٹی کپڑے پر رکھنا جائز نہیں ہے۔ مذکورہ بالا احکام بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو پوری طرح دیکھنے والا ہے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ احکام شرعیہ کی پابندی کرو اور اللہ سے ڈرو۔ خلاف ورزی کر کے مؤاخذہ اور عذاب کے مستحق نہ بنو۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ تمہارا کوئی عمل اللہ تعالیٰ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو یہ بیویاں اپنی جانوں کو روکے رکھیں چار مہینے

وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ

دس دن' پھر جب وہ پہنچ جائیں اپنی میعاد کو سو تم پر کوئی گناہ نہیں اس بات میں کہ وہ عورتیں اپنی جانوں کے بارے میں

بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

خوبی کے ساتھ کوئی فیصلہ کر لیں' اور جو تم کرتے ہو اللہ اسکی خبر رکھنے والا ہے

شوہر کی موت پر عدت گزارنے کے احکام

تفسیر: اس آیت شریفہ میں اُن عورتوں کی عدت بیان فرمائی ہے جن کے شوہر وفات پا جائیں اور یہ عدت چار مہینہ دس دن ہے۔ چار ماہ دس دن تک وہ عورت کسی دوسری جگہ نکاح نہ کرے۔ جس کا شوہر وفات پا گیا ہو' اور اس زمانہ میں سوگ بھی کرے' یعنی خوشبو مہندی نہ لگائے اور بن ٹھن کر نہ رہے۔ یہ حکم حدیث شریف میں وارد ہوا ہے' واضح رہے کہ چار ماہ دس دن اس عورت کی عدت ہے جس کو حمل نہ ہو اور اس کا شوہر وفات پا جائے اگر کسی ایسی عورت کا شوہر وفات پا جائے جو حمل

سے ہو تو پھر اسکی عدت وضع حمل ہے یعنی شوہر کی موت کے بعد جتنی مدت میں بھی بچہ پیدا ہو۔ اس وقت تک وہ عورت عدت میں رہے گی۔ خواہ شوہر کی مدت کے ایک گھنٹہ بعد ہی ولادت ہو جائے۔ خواہ مہینوں لگ جائیں۔ یہ مضمون سورۂ طلاق کی آیت وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ میں بیان فرمایا ہے۔ اور سوگ کرنا بھی اس کے لئے واجب ہے۔

مسئلہ: جو عورت عدت وفات گزار رہی ہو وہ عدت ختم ہونے تک اس گھر میں رہے جس میں رہتے ہوئے شوہر کی موت ہوئی ہے۔ اگر خرچہ نہ ہو تو بقدر ضرورت روزی حاصل کرنے کے لئے دن کے اوقات میں نکل سکتی ہے۔ ضرورت پوری کر کے پھر اسی گھر آ جائے۔

مسئلہ: اگر چاند رات کو شوہر کی وفات ہوئی ہو تو مہینوں کے اعتبار سے چار ماہ دس دن پورے کرے اور اگر چاند رات گزر جانے کے بعد وفات ہوئی ہے تو ایک سو تیس دن شمار کر کے عدت پوری کرے۔

جب عدت گزر جائے تو عورتیں اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی خود مختار ہیں کہ خوبی کے ساتھ شرعی قواعد کے موافق جس سے چاہیں نکاح کر لیں۔ اولیاء اس میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ ہاں اگر کوئی خلاف شرع کام کرنے لگیں تو اولیاء کے ذمہ ہوگا کہ اس سے روکیں اور نہی عن المنکر کریں۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ میں اسی کو بیان فرمایا ہے۔ اور عورتوں کو اور انکے اولیاء کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہارے کاموں کی پوری طرح خبر ہے، اگر کسی عورت نے خلاف شرع کوئی اقدام کیا یا مردوں نے اس طرح کا اقدام کرنے دیا تو گناہ گار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اس سے کسی کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِیْٓ

اور تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ ان عورتوں کو کنایۃً نکاح کا پیغام دیدو یا اپنے دلوں میں

اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا

پوشیدہ رکھو اللہ کو معلوم ہے کہ بے شک تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے اور لیکن ان سے نکاح کا خفیہ طور پر وعدہ نہ کر لینا، مگر یہ کہ ان سے ایسی بات کہو

قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰی یَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا

جو قاعدہ کے موافق ہو اور تم نکاح کرنے کا ارادہ مت کرو یہاں تک کہ عدت قانون کے مطابق ختم ہو جائے، اور تم جان لو

اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۲۳۵﴾

کہ بے شک اللہ جانتا ہے۔ جو تمہارے دلوں میں ہے، اور سو تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

بیوہ عورتوں کو صریح پیغامِ نکاح دینے کی ممانعت

تفسیر: اس آیت شریفہ میں عدت وفات گزارنے والی عورتوں کے بارے میں ایک تنبیہ فرمائی اور وہ یہ کہ ایسی عورتوں کو صاف صریح الفاظ میں نکاح کا پیغام نہ دیا جائے ہاں اگر اشارۃً و کنایۃً ذکر کر دیا جائے مثلاً یوں کہہ دیا جائے کہ فکر نہ کرنا اللہ مالک ہے۔ اور ان شاء اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اس میں بھی کوئی گناہ نہیں کہ صرف دل میں یہ خیال کر لیا جائے کہ اسکی عدت گزر جائے گی تو اس سے نکاح کر لوں گا۔ اللہ تعالیٰ کو

سب کے دلوں کا حال معلوم ہے۔ اس نے اتنی گنجائش دے دی کہ اشارۃً و کنایۃً عورت کے کان میں بات ڈال دی جائے۔ البتہ اسکی اجازت نہیں دی کہ عدت والی عورت کو پیغام دینے والا مرد آپس میں خفیہ طریقہ پر عقد نکاح کا آپس میں وعدہ کر لے اور اسکی بھی اجازت نہیں دی کہ عدت ختم ہونے سے پہلے نکاح کریں۔

آیت کے ختم پر پھر وہی بات دُہرائی کہ اللہ تعالیٰ کو دلوں کا سب حال معلوم ہے اس سے ڈرو احکام کی خلاف ورزی نہ کرو اگر کبھی کوئی خطاء ہو جائے تو توبہ کر لو اللہ تعالیٰ غفور بھی ہے حلیم بھی ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ

کوئی گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دے دو عورتوں کو جبکہ تم نے ان کو چھوا نہ ہو اور مہر مقرر نہ کیا ہو اور ان کو

فَرِيْضَةً ۚۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا

متعہ دو گنجائش رکھنے والے پر گنجائش کے بقدر ہے اور تنگ دست پر اسکی حیثیت کے موافق ہے یہ فائدہ پہنچانا عمدہ طریقہ پر ہو

بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ

واجب ہے اچھا سلوک کرنے والوں پر۔ اور اگر تم انکو اس سے پہلے طلاق دو کہ ان کو چھوا ہو

وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا

حالانکہ ان کے لئے مہر مقرر کر چکے ہو تو اس صورت میں اس کا آدھا ہے جتنا تم نے مقرر کیا ہے، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے

الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ

جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، اور یہ بات کہ تم معاف کر دو زیادہ قریب ہے تقویٰ سے۔ اور نہ بھولو آپس میں احسان کرنے کو،

بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

بے شک اللہ اس کو دیکھنے والا ہے جو کچھ تم کرتے ہو

مہر اور متعہ کے احکام

تفسیر: ان دونوں آیتوں میں چند مسائل بیان فرمائے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو صرف نکاح کر کے طلاق دیدے نہ اسے ہاتھ لگایا ہو نہ اسکے لئے مہر مقرر کیا ہو تو اس صورت میں مہر واجب نہیں ہے۔

البتہ بطور سلوک و احسان اور دلداری کے متعہ دینا واجب ہے، یہ متعہ ایک جوڑا کپڑوں کی صورت میں ہوگا، یعنی طلاق دینے والا مرد مطلقہ عورت کو تین کپڑے دے دے، ایک کرتہ، ایک دوپٹہ اور ایک خوب چوڑی چکلی چادر جو سر سے پاؤں تک ڈھانک سکے۔ اور اس میں مرد کی حالت کا اعتبار ہوگا۔ مرد پیسہ والا ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق دے اور تنگ دست ہے تو اپنے حالات کے مطابق دے دے، اس وجوب کو مؤکد فرمانے کے لئے ارشاد فرمایا: مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ

کہ یہ نفع پہنچانا شرعی قاعدہ کے مطابق ہو جو محسنین پر واجب ہے، ہر مسلمان اپنے ایمان کی وجہ سے صفت احسان اختیار کرنے پر مامور ہے اور ہر مؤمن محسن ہے لہٰذا اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ جو لوگ فاسق اور گناہ گار ہیں۔ ان پر واجب نہیں آیت بالا سے معلوم ہوا کہ اگر مہر مقرر کئے بغیر نکاح کر لیا جائے تو نکاح ہو جاتا ہے۔ اب اس کے بعد اگر مذکورہ بالا صورت پیش آ جائے (کہ مرد نے عورت کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور طلاق دے دی) تو اس صورت میں متعہ دینا ہوگا جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور اگر مہر مقرر کئے بغیر نکاح کر لیا اور پھر میاں بیوی والی بھی ہو گئی یا خلوت سے پہلے شوہر کی وفات ہو گئی تو مہر مثل دینا ہوگا۔ جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے۔

اور اگر مہر مقرر کیا تھا لیکن طلاق خلوت سے پہلے دیدی تو اس صورت میں مقرر کردہ مہر کا آدھا دینا لازم ہوگا۔ ہاں اگر عورت بالکل ہی چھوڑ دے کچھ بھی نہ لے تو معاف ہو جائے گا، اور اگر شوہر اسے پورا ہی مہر دیدے باوجودیکہ آدھا ہی واجب تھا، یا جو پورا مہر دے چکا تھا اس میں سے آدھا واپس نہ لے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں' اَوْ یَعْفُوَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ میں یہی آخری بات بیان فرمائی ہے۔ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ وہ شوہر ہے، اور اگر مہر مقرر کیا گیا تھا اور خلوت بھی ہو گئی تھی تو پورا مہر دینا فرض ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا: وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (کہ تمہارا معاف کر دینا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے) کیونکہ معاف کرنا موجب اجر و ثواب ہے۔

پھر فرمایا: وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ احسان کرنے کو نہ بھولو آپس میں حسن سلوک سے پیش آتے رہو قال صاحب الروح (ص ۱۵۵ ج ۲) ای لا تترکوا أن یتفضل بعضکم علی بعض کالشئ المنسی

آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔ کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔ اس میں وہی تذکرہ و تنبیہ ہے جو بار بار گزر چکی ہے اور مضامین کے ختم میں بار بار دھرائی جاتی ہے۔ درحقیقت اس بات کا مراقبہ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال سے باخبر ہے۔ اور ہمارے کردار کو وہ دیکھ رہا ہے۔ سارے اعمال کو درست بنا دینے کا ذریعہ ہے۔ دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ جہاں آخرت کی مسئولیت سے ذرا غفلت ہوتی ہے وہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ضائع ہونے کے مواقع پیش آ جاتے ہیں اس لئے قرآن مجید میں بار بار اس بات کو دہرایا ہے کہ آخرت کی پیشی اور محاسبہ کو سامنے رکھیں۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴿۲۳۸﴾

پابندی کرو نمازوں کی اور درمیان والی نماز کی، اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لئے اس حال میں کہ عاجزی اختیار کئے ہوئے ہو

تمام نمازوں اور خاص کر صلوٰۃ وسطیٰ کی محافظت کا حکم

تفسیر: طلاق اور شوہر کی وفات سے متعلق بعض مسائل باقی ہیں درمیان میں نمازوں کی پابندی کا حکم فرما دیا' بندے جس حال میں بھی ہوں۔ اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں اور خاص کر نمازوں کا خوب زیادہ اہتمام کریں۔ نماز سراپا ذکر ہے' بار بار خالق کائنات جل مجدہ کی یاد کی طرف متوجہ کرتی ہیں اور اللہ کی یاد ہی اس پورے عالم کی جان ہے۔ آدمی کیسی ہی مشغولیت میں ہو نماز سے غافل نہ ہو' اور ان نمازوں میں بھی صلاۃ وسطیٰ یعنی درمیان والی نماز کا اور زیادہ دھیان رکھے۔ احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ (درمیان والی نماز) سے عصر کی نماز مراد ہے۔ اس نماز کا خصوصی دھیان رکھنے کے لئے اس لئے ارشاد فرمایا کہ عموماً تجارتی امور اور کاروبار اور بہت سے کام ایسے وقت میں سامنے آ جاتے ہیں جبکہ

نمازِ عصر کا وقت ہوتا ہے۔ مالوں کی خرید و فروخت کی گرم بازاری عصر ہی کے وقت ہوتی ہے، اس وقت میں نمازوں کی پابندی کرنیوالے بھی نمازِ عصر سے غافل ہو جاتے ہیں۔

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پانچ نمازیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرض فرمایا ہے۔ جس نے اچھی طرح ان کا وضو کیا اور ان کو بروقت پڑھا اور ان کا رکوع و خشوع پورا کیا تو اللہ کے ذمہ یہ عہد ہے کہ وہ اسکی مغفرت فرما دے گا، اور جس نے ایسا نہیں کیا تو اُس کے لئے اللہ کا کوئی عہد نہیں چاہے تو اسے بخش دے اور چاہے اسے عذاب دے۔ (رواہ ابوداؤد ص ۶۱ ج ۱) آخر میں فرمایا: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ لفظ قانتین قنوت سے لیا گیا ہے۔ جو اسم فاعل کا صیغہ ہے اسکی تفسیر کئی طرح سے کی گئی ہے۔ مطیعین، خاشعین، ساکتین، یہ سب اسکی تفسیریں ہیں۔ جو سب حضرات سلف سے مشہور ہیں۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نماز کے اندر باتیں کر لیا کرتے تھے یہاں تک کہ آیت کریمہ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ نازل ہو گئی تو ہمیں خاموشی کا حکم ہوا اور آپس میں بات کرنے سے روک دیئے گئے۔ (رواہ البخاری ص ۶۵۰ ج ۲)

نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہی پڑھا جائے اور آپس میں باتیں نہ کی جائیں۔ حضرت مجاہد تابعی نے فرمایا کہ قنوت یہ ہے کہ رکوع لمبا ہو نظر پست ہو اور خشوع حاصل ہو، اور یہ کہ کسی طرف التفات نہ کیا جائے، اور کنکریوں کو اُلٹ پلٹ نہ کیا جائے (جو بعض مسجدوں میں فرش پر پڑی رہتی تھیں) اور دنیاوی اُمور کے وسوسے اپنے دل میں نہ لائے، بعض حضرات نے قانتین کی تفسیر کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے۔ مکملین الطاعة ومُتمميها علی أحسن وجه من غير اخلال بشیء ممايتبغی فيها۔ کہ نہایت اچھے طریقہ پر طاعت کو درجہ کمال تک پہنچایا جائے اور جو چیزیں طاعت کے لئے چاہئیں ان میں سے کسی بھی چیز میں خلل نہ آنے دیا جائے۔ (روح المعانی ص ۱۰۷ ج ۲)

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ
پھر اگر تم کو خوف ہو تو کھڑے ہوئے یا سواری پر بیٹھے ہوئے نماز پڑھ لیا کرو، پھر جب تم کو امن حاصل ہو جائے تو اللہ کو یاد کرو جیسا کہ اس نے
تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾
تمہیں سکھایا ہے جو تم نہیں جانتے تھے

دشمنوں کا ہجوم ہو تو نماز کیسے پڑھی جائے؟

تفسیر: گزشتہ آیت میں تمام نمازوں کی پابندی اور خاص کر صلاۃ وسطیٰ کی پابندی کا حکم فرمایا۔ اِس آیت میں خوف اور اَمن کے حالات میں نماز پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جہاں تک بھی ممکن ہو پانچوں نمازوں کو ہر حال میں اور ہر مقام میں ضرور پڑھیں۔ بعض مرتبہ دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس موقعہ پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ باقاعدہ رکوع سجدہ کے ساتھ نماز پڑھنا ممکن نہیں ہوتا ایسی صورت میں کھڑے کھڑے اشارہ ہی سے نماز پڑھ لیا کریں۔ زمین پر اُترنے کا موقعہ نہ ہو تو سواری ہی پر پڑھ لیں۔ پھر جب امن ہو جائے اور اطمینان نصیب ہو جائے تو اسی طرح نماز پڑھو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے امن و اطمینان کے حالات میں نماز پڑھنے کی تعلیم دی ہے اگر دشمنوں کا ہجوم ہو اور کوئی صورت کسی طرح نماز

پڑھنے کو بن نہ پڑے تو مجبوراً نماز مؤخر کردے اور بعد میں قضا پڑھ لے۔ صحیح بخاری (ص ۸۴ ج ۱) میں حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ جنگ خندق کے موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور کفار قریش کو برا کہنے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نماز نہیں پڑھ سکا یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ کی قسم میں نے بھی عصر نہیں پڑھی پھر وادی بطحان کی طرف توجہ فرمائی اور آپ نے وضو کیا اور ہم نے بھی وضو کیا۔ اس کے بعد آپ نے عصر کی نماز پڑھی جبکہ سورج غروب ہو چکا تھا۔ پھر اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ خندق کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مشرکین کو بددعا دیتے ہوئے) فرمایا اللہ انکی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھردے انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ سے روک دیا یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔ (صحیح مسلم ص ۲۲۶ ج ۱)

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ

اور جو لوگ وفات پا جائیں اور چھوڑ جائیں بیویوں کو وصیت کر دیں اپنی بیویوں کے لئے متمتع ہونے کی ایک سال تک اس طور پر کہ وہ گھر

غَیْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ

سے نہ نکالی جائیں، پس اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس بات میں جو وہ اپنی جانوں کے لئے قاعدہ کے مطابق اختیار کرلیں،

وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۴۰﴾

اور اللہ عزت والا ہے، حکمت والا ہے

بیویوں کے لئے وصیت کرنا

تفسیر: زمانہ جاہلیت میں جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا تھا تو اسکی عدت ایک سال تھی، وہ ایک سال تک کسی کوٹھڑی میں پڑی رہتی تھی اور ایک سال کے بعد اس کوٹھڑی سے نکالتے تھے اور اسکی گود میں اُونٹ کی مینگنیاں بھر دیتے تھے پھر اسے باہر گلی کوچے میں نکالتے تھے۔ وہ لوگوں پر مینگنیاں پھینکتی جاتی تھی اس سے لوگ سمجھ لیتے تھے کہ اسکی عدت ختم ہوگئی جیسا کہ صحیح بخاری (ص ۸۰۳ ج ۲) اور صحیح مسلم (ص ۴۸۷ ج ۱) اور سنن ابو داؤد (ص ۳۱۴ ج ۱) میں مذکور ہے اسلام میں ایسی عورت کی عدت چار ماہ دس دن مقرر فرمادی جس کا شوہر وفات پا جائے اور وہ حمل سے نہ ہو اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اس آیت میں حکم فرمایا کہ مرنے والا اپنی بیویوں کا خیال رکھے موت سے پہلے اس بات کی وصیت کردے کہ شوہر کے ترکہ سے ایک سال تک اس کو نان ونفقہ دیا جائے، لفظ مَتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ میں اس کو بیان فرمایا ہے۔ یہ حکم پہلے تھا بعد میں منسوخ ہوگیا اور اس کے ساتھ یہ حکم تھا کہ وصیت میں یہ بھی شامل کر دیں کہ ایک سال تک اسے شوہر کے گھر سے نہ نکالا جائے، غَیْرَ اِخْرَاجٍ میں اس حکم کو بیان فرمایا ہے۔ لیکن عورت کو اختیار تھا کہ اگر وہ چاہے تو مرنے والے شوہر کے گھر میں رہے اور چاہے تو اپنے ماں باپ کے یہاں چلی جائے فَاِنْ خَرَجْنَ الخ میں اس مضمون کا بیان فرمایا ہے۔ یہ حکم آیت میراث نازل ہونے سے پہلے تھا۔ جب میراث کا حکم نازل ہوگیا اور شوہر کے مال میں بیوی کا حصہ بطور میراث مقرر کر دیا گیا تو یہ حکم کہ ایک سال تک اسے نان ونفقہ دیا جائے، منسوخ ہوگیا اور اس کے بعد یہ حکم ہوگیا کہ میراث لے لے اور خرچہ

اسی میں سے کرے۔ البتہ عدت پوری ہونے تک شوہر ہی کے گھر میں رہے۔ نہ اس میں سے نکلے نہ نکالی جائے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے فائدہ پہنچانا ہے اچھے طریقہ پر یہ ضروری قرار دیا گیا ہے متقیوں پر اسی طرح اللہ بیان فرماتا ہے اپنی آیات

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

تاکہ تم سمجھو

مطلقہ عورتوں کو متعہ دینے کی تاکید

تفسیر: جن عورتوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دیدی جائے اور مہر مقرر نہ کیا گیا ہو ان کے لئے متعہ دینے کا حکم عنقریب گذر چکا ہے۔ اس آیت میں پھر فرمایا کہ طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے نفع پہنچانا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے اس کے بارے میں بعض مفسرین نے تو یہ فرمایا ہے کہ اس سے پہلے جن عورتوں کو متعہ یعنی تین کپڑے دینے کا حکم ہوا تھا اس کو یہاں بطور تاکید دوبارہ بیان فرمایا ہے۔ صاحب روح المعانی (ص ۱۶۰ ج ۲) لکھتے ہیں کہ اسکی تعیین اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن جریر نے ابن زید سے روایت کی ہے اور وہ جو کہ جب لفظ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ نازل ہوا تو ایک شخص نے کہا کہ یہ تو احسان اور سلوک کی بات ہوئی۔ (یعنی تبرع والا معاملہ ہوا) چاہے عمل کروں چاہے نہ کروں۔ اس پر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی اور حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ فرمادیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص اس پر عمل نہیں کرے گا وہ گناہ گار ہوگا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے عدت کے زمانہ کا نان ونفقہ مراد ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بھی نفع پہنچانے میں شامل ہے۔ اور لفظ مَتَاعٌ کو اور زیادہ عام لیا جائے تو اس میں وہ سب احکام داخل ہو جاتے ہیں جو مطلقہ عورتوں سے متعلق ہیں جس میں بعض صورتوں میں پورے مہر کی ادائیگی اور بعض صورتوں میں نصف مہر کی ادائیگی واجب ہے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اگر بیوی کا مہر ادا نہیں کیا ہے تو یہ نہ سمجھے کہ اب تو میری بیوی رہی ہی نہیں اب کیا لینا دینا ہے بلکہ اب تو مہر کی ادائیگی کی فرضیت اور زیادہ مؤکد ہو گئی کیونکہ جب تک نکاح میں تھی تو معاف کر دینے کا بھی احتمال تھا اب کیوں معاف کرنے لگی۔ لہٰذا اب جلدی ادائیگی کر کے سبکدوش ہو جائے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۟

تو نے ایسے لوگوں کو دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے اور وہ تعداد میں ہزاروں تھے، پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ،

ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

پھر ان کو زندہ فرما دیا، بے شک اللہ ضرور فضل والا ہے لوگوں پر، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور قتال کرو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے

بنی اسرائیل کا ایک واقعہ

تفسیر: علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ معالم التنزیل (ص ۲۲۳ ج ۱) میں لکھتے ہیں کہ اکثر اہل علم نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک بستی جس کا نام داوردان تھا اس میں طاعون واقع ہو گیا' اس موقعہ پر ایک جماعت وہاں سے نکل گئی اور ایک جماعت بستی ہی میں رہ گئی۔ جو لوگ بستی میں رہ گئے تھے ان میں سے اکثر ہلاک ہو گئے۔ اور جو لوگ بستی چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ صحیح سلامت رہے اور پھر بستی میں آ گئے' جو لوگ بستی میں رہ گئے تھے اُنہوں نے کہا کہ ہمارے یہ ساتھی ہم سے زیادہ ہوشیار رہے۔ آئندہ ہم ایسی زمین کی طرف نکل جائیں گے جہاں وباء نہ ہو چنانچہ آئندہ سال طاعون واقع ہوا تو بستی کے تقریباً سب ہی لوگ چلے گئے اور ایک وسیع میدان میں قیام کر لیا' اس میدان میں نجات پانے کی نیت سے قیام کیا تھا لیکن ہوا یہ ایک فرشتہ نے اوپر کے حصہ سے اور ایک فرشتہ نے میدان کے نچلے والے حصہ سے پکارا اور کہا کہ مُوْتُوْا کہ تم سب مر جاؤ' چنانچہ وہ سب مر گئے۔

دوسرا قول علامہ بغوی نے یہ نقل کیا ہے کہ جو لوگ گھروں سے نکلے تھے یہ لوگ جہاد سے فرار ہوئے تھے جس کا واقعہ یوں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے ان کو حکم دیا تھا کہ دشمن سے جنگ کرنے کے لئے نکلیں ان لوگوں نے اول تو لشکر تیار کر لیا لیکن پھر اُن پر بزدلی سوار ہو گئی اور موت سے جان چھڑانے لگے' لہٰذا اُنہوں نے ایک حیلہ بنایا اور اپنے بادشاہ سے کہا کہ جس سرزمین میں جہاد کرنے کے لئے ہم کو جانے کا حکم ہوا ہے اس میں وبا پھیلی ہوئی ہے۔ جب وبا ختم ہو جائے گی تو ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان پر موت بھیج دی' جب وہیں ان کی بستی میں موتیں ہونی شروع ہوئیں تو وہ موت کے ڈر سے گھروں کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ جب بادشاہ نے یہ منظر دیکھا تو بارگاہ خداوندی میں اُس نے دعا کی کہ اے اللہ! آپ ان کو کوئی ایسی نشانی دکھا دیئے جس سے یہ سمجھ لیں کہ موت سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں' اور فرار موت سے نہیں بچا جا سکتا۔ چنانچہ جب وہ بستیوں سے نکلے تو اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا مُوْتُوْا (مر جاؤ) اور یہ بطور عقوبت و سزا کے فرمایا چنانچہ وہ لوگ مر گئے' انکے جانور بھی مر گئے اور آن واحد میں سب کو موت آ گئی۔ جیسے شخص واحد کی موت ہو وہ آٹھ دن تک اسی طرح پڑے رہے' یہاں تک کہ نعشیں ان کی پھول گئیں۔ ان کی طرف لوگ نکلے تو اتنی کثیر تعداد کو دفن کرنے سے عاجز آ گئے۔ لہٰذا اُنہوں نے ان کے چاروں طرف احاطہ بنا دیا تا کہ درندے نہ پھاڑ ڈالیں اور ان کو اسی حالت میں چھوڑ دیا' حضرت حزقیل علیہ السلام جو اس زمانہ کے نبی تھے وہ ان لوگوں پر گزرے تو کھڑے ہو گئے اور تعجب سے غور فرمانے لگے' اللہ جل شانہٗ نے ان کی طرف وحی بھیجی کیا میں تمہیں کوئی نشانی دکھاؤں عرض کیا' ہاں دکھایئے' اس پر اللہ نے ان کو زندہ فرما دیا' اور ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت حزقیل علیہ السلام نے ان کے زندہ کرنے کے لئے دعا کی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ فرما دیا' جب وہ لوگ زندہ ہو گئے تو ان کی زبان سے یہ کلمات نکلے۔

سُبحان اللّٰہ ربنا وبحمدک لا الٰہ الّا انت (اے اللہ اے ہمارے رب ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں) زندہ ہو کر یہ لوگ اپنی قوم میں چلے گئے' حضرت قتادہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بطور سزا کے موت دیدی تھی۔ کیونکہ موت سے بھاگے تھے پھر باقی عمریں پوری کرنے کے لئے زندہ کر دیئے گئے' اگر انکی عمریں ختم ہو چکی ہوتیں تو دوبارہ زندہ نہ کئے جاتے۔

یہ لوگ مقدار میں کتنے تھے جو موت کے بعد زندہ ہوئے اس کے بارے میں علامہ بغوی نے مختلف اقوال نقل کئے ہیں ۳ ہزار' ۴ ہزار' ۸ ہزار' دس ہزار' تیس ہزار سے کچھ اوپر' چالیس ہزار' ستر ہزار علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ جس نے دس ہزار

سے زیادہ کہا وہ قول زیادہ مناسب ہے کیونکہ لفظ اُلوف جمع کثرت ہے جس کا دس ہزار سے کم پر اطلاق نہیں ہوتا۔

یہ جو کچھ معالم التنزیل سے نقل کیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی کتب تفسیر میں واقعات کچھ نقل کئے گئے ہیں۔ بظاہر یہ سب واقعات اسرائیلیات ہیں اور ان قصوں کے جاننے پر قرآن کا مفہوم سمجھنا موقوف بھی نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے ایک واقعہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہزاروں انسانوں کو موت دیدی پھر ان سب کو زندہ فرما دیا' اللہ تعالیٰ کی قوت کاملہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسے موت دینے اور پھر زندہ کرنے پر قدرت ہے۔ ایک جان کی موت وحیات اور ہزاروں جانوں کی موت وحیات اس کے لئے سب برابر ہیں۔ آن واحد میں وہ ہزاروں افراد کو موت دے سکتا ہے اور زندہ بھی کر سکتا ہے۔ اس واقعہ میں خاص کر بنی اسرائیل کے لئے تذکیر ہے۔ کیونکہ انہیں اپنے خاندانوں کے واقعات یاد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اُمّی تھے۔ آپ کو ان باتوں کا پتہ نہ تھا' اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ باتیں بتائی ہیں۔ اور یہ آپ کی نبوت کے دلائل میں سے روشن دلیل ہے۔ دوسری آیت میں یہ جو فرمایا کہ اللہ کی راہ میں قتال کرو اس کے بارے میں مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ اُن لوگوں کو خطاب ہے جو موت کے بعد زندہ کئے گئے تھے۔ اور یہ بات ان مفسرین کے بیان سے جوڑ بھی کھاتی ہے جنہوں نے فرمایا کہ ان لوگوں نے جہاد سے بچنے کے لئے راہ فرار اختیار کی تھی' اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ اس میں اُمت محمدیہ کو خطاب فرمایا ہے اور ان کو جہاد کا حکم دیا ہے اس قول کے مطابق بنی اسرائیل کے واقعہ کو حکم جہاد کی تمہید کہا جا سکتا ہے کہ جہاد میں شریک ہونے سے موت کا خوف مانع نہ ہونا چاہئے موت کے ڈر سے بھاگنا موت سے بچا نہیں سکتا۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں آدمی بھاگ کھڑے ہوئے تھے لیکن موت نے ان کو نہ چھوڑا' اللہ کی راہ میں جہاد کرنا آخرت کے بہت بڑے اجر و ثواب اور اعلاء کلمۃ اللہ کا ذریعہ ہے جو جہاد نہ کریگا موت اسکو بھی آئے گی پھر کیوں اجر و ثواب کو کھوئے بعض اہل تفسیر کے قول کے مطابق وہ لوگ طاعون سے بھاگے تھے جو بنی اسرائیل کے لئے عذاب تھا اور اس امت کے لئے رحمت ہے ہمارے نبی فخر الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

طاعون ایک عذاب ہے اللہ جس پر چاہتا ہے اُسے بھیج دیتا ہے۔ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اُسے مومنین کے لئے رحمت بنایا ہے' جو بھی کوئی شخص کسی ایسی جگہ موجود ہو جہاں طاعون واقع ہو گیا ہو اور صبر کرتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے وہیں ٹھہرا رہے کہ مجھے اس کے سوا کچھ (ضرر) نہیں پہنچ سکتا۔ جو اللہ نے میرے لئے لکھ دیا ہے' تو ایسے شخص کے لئے ایک شہید کا ثواب ہے۔ (رواہ البخاری ص ۸۵۳ ج ۲)

یہ تو اس شخص کے لئے ہے جو طاعون کی جگہ ثابت قدم رہا۔ وہاں سے گیا نہیں اور طاعون میں مبتلا نہ ہوا۔ صبر و استقامت کی وجہ سے اسے شہید کا ثواب ملے گا اور جو شخص طاعون میں مر گیا تو وہ بھی شہیدوں میں شمار ہے۔ (کما رواہ البخاری ص ۸۵۳ ج ۲)

حضرت عبداللہ بن عوف اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم سنو کہ کسی سرزمین میں طاعون ہے تو وہاں نہ جاؤ اور جب کسی ایسی سرزمین میں طاعون آجائے جہاں تم موجود ہو تو اس سے بھاگنے کے لئے مت نکلنا (رواہ البخاری ص ۸۵۳ ج ۲)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص طاعون سے بھاگے تو وہ ایسا ہے جیسے میدان جہاد سے بھاگا اور جو صبر کرتے ہوئے وہیں رہے اس کیلئے ایک شہید کا ثواب ہے۔ (رواہ احمد کما فی المشکوٰۃ ص ۱۳۹ ج ۱)

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ

کون ہے جو قرض دے اللہ کو قرض حسن' پھر اللہ اُس کے لئے اضافہ فرما دے چند در چند بہت سے اضافے فرما کر اور اللہ تنگی فرماتا ہے

وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اور کشادہ فرماتا ہے' اور اسکی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے

اللہ کی رضا کیلئے صدقہ خیرات کرنیکی فضیلت

تفسیر: لباب النقول میں اس آیت کریمہ کا سبب نزول بتاتے ہوئے بحوالہ ابن حبان وغیرہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب آیت شریفہ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ (آخر تک) نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا رَبِّ زِدْ اُمَّتِیْ (یعنی اے میرے رب میری اُمت کو اور زیادہ عطا فرما) اس پر آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے استفہام کا طریقہ اختیار فرمایا ہے (جو ترغیب کا بہت عمدہ طریقہ ہے) کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دیتا ہے۔ قرض کا معنی تو سب ہی جانتے ہیں اور حسن اچھے کے معنی میں آتا ہے۔ صاحب روح المعانی (ص ۱۶۲ ج ۲) لکھتے ہیں کہ اخلاص کے ساتھ خرچ کرنا اور حلال اور طیب مال خرچ کرنا یہ سب قرض حسن کے عموم میں داخل ہے اھ اللہ تعالیٰ شانہٗ محتاج نہیں ہے سب کچھ اسی نے پیدا فرمایا اور سب اسی کی ملکیت ہے۔ جو لوگ مجازی مالک ہیں وہ اور اُن کے اموال سب اللہ ہی کی ملکیت ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کا کتنا بڑا فضل ہے اور شان کریمانہ ہے کہ اس کو دیئے ہوئے میں سے جو شخص اس کی مخلوق پر خرچ کرے جو خرچ کرنے والے کی اپنی جنس ہے حتیٰ کہ اپنے اُوپر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے اور اس میں ثواب سمجھے تو اس کا نام قرض رکھ دیا۔ اور پھر جتنا دیا ہے اس سے بہت زیادہ عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا جس کو اپنی آیت میں اَضْعَافًا كَثِیْرَةً فرمایا ہے کسی نے کیا خوب کہا۔

مالِ عالم ملک تست و مالکاں مملوک تو ﴿﴾ باوجود ایں بے نیازی اقرضوا اللہ گفتۂ

صحیح بخاری (ص ۱۸۹ ج ۱) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب کوئی شخص ایک کھجور کے برابر حلال مال سے صدقہ کرے اور اللہ تعالیٰ صرف حلال ہی کو قبول فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما لیتا ہے پھر اسکی تربیت فرماتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے گھوڑے کے بچہ کی تربیت کرتا ہے اور وہ ذرا سا صدقہ بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔

صحیح مسلم (ص ۲۵۸ ج ۲) میں ہے کہ روزانہ رات کو جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کون ہے جو مجھ سے دعا کرے میں اسکی دعا قبول کروں۔ کون ہے جو مجھ سے سوال کرے میں اسکو دے دوں' کون ہے جو مجھ سے مغفرت مانگے میں اسکی مغفرت کر دوں' کون ہے جو ایسے کو قرض دے جس کے پاس سب کچھ ہے اور جو ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ صبح تک یوں ہی فرماتے رہتے ہیں۔ یہ جو فرمایا کہ کون ہے جو ایسے کو دے جس کے پاس سب کچھ ہے اس میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کے مال کی حاجت نہیں ہے اسکی ملکیت میں سب کچھ ہے' کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ ضرورت مند کو دے رہا ہوں' بلکہ اپنا فائدہ سمجھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اور یہ جو فرمایا کہ وہ ظلم کرنے والا نہیں ہے اس میں یہ بتایا کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے ضائع نہ جائے گا اس کے مارے جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔

پھر فرمایا: وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ اللہ تعالیٰ تنگی کرتا ہے اور کشادہ فرماتا ہے۔ اور اسکی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ جس کو جتنا چاہے دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسکی روزی تنگ کر دے اس کا بھی اسے اختیار ہے اس پر کوئی پابندی لگانے والا نہیں۔ کسی کو زیادہ دینا اور دے کر کم کر دینا سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اس مضمون کو قرآن کریم میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: اِنَّ رَبَّكَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا (بلا شبہ تیرا رب جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق عطا فرماتا ہے اور تنگی فرما دیتا ہے۔ بلا شبہ وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے دیکھنے والا ہے) یہ مضمون سورۃ العنکبوت رکوع نمبر ۶ اور سورۂ سباء رکوع نمبر ۴ اور رکوع نمبر ۵ میں بھی مذکور ہے۔ آخر میں یہ جو فرمایا وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ اس میں یہ بتایا کہ اللہ کے لئے خرچ کیا ضائع نہیں ہے۔ جب اللہ کے یہاں پہنچو گے سب کا ثواب پا لو گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا

کیا آپ کو بنی اسرائیل کی ایک جماعت کا قصہ معلوم ہے جو موسیٰ کے بعد پیش آیا، جب انہوں نے اپنے نبی سے عرض کیا کہ مقرر کر دیجئے ہمارے لئے

مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا

ایک بادشاہ تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں، انہوں نے فرمایا کیا ایسا ہو گا کہ اگر تم پر قتال فرض کیا گیا تو

تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ

تم قتال نہ کرو؟ وہ کہنے لگے اور ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال نہ کریں حالانکہ ہم نکال دیئے گئے ہیں اپنے گھروں سے اور

اَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾

اپنے بیٹوں کے پاس سے، پھر جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو پھر گئے سوائے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ

اور کہا ان سے ان کے نبی نے بیشک اللہ نے مقرر فرما دیا تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ وہ کہنے لگے کہ ان کو ہم پر حکمران ہونے کا حق کیسے پہنچتا ہے

عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ

حالانکہ ہم ان سے زیادہ حکمرانی کے مستحق ہیں اور انکو مالی گنجائش نہیں دی گئی، ان کے نبی نے کہا کہ بے شک اللہ نے ان کو تم پر حکمرانی

عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ

کے لئے منتخب فرمایا ہے، اور ان کو علم میں اور جسم میں فراخی عطا فرمائی ہے۔ اور اللہ اپنا ملک جسے چاہے دے اور اللہ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ

وسعت والا ہے علم والا ہے۔ اور کہا ان سے ان کے نبی نے کہ بلاشبہ ان کے حکمران ہونے کی یہ نشانی ہے کہ آ جائے گا تمہارے پاس تابوت جس میں تسکین ہے

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جنہیں چھوڑا تھا آل موسیٰ اور آل ہارون نے جس کو فرشتے اٹھا کر لے آئیں گے۔ بے شک اس میں

لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

ضرور نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان والے ہو۔

بنی اسرائیل کا ایک واقعہ اور طالوت کی بادشاہت کا ذکر

تفسیر: ان آیات کریمہ میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان فرمایا ہے۔ پورا واقعہ پارہ کے ختم کے قریب تک بیان ہوا ہے۔ اس واقعہ میں بنی اسرائیل کے لئے جہاں تذکیر کی نعمت ہے وہاں اُمت محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والتحیۃ) کے لئے بھی بہت سی

عبرتیں ہیں، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد انہی کی قوم میں سے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے جو یکے بعد دیگرے آتے رہے، حضرت یوشع، حضرت شمعون، حضرت شمویل اور حضرت کالب بن یوقنا اور حضرت حزقیل علیہم السلام کے اسماء گرامی لکھے ہیں۔ یہ حضرات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تبلیغ اور توریت شریف کے مضامین بیان فرماتے تھے۔ بنی اسرائیل میں شدہ شدہ بے دینی بلکہ بد دینی تک آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط فرما دیا۔ جو جالوت کی قوم میں سے اور عمالقہ میں سے تھے اور بحر روم کے ساحل پر مصر و فلسطین کے درمیان رہتے تھے۔ یہ لوگ بنی اسرائیل پر غالب ہو گئے۔ انکی زمین چھین لی اور ان کو اور ان کی اولاد کو جن میں ان کے بادشاہوں کی نسل کے لوگ بھی تھے قید کر لیا اور ان پر جزیہ لگا دیا۔ بنی اسرائیل اس موقع پر بہت ہی زیادہ مصیبت اور سختی میں مبتلا رہے کوئی ایسا نہ رہا جو اُن کا قائد اور مدبر ہوتا۔ جب بہت زیادہ دُکھ اور تکلیف میں مبتلا ہوئے تو اس زمانہ میں جو اُن کے نبی تھے۔ (اور اسی مصیبت کے زمانہ میں وہ پیدا ہوئے اور بڑے ہو کر نبوت سے سرفراز ہوئے) انکی خدمت میں بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ اللہ پاک کی طرف سے آپ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کرا دیں تا کہ ہم ان کے ساتھ مل کر دشمنوں سے جہاد کریں اور ان کو اپنے علاقوں سے نکال دیں (چونکہ بنی اسرائیل کو سیاسی حالات میں بادشاہوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی عادت تھی اس لئے انہوں نے ایسا سوال کیا) جب ان لوگوں نے کسی کو بادشاہ بنانے کا سوال کیا اور دشمنوں سے جہاد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کے نبیؑ نے جو ان کے حال اور قال کو جانتے تھے۔ خطرہ ظاہر کیا اور فرمایا کہ تم سے تو یہ اُمید ہے کہ قتال فرض ہو گیا تو جنگ سے دور بھاگو گے اور لڑائی سے جان چھڑاؤ گے اس پر وہ کہنے لگے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں۔ جنگ نہ لڑنے کا کوئی سبب نہیں بلکہ لڑنے کا سبب موجود ہے اور وہ یہ کہ دشمن نے ہم پر جو تسلط کر رکھا ہے اسکی وجہ سے ہم اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں اور اپنی اولادوں سے دور کر دیئے گئے ہیں۔ باتیں تو بڑھ چڑھ کر کر رہے تھے لیکن جب قتال فرض ہو گیا تو وہ خطرہ سامنے آ گیا جو ان کے نبی کو تھا اور تھوڑے لوگوں کے علاوہ باقی سب ارادوں اور وعدوں سے پھر گئے اور جنگ کرنے سے منہ موڑ لیا۔ اللہ جل شانہٗ نے انکی درخواست پر حضرت طالوت کو بادشاہ بنا دیا اور ان کے نبی نے اس کا اعلان کر دیا۔ عمل اور کارگزاری حضرت طالوت کی تھی اور مشورہ اور رہبری ان کے نبی کی تھی۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ نبی جس سے مذکورہ بالا درخواست کی تھی۔ حضرت شمعون علیہ السلام تھے۔

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکی درخواست پر حضرت طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا گیا تو اپنی روایتی کجروی کے باعث اُسی طرح کی اُلٹی باتیں کیں جیسا کہ ان کا مزاج تھا اور پرانا طریقہ کار تھا۔ ان کی اس طرح کی باتیں ذبح بقرہ کے واقعہ کے سلسلہ میں گزر چکی ہیں۔ حضرت طالوت کی بادشاہت کا اعلان سننے کے بعد کہنے لگے کہ یہ شخص ہمارا بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے اس کے پاس پیسہ ہے نہ کوڑی، اس سے زیادہ تو ہم بادشاہ بننے کے مستحق ہیں اپنی جہالت سے وہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کو بھی رائے دینے لگے کہ اس کے بجائے ہم میں سے کوئی پیسہ والا بادشاہ ہونا چاہئے۔ اور یہ انسان کا عجیب مزاج ہے کہ وہ پیسہ والا کو بڑا آدمی سمجھتا ہے خواہ کیسا ہی بے علم اور نا سمجھ اور بخیل ہو۔

ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو منتخب فرما لیا ہے تم پر ان کو ترجیح دے دی اور حکومت کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اس میں پوری طرح موجود ہے حکومت کے لئے علم ہونا چاہئے جس کے ذریعہ وہ تدبیر امور کر سکے اور دشمنوں سے نمٹ سکے اور ساتھ ہی جسمانی قوت بھی ہونی چاہئے علم کی تدبیر اور جسم کی قوت سے ہمت ہوتی ہے اور حوصلہ بلند ہوتا ہے اور دشمنوں پر غلبہ پانے کے لئے انہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور یوں بھی اللہ کو اختیار ہے وہ جس کو چاہے حکومت اور مملکت عطا فرمائے، تمہیں اعتراض کا کیا حق ہے اور اللہ کے فیصلہ کے خلاف تم رائے دینے والے کون ہو اُسے معلوم ہے کہ حکومت ملنے پر کوئی کیا کرے گا اور کیسا ثابت ہوگا۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ایک نبی کا فرمانا بات ماننے کے لئے اور حضرت

طالوت کو بادشاہ تسلیم کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن ان کے نبی نے حضرت طالوت کی بادشاہت کا ثبوت دینے کے لئے ایک نشانی بھی بیان فرمائی اور وہ یہ کہ تمہارے پاس وہ تابوت آئے گا جو تمہارے لئے باعثِ اطمینان وسکون ہوگا۔ اس تابوت میں ان چیزوں کا بقیہ ہوگا جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے چھوڑی تھیں چنانچہ وہ تابوت ان لوگوں کے پاس آ گیا جسے فرشتے اُٹھائے ہوئے تھے، دشمنوں نے ان سے چھین لیا تھا جب یہ تابوت انکے پاس تھا تو دشمنوں سے جنگ کرتے وقت اُن کو سامنے رکھا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ دشمن پر فتح یابی حاصل کر لیتے تھے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے جو چیزیں چھوڑی تھیں ان کا بقیہ کیا تھا جو اس تابوت میں تھا۔ اس کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ توراۃ شریف کی دو تختیاں تھیں اور اُن تختیوں کا کچھ چورا تھا جو ٹوٹ گئی تھیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا اور حضرت ہارون علیہ السلام کی پگڑی تھی، اور کچھ من بھی تھا جو سلویٰ کے ساتھ بنی اسرائیل پر نازل ہوا کرتا تھا۔ اس تابوت کا ان کے پاس فرشتوں کا لیکر آنا اور دوبارہ واپس مل جانا اس بات کی صریح دلیل تھی کہ حضرت طالوت کو واقعی اللہ تعالیٰ نے بادشاہ بنایا ہے۔ فرشتے یہ تابوت لائے اور حضرت طالوت کے سامنے رکھ دیا لیکن بنی اسرائیل سے پھر بھی یہ بعید نہ تھا کہ انکار کر بیٹھیں اس لئے ان کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (تمہارے لئے اس میں نشانی ہے اگر تم مومن ہو)۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَھَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْہُ

طالوت لشکروں کے ساتھ روانہ ہوئے تو انہوں نے کہا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر کے ذریعہ آزمانے والا ہے سو جس نے اس میں سے پی لیا

فَلَیْسَ مِنِّیْ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَۃًۢ بِیَدِہٖ فَشَرِبُوْا

وہ مجھ سے نہیں ہے اور جس نے اس میں سے نہ پیا تو وہ مجھ سے ہے سوائے اس شخص کے جس نے اپنے ہاتھ سے ایک چلو پی لیا' پھر تھوڑے سے افراد کے علاوہ

مِنْہُ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْھُمْ فَلَمَّا جَاوَزَہٗ ھُوَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ قَالُوْا لَا طَاقَۃَ لَنَا

سب نے اس میں سے پی لیا پھر جب آگے بڑھے طالوت اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ایمان لائے تھے تو کہنے لگے کہ

الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِہٖ قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوا اللّٰہِ کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ

آج ہمیں جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے، جو لوگ اللہ کی ملاقات کا یقین رکھتے تھے وہ کہنے لگے کتنی ہی

قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃًۢ بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ

کم تعداد جماعتیں اللہ کے حکم سے بھاری تعداد والی جماعتوں پر غالب ہو چکی ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جب یہ لوگ جالوت

وَجُنُوْدِہٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ

اور اس کے لشکروں کے مقابلہ کے لئے نکلے تو عرض کیا کہ اے ہمارے رب ہم پر صبر ڈال دے اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور

الْکٰفِرِیْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَھَزَمُوْھُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ وَالْحِکْمَۃَ

کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔ سو ان کو شکست دے دی اللہ کے حکم سے اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو اور اللہ نے انکو ملک دیدیا حکمت

وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ

عطا فرما دی' اور ان کو جو کچھ چاہا علم دے دیا اور اگر نہ ہوتا اللہ کا دفع فرمانا لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعہ تو

الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا

زمین میں فساد ہو جاتا اور لیکن اللہ جہانوں پر فضل فرمانے والا ہے۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم آپ پر تلاوت کرتے ہیں

عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

اور بلا شبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں

طالوت کے لشکر کا عمالقہ پر غالب ہونا اور جالوت کا مقتول ہونا

تفسیر: جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کا حکمران مقرر کر دیا گیا اور انکے نبی کی خبر کے مطابق مذکورہ تابوت فرشتے لے کر آ گئے تو اب بنی اسرائیل کے لئے کوئی حجت باقی نہیں رہی' اور جہاد کرنے کے لئے نکلنا پڑا۔ جب دشمن سے جنگ کرنے کے لئے روانہ ہوئے تو حضرت طالوت نے اپنے لشکروں سے فرمایا کہ تم لوگوں کا امتحان ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو مبتلا فرمائے گا اور یہ ابتلاء اور امتحان ایک پانی کی نہر کے ذریعہ ہوگا' چونکہ گرمی سخت تھی اور پیاس سے بے تاب ہو رہے تھے اس لئے اکثر افراد امتحان میں ناکام ہو گئے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ نہر فلسطین تھی اور بعض حضرات کا قول ہے کہ اردن اور فلسطین کے درمیان کوئی نہر تھی جس کا پانی میٹھا تھا' حضرت طالوت نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ دیکھو اس میں سے چلو بھر پانی پینے تک تو بات ٹھیک ہے جس نے چلو بھر پانی پی لیا وہ تو میرا ساتھی ہے میرے آدمیوں میں ہے اور جس نے زیادہ پانی پی لیا وہ مجھ سے نہیں ہے میری جماعت میں اس کا شمار نہیں' چونکہ اکثر افراد نے خوب پانی پی لیا تھا اس لئے ان کے حوصلے پست ہو گئے اور جی چھوڑ بیٹھے اور ہمت ہار گئے اور کہنے لگے ہم تو آج اپنے دشمن جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں۔ ہماری بساط نہیں کہ ہم ان سے لڑ سکیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ جو لوگ حضرت طالوت کے ساتھ روانہ ہوئے تھے وہ ستر یا اسی ہزار تھے ان میں سے تھوڑے ہی سے رہ گئے جنہوں نے پانی نہیں پیا' جن لوگوں نے پانی نہیں پیا تھا انکی تعداد تین سو تیرہ لکھی ہے۔ یہ تھوڑا سا ایک چلو پانی جن لوگوں نے پیا اللہ تعالیٰ نے اتنے ہی پانی کو ان کے لئے کافی فرما دیا ان کی پیاسیں اس سے بجھ گئیں اور جن لوگوں نے ڈٹ کر پانی پی لیا تھا وہ وہیں نہر کے کنارے پھیل گئے اور بزدل ہو کر گر پڑے' جو لوگ حضرت طالوت کے ساتھ آگے بڑھے اور دشمن کی طرف پیش قدمی کی وہ دشمن کے مقابلے میں بہت تھوڑے تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ ہمیں اللہ کے پاس جانا ہے۔ میدان جہاد سے بھاگنا مؤمن کا شیوہ نہیں۔ ہمیں جہاد کرنا ہی کرنا ہے۔ رہا ہماری جماعت کا کم تعداد ہونا تو اللہ کی مدد کی اُمید رکھنے والوں کے لئے یہ بات سوچنے کی نہیں ہے بہت سی کم تعداد جماعتیں بڑی بھاری تعداد والی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب ہو چکی ہیں۔ صبر و ثابت قدمی اللہ کی مدد کو لانے والی ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ جب حضرت طالوت کا لشکر دشمن سے جہاد کرنے کے لئے جا رہا تھا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے ایک تھیلے میں چند پتھر رکھ لئے تھے جب دونوں فریق مقابل

ہوئے تو جالوت نے کہا کہ تم لوگ اپنے میں سے ایک شخص نکالو جو مجھ سے جنگ کرے اگر اس نے مجھے قتل کر دیا تو میرا ملک تمہارا ہو جائے گا۔ اور میں نے قتل کر دیا تو تمہارا ملک میرے ملک میں شامل ہو جائے گا۔ حضرت طالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو جالوت کے مقابلہ کے لئے روانہ کرنا چاہا اور ان کو ہتھیار پہنچا دیئے' حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اس سے جنگ کرنے کے لئے ہتھیار پہننا منظور نہیں ہے۔ اصل اللہ کی مدد ہے اگر اللہ نے مدد نہ فرمائی تو کوئی ہتھیار کام نہیں دے سکتا۔ یہ کہہ کر جالوت سے مقابلہ کرنے کے لئے نکلے۔ جالوت نے کہا کہ تم مجھ سے مقابلہ کرو گے انہوں نے فرمایا کہ ہاں' جالوت نے کہا تم تو یہ پتھر اور غلیل لے آئے جس سے کتے کو مارا جاتا ہے' حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ تو اللہ کا دشمن ہے کتے سے بھی بدتر ہے یہ کہہ کر اپنی غلیل سے ایک پتھر مارا جو اسکی آنکھوں کے درمیان لگا اور دماغ میں گھس گیا۔ اس سے جالوت کا کام تمام ہوا اور اس کے لشکر نے شکست کھائی۔ جالوت جو اُن کا دشمن تھا اور قوم عمالقہ کا بادشاہ تھا اس سے اور اس کے لشکروں سے آمنا سامنا ہوا' دونوں فریق صف آرا ہوئے تو حضرت طالوت کے ساتھیوں نے اللہ تعالیٰ سے صبر کی اور ثابت قدمی کی اور کافروں کے مقابلہ میں فتح یاب ہونے کی دعا کی۔ جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں جالوت اور اس کے لشکروں کو شکست ہوئی' اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت طالوت کے لشکر کو فتح یابی ہوئی' اور دشمن نے باوجود کثیر تعداد ہونے کے شکست کھائی' اس جہاد میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی شریک تھے۔ ان کے ہاتھ سے جالوت قتل ہوا۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہوا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکومت عطا فرما دی جس کا ذکر سورۂ صٓ کے پہلے رکوع میں فرمایا ہے۔ حضرات مفسرین نے فرمایا ہے کہ ملک سے حکومت اور حکمت سے نبوت مراد ہے اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو دونوں سے سرفراز فرمایا صاحب روح المعانی (ص ۱۷۳ ج ۲) لکھتے ہیں کہ انکے زمانہ کے جو نبی تھے انکی وفات کے بعد اور طالوت کی وفات کے بعد ان کو نبوت اور بادشاہت دی۔ جس کا اجمالی طور پر وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ میں تذکرہ فرمایا ہے مذکورہ قصہ جہاد بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ فرماتا تو زمین فساد والی ہو جاتی اور لیکن اللہ تعالیٰ جہانوں پر فضل فرمانے والا ہے) وہ قوت اور شوکت والوں کی طاقت کو دوسرے لوگوں کے ذریعہ دفع فرماتا رہتا ہے اور ظالمین تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کسی ایک ہی علاقہ یا ایک ہی قوم کی قوت و شوکت ہمیشہ رہتی تو وہ ساری دنیا کو مصیبت میں ڈال دیتے اور سب کو مقہور و مجبور بنا لیتے' اور ہمیشہ طغیانی سرکشی کرتے رہتے۔

آخر میں فرمایا ''کہ یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم حق کے ساتھ آپ پر تلاوت کرتے ہیں اور بلا شبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں''۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کتابیں پڑھی تھیں' نہ پرانی تاریخیں سنی تھیں۔ اس لئے ان واقعات کا علم ہو جانا اور لوگوں کو بتانا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بتایا گیا ہے۔ **قال صاحب الروح قوله تعالىٰ (وانک لمن المرسلين) حيث تخبر بتلک الآيات والقرون الماضية على ما هي عليه من غير مطالعة كتاب ولا اجتماع بأحد يخبر بذلک** (ص ۱۷۵ ج ۲)۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ

یہ رسول ہیں ہم نے فضیلت دی ان میں بعض کو بعض پر، ان میں بعض سے اللہ نے کلام فرمایا اور

بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ

بعض کو درجات کے اعتبار سے بلند فرمایا اور ہم نے دیئے عیسیٰ بن مریم کو کھلے کھلے معجزات، اور ہم نے انکی تائید کی روح القدس کے ذریعہ

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ

اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ آپس میں جنگ نہ کرتے جو اُن کے بعد تھے اس کے بعد کہ آئے ان کے پاس کھلے ہوئے معجزات، لیکن

اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ

انہوں نے آپس میں اختلاف کیا سو ان میں سے بعض وہ تھے جو ایمان لائے اور بعض وہ تھے جنہوں نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ آپس میں جنگ نہ کرتے لیکن

اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے

حضرات انبیاء علیہم السلام کے درمیان فرقِ مراتب

تفسیر: لفظ تلک اسم اشارہ ہے اس کا مشار الیہ المرسلین ہے یعنی یہ پیغمبر جن کا ذکر ابھی ابھی ہوا ان کو ہم نے آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت دی کہ بعض کو ایک منقبت سے متصف فرما دیا جو بعض دوسروں میں نہیں تھی اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے تفضیل بالشرائع مراد ہے۔ ان میں سے بعض کو مستقل شریعت دی اور بعض کو سابق نبی ہی کی شریعت کا مؤید و مبلغ بنایا' صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں (ص ۲ ج ۳) پہلے قول کی تائید مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ سے ہوتی ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے بعض ایسے حضرات تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو سب ہی کلیم اللہ کے نام سے جانتے ہیں۔ سورۃ النساء میں فرمایا وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا اور اس کلام سے بلاواسطہ کلام مراد ہے جس میں فرشتے کا واسطہ نہیں تھا۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ان حضرات میں شامل ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ کلام فرمایا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی ایک دوسرے پر فضیلت بیان کرتے ہوئے وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ بھی فرمایا یعنی بعض انبیاء کے درجات دوسرے بعض انبیاء کے مقابلہ میں زیادہ بلند فرمائے۔ صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں کہ یہاں بَعْضَهُمْ سے سرورِ عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے آپ کو وہ وہ خواص علمیہ و عملیہ عطا فرمائے کہ زبانیں ان کو پوری طرح ذکر کرنے سے عاجز ہیں' آپ رحمۃ للعالمین ہیں' صاحب الخلق العظیم آپ کی صفت خاص ہے۔ آپ پر قرآن کریم نازل ہوا جو پوری طرح محفوظ ہے۔ آپ کا دین ہمیشہ باقی رہنے والا ہے جو معجزات کے ذریعے مؤید ہے۔ مقامِ محمود اور شفاعت عظمیٰ کے ذریعہ آپ کو رفعت دی گئی ہے اور آپ کے فضائل اور مناقب اتنے زیادہ ہیں جن کا شمار کرنا بندوں کے بس سے باہر ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی کی کتاب الخصائص الکبریٰ' اور امام بیہقی کی کتاب دلائل النبوۃ کا مطالعہ کیا جائے آخر الذکر کتاب سات جلدوں میں ہے جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

پھر ارشاد فرمایا وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَاَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح معجزات عطا کئے اور روح القدس (یعنی جبریل علیہ السلام) کے ذریعہ انکی تائید کی اُسکی تفسیر وتشریح سورۃ البقرہ کے رکوع نمبر ۱۲ میں گزر چکی ہے پھر ارشاد فرمایا: وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ (الآیۃ) اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ آپس میں جنگ اور قتل وقتال نہ کرتے۔ جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے تشریف لیجانے کے بعد آپس میں مختلف ہو گئے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی امتیں آپس میں اختلاف کرتی رہیں اور ان میں لڑائیاں ہوتی رہیں حالانکہ ان کے پاس کھلے ہوئے دلائل موجود تھے۔ اگر ان کو سامنے رکھتے تو نہ مختلف ہوتے نہ جنگ کرتے ان میں بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے ایمان قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام کے متبع بنے اور بہت سے لوگوں نے کفر اختیار کیا اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی تو ان کا آپس میں قتل وقتال نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ قادر مطلق اور فاعل مختار ہے وہ جو چاہے کرے اس پر کسی کا اعتراض ہو نہیں سکتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ

اے ایمان والو اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے کہ جس میں نہ بیع

فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

ہو گی نہ دوستی اور نہ سفارش اور جو کافر ہیں وہ ظلم کرنے والے ہیں

روز قیامت آنے سے پہلے پہلے اللہ کیلئے خرچ کرلو

تفسیر: اس آیت شریفہ میں مال خرچ کرنے کا حکم فرمایا ہے اور لفظ رَزَقْنٰكُمْ میں یہ بتادیا کہ یہ مال ہمارا دیا ہوا ہے۔ جس نے مال دیا اس کو پورا پورا حق ہے کہ مال خرچ کرنے کا حکم فرمائے نیک کاموں میں فرائض واجبات کے مصارف بھی ہیں اور مستحب ونفلی صدقات بھی اور جس طرح بدنی عبادات (نماز روزہ) آخرت کے عذاب سے بچانے کا ذریعہ ہیں۔ اسی طرح مالی عبادات اس کا سبب ہیں۔

صحیح بخاری (ص ۱۹۱ ج ۱) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ (دوزخ سے بچو اگرچہ آدھی ہی کھجور کا صدقہ کردو) قیامت کا دن بہت سخت ہوگا نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ ایمان اور اعمال صالحہ ہی کام دیں گے۔ اس دن نہ بیع ہوگی، نہ دوستی نہ سفارش لہٰذا اس دن نجات پانے اور عذاب سے بچنے کے لئے اعمال صالحہ کرتے رہنا چاہئے۔ اعمال صالحہ میں اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرنا بھی شامل ہے۔

یہ جو فرمایا کہ "اس دن بیع نہیں ہوگی" اس کے بارے میں حضرات مفسرین لکھتے ہیں کہ اس سے فدیہ یعنی جان کا بدلہ مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن کوئی جان کسی جان کے بدلہ عذاب بھگتنے کے لئے تیار نہیں ہوگی جیسا کہ سورۃ البقرہ کے چھٹے رکوع میں فرمایا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا اور فدیہ کی صورت میں کیونکہ مبادلہ ہوتا ہے اس لئے اسے بیع سے تعبیر فرمایا۔ اور جو فرمایا اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ سوائے ان لوگوں کے جو صفت تقویٰ سے متصف تھے) وَلَا شَفَاعَةٌ فرما کر شفاعت یعنی سفارش کی نفی فرمادی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کے لئے اُس دن کوئی شفاعت نہ ہوگی۔ جیسا کہ سورۃ المؤمن میں فرمایا: مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (کہ ظالموں کے لئے نہ کوئی دوست ہوگا نہ سفارش کرنے والا ہوگا جس کی

بات مانی جائے) اہل ایمان کے لئے جو شفاعت ہوگی اس میں اسکی نفی نہیں ہے جس کو سفارش کرنے کی اجازت ہوگی وہی سفارش کر سکے گا اور جس کے لئے سفارش کرنے کی اجازت ہوگی اس کے لئے سفارش ہو سکے گی۔

آیت کے ختم پر فرمایا وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (کفر کرنے والے ظالم ہی ہیں) اُنہوں نے معبود حق سے منہ موڑا اور خالق و مالک سے منحرف ہوگئے۔ ایسے لوگوں کی نجات کا کوئی راستہ نہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
اللہ ایسا ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر وہی' وہ زندہ ہے' قائم ہے' قائم رکھنے والا ہے' اس کو نہیں پکڑتی اُونگھ اور نہ نیند' اُسی کے لئے ہے جو آسمانوں
وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ
میں ہے اور جو زمین میں ہے' کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اس کی اجازت کے ساتھ' وہ جانتا ہے جو اُن کے سامنے ہے
وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ
اور جو ان کے پیچھے ہے' اور وہ احاطہ نہیں کرتے اسکی معلومات میں سے کسی چیز کا مگر جو وہ چاہے' گنجائش ہے اسکی کرسی میں
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾
آسمانوں کی' اور زمین کی اور اسے بھاری نہیں ہے ان دونوں کی حفاظت' اور وہ برتر ہے' عظمت والا ہے

اللہ جل شانہٗ کی صفاتِ جلیلہ کا بیان

تفسیر: یہ آیت کریمہ آیۃ الکرسی ہے احادیث شریفہ میں اسکی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے بیان فرمایا کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے ابوالمنذرؓ (یہ انکی کنیت ہے) کیا تم جانتے ہو اللہ کی کتاب میں وہ کون سی آیت تمہارے پاس ہے جو اعظم ہے (سب سے بڑی عظمت والی ہے) میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ آپ نے پھر وہی سوال فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ وہ آیت اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ہے' آپ نے میرے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اے ابوالمنذرؓ تمہیں علم مبارک ہو۔ (رواہ مسلم ص ۲۷۱ ج ۱)

چونکہ اس آیت شریفہ میں کرسی کا ذکر ہے اس لئے عوام و خواص سب ہی اسے آیۃ الکرسی کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ خود روایات حدیث میں اسے آیۃ الکرسی کے نام سے ذکر فرمایا ہے۔ آیۃ الکرسی میں اللہ جل شانہٗ نے اپنی صفات جلیلہ بیان فرمائی ہیں۔ اول تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے' وہی معبود حقیقی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ صفت الوہیت میں منفرد ہے۔

پھر ارشاد فرمایا اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لفظ حیّ عربی زبان میں زندہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ زندہ ہے ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا۔ اسکی ذات و صفات ازلی و ابدی ہیں جن کو کبھی بھی زوال نہیں' اور قَیُّوْم مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قائم خود قائم رہنے والا اور قیوم قائم رکھنے والا' ساری کائنات اللہ تعالیٰ شانہٗ کی مخلوق ہے اور اس نے ان سب کو وجود دیا ہے اور اسی کے اذن و مشیت سے سب کا وجود قائم ہے کائنات کے سب احوال اسی کی مشیت اور قدرت سے متغیر و متبدل ہوتے ہیں اور وہ جس کو جس حال میں

چاہے رکھتا ہے۔ صحیح بخاری (ص ۱۵۱ ج ۱) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو جب نماز تہجد کے لئے بیدار ہوتے تھے تو بارگاہ خداوندی میں جو معروض پیش کرتے تھے۔ اس میں یہ بھی تھا: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْھِنَّ (اے اللہ آپ ہی کیلئے سب حمد ہے۔ آپ تمام آسمانوں کے اور زمینوں کے اور جو کچھ ان میں ہے ان سب کے قائم رکھنے والے ہیں)۔

پھر فرمایا: لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ (اس کو نہیں پکڑتی ہے اُونگھ اور نہ نیند) سِنَۃٌ ہلکی نیند کو کہتے ہیں جس کا ترجمہ اونگھ سے کیا گیا ہے۔ اور نَوْمٌ سو جانے کو کہا جاتا ہے جس میں ہوش و حواس بالکل ہی قائم نہیں رہتے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ اونگھ اور نیند دونوں سے برتر اور بالا ہے، مخلوق کو تھکن دور کرنے اور آرام پانے کیلئے نیند کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ جل شانہٗ کو کسی طرح کی کوئی بھی تھکن نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ نیز نیند اور اونگھ میں انفعال ہوتا ہے اور تغیر حال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ انفعال اور تغیر حال سے پاک ہے۔ لہٰذا اسے نہ نیند آ سکتی ہے نہ آتی ہے مخلوق کا یہ حال ہے کہ کام کرتے کرتے تھک جائیں تو نیند غالب ہو جاتی ہے، سونا نہ چاہیں تب بھی نیند دبا لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ اپنے اختیار سے سوتا ہے اور نہ اسے نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ لفظ لَا تَاْخُذُہٗ میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ پر نیند غلبہ نہیں پا سکتی۔ جب ہلکی نیند یعنی اُونگھ بھی اسے نہیں پکڑ سکتی تو بڑی نیند کیسے غلبہ پائے گی۔ نیند مخلوق کی صفت ہے جو خالق کائنات کے حق میں عیب و نقص ہے اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنَامُ وَلَا یَنْبَغِیْ لَہٗ اَنْ یَّنَامَ (رواہ مسلم ص ۹۹ ج ۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نہیں سوتا اور نہ یہ اسکی ذات کے شایان شان ہے کہ وہ سوئے۔ پھر فرمایا: لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے) سب اسی کے بندے ہیں اور ہر چیز اسکی ملکیت ہے سب کو اُسی نے پیدا فرمایا ہے وہ فاعل مختار ہے جس طرح چاہے اپنی مخلوق میں تصرف فرمائے پھر فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ۔ (کون ہے جو اسکی بارگاہ میں سفارش کرے مگر اسکی اجازت سے) اس میں یہ بتایا کہ کسی کی ایسی حیثیت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارش کر سکے، ہاں اس کا یہ کرم اور فضل ہے کہ جس کو چاہے سفارش کرنے کی اجازت دیدے اور جس کے لئے اجازت دے اسی کی سفارش ہو سکتی ہے۔ قیامت کا دن جو مخلوق کے لئے بہت ہی کٹھن ہوگا۔ اس وقت لوگ متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے جب سب عاجزی ظاہر کر دیں گے تو فخر الاوّلین والآخرین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے کہ آپ ہماری سفارش فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں روانہ ہو جاؤں گا۔ اور عرش کے نیچے آ کر اپنے رب کیلئے سجدہ میں پڑ جاؤں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی وہ تعریفیں اور وہ بہترین ثنا منکشف فرمائیں گے۔ جو مجھ سے پہلے کسی پر منکشف نہ فرمائی تھیں۔ پھر ارشاد ربی ہوگا کہ اے محمد سر اُٹھاؤ اور مانگو تمہارا سوال پورا کیا جائے گا۔ سفارش کرو تمہاری سفارش پوری کی جائے گی (اس کے بعد آپ سفارش فرمائیں گے۔ جس کا مفصل واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے)۔

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد فرمایا: یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَہٗ قَوْلًا۔ (اس روز سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسے شخص کو جس کے واسطے رحمٰن نے اجازت دی ہو اور جس کے لئے بات کرنا پسند فرمایا ہو) سورۃ الانبیاء میں فرشتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا: یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ (اللہ جانتا ہے انکے اگلے پچھلے احوال کو اور وہ سفارش نہیں کر سکتے مگر اس کے لئے جس کے لئے خدا تعالیٰ راضی ہو اور وہ سب اللہ کی ہیبت سے ڈرتے ہیں) سورۃ نجم میں فرمایا: وَکَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُھُمْ

شَیْئًا اِلَّا مِنْ ۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰہُ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَرْضٰی (اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں موجود ہیں جنکی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں اجازت دیدیں۔اور راضی ہوجائیں)۔

پھر فرمایا یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ۔ (اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ مخلوقات کے آگے اور پیچھے ہے) یعنی ان کے امور دنیویہ واخرویہ کا اس کو پوری طرح علم ہے۔بعض مفسرین نے اسکی تفسیر میں لکھا ہے کہ عمل کرنیوالوں کے جو اعمال اچھے برے سامنے ہیں وہ ان کو بھی جانتا ہے اور جو پہلے کر چکے ہیں انکو بھی جانتا ہے' غرض کہ اس کا علم پوری مخلوق کو اور مخلوق کے احوال واعمال وافعال سب کو پوری طرح محیط ہے۔

پھر فرمایا: وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاءَ (اور بندوں کو اللہ کی معلومات میں سے بس اسی قدر علم ہے جتنا اُس نے چاہا) جس کسی مخلوق کو جتنا بھی علم ہے وہ اللہ تعالیٰ کے عطا فرمانے سے ملا ہے۔ان میں سے کسی کا کوئی علم ذاتی نہیں ہے اور نہ کسی کا علم ساری معلومات الٰہیہ تک محیط ہے۔

پھر فرمایا: وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (کہ گنجائش ہے اسکی کرسی میں آسمانوں کی اور زمینوں کی) اس میں کرسی کی وسعت بتائی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ اسکی کرسی میں آسمان اور زمین سب سما سکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ شانہٗ نشست و برخاست سے اور جگہ ومکان سے بالاتر ہے۔اور منزہ ہے۔اس طرح کی آیات کو علماء کرام متشابہات میں شمار فرماتے ہیں جن کا حکم یہ ہے کہ انکے اس معنی ومفہوم پر ایمان لائیں کہ اُن کا جو مطلب اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے میں اُس پر ایمان لاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر قیاس بھی نہ کریں' عرش اور کرسی دونوں کا ذکر قرآن مجید میں وارد ہوا ہے صاحب روح المعانی (ص ۹ ج ۳) نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل فرمایا ہے کہ اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں کو الگ الگ پھیلا دیا جائے تو کرسی کے مقابلہ میں سب مل کر ایسی ہوں گی جیسے جنگل میں کوئی چھوٹی سی گول چیز پڑی ہو' پھر صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ کرسی عرش کے علاوہ ہے اور کرسی عرش کے سامنے اتنی چھوٹی ہے جیسے چھوٹی سی گول چیز میدان میں پڑی ہو۔یہ روایت انہوں نے بحوالہ ابن جریر حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کی ہے۔یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بتایا ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ عرش اور کرسی ایک ہی چیز ہے۔کرسی کے بارے میں اور بھی چند اقوال مفسرین نے نقل فرمائے ہیں۔پھر فرمایا: وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا (کہ اللہ تعالیٰ کو آسمان وزمین کی حفاظت بھاری نہیں ہے) چونکہ وہ خالق ہے اور مالک ہے اس لئے اسکی کوئی بھی مخلوق خواہ آسمان ہو خواہ زمین اس کے علم سے اور اس کی حفاظت سے باہر نہیں۔مخلوق عاجز ہے وہ اپنی جیسی مخلوق کی حفاظت سے بھی عاجز ہے اللہ تعالیٰ خالق ومالک ہے وہ اپنی ساری مخلوق کا نگران ونگہبان ہے۔

آخر میں فرمایا: وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (کہ اللہ تعالیٰ برتر ہے اور عظمت والا ہے) صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ شانہٗ کی صفات عالیہ الوہیت' وحدانیت' حیات' علم' ملک' قدرت' ارادہ' جمع فرمادی ہیں: ونطقت بأنه سبحانه موجود' منزه عن التحيز والحلول' مبرأ عن التغير والفتور' لا مناسبة بينه وبين الأشباه لا يحل بساحة جلاله ما يعرض النفوس والأرواح' مالك الملوك والملكوت' و مبدع الأصول والفروع' ذو البطش الشديد' العالم وحده بجلي الأشياء وخفيها' وكليها وجزئيها' واسع الملك والقدرة لكل ما من شأنه أن يملك ويقدر عليه' لا يشق عليه شاق ولا يثقل شيء لديه' متعالٍ عن كل مالا يليق بجنابه عظيم لا يستطيع طيرًا لفكر أن يحوم في بيداء صفات قامت به. (روح المعانی ص ۱۱ ج ۳)

فائدہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرے تو جنت کے داخل ہونے میں اس کے لئے صرف موت ہی آڑ بنی ہوئی ہے۔ اور جس نے آیۃ الکرسی لیٹتے وقت پڑھ لی اللہ تعالیٰ اس کے گھر کو اور اس کے پڑوسی کے گھر کو اور آس پاس کے چند گھروں کو امن سے رکھے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۸۹)

اور ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے رات کو اپنے بستر پر پہنچ کر آیت الکرسی پڑھ لی۔ صبح ہونے تک اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نگران مقرر رہے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۸۵ عن البخاری فی قصۃ اسیر ابی ہریرۃؓ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جس نے صبح کو سورہ حٰمٓ (یعنی سورہ مومن جسے سورۂ غافر بھی کہتے ہیں) اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ تک پڑھی اور اس کے ساتھ آیۃ الکرسی بھی پڑھ لی تو شام ہونے تک ان دونوں کی وجہ سے محفوظ رہے گا اور جس نے ان دونوں کو شام کو پڑھ لیا تو صبح ہونے تک محفوظ رہے گا۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۸۷ عن الترمذی)

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ

نہیں ہے زبردستی دین میں، ظاہر ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو کر، سو جو شخص منکر ہو طاغوت کا

وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

اور ایمان لائے اللہ پر تو بے شک اُس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا۔ جو ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

دین میں زبردستی نہیں ہے

تفسیر: لباب النقول میں اس آیت کا سبب نزول بتاتے ہوئے بحوالہ ابوداؤد و نسائی و ابن حبان، حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ زمانہ اسلام سے پہلے جس عورت کا بچہ مر جاتا تھا وہ یہ نذر مان لیتی تھی کہ اگر میرا بچہ زندہ رہا تو اسے یہودی بنا دوں گی (العیاذ باللہ) جب یہود کا قبیلہ بنونضیر مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا گیا تو ان میں انصار کے قبیلوں کے وہ لڑکے بھی تھے جو دین یہودیت پر تھے۔ یہودی مدینہ منورہ سے جانے لگے تو ان لڑکوں کے خاندان والوں نے کہا کہ ہم ان کو نہیں جانے دیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ نازل فرمائی۔

نیز لباب النقول میں بحوالہ ابن جریر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آیت کریمہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئی جو قبیلہ بنی سالم میں سے تھے اور جن کا نام حصین تھا ان کے دو بیٹے نصرانی تھے اور وہ خود اسلام قبول کر چکے تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یہ دونوں نصرانیت چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں، کیا میں ان پر زبردستی نہ کروں (تاکہ وہ دونوں مسلمان ہو جائیں) اس پر اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

آیت شریفہ میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ دین میں زبردستی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص دین اسلام قبول نہیں کرتا تو اس پر زبردستی نہیں کی جائے گی کہ تو اسلام قبول کر لے ورنہ تجھے قتل کر دیں گے، شاید حکم جہاد کی وجہ سے کسی کو اس کا وہم اور وسوسہ ہو کہ زبردستی نہیں ہے تو جہاد کیوں شروع کیا گیا جن لوگوں کو جہاد کی حقیقت معلوم ہے وہ جانتے ہیں کہ جہاد کا قانون یہ ہے کہ جب کافروں کی کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو اول ان کو اسلام کی دعوت دی جائے اور یہ دعوت ان کو آخرت کے عذاب سے بچانے کے لئے ہے اگر وہ اسلام قبول کرنے پر راضی نہ ہوں تو اُن سے کہا جائے گا کہ تم جزیہ دو، جب وہ جزیہ دینے لگیں گے تو ان کا دار السلام اور اہل اسلام سے

اللہ تعالیٰ نے ہر دعا کے جواب میں قد فعلتُ فرمایا یعنی میں نے تمہارے سوال کے مطابق کردیا یعنی تمہاری دعائیں قبول ہوگئیں۔

صحیح مسلم (ص ۹۷ ج ۱) میں یہ بھی ہے کہ شب معراج میں رسول اللہ ﷺ کو تین چیزیں عطا کی گئیں۔ (۱) پانچ نمازیں (۲) سورۃ البقرہ کا آخری حصہ (آمن الرسول سے سورۃ کے ختم تک) (۳) آپ کی اُمت میں جو لوگ مشرک نہ ہوں۔ انکے بڑے بڑے گناہوں کی بخشش کردی گئی (گناہ کبیرہ محض اللہ کی رحمت سے یا توبہ سے یا بطور تطہیر و تمحیص عذاب بھگت کر معاف ہوجائیں گے اور اہل ایمان ایمان کی وجہ سے جنت میں چلے جائیں گے۔ فاسق کو دائمی عذاب نہیں ہے۔ کافر و مشرک کو دائمی عذاب ہوگا)۔ قال النووی فی شرح صحیح مسلم والمراد واللہ اعلم بغفرانھا انہ لا یخلد فی النار بخلاف المشرکین ولیس المراد انہ لا یعذّب اصلا الخ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تشریف رکھتے تھے اسی اثناء میں اُوپر سے ایک آواز سُنی' انہوں نے اوپر کو سر اُٹھایا اور بتایا کہ یہ آسمان کا ایک دروازہ آج کھولا گیا ہے۔ جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا۔ اس دروازے سے ایک فرشتہ نازل ہوا تو جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ فرشتہ آج زمین پر نازل ہوا ہے آج سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا تھا۔ اس فرشتے نے آنحضرت سرور عالم ﷺ کو سلام کیا اور عرض کیا کہ آپ دو نوروں کی خوشخبری سن لیں جو آپ کو عطا کئے گئے ہیں آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ اول فاتحۃ الکتاب یعنی سورۃ فاتحہ' دوم سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں (سورۂ فاتحہ اور یہ آیات دعاؤں پر مشتمل ہیں) ان میں سے جو بھی کوئی حصہ آپ تلاوت کریں گے (جو سوال پر مشتمل ہوگا) تو اللہ تعالیٰ ضرور آپ کو سوال کے مطابق عطا فرمائیں گے۔ (صحیح مسلم ص ۲۷۱ ج ۱)

مذکورہ بالا روایات سے سورۃ البقرہ کی آخری دونوں آیات کی اہمیت اور فضیلت معلوم ہوئی کہ یہ آیات شب معراج میں عطا ہوئیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دعاؤں کو قبول فرمالیا۔ صحیح بخاری (ص ۷۵۵ ج ۲) اور صحیح مسلم (۲۷۱ ج ۱) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ الأیتان فی آخر سورۃ البقرۃ من قرء بھما فی لیلۃ کفتاہ (یعنی جس نے کسی رات میں سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھ لیں تو اس کے لئے کافی ہوں گی)

حضرات شراح حدیث نے کافی ہونے کے کئی مطلب لکھے ہیں اول یہ کہ پڑھنے والے کو تمام انسان اور جنات کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے کافی ہوں گی' دوسرے یہ کہ ہر قسم کی آفات و مکروہات سے حفاظت رہے گی' تیسرے یہ کہ رات کو جو پڑھنے کی چیزیں ہیں وہ رہ گئیں تو انکی جگہ کفایت کریں گی' اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ قیام اللیل یعنی رات کو نفل نمازوں میں قیام کرنے کے قائم مقام ہوجائیں گی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

ولقد من اللہ تعالیٰ با کمال تفسیر سورۃ البقرۃ علی ید ھذا العبد الضعیف بالمدینۃ المنورۃ فی اواخر شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ بحسن توفیقہ و تیسیرہ وأرجوأن یوفقنی اللہ تعالیٰ لإتمام تفسیر کتابہ کلہ والحمد للہ اولا و آخرا' والصلوٰۃ والسلام علی من جاء نا بکتاب اللہ تعالیٰ وأرسل طیبا وطاھرا'

وکانت مدۃ تالیفہ من بدء سورۃ الفاتحۃ اِلٰی آخر سورۃ البقرۃ سنۃ فصاعدا واللہ ولی التوفیق و بیدہ أزمۃ التحقیق.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ ﷺ نے اس طرح کے وسوسے آنے پر پڑھنے کے لئے یہ بتایا اَللّٰہُ اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ اور فرمایا اس کے بعد بائیں طرف کو تین بار تھوک دے اور اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھ لے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۹)

پھر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اپنے بندوں کو دعا تلقین فرمائی کہ اس طرح دعا مانگا کریں، جو متعدد جملوں پر مشتمل ہے اور ان میں متعدد دعائیں ہیں پہلے یہ دعا بتائی: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا (اے ہمارے رب ہماری گرفت نہ فرما۔ اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے چوک ہو جائے) صاحب جلالین فرماتے ہیں کہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ خطا اور نسیان پر مؤاخذہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ سوال کرنا اللہ تعالیٰ شانہٗ کی اس نعمت کا اقرار کرنا ہے کہ اُس نے بھول اور خطاء پر مؤاخذہ نہیں رکھا۔

خطا اُردو کے محاورہ میں گناہ کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں وہ معنی مراد نہیں ہیں بلکہ خطا سے وہ عمل مراد ہے جو بلا ارادہ صادر ہو جائے۔ یاد رہے کہ مؤاخذہ ہونا نہ ہونا اور بات ہے اور خطا و نسیان سے بعض احکام کا متعلق ہونا دوسری بات ہے۔ خطا اور نسیان کے بارے میں جو بعض احکام ہیں عدم مؤاخذہ فی الآخرۃ سے اُن احکام کی نفی نہیں ہوتی مثلاً نماز میں بھول کر کوئی شخص بول پڑا تو اس سے نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر خطاً کسی مؤمن کو قتل کر دیگا تو دیت اور کفارہ واجب ہوگا۔

پھر ایک اور دعاء تلقین فرمائی اور وہ یہ ہے: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا اس میں ارشاد فرمایا ہے کہ بارگاہ خداوندی میں یوں عرض کرو کہ اے ہمارے رب ہم پر بھاری احکام کا بوجھ نہ رکھ جیسا کہ ہم سے پہلے لوگوں یعنی بنی اسرائیل پر رکھا تھا مثلاً توبہ قبول ہونے کے لئے اپنی جان کو قتل کرنا مشروط تھا اور زکوٰۃ میں چوتھائی مال نکالنا فرض تھا اور کپڑا دھو کر پاک نہیں ہو سکتا تھا اس کے لئے نجاست کی جگہ کو کاٹ دینا پڑتا تھا اور جب کوئی شخص چھپ کر رات کو گناہ کرتا تھا تو صبح کو اُس کے دروازے پر لکھا ہوا ہوتا تھا کہ اس نے فلاں گناہ کیا ہے اور بعض طیبات اُن پر حرام کر دی گئی تھیں۔

کما قَالَ تَعَالٰی حَرَّمْنَا عَلَیْھِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَھُمْ وَقَالَ تَعَالٰی وَعَلَی الَّذِیْنَ ھَادُوْا حَرَّمْنَا کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ (الآیۃ) اور نماز پڑھنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ مسجد ہی میں نماز پڑھے اور مال غنیمت اُن لوگوں کے لئے حلال نہیں تھا اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اُمت محمدیہ کیلئے آسانی فرمائی اور مشکل احکام مشروع نہیں فرمائے جو بنی اسرائیل پر فرض تھے۔ سورۂ اعراف میں رسول اللہ علیہ ﷺ کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ (وہ پاکیزہ چیزوں کو ان کیلئے حلال فرماتے ہیں اور گندی چیزوں کو اُن پر حرام فرماتے ہیں اور اُن پر جو بوجھ اور طوق تھے اُن کو دور کرتے ہیں)۔

مزید دعا تلقین فرماتے ہوئے ارشاد ہے: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ۔ (اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی ایسا بار نہ ڈالئے جس کی ہم کو طاقت نہ ہو) اس سے تکالیف شرعیہ بھی مراد ہو سکتی ہیں اور مصائب تکوینیہ بھی اور دونوں بھی مراد لے سکتے ہیں۔ صاحب جلالین لکھتے ہیں: من التکالیف والبلایا اس سے دونوں کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

آخر میں مختصر الفاظ میں چار دعائیں اکٹھی تلقین فرمائیں۔ وَاعْفُ عَنَّا (اور ہمیں معاف فرما) وَاغْفِرْ لَنَا (اور ہماری مغفرت فرما) وَارْحَمْنَا (اور ہم پر رحم فرما) اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ (تو ہمارا مولیٰ یعنی وَلی اور مددگار ہے۔ سو ہماری مدد فرما کافر قوم کے مقابلہ میں)۔

صحیح مسلم (ص ۷۸ ج ۱) میں ہے ہر ہر دعا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب میں نَعَمْ کا جواب ملا، دوسری روایت میں ہے کہ

ایک خاص تعلق پیدا ہو جائے گا جس سے آپس میں ملنا جلنا ہوگا۔ اہل کفر اسلام سے قریب ہوں گے اس کے سمجھنے کے مواقع فراہم ہوں گے۔ اللہ کی کتاب ان کے کانوں میں پڑے گی۔ اسلام کی سچائی کے دلائل واضحہ ان کے سامنے آئیں گے۔ اور اہل ایمان کے اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ دیکھیں گے تو اقرب ہے کہ کفر سے باز آ جائیں اور اسلام قبول کر لیں اگر اسلام کے دلائل واضحہ سامنے آنے کے بعد بھی کوئی شخص اسلام کو قبول نہیں کرتا تو اس کی حماقت ہے کہ کفر پر جمنے ہی کو اختیار کئے ہوئے ہے۔

اسلام کے عہد اول سے لے کر آج تک مسلمان ممالک میں کروڑوں کافروں نے زندگی گزاری ہے۔ کسی امیر یا خلیفہ یا بادشاہ نے انہیں اسلام پر مجبور نہیں کیا۔ اور جن قوموں نے اسلام قبول کیا وہ اہل اللہ کی محنتوں و کوششوں سے اسلام کی آغوش میں آئی ہیں، کسی نے سر پر تلوار رکھ کر یا سینہ پر بندوق رکھ کر کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا فقہاء نے واضح طور پر لکھا ہے کہ میدان جہاد میں عورتوں، بوڑھوں، اپاہجوں اور گرجوں میں رہنے والوں کو قتل نہ کیا جائے، حالانکہ ان لوگوں کو تلوار کے ذریعہ بآسانی اسلام میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ تفسیر درمنثور (ص ۳۳۰ ج ۱) میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا أَسْلِمِيْ تَسْلَمِيْ (یعنی تو اسلام قبول کر لے۔ عذاب سے بچ جائے گی) اس نے انکار کیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ پاک کے حضور میں عرض کیا اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ (کہ اے اللہ آپ گواہ رہیں میں نے دعوت دے دی ہے) اس کے بعد اُنہوں نے یہی آیت لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ تلاوت کی البتہ اتنی بات ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ کفر خالق و مالک کی سب سے بڑی بغاوت ہے۔ باغی کی سزا تو سب کو معلوم ہی ہے۔ ان باغیوں کی بہت بڑی اور سب سے بڑی دائمی سزا تو ان کو آخرت میں ہوگی لیکن دنیا میں بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ انکی سرکوبی ہوتی رہے۔ اور کفر کا اثر جس قدر بھی کم ہو اچھا ہے اگر جہاد و قتال نہ ہو تو کافر اہل ایمان پر چڑھ جائیں گے اور اہل ایمان تھوڑے رہ جائیں گے اور انکا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اگر جزیہ بھی دینا منظور نہیں کرتے تو ان سے قتال کیا جائے، اور یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ کفر جو خداوند تعالیٰ کی بغاوت ہے اسکی سزا میں قتل کر دینا اور بات ہے (اور جو لوگ باغیوں کا قانون جانتے ہیں وہ اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کر سکتے) اور سر پر تلوار رکھ کر یہ کہنا کہ اسلام قبول کر ورنہ قتل کر دینگے یہ دوسری بات ہے اس دوسری بات کو اکراہ کہا جاتا ہے اور جہاد کے موقعہ پر اکراہ نہیں کیا جاتا اور یہ بات بھی ہے کہ ایمان قبول کرنے پر زبردستی کا کوئی فائدہ ہے بھی نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص جبر و اکراہ کی وجہ سے ظاہری طور پر اسلام قبول کر بھی لے اور دل سے مسلمان نہ ہو تو نہ تو اس کے حق میں مفید فی الآخرۃ ہوگا اور نہ جھوٹی زبان سے اسلام قبول کرنے والے سے مسلمانوں کو کوئی نفع پہنچے گا۔ جیسا کہ منافقین ظاہر میں مسلمان تھے اور اندر سے کافر تھے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہتے تھے۔ اسلام کی حقانیت اور اسکی سچائی کے دلائل روز روشن کی طرح واضح ہیں دنیا بھر کی زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ چھپ چکا ہے گھر گھر اسلام کا کلمہ پہنچ چکا ہے۔ آلات جدیدہ نے دنیا کے ہر گوشہ میں اسلام کی دعوت پہنچا دی ہے اس کو حق جانتے ہوئے بھی جو لوگ اس کو قبول نہیں کرتے، وہ اپنے کو عذاب میں دھکیلنے کے خود ذمہ دار ہیں۔ ہدایت ظاہر ہو چکی ہے، گمراہی کو لوگ سمجھ چکے ہیں، دونوں میں کوئی التباس و اشتباہ نہیں ہے اب اگر کوئی شخص ہدایت قبول نہیں کرتا اور جانتا ہے کہ یہ ہدایت ہے، دنیاوی مصلحتوں نے، جائیدادوں کے خیال نے، رشتہ داریوں کی فکر نے، عہدوں کے چھن جانے کے خوف نے، ہدایت قبول کرنے سے روک رکھا ہے اور چند روزہ دنیاوی زندگی کے منافع و مصالح کی وجہ سے آخرت کے دائمی عذاب کے لئے تیار

ہے اور اس طرح اپنی جان کا دشمن بنا ہوا ہے' تو اس کا علاج ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہداھم اللہ تعالیٰ۔

لفظ طاغوت معتل لام واوی ہے جس کا ماضی مضارع طغی یطغی ہے یہ لفظ سرکشی کے معنی پر دلالت کرتا ہے اہل لغت کا فرمانا ہے کہ اس میں قلب مکانی ہوا ہے اصل کلمہ طغووت ہے۔ لام کلمہ کو مقدم کر دیا گیا اور عین کلمہ کو مؤخر کر دیا گیا' پھر حرف علت کو الف سے بدل دیا گیا' یہ تو لفظی تحقیق ہوئی معنوی اعتبار سے اس میں متعدد اقوال ہیں۔ حضرت عمر اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ اس سے شیطان مراد ہے' مجاہد اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کل ما عبد من دون اللہ فھو طاغوت (یعنی اللہ کے سوا جس کسی کی بھی عبادت کی گئی۔ وہ طاغوت ہے) اور بعض حضرات کا قول ہے کہ اس سے اصنام یعنی بت مراد ہیں' یہ سب اقوال لکھنے کے بعد صاحب رُوح المعانی لکھتے ہیں (ص ۱۳ ج ۳) والأولی أن یقال بعمومه (یعنی اس کا عمومی معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے) اور اس کے مفہوم میں وہ سب معانی داخل ہیں جو اُوپر بیان ہوئے' درحقیقت شیطان اور اسکی مددگار تمام طاغوتی طاقتیں انسان کو اسلام سے روکتی ہیں۔ جس کسی نے بھی ان طاقتوں کو نہ گردانا اور ان سے رشتہ توڑا اور ان سب سے منہ موڑا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے بہت مضبوط حلقہ اور بڑی قوت والا کڑا پکڑ لیا' یہ کڑا ایسا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں جس نے اللہ تعالیٰ کو مان لیا اور اس کے دین کو تسلیم کر لیا اور اس کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لے آیا اس نے سب سے بڑی طاقت کا سہارا لے لیا اور یقین کی دولت سے مالا مال ہو گیا' نہ اس قوت کو شکستگی ہے نہ زوال ہے' آخر میں فرمایا کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ وہ سب کے اقوال کو سنتا ہے۔ سب کے اعمال کو جانتا ہے' جو صرف زبان سے مسلمان ہوا اس کا بھی علم ہے اور جس نے جھوٹی زبان سے کلمہ پڑھا وہ اس سے بھی باخبر ہے۔

صاحب بیان القرآن لکھتے ہیں اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاک اور خسران سے محفوظ رہتا ہے اس لئے اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تھام کر گرنے سے مامون ہو جائے اور جس طرح ایسی رسی کے ٹوٹ کر گرنے کا خطرہ نہیں (اور یوں کوئی رسّی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے) اسی طرح اسلام میں بطلان کا احتمال نہیں جو مفضی إلی الھلاک ہو' اور خود کوئی اسلام ہی کو چھوڑ دے وہ اور بات ہے' اور مقصود آیت کا اسلام کی خوبی کا واضح وثابت بالدلیل ہونا ہے جس کو اس عنوان خاص سے بیان فرمایا گیا۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا

اللہ ولی ہے اُن لوگوں کا جو ایمان لائے' وہ ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے نور کی طرف' اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا

اَوْلِيٰٓـــُٔھُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

ان کے اولیاء شیاطین ہیں وہ اُن کو نکالتے ہیں نور سے اندھیریوں کی طرف' یہ لوگ دوزخ والے ہیں

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ولی ہیں اور کافروں کے اولیاء شیطان ہیں

تفسیر: ولی مددگار کارساز اور دوست کو کہتے ہیں' اس آیت شریفہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا ولی ہے وہ ایمان والوں کو

کفر وشرک کی اندھیریوں سے نکالتا ہے ان کو اسلام کی روشنی میں لاتا ہے ان کو نور پر ثابت قدم رکھتا ہے اور اندھیریوں سے بچاتا ہے۔

اور جن کے لئے ایمان مقدر ہے ان کو کفر وشرک کی تاریکیوں سے نکال کر نور ایمان عطا فرماتا ہے برخلاف کافروں کے کہ ان کے اولیاء یعنی دوست شیاطین ہیں۔ شیاطین ان کو ایمان قبول کرنے نہیں دیتے اور ان کو کفر کی تاریکیوں ہی میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ کفر پر مریں۔ شیاطین خود دوزخ والے ہیں وہ اپنے ماننے والوں کو بھی دوزخ میں لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں سب دوزخی ہیں اور ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اہل ایمان کے بارے میں جو فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالتا ہے اس کے عام معنی مراد لئے جائیں تو زیادہ بہتر ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو کفر کی تاریکیوں سے اور گناہوں کی تاریکیوں سے محفوظ رکھتا ہے اور نور کو عام لیا جائے تو تمام اعمال صالحہ کے نور کو بھی اس کا شمول ہوگا **والأولى أن يحمل الظلمات على المعنى الذى يعم سائر انواعها ويحمل النور أيضا على مايعم سائر انواعه' ويجعل فى مقابلة كل ظلمة مخرج منهانور مخرج اِليه**۔ (ص ۱۴ ج ۳)

صاحب روح المعانی یہ بھی لکھتے ہیں کہ نور کو مفرد اور ظلمات کو جمع لایا گیا ہے۔ کیونکہ حق ایک ہی ہے جسے نور سے تعبیر فرمایا ہے اور تاریکیاں چونکہ بہت ساری ہیں اور طرح طرح کی ہیں (کیونکہ گمراہی کے راستے بہت سے ہیں) اس لئے اس کے لئے لفظ جمع یعنی ظلمات لایا گیا ہے۔ اہل کفر کا ذکر فرماتے ہوئے جو **يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ** فرمایا اس کے بارے میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس سے یا تو وہ نور فطری مراد ہے جس پر تمام انسان پیدا کئے گئے **(وهو المراد بقوله عليه ﷺ كل مولود يولد على الفطرة الحديث)** اور نور بینات بھی مراد ہوسکتا ہے کھلے دلائل کے ذریعہ جو حق واضح ہو چکا ہے وہ سراپا نور ہے شیاطین اپنے ماننے والوں کو اس سے بچاتے ہیں اور کفر وشرک کے فائدے ان کو سمجھاتے ہیں اور حق قبول کرنے نہیں دیتے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ

کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے حجت بازی کی ان کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ اللہ نے اس کو حکومت دی تھی؛ جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا

رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ۗ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ

میرا رب وہ ہے جو زندہ فرماتا ہے اور موت دیتا ہے اس نے کہا میں زندہ کرتا ہوں اور موت دیتا ہوں' ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا سو بلاشبہ اللہ لاتا ہے

بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ۗ وَاللّٰهُ

سورج کو پورب سے تو اس کو لے آ پچھم سے' پس حیرانی میں پڑ گیا وہ شخص جو کفر اختیار کئے ہوئے تھا اور اللہ

لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ ﴿۲۵۸﴾

قوم ظالمین کو ہدایت نہیں دیتا

ایک کافر بادشاہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مباحثہ

تفسیر: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیدائشی وطن شہر بابل کے آس پاس تھا ان کے زمانہ کا بادشاہ نمرود تھا جو اس علاقہ پر حکمران تھا۔ دنیا میں کفر وشرک پھیلا ہوا تھا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ بھی بُت پرست تھا جس کا تذکرہ سورة

الانعام (ع ۸) اور سورۃ مریم (ع ۳) میں فرمایا ہے۔ حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام نے جب توحید کی دعوت دی اور پوری قوم کو بتایا کہ تم گمراہی پر ہو تو سب کو برا لگا' نمرود بھی کافر تھا نہ صرف کافر تھا بلکہ داعی کفر تھا اور اپنے آپ کو معبود بتاتا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کی دعوت دی تو وہ کٹ حجتی کرنے لگا اور کہنے لگا کہ میرے خیال میں تو میرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ملک اور مال دیا تھا اسی لئے اس کے گھمنڈ میں اس نے ایسی بات کہی' اور حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام سے دلیل مانگی کہ آپ جس رب کی توحید کی دعوت دیتے ہیں اس کے وجود پر کیا دلیل ہے' حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام نے ارشاد فرمایا: رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ فرماتا ہے۔ اور موت دیتا ہے۔ درحقیقت یہ بہت بڑی دلیل تھی جتنے بھی خدائی کے دعوے دار ہوتے ہیں اور جتنے انکے ماننے والے ہیں سب کو معلوم ہے کہ زندہ کرنے اور موت دینے کا کام ان میں سے کسی کے بس کا بھی نہیں ہے لامحالہ کوئی ذات ہے جس کے تصرف میں ساری مخلوق ہے اور جلانا اور موت دینا اسی کا کام ہے۔ جو خدائی کے دعوے دار ہوئے وہ اپنی جان کو تو بچا ہی نہیں سکے وہ کسی دوسرے کو کیا زندہ کرتے' ایسی واضح موٹی بات نمرود نے یا تو بے عقل ہونے کی وجہ سے نہ سمجھی یا بطور کٹ حجتی کے یوں ہی بحث جاری رکھنے کے لئے اس نے جواب میں یوں کہہ دیا کہ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ کہ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ اپنی بات کی دلیل کے لئے اس نے یہ کیا کہ دو آدمیوں کو بلایا جن کے قتل کا حکم ہو چکا تھا ان میں سے ایک کو قتل کروادیا' اور ایک کو چھوڑ دیا' اسکی جہالت کا جواب تو یہ تھا کہ تو یہ بتا کہ جسے تو نے قتل کیا ہے اس میں جان کس نے ڈالی تھی اور جسے تو نے چھوڑ دیا یہ موت کے بعد زندہ کرنا ہوا یا زندہ کو زندہ چھوڑ دینا ہوا لیکن سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس کے عناد اور سفاہت و جہالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے خالق کائنات جل مجدہ کے وجود پر اور کائنات میں اس کے تصرفات پر دوسری دلیل دیدی اور فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ کہ اللہ تعالیٰ روزانہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اگر معبود ہونے کا مدعی ہے تو سورج کو پچھم سے لا کر دکھادے' میرے رب کے حکم سے روزانہ سورج پچھم کی جانب غروب ہو جاتا ہے تو اسی جانب سے اسے واپس کردے۔ یہ سنتے ہی خدائی کا دعویٰ دار نمرود مبہوت اور حیران رہ گیا اور بالکل ہی گونگا بن گیا آگے ایک کلمہ بھی نہ بول سکا۔

پھر فرمایا: وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کی رہبری نہیں فرماتا وہ کسی نبی یا نبی کے نائبین کے سامنے حجت اور دلیل سے نہیں جیت سکتے۔ سورہ شوریٰ میں فرمایا: وَالَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ۔ (اور جو لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کے بارے میں اس کے بعد کہ اس کا معبود ہونا تسلیم کرلیا گیا ہے (یعنی اصحاب علم وفہم اس پر ایمان لاچکے ہیں) اُن لوگوں کی حجت ان کے رب کے نزدیک باطل ہے' اور اُن پر غضب ہے اور اُن کے لئے سخت عذاب ہے)۔

بعض علماء تفسیر نے فرمایا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب سورج مشرق سے لاتا ہے تو مغرب سے لا کر دکھادے تو وہ کہہ سکتا تھا کہ میں مشرق سے لاتا ہوں تو اپنے رب سے کہہ کہ وہ مغرب سے لائے' لیکن وہ ابراہیم علیہ السلام کے جواب سے ایسا مبہوت و متحیر ہو چکا تھا کہ اس کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا۔ اہل حق کے مقابلہ میں اہل باطل دلیل کے ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے یہ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال کر لے آ' اسکی وجہ سے اسکو یہ یقین ہو گیا کہ واقعی اس پوری دنیا کا کوئی خالق و مالک متصرف ضرور ہے اور یہ شخص جو برملا مجھ سے سوال و جواب کر رہا ہے ضرور اسی ذات پاک کا پیغمبر ہے جو ہر چیز کا خالق و مالک ہے اور جس کے تصرف میں ساری

مخلوق ہے اور اسکی یہ دلیل بہت زیادہ وزن دار ہے اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں مشرق سے سورج کو لاتا ہوں تو اپنے رب سے کہہ کر مغرب سے لے آ' تو حاضرین میں سے کوئی اس کو نہیں مانے گا اور جو میرے ماننے والے ہیں وہ اسی کی طرف ہو جائیں گے۔ تھوڑی سی جو چھوٹی سلطنت ہے وہ بھی جاتی رہے گی اس لئے اس نے دم بخود ہو جانا ہی مناسب جانا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ

یا اس شخص کی طرح سے جو گزرا ایک بستی پر اور وہ اس حال میں تھی کہ چھتوں پر اسکی دیواریں گری پڑی تھیں' یہ شخص کہنے لگا کہ

اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ

اللہ کیونکر زندہ فرمائے گا اس بستی کو اس کی موت کے بعد' پس اللہ تعالیٰ نے اس کو سو سال تک مردہ رکھا پھر اسے اٹھا دیا' اس سے سوال فرمایا کہ تو کتنے عرصہ تک ٹھہرا رہا۔ اس نے کہا

لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ

کہ میں ایک دن یا ایک دن سے کم ٹھہرا ہوں' فرمایا بلکہ تو سو سال تک ٹھہرا رہا ہے' سو تو دیکھ لے اپنے کھانے کو

وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى

اور پینے کی چیز کو وہ سڑی گلی نہیں ہے اور دیکھ لے اپنے گدھے کو' اور تاکہ ہم تجھے نشانی بنا دیں لوگوں کے لئے اور دیکھ

الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ

ہڈیوں کی طرف' ہم ان کو کیسے جوڑ دیتے ہیں پھر ان پر گوشت پہنچا دیتے ہیں' سو جب اس پر یہ سب کچھ ظاہر ہو گیا تو کہنے لگا کہ میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ

عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

ہر چیز پر قادر ہے

مردہ کو زندہ فرمانے کا ایک واقعہ

تفسیر: یہ آیت پہلی آیت پر معطوف ہے اور تقریری عبارت اس طرح سے ہے۔ الم تر إلى الذى حاج ابراهيم فى ربه او هل رايت كالذى مر على قرية۔ حضرات مفسرین کرام نے فرمایا ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن سلامؓ، حضرت قتادہؓ اور حضرت عکرمہؓ وغیرہم بہت سے حضرات نے فرمایا ہے کہ جس شخصیت کا اس آیت میں ذکر ہے وہ حضرت عزیر بن شرخیا تھے اور بعض حضرات نے آرمیا بن خلقیا بھی بتایا ہے اور اس بارے میں دیگر اقوال بھی ہیں لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے' بہر صورت قرآن کریم نے موت کے بعد زندہ ہونے کا مشاہدہ کرنے والے شخص کا واقعہ ذکر فرمایا ہے یہ حضرت عزیر علیہ السلام ہوں یا کوئی بھی شخصیت ہو ایک بستی پر ان کا گزر ہوا جس کی سب آبادی ختم ہو چکی تھی۔ اور بستی کے در و دیوار بھی منہدم تھے چھتیں گر گئی تھیں پھر چھتوں پر دیواریں گر گئی تھیں اس بستی کا یہ حال دیکھ کر ان کے منہ سے بطور تعجب یہ نکلا کہ اللہ اس بستی کو اسکی موت کے بعد کیسے زندہ فرمائے گا؟ خدا تعالیٰ شانہٗ کی قدرت کا انکار کرنا مقصود نہ تھا بلکہ انسان کے مزاج میں جو ایسی چیزوں میں ایک استبعاد کی شان ہے اس کے اظہار کے طور پر منہ سے ایسے الفاظ بے ساختہ نکل گئے' جیسے حضرت

زکریا علیہ السلام نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے کو بھی اولاد دے سکتا ہے خدا تعالیٰ سے اپنے لئے بیٹے کی دعا کی پھر جب فرشتے بیٹے کی خوشخبری لے کر آئے تو بطور تعجب یوں کہنے لگے رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ (کہ اے میرے رب کیسے ہوگا میرے لڑکا حالانکہ میں بڑھاپے کو پہنچ چکا اور میری بیوی بانجھ ہے) جس نے سوال کیا ہو وہ کیسے قدرت الٰہیہ کا منکر ہوسکتا ہے لیکن بطور تعجب سوال کر بیٹھے، جس واقعہ کا یہاں ذکر ہے اس میں بھی اس طرح کی بات ہے جب انہوں نے یہ کہا کہ اللہ کیسے زندہ فرمائے گا اس بستی کو (جس میں تعجب بھی تھا اور کیفیت کا سوال بھی) تو اللہ تعالیٰ نے اس بات کے کہنے والے ہی کو موت دے دی اور سو سال تک اسی حال میں رکھا پھر سو سال کے بعد زندہ فرما کر اٹھا دیا اور سوال فرمایا کہ تم کتنے وقت اسی حالت میں ٹھہرے رہے (جو زندگی کی حالت نہ تھی) تو انہوں نے جواب میں عرض کر دیا کہ میں اس حالت میں ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ رہا ہوں، مفسرین نے بیان کیا ہے کہ چاشت کے وقت ان کو موت آئی تھی اور سو سال گزرنے کے بعد جب انکو اللہ تعالیٰ نے اٹھایا تو غروب سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ سورج پر نظر ڈالی تو نظر آیا کہ وہ غروب ہونے والا ہے لہٰذا انہوں نے جواب میں کہا کہ ایک دن ایسی حالت میں رہا ہوں اور جب یوں غور کیا کہ ابھی تو سورج چھپا بھی نہیں تو کہنے لگے کہ ایک دن بھی نہیں بلکہ دن کا کچھ حصہ رہا ہوں، اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ تمہارا یہ بیان کرنا صحیح نہیں بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ تم سو سال تک اسی حالت میں رہے ہو سو سال تک وہ مردہ رہے لیکن چونکہ جسم اسی طرح صحیح سالم تروتازہ باقی رہا۔ جیسا کہ زندگی میں تھا تو ان کو اس سے مزید تعجب ہوا اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا ایک اور نمونہ ان کو دکھایا اور فرمایا کہ تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ لے وہ ذرا بھی گلی سڑی نہیں ہے۔ جس طرح یہ کھانا اپنی حالت پر سو سال باقی رہ گیا اسی طرح بغیر روح کے تیرا جسم بھی صحیح سالم تروتازہ رہا، قال فی الروح (ص ۲۲ ج ۳) **واستشكل تفرع فانظر على لبث المائة بالفاء وهو يقتضي التغير، واجيب بأن المفرع عليه ليس لبث المائة بل لبث المائة من تغير فی جسمه حتى ظنه زمانا قليلا ففرع عليه ماهو أظهر منه وهو علم تغير الطعام والشراب وبقاء الحيوان حيا من غير غذاء۔** پھر اللہ جل شانہٗ نے انکے سامنے ان کے مردہ گدھے کو زندہ کر کے دکھایا۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ تم اپنے گدھے کو دیکھو اور ہڈیوں پر نظر ڈالو۔ گدھے کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا دیکھو ہم ان کو کس طرح ترکیب دیتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں، ان کے سامنے وہ ہڈیاں ترتیب کے ساتھ جمع ہوئی پھر ان پر گوشت چڑھا اور گدھا زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ جب یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو بے اختیار بول اٹھے کہ میں جانتا ہوں کہ بلا شبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، یقین تو پہلے ہی سے تھا کیونکہ مؤمن آدمی تھے۔ لیکن عینی مشاہدہ بھی کر لیا، درمیان میں یہ جو فرمایا کہ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ اس کے بارے میں مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ محذوف پر معطوف ہے صاحب روح المعانی (ص ۲۳ ج ۳) لکھتے ہیں کہ یہاں عبارت مقدر ہے۔ **ای وفعلنا ذلك لنجعلك** یعنی ہم نے تمہیں مردہ کر کے زندہ کر دیا تاکہ ہم تمہاری ذات کو لوگوں کے لئے نشانی بنا دیں، تمہیں دیکھ کر اور تمہارا واقعہ معلوم کر کے لوگوں کو ہدایت ہوگی اور موت کے بعد اٹھائے جانے پر یقین کرنے میں ہچکچاہٹ کرنے کا موقعہ نہ رہے گا۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اُنْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ جو حکم تھا وہ مدت دراز تک موت کی حالت میں رہنے کو ظاہر کرنے کے لئے تھا اور وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ میں جو حکم ہوا وہ مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ

اور جب کہا ابراہیم نے کہ اے میرے رب آپ مجھے دکھا دیجئے مردوں کو کس طرح زندہ فرماتے ہیں، فرمایا

بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ

کیا تم کو یقین نہیں ہے؟ عرض کیا یقین ہے لیکن اس غرض سے سوال کرتا ہوں کہ میرا قلب مطمئن ہو جائے فرمایا سو تم لے لو چار پرندے پھر انکو اپنے سے ہلا لو

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا وَاعْلَمْ

پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ایک حصہ رکھ دو پھر ان کو بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے اور جان لو کہ

اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

بلاشبہ اللہ عزیز ہے حکیم ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال پر پرندوں کا زندہ ہونا

تفسیر: اس آیت شریفہ میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کا ایک سوال اور پھر خداوند قدوس کی طرف سے عینی مشاہدہ کرا کر ان کے سوال کا جواب ذکر فرمایا ہے' حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بڑے موحد تھے حشر و نشر بعث بعد الموت کے قائل تھے پھر بھی اُنہوں نے نظروں سے دیکھنے کیلئے اللہ جل شانہ سے سوال کیا کہ آپ مجھے دکھا دیجئے کہ آپ مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے' اللہ جل شانہ' نے فرمایا کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں مردوں کو زندہ کر دوں گا انہوں نے عرض کیا کہ یقین ضرور ہے پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ علم الیقین سے آگے مجھے عین الیقین کا مرتبہ حاصل ہو جائے اور اپنی آنکھوں سے مردوں کو زندہ ہوتے دیکھ لوں تاکہ طبعی طور پر انسان کو جو اطمینان دیکھنے سے حاصل ہو جاتا ہے وہ بھی مجھے حاصل ہو جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر حضرات سے منقول ہے کہ جب فرشتہ نے ان کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیل بنالیا ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کو قبول فرمائے گا اور آپ کی دعا سے مردوں کو زندہ فرمائے گا تو اس پر انہوں نے یہ سوال کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم چار پرندے لے لو اور پہلے ان کو اپنے پاس رکھو اور مانوس کر لو اور ہلا لو جب وہ تم سے مانوس ہو جائیں اور ہل جائیں تو ان چاروں کو ذبح کرنا اور انکے گوشت کو اور پروں کو ایک ساتھ ملا دینا اور ان کا ایک ایک حصہ پہاڑ پر رکھ دینا پھر انکو پکارنا وہ پرندے تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے' چنانچہ حسب الحکم انہوں نے ایسا ہی کیا اور وہ پرندے زندہ ہو کر انکی آواز پر دوڑتے ہوئے چلے آئے' پرندے ہونے کے باوجود اُڑ کر نہ آئے بلکہ پیروں سے چل کر آئے کیونکہ نظروں کے سامنے اس کا ظہور بدرجہ اتم ہے۔

آخر میں فرمایا: وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ (کہ اللہ غالب ہے اور حکمت والا ہے) اسباب عادیہ وغیر عادیہ سب اُس کے قبضہ میں ہیں۔ اس کے سب کاموں میں حکمت ہے۔ (من روح المعانی ص ۲۶ تا ۳۱ ج ۳)

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ

مثال ان لوگوں کی جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ ہو اس نے اُگائیں سات

سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ

بالیں' ہر بال میں ہیں سو دانے' اور اللہ چند در چند کر دیتا ہے جس کے لئے چاہے۔ اور اللہ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

وسعت والا ہے علم والا ہے

فی سبیل اللہ خرچ کرنیوالوں کا اجر وثواب

تفسیر: اس آیت شریفہ میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی فضیلت بیان فرمائی۔ اللہ کی رضا کے لئے جو بھی مال خرچ کیا جائے وہ سب فی سبیل اللہ ہے۔ اور عام طور سے یہ لفظ جہاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بہر صورت جہاد میں خرچ کرے یا غیر جہاد میں خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسکی فضیلت بہت ہے اور یہ تو عام قانون ہے کہ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ (جو کوئی شخص ایک نیکی کرے اس کے لئے اس کا دس گنا ہے) ایک نیکی کی دس نیکی یہ تو کم سے کم ہے اور اس کے علاوہ اللہ جل شانہٗ اس سے زیادہ جتنا جس کو بڑھا چڑھا کر عنایت فرمائے وہ مزید انعام واکرام ہے۔ اس آیت شریفہ میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنیوالوں کے بارے میں ایک مثال بیان فرمائی ہے اور وہ یہ کہ جیسے کوئی دانہ زمین میں گر جائے پھر اس سے ایک درخت نکل آئے اس درخت میں سات بالیں ہوں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہیں اس طرح سے ایک دانہ کے سات سو دانے بن گئے' اللہ تعالیٰ شانہٗ' ایک درہم یا ایک دینار یا ایک روپیہ یا ایک پیسہ خرچ کرنے پر اس کے عوض ثواب میں سات سو گنا عطا فرماتے ہیں اور سات سو پر بھی کوئی منحصر نہیں ہے اس سے زیادہ بھی عطا فرما دیتے ہیں جس کو وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑی وسعت والا ہے وہ جس کو جتنا چاہے دے سکتا ہے اور وہ علم والا بھی ہے کسی کی کوئی نیکی اس کے علم سے باہر نہیں اس کی رضا کے لئے جو بھی کوئی بدنی یا مالی عبادت انجام دے گا اس کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں' آخرت میں اس کا ثواب چند در چند پالے گا۔

سنن ابن ماجہ میں (۱۹۸) متعدد صحابہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جس نے اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد میں) خرچ کرنے کیلئے مال بھیج دیا اور خود گھر ہی میں رہا تو اسے ہر درہم کے عوض سات سو درہم (کا ثواب) ملے گا اور جس شخص نے اپنی جان سے شریک ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور اللہ کی خوشنودی کیلئے مال خرچ کیا تو اُس کیلئے ہر درہم کے عوض سات لاکھ درہم ہونگے' یہ فرما کر آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ کی تلاوت فرمائی تفسیر در منثور (۳۳۶ ج ۱) میں بحوالہ طبرانی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ اس کیلئے بہت بڑی خوبی ہے جو فی سبیل اللہ جہاد میں مشغول ہوتے ہوئے اللہ کے ذکر کی کثرت کرے کیونکہ اُسے ہر کلمہ کے عوض ستر ہزار نیکیاں ملیں گی جن میں سے ہر نیکی دس گنی کر کے ملے گی اسکے علاوہ جو اس کیلئے اللہ کے نزدیک ہے وہ مزید ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا کیا ثواب ہے آپ نے فرمایا وہ بھی اس قدر ہے۔ حضرت معاذ بن جبل کے شاگرد نے عرض کیا کہ میں نے تو یہ سُنا ہے کہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا ثواب سات سو گنا ہے اُنہوں نے فرمایا کہ تو کم سمجھ آدمی ہے۔ یہ سات سو گنا اس وقت ہے جب اپنے گھروں میں رہتے ہوئے جہاد میں خرچ کرنے کیلئے بھیج دیں اور خود جہاد میں شریک نہ ہوں اور جب خود جہاد میں شریک ہوں اور اس وقت خرچ کریں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانوں میں ان کیلئے جو کچھ پوشیدہ رکھا ہے وہاں بندوں کے علم کی رسائی نہیں ہے اور بندے اسکی کیفیت کے جاننے سے عاجز ہیں۔ یہ لوگ حزب اللہ (اللہ کی جماعت ہیں) اور اللہ کی جماعت غالب ہونے والی ہے۔

حضرت بریدہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حج و جہاد کا خرچہ یکساں ہے ایک درہم خرچ کرنا سات سو درہم خرچ کرنے کے برابر ہے (درمنثور ص ۳۴۳ ج ۱) اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی کے ثواب میں کوئی کمی نہیں فضل ہی فضل ہے' عطا ہی عطا ہے۔ تھوڑے پر بہت ملتا ہے۔ نیت اللہ کی رضا کی کرنی لازم ہے' آیت بالا میں بھی لفظ فی سبیل اللہ فرما کر اخلاص کی طرف متوجہ فرمایا ہے اور آئندہ آنے والی آیات میں خرچ کرنے کے آداب بتاتے ہوئے ریاکاری کے طور پر خرچ کرنے کی مذمت فرمائی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ

جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں پھر خرچ کرنے کے بعد احسان نہیں دھرتے اور

اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ

ایذاء نہیں پہنچاتے ان کے لئے ثواب ہے ان کے رب کے پاس' اور نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے بھلی بات کہہ دینا

مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ﴿۲۶۳﴾

اور درگزر کر دینا ایسے صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد تکلیف پہنچائی جائے اور اللہ غنی ہے حلیم ہے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ

اے ایمان والو! مت باطل کرو اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر اس شخص کی طرح سے جو اپنا مال خرچ کرتا ہے

رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ

لوگوں کو دکھانے کے لئے اور ایمان نہیں لاتا اللہ پر اور یوم آخرت پر' سو اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنا پتھر ہو جس پر

تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ

ذرا سی مٹی ہو پھر پہنچ گئی اس کو زوردار بارش سو کر چھوڑا اس کو بالکل ہی صاف' یہ لوگ اپنی کمائی میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے

لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾

اور اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا

فی سبیل اللہ خرچ کرنے کے آداب اور ریاکاروں کے صدقات کی مثال

تفسیر: ان آیات میں اول تو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت بتائی ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے لئے اجر و ثواب ہے نہ ان پر کوئی خوف ہے نہ وہ رنجیدہ ہوں گے' اور ساتھ ہی دو باتوں پر تنبیہ فرمائی ہے۔ اول یہ کہ جس کسی کو مال دیں اس پر احسان نہ دھریں اور اسے تکلیف نہ پہنچائیں' ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ صدقہ دینے کے بعد احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے سے صدقہ باطل ہو جاتا ہے' بہت سے لوگوں کی جو یہ عادت ہوتی ہے کہ تھوڑا بہت صدقہ دے کر ان لوگوں پر احسان دھرتے ہیں جن لوگوں کو کچھ دیا اور خاص کر ان لوگوں پر جو رشتہ دار ہیں یا اپنے شہر کے رہنے

والے ہیں ایسے لوگ احسان دھرنے سے اپنا ثواب باطل کر دیتے ہیں جس پر احسان دھرا جائے اسے احسان کے الفاظ سننے سے یا احسان دھرنے کی طرح برتاؤ کرنے سے تکلیف ہوتی ہی ہے اور بعض مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اُن پر خرچ کرنے کی وجہ سے بیگاریں لیتے ہیں اس لئے لفظ مَنّ (احسان جتانے) کے ساتھ لفظ اَذیٰ بھی ذکر فرمایا کہ اللہ کے لئے خرچ کریں اور احسان بھی نہ دھریں اور کسی قسم کی کوئی تکلیف بھی نہ پہنچائیں تب ثواب کے مستحق ہوں گے' اگر کسی نے سوال کیا اور اسے نہ دیا اور خوبصورتی کے ساتھ اچھے الفاظ میں جواب دے دیا اور سائل کی بدتمیزی پر اور تنگ کرنے پر جو غصہ آیا اس سے درگزر کر دیا تو یہ اس سے بہتر ہے کہ کچھ دیدے پھر احسان دھرے یا کسی طرح سے تکلیف پہنچائے۔ اس کو فرمایا: قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۔ جو لوگ صدقہ کر کے احسان جتاتے ہیں یا ایذاء پہنچاتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا کہ ان لوگوں کا ایسا حال ہے جیسے کوئی شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے مال خرچ کرے اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہ رکھتا ہو ایسے شخص کے خرچ کرنے کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جیسے کوئی چکنا پتھر ہو اس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اُوپر سے زوردار بارش پڑ جائے جو اس ذرا سی مٹی کو بہا کر لے جائے اور پتھر کو بالکل چکنا سپاٹ چھوڑ دے' اول تو پتھر چکنا پھر اس پر مٹی بھی ذرا سی اور جو بارش برسی تو وہ بھی زوردار' ظاہر ہے کہ اس حالت میں پتھر صاف ہو کر چکنا نہ رہ جائے گا تو اور کیا ہوگا۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ منافق کے خرچ کرنے کی مثال ہے کیونکہ وہ اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ مسلمانوں میں شریک ہو کر جو کسی نیک کام میں تھوڑا بہت خرچہ کیا تو ایسا ہوا جیسے چکنے پتھر پر ذرا سی مٹی آجائے اور چونکہ اس خرچ کا اسے کوئی ثواب نہ ملے گا اس لئے یہ خرچ کرنا اس کے حق میں بالکل ہی بے فائدہ ہے جیسا کہ اس ذرا سی مٹی پر خوب تیز بارش برس جائے اور اسے دھو ڈالے۔ یہ لوگ اپنی کمائی پر ذرا بھی قادر نہ ہوں گے کیونکہ انہوں نے جو کچھ کمایا اور خرچ کیا حالت کفر میں تھا اور دکھاوے کے لئے تھا اس کا ثواب انہیں ذرا نہ ملے گا' آخرت میں ان کا کمانا بھی ضائع ہے اور خرچ کرنا بھی' اور جب ایمان نہیں اور اخلاص نہیں تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُنہیں جنت کا راستہ بھی نہ دکھائے گا۔ اوپر منافق ریاکار کا ذکر ہے جو مومن مخلص کے مقابلہ میں آیا ہے۔

اگر کوئی شخص مسلمان ہو اور ریاکاری سے کوئی ایسا کام کرے جو فی نفسہ نیک ہو خواہ مالی عبادت ہو یا جانی عبادت' ریاکاری کی وجہ سے وہ بھی ثواب سے محروم رہے گا بلکہ ریاکاری اس کے لئے وبال ہوگی اور آخرت میں مستحق عذاب ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے جن لوگوں کے بارے میں سزا کا فیصلہ ہوگا۔ ان میں ایک شخص وہ ہوگا جو بظاہر شہید ہو گیا تھا لیکن اُسکی نیت یہ تھی کہ بہادری میں اس کا نام ہو اور ایک وہ شخص ہوگا جس نے علم پڑھا اور پڑھایا اور قرآن شریف پڑھا۔ علم حاصل کرنے سے اسکی نیت یہ تھی کہ اس کو عالم کہا جائے اور قرآن پڑھنے سے اُس کی نیت یہ تھی کہ اُس کو قاری کہا جائے۔ اور ایک وہ شخص ہوگا جسے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کا مال دیا تھا وہ اللہ پاک کے حضور میں کہے گا کہ جو بھی کوئی خرچ کرنے کی سبیل مجھے ملی جس میں خرچ کرنا آپ کے نزدیک محبوب تھا اس میں میں نے آپ کے لئے خرچ کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ تو جھوٹ کہتا ہے تو نے یہ اس لئے کیا کہ تجھے سخی کہا جائے۔ تینوں آدمیوں سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تمہاری جو خواہش تھی وہ پوری ہو چکی اور جو تم چاہتے تھے وہ کہا جا چکا لہٰذا ان تینوں کو منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جن کے ذریعہ سب سے پہلے دوزخ کو دہکایا جائے گا یہ تین آدمی ہوں گے۔ (الترغیب والترہیب ص ۶۲ ج ۱)

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سُنا ہے کہ جس نے ریاکاری کرتے ہوئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا' اور جس نے روزہ رکھ کر ریاکاری کی اُس نے شرک کیا اور جس نے صدقہ دے کر ریاکاری کی اُس نے شرک کیا۔ (مشکوٰۃ ص ۴۵۵ ج ۳)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ

اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی رضا جوئی کے لئے اور نفسوں کو پختہ کرنے کے لئے

كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا

ایسی مثال ہے جیسے ایک باغ ہو کسی ٹیلہ پر جس کو پہنچ جائے زور دار بارش پھر وہ دوگنا پھل لایا ہو پس اگر زور دار بارش نہ پہنچی

وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

تو ہلکی بوندا باندی بھی اسے کافی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

اللہ کی رضا کیلئے خرچ کرنیوالوں کی مثال

تفسیر: اس آیت شریفہ میں مؤمنین صالحین مخلصین کے مال خرچ کرنے کی ایک مثال بتائی ہے اور اس مثال میں ان کے ثواب کی کثرت اور عند اللہ مقبولیت ظاہر فرمائی ہے، ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اور اس خرچ کرنے میں انکی یہ بھی نیت ہے کہ ان کے نفس اس نیکی کرنے پر پختہ ہو جائیں تا کہ نفس خرچ کرنے کے خوگر رہیں اور کنجوسی کو پاس نہ آنے دیں تو ایسے لوگوں کے خرچ کرنے کی ثواب کے اعتبار سے ایسی مثال ہے جیسے کسی ٹیلے پر ایک باغیچہ ہو (ٹیلوں کی آب و ہوا باغوں کے لئے نہایت مناسب ہوتی ہے) پھر اُوپر سے زور دار بارش بھی ہو جائے تو زمین کو اور زیادہ قوت و طاقت پہنچ جائے جس کی وجہ سے دوگنے پھل آجائیں چونکہ یہ باغیچہ اُونچے ٹیلہ پر ہے اس لئے زور دار بارش نہ ہو تو تھوڑا بہت چھینٹا بھی اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے جس طرح اس باغیچہ میں پھل خوب زیادہ کثیر مقدار میں آئیں گے اہل ایمان اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے جو مال خرچ کریں گے اسی طرح انکے خرچ کرنے کا ثواب بھی بہت زیادہ ملے گا۔

آخر میں فرمایا: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. یعنی جو بھی کوئی کسی طرح کا عمل کرتا ہے اچھا ہو یا برا اللہ تعالیٰ سب کو دیکھتا ہے ہر عمل کا بدلہ اللہ کے یہاں سے ملے گا۔ ریا کار کو بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور مخلصین کو بھی اپنے عمل کی ہر ایک کو نگرانی کرنا لازم ہے کہ اخلاص ہے یا نہیں صاحب بیان القرآن لکھتے ہیں کہ اس تشبیہ میں جو دو طرح کی بارش فرض کی گئی ہے اس سے مقصود تفاوت مراتب اخلاص کا بیان کرنا ہے کہ چونکہ یہ انفاق ایمان کے ساتھ مقرون ہے مَنّ و اَذٰی و ریا اس میں مفقود ہے اخلاص اس میں موجود ہے تو ضرور ہی مقبول ہو کر موجب تضاعف اجر و ثواب ہو جاتا ہے۔ خواہ اخلاص اعلیٰ درجہ کا ہو یا اوسط یا ادنیٰ درجہ کا ہو نفس قبول و تضاعف کے لئے ہر حال میں کافی ہے گو تفاوت مراتب اخلاص سے مراتب قبول و تضاعف میں بھی تفاوت ہو جائے گا۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ

کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا اس کے نیچے جاری ہوں

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ

نہریں اس میں اس کے لئے ہر طرح کے پھل ہوں اور اس کو بڑھاپا آ جائے اور اسکی

ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ

ضعیف آل و اولاد ہو پھر پہنچ گئی اس کو سخت تیز آندھی جس میں آگ ہو سو وہ باغ جل جائے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے تمہارے لئے

الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

آیات تاکہ تم فکر کرو

عبادت اور طاعات کو باطل کردینے والوں کی مثال

تفسیر: اس آیت شریفہ میں ان لوگوں کے بارے میں ایک مثال بیان فرمائی ہے۔ جو اعمال صالحہ انجام دیتے ہیں لیکن انکو ریاکاری یا مَنّ واذی کی وجہ سے یا کسی ایسے عمل کے کرنے سے جو حبط اعمال کا سبب ہو برباد کردیتے ہیں، ارشاد فرمایا کہ کسی شخص کا باغ ہو جس میں کھجوروں اور انگوروں کے درخت ہوں اور انکے علاوہ بھی ہر قسم کے پھل ہوں اس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں وہ خود بوڑھا ہو گیا اور اس کے اہل و اولاد ضعیف ہوں۔ خود بھی کچھ نہیں کرسکتا اور اولاد بھی کسی قابل نہیں، گزارہ کا راستہ صرف یہی باغ ہے اپنا خرچہ بھی اس سے ہے اور بال بچوں کا سہارا بھی یہی باغ ہے۔ ایسی حالت میں ایک تیز آندھی آئی اس آندھی میں آگ تھی اُس آگ نے سارے باغ کو جلا کر خاکستر کردیا، عین حاجت کے وقت جبکہ اس باغ کی بہت زیادہ ضرورت تھی کچھ بھی نہ بچا سارا ہی جل کر راکھ ہو گیا، اس مثال کو سامنے رکھ کر سمجھ لیں کہ جو اعمال صالحہ انجام دیئے جاتے ہیں اُن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آخرت میں ان کا ثواب ملے۔ وہاں حاجتیں پوری ہوں اور عذاب سے حفاظت ہو لیکن اخلاص نہ ہونے کے باعث جب بہت بڑی اور سب سے بڑی حاجت کا وقت آیا تو جو اعمال کئے تھے انہوں نے کچھ بھی کام نہ دیا کیونکہ اللہ کی رضا کے لئے نہیں بلکہ بندوں کو دکھانے کے لئے اعمال کئے تھے جو بظاہر نیک تھے لیکن ریاکاری نے ان کی نیکی ختم کردی تھی نماز پڑھی دکھاوے کے لئے، حج کیا نام و نمود کے لئے، صدقہ دیا شہرت کے لئے، جہاد کیا بہادری ظاہر کرنے کے لئے، صدقہ دیا شہرت کے لئے، اور شہرت کے خیال سے نہ تھا تو جن کو دیا تھا اُن پر احسان دھر کر اور تکلیف پہنچا کر اکارت کردیا آخرت میں پیشی ہے اعمال صالحہ کی ضرورت ہے اور اعمال کا ثواب مل نہیں رہا ایسے وقت میں جو بدحالی ہوگی اس کا کچھ اندازہ مذکورہ بالا باغ والے آدمی کی حیرت اور پریشانی سے کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فکرمند بنانے کیلئے طرح طرح کی مثالیں بیان فرماتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ

اے ایمان والو! خرچ کرو اپنی کمائی میں سے پاکیزہ چیزوں کو اور اس میں سے جو ہم نے نکالا تمہارے لئے

مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ

زمین میں سے، اور مت ارادہ کرو ردی چیزوں کا کہ اس میں سے خرچ کرو، اور تم خود اس کے لینے والے نہیں ہو مگر اس صورت میں کہ

تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

چشم پوشی کر جاؤ، اور جان لو کہ بلا شبہ اللہ غنی ہے اور حمید ہے

اللہ کی رضا کیلئے عمدہ مال خرچ کرنے کا حکم

تفسیر: گزشتہ آیات میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کا ثواب ذکر فرمایا ہے اور خرچ کرنے کے آداب بتائے ہیں اس آیت میں اپنے کمائے ہوئے مالوں میں سے طیّب عمدہ حلال اور اچھی چیزیں خرچ کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ حرام کمانا تو حرام ہے جو حلال مال ہے اس میں سے بھی عمدہ چیز کو اللہ کی راہ میں دینا چاہئے۔ اسباب النزول صفحہ ۸۲ میں اس آیت کا سبب نزول بتاتے ہوئے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی، جب فصل پر کھجوروں کے پھل کاٹتے تھے تو کھجوروں کے خوشے رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں ستونوں کے درمیان بندھی ہوئی رسی پر لاکر ٹانگ دیتے تھے جس میں سے فقراء مہاجرین کھالیتے تھے ان میں سوکھے ہوئے خوشے بھی ہوتے تھے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ (کہ تم ردّی چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو)

لباب النقول میں بحوالہ حاکم حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صدقۃ الفطر ادا فرمانے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ کھجور کا ایک صاع صدقہ میں دیا جائے اُس پر ایک شخص ردی کھجوریں لے آیا لہٰذا آیت کریمہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ نازل ہوئی یہ جو فرمایا وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ۔ اس میں تنبیہ فرمائی کہ تم اللہ کی راہ میں گھٹیا مال خرچ کرنے کو تو تیار ہو لیکن ویسا ہی گھٹیا مال تمہیں کوئی دے تو تم خود اسے لینے کو تیار نہ ہو گے۔ تمہارا کسی پر قرضہ ہے قرضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں تمہیں کوئی خراب کھجوریں یا دوسرا کوئی گھٹیا مال دینے لگے تو تم اُسے قبول نہ کرو گے ہاں یہ اور بات ہے کہ موقع دیکھ کر آنکھیں میچ لو اور یہ سمجھ کر رکھ لو کہ اس آدمی سے عمدہ مال کبھی بھی نہیں ملے گا چلو جو ہاتھ آتا ہے یہ ہی سہی یہ مسامحت والی بات دوسری ہے رضا اور رغبت اور دل کی خوشی کے ساتھ تم ردّی چیز قبول نہیں کرسکتے۔

عمومی طور پر مال طیّب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (کہ ہم نے زمین سے جو کچھ تمہارے لئے نکالا ہے اس میں سے بھی خرچ کرو) حضرات فقہاء کرام نے اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ زمین کی پیداوار پر بھی زکوٰۃ ہے اور احادیث شریفہ سے بھی پیداوار کی زکوٰۃ ثابت ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں اس کو عشر کہا جاتا ہے)۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے عموم سے استدلال کیا ہے کہ زمین سے جو بھی کچھ پیدا ہو (غلہ ہو یا سبزیاں، ترکاریاں ہوں یا پھل) سب کی زکوٰۃ نکالنا فرض ہے۔ البتہ گھاس اور لکڑی ان کے نزدیک اس سے مستثنیٰ ہے۔ پیداوار کی زکوٰۃ کا اُصول یہ ہے کہ جو زمین ایسے پانی سے سیراب کی جائے جس کی قیمت ادا کرنی نہ پڑے مثلاً بارش کے پانی سے سیراب کی جائے یا ندی یا دریا کے کنارے پر ترائی میں کوئی چیز پانی دیئے بغیر بونے سے پیدا ہو جائے تو اسکی کل پیداوار سے دسواں حصہ مستحقین زکوٰۃ کو دینا فرض ہے اور یہ بھی زکوٰۃ ہی ہے مثلاً دس کلو پیداوار میں سے ایک کلو دیدے اور اسی طرح باغ میں جو پھل پیدا ہوں ان کا بھی دسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرے۔ اور اگر پانی کی قیمت دے کر زمین کو سیراب کیا گیا ہے تو ایسی زمین کی پیداوار کا نصف العشر یعنی دسویں کا آدھا زکوٰۃ میں دینا فرض ہوتا ہے، جس کو بیسواں حصہ کہا جاتا ہے یعنی دس کلو پیداوار سے آدھا کلو زکوٰۃ دیدے۔

مسئلہ: یہ دسواں یا بیسواں حصہ جو زکوٰۃ میں ادا کرنا فرض ہے۔ اس میں کوئی نصاب نہیں ہے یعنی جس قدر بھی پیداوار ہو اُس کا دسواں یا بیسواں حسب تفصیل بالا ادا کرے۔

مسئلہ: کھیتی پر جو مال خرچ ہوا مثلاً بیج ڈالا، مزدوروں سے زمین کھودوائی، بیل خریدے، ٹریکٹر چلوایا، کام کرنے

والوں کومزدوری دی، یہ سب اخراجات منہانہیں ہوں گے جو کچھ بھی پیداوار ہواسکی زکوٰۃ کا دسواں یا بیسواں حصہ (حسب تفصیل بالا) زکوٰۃ میں ادا کرنا لازم ہے۔

فائدہ: زمینوں کے عشری اور خراجی ہونے میں کچھ تفصیل ہے۔ مختصراً اتنا سمجھ لیا جائے کہ جو کوئی علاقہ کافروں کے قبضہ میں تھا پھر مسلمانوں نے حملہ کر کے وہ علاقہ اُن سے چھین لیا اور امیر المومنین نے اس علاقہ کی زمین مسلمانوں میں تقسیم کردی تو یہ زمین عشری ہے اسی طرح سے اگر کسی شہر کے رہنے والے مسلمان ہو جائیں تو انکی زمین بھی عشری ہو جائے گی۔

آیت کے ختم پر فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ کہ (اللہ تعالیٰ غنی ہے مستحق حمد ہے) اُسے تمہارے صدقات کی حاجت نہیں جو کچھ خرچ کرتے ہو آپس میں خود ہی منتفع ہوتے ہو اُس نے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے عطاء فرمانے پر وہ مستحق حمد ہے مستحق شکر ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ حمید بمعنی حامد بھی ہوسکتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ عمدہ چیز قبول فرماتا ہے یعنی خرچ کرنے والے کو ثواب دیتا ہے اور یہ قبول کرنا اور ثواب دینا اسکی طرف سے بندوں کی تعریف ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ج وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً

شیطان تم کو ڈراتا ہے تنگدستی سے، اور حکم دیتا ہے تمہیں فحش کاموں کا اور اللہ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی طرف سے مغفرت کا

مِّنْہُ وَفَضْلًا ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۸﴾ صلے لا یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ج وَمَنْ یُّؤْتَ

اور فضل کا، اور اللہ وسعت والا ہے۔ خوب جاننے والا ہے، وہ حکمت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور جس کو

الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ط وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

حکمت دی گئی اُسے خوب زیادہ خیر عطاء کی گئی، اور وہ ہی لوگ نصیحت قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں

شیطان تنگدستی سے ڈراتا ہے اور اللہ تعالیٰ مغفرت اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے

تفسیر: اس آیت شریفہ میں ہدایت فرمائی ہے کہ شیطان کے بہکانے اور ڈرانے میں نہ آؤ جب تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ارادہ کرو گے تو شیطان تمہارے دل میں وسوسے ڈالے گا۔ اور یوں کہے گا کہ صدقہ دو گے تو مال کم ہو جائے گا۔ تنگدستی آجائے گی اپنی کل کی ضرورت کے لئے مال بچا کر رکھو بچوں کے کام آئے گا اگر خرچ کرنے ہی لگو گے تو پھر وہ گھٹیا مال خرچ کرنے کی ترغیب دے گا وہ تنگدستی سے ڈراتا ہے۔ بخل پر اُبھارتا ہے اور اس کے علاوہ بے حیائی کے کاموں کا بھی حکم کرتا ہے وہ گناہوں کی ترغیب دیتا ہے تم اس کے کہنے میں نہ آؤ اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھو اس نے تم سے جو مغفرت اور فضل کا وعدہ فرمایا ہے اس کے امیدوار رہو اور یقین جانو کہ وہ اپنے سب وعدے پورے فرمائے گا، اپنے خالق و مالک کے وعدوں کو بھول جانا اور دشمن شیطان کی باتوں میں آجانا سمجھداری کی بات نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تھوڑا سا دو گے تو بہت ملے گا آخرت میں تو اجر و ثواب ہے ہی دنیا میں بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بڑے بڑے منافع ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن پر میں قسم کھاتا ہوں ایک تو یہ ہے کہ صدقہ کرنے سے کسی بندہ کا مال کم نہ ہوگا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ جس کسی بندہ پر بھی ظلم کیا جائے وہ اس پر صبر کرلے گا تو اللہ اسکی وجہ سے اس کو ضرور عزت عطا فرمائے گا اور تیسری بات یہ ہے کہ جو بھی کوئی شخص بندوں سے

مانگنے کا دروازہ کھولے گا تو اس کے لئے ضرور تنگدستی کا دروازہ کھل جائے گا۔ (رواہ الترمذی کما فی المشکوٰۃ ص ۴۵۱ ج ۱)

زکوٰۃ اور صدقات سے مال گھٹتا نہیں ہے بڑھتا ہی ہے اور اس سے مال کی حفاظت بھی ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اپنے مالوں کو زکوٰۃ ادا کر کے ضائع ہونے سے محفوظ کرو اور اپنے مریضوں کے علاج کے لئے صدقہ دیا کرو (کیونکہ یہ بہت بڑا علاج ہے) اور مُصیبت کی موجوں کا مقابلہ دُعاء سے اور تضرع وزاری سے کرو۔ (رواہ ابوداؤد فی المراسیل)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ روزانہ جب صبح ہوتی ہے تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ اے اللہ خرچ کرنے والے کو اُس کے عوض اور دے اور دوسرا کہتا ہے کہ اے اللہ! روکنے والے کا مال تلف کر دے (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۶۴ ج ۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ابن آدم تو (مخلوق پر) خرچ کر میں تجھ پر خرچ کروں گا۔ (صحیح بخاری)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم خرچ کرتی رہو اور گن کر مت رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی گن کر دے گا اور بند کر کے نہ رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی داد و دہش بند فرما دیگا جو بھی تھوڑا بہت ہو خرچ کرتی رہو۔ (صحیح بخاری ص ۱۹۳ ج ۱)

شیطان چاہتا ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کریں نفس بھی ہچکچاتا ہے کہ خرچ ہو جائے گا تو آگے کیا ہوگا' کہاں سے آئے گا اور ایسے ہی وقت میں صدقہ کرنے کی زیادہ فضیلت ہے جبکہ نفس کنجوسی کی طرف جاتا ہو۔

ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کونسا صدقہ ثواب کے اعتبار سے زیادہ بڑا ہے آپ نے فرمایا ایسا صدقہ کہ صدقہ کرتے وقت تندرست ہو۔ (مرض الموت میں نہ ہو) خرچ کرنے کو دل نہ چاہتا ہو۔ تنگدستی سے ڈرتا ہو اور پیسہ پاس رکھنے کی آرزو رکھتا ہو یہ صدقہ ثواب کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے' اور خرچ کرنے میں تو دیر نہ لگا یہاں تک کہ جب موت آ جائے اور جان حلق کو پہنچ جائے تو کہنے لگے کہ فلاں کو اتنا اور فلاں کو اتنا (اب فلاں کو کیا دلوا رہا ہے) اب تو دوسروں کا ہو ہی چکا۔ (صحیح بخاری ص ۱۹۱ ج ۱)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دی تو اس کی وجہ سے مال کا شر چلا گیا یعنی مال کی وجہ سے جس کسی شر کا اندیشہ تھا اس سے حفاظت ہو گئی۔ (الترغیب والترہیب ص ۵۱۹ ج ۱)

شیطان انسان کا بہت بڑا دشمن ہے یہی نہیں کہ صرف اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے بلکہ طرح طرح کی مشکلات سامنے لا کر پریشان کرتا ہے اور ڈراتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے اور بندوں کے ایمان کو متزلزل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی آدم کے دل پر شیطان کی پہنچ بھی ہوتی ہے اور فرشتے کا نزول بھی ہوتا ہے۔ شیطان (تنگدستی وغیرہ سامنے لا کر) ڈراتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے۔ اور فرشتہ خیر کے واقع ہونے کی اُمیدیں دلاتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ سو تم میں سے جو شخص بھی اسے محسوس لے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے لہٰذا اللہ کی حمد کرے اور جو شخص دوسری بات (یعنی شیطان کی سمجھائی ہوئی چیز) محسوس کرے وہ محفوظ رہنے کے لئے اللہ کی پناہ مانگے۔ یہ بات بیان فرما کر آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہی آیت اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ تلاوت فرمائی۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۸ ج ۱)

آیت کے ختم پر فرمایا: وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ کہ اللہ تعالیٰ وسیع رحمت وسیع فضل' وسیع علم والا ہے۔ سب کے صدقات کو اور نیتوں کو جانتا ہے۔ وہ خوب زیادہ دے گا پھر فرمایا يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ کہ اللہ تعالیٰ حکمت عطا فرماتا ہے جس کو چاہے' لفظ

حکمت مضبوط چیز کے معنی میں آتا ہے علم عمل قول جس میں بھی اتقان ہو وہ سب حکمت ہے یہ لفظ قرآن مجید میں بہت سی جگہ وارد ہوا ہے۔ روح المعانی (ص ۴۱ ج ۳) میں تفسیر البحر المحیط سے نقل کیا ہے کہ اس میں حضرات علماء کرام کے انتیس اقوال ہیں اور تقریباً سب کا مرجع ایک ہی ہے' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے فقہ فی القرآن مراد ہے' حضرت قتادہ وغیرہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے' حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن کو پڑھنا اور اس میں فکر کرنا یہ حکمت عملی ہے' حضرت مجاہد نے فرمایا کہ قول و عمل کی دُرستگی حکمت ہے۔ اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ قرآن و علم وفقہ یہ سب حکمت ہے' انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ حکمت سے وہ علم مراد ہے' جس کا نفع بہت بڑا ہو اور فائدہ خوب زیادہ ہو' حضرت عطاء نے فرمایا کہ اللہ کی معرفت کا نام حکمت ہے۔ حضرت ابو عثمان نے فرمایا کہ حکمت ایک نور ہے جس کے ذریعہ وساوس اور الہام صحیح میں فرق ہوتا ہو' جو بھی معنی لیا جائے ہر ایک مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ سب کا مرجع تقریباً ایک ہی ہے' علم محکم اور علم نافع اور عمل صحیح اور قول صحیح اجمالی طور پر یہ معنی مراد لے لئے جائیں تو آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے' اول تو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت عطا فرمائے۔ پھر فرمایا کہ جسے حکمت عطا کی گئی اُسے بہت زیادہ خیر عطا کر دی گئی' کیونکہ حکمت اس کے لئے دنیا و آخرت کی خیر حاصل ہونے کا ذریعہ بنے گی جس کے اقوال و اعمال ٹھیک ہوں علم محکم کے مطابق ہوں۔ صحیح بخاری (ص ۱۷ ج ۱) میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رشک کے قابل صرف دو ہی آدمی ہیں ایک وہ جسے اللہ نے مال دیا پھر اسے خیر کے کاموں میں خوب زیادہ خرچ کرنے پر مسلط فرما دیا' اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے حکمت دی اور وہ اس کے ذریعے فیصلے کرتا ہے اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ آیت کے ختم پر فرمایا: وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ کہ عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں جو اوہام سے اور اتباع ھوی کی تاریکیوں سے دور ہیں۔ اللہ کی آیات میں غور و فکر ان کے لئے ذریعہ موعظت و نصیحت بنتا ہے۔ کما قال تعالیٰ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الآیۃ)

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا

جو کچھ کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو سو بلا شبہ اللہ اسکو جانتا ہے اور

لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

ظلم کرنے والوں کیلئے کوئی بھی مددگار نہیں

جو کچھ خرچ کرو گے یا نذر مانو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے

تفسیر: اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت اور ریا اور من و اذی سے بچنے کی تاکید اور مال طیب خرچ کرنے کا حکم فرمانے اور شیطان کے وسوسوں پر عمل نہ کرنے اور خدائی وعدوں کے مطابق اعمال کے ثواب کی اُمید رکھنے کا حکم دینے کے بعد اب اجمالی طور پر یہ فرمایا ہے کہ تم جو بھی کوئی خرچہ کم یا زیادہ دکھا کر یا پوشیدہ طور پر خرچ کرو گے یا کوئی نذر مانو گے تو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے وہ نیت اور عمل سب کو جانتا ہے اسی کے مطابق وہ جزا دے گا۔ یہ ایک اعتبار سے گزشتہ مضامین کی تاکید ہے' نفقہ کے ساتھ نذر کا ذکر بھی فرمایا ہے کوئی شخص اگر نذر مان لے بشرطیکہ گناہ کی نذر نہ ہو تو وہ لازم ہو جاتی ہے نذر مطلق بھی ہوتی ہے اور معلق بھی' مطلق یہ کہ یوں زبان سے کہے کہ اللہ کے لئے ایک روزہ رکھوں گا یا دو رکعت نماز پڑھوں گا

یا نفلی صدقہ کروں گا اور نذر معلق یہ ہے کہ یوں کہے کہ میرا بیٹا اچھا ہو جائے تو اتنے نفل پڑھوں گا یا اتنے مسکینوں کو کھانا کھلاؤں گا یا سو روپے صدقہ کرونگا دونوں طرح کی نذر کرنے سے نذر کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

سورہ حج میں ارشاد ہے: وَلْيُوفُوا نُذُوْرَهُمْ (کہ اپنی نذروں کو پورا کریں) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام طور سے لوگ چونکہ کسی مرض یا خوف یا کسی مصیبت کے دور کرنے کے لئے نذر مانتے ہیں اور عموماً مال خرچ کرنے کی نذر ہوتی ہے اس لئے یہاں نفقہ کے ساتھ اُس کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ نذر کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا اور فرمایا کہ وہ کسی چیز کو دفع نہیں کر سکتی اور ہوتا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ بخیل سے کوئی چیز نکال لی جاتی ہے۔ (رواہ البخاری ص ۹۹۰ ج ۲)

نذر ماننا مناسب تو نہیں جیسا کہ حدیث میں معلوم ہوا لیکن اگر کوئی شخص نذر مان لے تو اسے پورا کرے۔ البتہ اگر گناہ کی نذر مانی ہے تو اس کو پورا نہ کرے لیکن اس کا کفارہ ادا کرے جو قسم کا کفارہ ہے وہ ہی نذر کی خلاف ورزی کا بھی کفارہ ہے قسم کا کفارہ سورۂ مائدہ میں ساتویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے وہاں اسکی تفصیل دیکھ لی جائے۔

مسئلہ: کسی بھی گناہ کی نذر ماننا حرام ہے حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کی اطاعت کی نذر مانے وہ اللہ کی اطاعت کرے اور جو شخص مصیبت کی نذر مان لے وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔ (رواہ البخاری ص ۹۹۱ ج ۲) یعنی گناہ کی نذر ماننے کی وجہ سے یہ نہ سمجھے کہ مجھے گناہ کرنا ہی ہے بلکہ اپنی نذر کی خلاف ورزی کرے اور کفارہ دیدے۔ (کمافی روایة ابی داؤد و الترمذی و النسائی مشکوٰة المصابیح ص ۲۹۸)

وجوب نذر سے متعلق فقہاء نے چند مسائل لکھے ہیں ان کے لئے کتب فقہ کی مراجعت کی جائے' پھر فرمایا: وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (کہ ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں) ہر معصیت ظلم ہے۔ چھوٹے بڑے جتنے بھی گناہ ہیں اپنے اپنے درجہ کے اعتبار سے ظلم ہیں بہت سے گناہ ایسے ہیں جو دوسروں پر ظلم کرنے کا سبب بنتے ہیں لیکن ہر گناہ' گناہ کرنے والے کی جان پر تو بہر حال ظلم ہے ہی اور سب سے بڑا ظلم کفر و شرک ہے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ
اگر تم صدقات ظاہر کر کے دو تو یہ اچھی بات ہے' اور اگر تم ان کو چھپاؤ اور فقراء کو دو تو وہ زیادہ بہتر ہے
لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾
تمہارے لئے' اور اللہ تمہارے گناہوں کا کفارہ فرما دے گا۔ اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے

صدقات کو ظاہر کر کے یا پوشیدہ طریقہ پر دینا

تفسیر: اس آیت شریفہ میں صدقات دینے کے بارے میں ایک بہت اہم بات ذکر فرمائی ہے اور وہ صدقات ظاہر کر کے دینے اور چھپا کر دینے کے متعلق ہے اول تو یہ سمجھنا چاہئے کہ ریا کاری جس کا نام ہے وہ خواہ مخواہ چپکتی نہیں پھرتی وہ تو نیت وارادہ کا نام ہے' جو کوئی شخص نماز پڑھے یا ذکر کرے یا زکوٰۃ دے یا صدقہ نافلہ دے اور اسکی نیت یہ ہو کہ لوگ مجھے نیک سمجھیں' میرا نام ہو' میری شہرت ہو تو یہ ریاکاری ہوگی اور گناہ ہوگا جس سے اعمال ضائع ہو جائیں گے' لیکن

اگر کوئی شخص صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جانی و مالی عبادت کرے چاہے لوگوں کے سامنے ہی ہو اور اس سے نام و نمود شہرت مقصود نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں' بلکہ اگر یہ نیت ہو کہ لوگوں کے سامنے عمل کرنے سے دوسروں کو بھی ترغیب ہوگی تو اس نیت کا مستقل ثواب ملے گا' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ بیان فرمایا کہ میں اپنے گھر کے اندر اپنی نماز کی جگہ نماز پڑھ رہا تھا ایک آدمی داخل ہوا اس نے مجھے دیکھ لیا اس کے آنے سے مجھے یہ بھلا معلوم ہوا کہ اس نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے واقعہ عرض کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ تجھ پر اللہ کی رحمت ہو اس میں تیرے لئے دو اجر ہیں' پوشیدہ عمل کرنے کا اجر بھی اور ظاہر اً عمل کرنے کا اجر بھی۔ (رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو یہ بیان کیا کہ ''مجھے یہ بھلا معلوم ہوا کہ اس نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بیان کرنے میں یا تو ان کا یہ مطلب تھا کہ میرے نفس میں ریاکاری کا وسوسہ آ گیا کہ مجھے ایک آدمی نے تنہائی میں نماز پڑھتے دیکھ لیا یا یہ مطلب تھا کہ نفس کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ یہ جو آدمی آیا ہے یہ میرا عمل دیکھ کر خود بھی عمل کرے گا۔ بہر حال جو بھی صورت ہو آنحضرت ﷺ نے ان کو دوہرے اُجر کی خوشخبری دی۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ ریا لوگوں کے سامنے عمل کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تو اندر کے اس جذبہ کا نام ہے کہ لوگ میرے معتقد ہوں اور مجھے اچھا کہیں اور عبادت کی وجہ سے میری تعریف ہو اس تمہید کے بعد آیت بالا کی تفسیر ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ اللہ جل شانہ' نے فرمایا کہ اگر تم صدقات ظاہر کر کے دے دو تو یہ بھی اچھی بات ہے' جب نیت خالص ہے اور اللہ کی رضا مقصود ہے تو یہ ادائیگی ریاکاری نہ رہی اور اس میں اس فائدہ کی اُمید ہے کہ دوسروں کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب ہوگی پھر فرمایا اور اگر تم صدقات کو چھپا کر دو تو یہ تمہارے لئے ظاہر کر کے دینے سے زیادہ بہتر ہے ظاہر کر کے دینے کو اچھی بات بتایا اور چھپا کر دینے کو زیادہ بہتر بتایا۔ کیونکہ چھپا کر دینے میں احتمال ریا کا ختم ہو جاتا ہے اور نفس کے پھولنے کا احتمال باقی نہیں رہتا۔ اور اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جس کو صدقہ دیا جائے وہ تنہائی میں لینے سے شرماتا نہیں اور اپنی خفت بھی محسوس نہیں کرتا۔ الفاظ آیت کے عموم میں معلوم ہو رہا ہے کہ چھپا کر دینا ہی زیادہ بہتر ہے۔ بعض حالات کے اعتبار سے لوگوں کے سامنے خرچ کرنا زیادہ باعث فضیلت ہو جائے وہ دوسری بات ہے۔ مثلاً کسی جگہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا رواج نہیں ہے لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے ہیں فریضۂ زکوٰۃ زندہ کرنے اور اس کا رواج ڈالنے کیلئے لوگوں کے سامنے دے یا کوئی ایسا شخص ہو جس کی اقتداء میں لوگوں کو خرچ کرنے کی طرف توجہ ہوگی تو ایسی صورت میں لوگوں کے سامنے دینے اور خرچ کرنے میں چھپا کر دینے سے زیادہ ثواب ہو سکتا ہے اصل چیز اخلاص نیت ہے اور نفس پر قابو پانا چونکہ ہر شخص کے بس کا نہیں ہے اس لئے چھپا کر خرچ کرنے کو زیادہ بہتر اور افضل بتایا ہے۔ بہت سے لوگ دیتے تو تنہائی میں ہیں لیکن اخبارات کے ذریعہ شہرت کرتے ہیں اور مساجد و مدارس کی روئیدادوں میں اپنا نام لانے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑے بڑے القاب و آداب کے ساتھ اپنا نام چھپنے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ تنہائی میں دینے کا کیا فائدہ ہوا جبکہ دل میں ریاکاری کی موجیں اُٹھ رہی ہیں۔ عمل ظاہر میں کرے یا پوشیدہ کرے صرف اللہ کی رضا مقصود ہو اور عمل کی جو خوبی ظاہر میں ہو وہی پوشیدہ حالت میں ہو تو یہ دلیل اخلاص ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جب لوگوں کے سامنے نماز پڑھتا ہے اور اچھی طرح نماز پڑھتا ہے۔ اور پوشیدہ طور پر نماز پڑھتا ہے تب اچھی نماز پڑھتا ہے تو اللہ جل شانہ' فرماتے ہیں کہ واقعی یہ میرا بندہ ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۵۵)

صاحب روح المعانی (ص ۴۴ ج ۳) لکھتے ہیں کہ چھپا کر صدقہ کرنے کے بارے میں کثیر تعداد میں احادیث و آثار وارد ہوئے ہیں پھر مسند احمد سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جو صدقہ کسی فقیر کو چپکے سے دے دیا جائے یا ایسا شخص صدقہ کر دے جو تنگدست ہوتے ہوئے محنت اور کوشش کر کے مال حاصل کرے اور صدقہ دے دے اس کے بعد آپ نے آیت بالا تلاوت فرمائی صحیح بخاری (ص ۱۹۱ ج ۱) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات افراد ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس دن اپنے سایہ میں جگہ دے گا جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا' ان سات آدمیوں میں ایک وہ شخص ہے جس نے دائیں ہاتھ سے اس طرح چھپا کر صدقہ دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوئی۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ
آپ کے ذمہ نہیں ہے انکی ہدایت' لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جو بھی کچھ اچھا مال تم خرچ کرتے ہو' تو وہ
فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ
تمہاری جانوں کے لئے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے ہو مگر اللہ کی رضا کے لئے' اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے اچھا مال وہ پورا پورا تمہیں دے دیا جائے گا
وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾
اور تم پر ظلم نہ کیا جائے گا

جو کچھ بھی اچھا مال خرچ کرو گے اس کا بدلہ تمہیں مل جائے گا

تفسیر: رسول اللہ ﷺ بہت محنت و کوشش فرماتے تھے اور اہل کفر کو حق کی دعوت دیتے تھے۔ وہ لوگ جب قبول نہیں کرتے تھے تو آپ کو طبعی طور پر رنج ہوتا تھا' آپ ﷺ کی تسلی کے لئے آیات نازل ہوتی تھیں' ایسی آیات قرآن کریم میں کئی جگہ موجود ہیں انہی میں سے ایک یہ آیت بھی ہے کہ آپ کا کام راہ دکھانا ہے۔ صحیح بات بتانا ہے' حق کا قبول کرانا آپ کے ذمہ نہیں ہے' اللہ تعالیٰ ہادی ہے۔ وہ جس کو چاہے ہدایت دے' آپ کو غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ صاحب روح المعانی (ص ۴۵ ج ۳) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کا سبب نزول یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہم صرف اہل اسلام پر خرچ کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ نیز حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ انصار کی رشتہ داریاں تھیں جن میں بعض لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ حضرات ان کو صدقہ دینے سے بچتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ اسلام قبول کر لیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی' سبب نزول کو سامنے رکھنے کے اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہدایت پر لانا آپ کا کام نہیں ہے۔ تاکہ صدقہ روک کر لوگوں کو اسلام پر لانے کی صورت پیدا کی جائے صدقات نافلہ غیر مسلم ضرورت مندوں کو دینے میں بھی ثواب ہے اسلام قبول کرنا نہ کرنا انکا کام ہے۔

پھر فرمایا: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ صاحب روح المعانی اسکی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو مال بھی نیک کاموں میں خرچ کرو گے اس کا نفع تم ہی کو ہوگا۔ لہٰذا مَنّ اور اَذیٰ اور ریاکاری سے اُسے ضائع نہ کرو' یا یہ مطلب ہے

کہ فقراء کو دے دیا کرو خواہ وہ کافر ہی ہو تمہیں ثواب ملنے سے مطلب ہے۔

پھر فرمایا: وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ کہ تم تو صرف اللہ کی رضا ہی کے لئے خرچ کرتے ہو لہٰذا ان آداب کی رعایت کرو جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو اور ان اعمال سے بچو جن سے اللہ کی ناراضگی ہوتی ہو اور جن سے صدقات باطل ہو جاتے ہوں بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ نفی نہی کے معنی میں ہے یعنی تم نہ خرچ کرو مگر اللہ کی رضا کے لئے پھر فرمایا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ یعنی جو مال بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور ذرا سی بھی کمی نہ ہوگی اس میں پچھلے جملہ کی تاکید ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس کا یہ معنی بتایا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے خرچ کرنے کے بعد مزید مال عطا فرمائے گا۔ بحکم حدیث **اللّٰهم اعط منفقا خلفا** یہ معنی لینا بھی بعید نہیں ہے (من روح المعانی ج ۳ ص ۴۶)

مسئلہ: کافر کو نفلی صدقات دینا جائز ہے اس میں بھی ثواب ہے۔ البتہ یہ کافر کو زکوٰۃ اور صدقات واجبہ دینا جائز نہیں۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ
صدقات فقراء کے لئے ہیں جو اللہ کی راہ میں روکے ہوئے ہیں وہ زمین میں سفر نہیں کر سکتے۔
يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ
سوال سے بچنے کے سبب انجان آدمی انہیں مالدار سمجھتا ہے' تو انہیں پہچان لے گا۔ انکی نشانی سے' وہ لگ لپٹ کر لوگوں سے سوال نہیں
اِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾
کرتے' اور جو بھی کچھ تم خرچ کرو گے' اچھا مال سو اللہ اس کا جاننے والا ہے

فی سبیل اللہ کام کرنے والوں پر خرچ کرنے کا حکم

تفسیر: اس آیت شریفہ میں ان فقراء پر خرچ کرنے کی فضیلت بیان فرمائی جو دینی کاموں میں مشغول ہوں ان کی دینی مشغولیت انہیں کہیں آنے جانے نہیں دیتی کسب مال کے مواقع انکی مشغولیت کی وجہ سے میسر نہیں ہیں۔

صاحب روح المعانی (ص ۴۶ ج ۳) میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ان سے حضرات اصحاب صفہ مراد ہیں پھر لکھا ہے کہ یہ حضرات تین سو کے لگ بھگ تھے ان کی تعداد میں کمی بیشی بھی ہوتی رہتی تھی یہ فقراء مہاجرین تھے جو مسجد نبوی کے چبوترے پر رہتے تھے جس پر چھپر پڑا ہوا تھا۔ یہ حضرات اپنے اوقات علم دین حاصل کرنے میں اور جہاد میں خرچ کرتے تھے اور جو کوئی جماعت جہاد کے لئے رسول اللہ ﷺ بھیجتے تھے۔ اس میں چلے جاتے تھے۔

حضرت سعید بن جبیرؓ نے فرمایا کہ ان سے وہ حضرات مراد ہیں۔ جن کو جہاد میں زخم آ گئے تھے اور وہ معذور ہو گئے تھے لہٰذا مسلمانوں کے اموال میں ان کا حق مقرر فرمایا۔

صاحب روح المعانی اس کے بعد لکھتے ہیں کہ دونوں روایتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آیت کا مفہوم ان حضرات کو اوّلیت کے اعتبار سے شامل ہے حصر مقصود نہیں ہے کیونکہ ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کا حکم قیامت کے دن تک

باقی ہے جو لوگ اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں ان کی ایک صفت تو یہ بیان فرمائی کہ دینی مشغولیت کی وجہ سے چل پھر کر کسب معاش نہیں کر سکتے اور اُن پر خرچ کرنے کا یہ بہت بڑا سبب ہے۔

دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ کہ یہ لوگ مخلوق کے سامنے سوال کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اس وجہ سے انجان آدمی جسے ان کا اندرونی حال معلوم نہیں ہے انہیں مالدار سمجھتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں جنہیں کمانے کی فرصت نہیں وہ مخلوق سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کریں کسی کے سامنے کوئی حاجت نہ رکھیں ایسے بے نیاز ہو کر رہیں کہ جنہیں ان کا حال معلوم نہ ہو وہ انکی بے نیازی کو دیکھ کر انہیں مالدار سمجھیں ہاں دوسرے مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ خرچ کرنے کی صحیح جگہ پہنچیں اور ایسے حاجت مندوں کا پتہ چلائیں، اور در حقیقت اصل مسکین وہی ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ وہ مسکین نہیں ہے جو لوگوں کے پاس گھومتا پھرتا ہے۔ اُسے ایک لقمہ اور دو لقمے اور ایک کھجور اور دو کھجوریں در بدر پھراتی ہیں لیکن واقعی مسکین وہ ہے جسے اتنا مقدور نہیں جو اُسے بے نیاز کر دے اور اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تا کہ اُس پر خرچ کر دیا جائے اور وہ لوگوں سے سوال کرنے کے لئے بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ (رواہ البخاری ج ۱)

ان حضرات کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی تَعۡرِفُهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ کہ اے مخاطب ایسے لوگوں کو تو انکی نشانی سے پہچان لے گا۔ نشانی سے حالت ظاہرہ مُراد ہے جسے دیکھ کر انکی حاجت مندی اور بے چارگی معلوم ہو جائے۔ اس نشانی کے بارے میں بعض حضرات نے لکھا ہے کہ مشقت کے ظاہری آثار جو چہرے سے عیاں ہوں وہ مراد ہیں اور بعض حضرات نے فرمایا کہ بھوک کی وجہ سے جو رنگ زرد ہو گئے ہوں وہ مراد ہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ کپڑوں کا پھٹا پُرانا ہونا مراد ہے۔ صاحب معالم التنزیل (ص ۲۵۹ ج ۱) نے یہ اقوال نقل کئے ہیں لیکن در حقیقت ان پر کوئی انحصار نہیں، بھانپنے والے طرح طرح سے بھانپ لیتے ہیں جو فکر مند ہو گا وہ ان کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اور انکے پاس اُٹھ بیٹھ کر انکی حاجت مندی کو پہچان ہی لے گا۔

پھر فرمایا کہ لَا يَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا یعنی یہ حضرات لوگوں سے لگ لپٹ کر ذمہ ہو کر ضد کر کے سوال نہیں کرتے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اِلۡحَافًا قید احترازی نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل ہی سوال نہیں کرتے اگر سوال کرتے تو دیکھنے والا انہیں مالدار کیوں سمجھتا اور ان کے بارے میں یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ کیوں ارشاد ہوتا۔ آخر میں فرمایا: وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ۔ اور جو بھی کچھ تم خیر میں سے خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اُس کا جاننے والا ہے اسکی قدر فرمائے گا اور اسکی جزا دے گا تمہارا خرچ کیا ہوا ضائع نہ ہو گا۔

صاحب بیان القرآن لکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس آیت کے مصداق سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو علوم دینیہ کی اشاعت میں مشغول ہیں پس اس بنا پر سب سے اچھا مصرف طالب علم ٹھہرے اور ان پر بعض نا تجربہ کاروں کا جو یہ طعن ہے کہ ان سے کمایا نہیں جاتا اس کا جواب قرآن میں دے دیا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص ایسے دو کام نہیں کر سکتا جن میں سے ایک میں یا دونوں میں پوری مشغولی کی ضرورت ہو اور جس کو علم دین کی خدمت کا کچھ مذاق ہو گا وہ مشاہدہ سے سمجھ سکتا ہے کہ اس میں غایت مشغولی اور انہماک کی حاجت ہے اس کے لئے اس کے ساتھ اکتساب مال کا شغل جمع نہیں ہو سکتا اور اس کے کرنے سے علم دین کی خدمت ناتمام رہ جاتی ہے چنانچہ ہزاروں نظائر پیش نظر ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ

جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں پوشیدہ طور پر اور علانیہ طور پر سو ان کے لئے ان کا اجر ہے

عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

ان کے رب کے پاس، اور ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

رات دن مال خرچ کرنے والوں کی فضیلت اور منقبت

تفسیر: اس آیت میں رات دن اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرنے کا تذکرہ ہے۔ جو لوگ پوشیدہ طور پر اللہ کی راہ میں مال خرچ کریں گے یا علانیہ طور پر قیامت کے دن ان کا خرچ کیا ہوا مال اجر و ثواب کی صورت میں انہیں مل جائے گا۔ وہ وہاں غمگین نہ ہوں گے جبکہ بہت سے لوگ بدعملی کی وجہ سے یا اپنے مالوں کو گناہوں میں خرچ کرنے کی وجہ سے غمگین ہوں گے اس آیت میں مال خرچ کرنے کے بیان میں سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے سامنے مال خرچ کرنا ریا کاری میں شامل نہیں جس سے گناہ ہو اور خرچ کرنا اکارت ہو جاتا ہو گو خفیہ طریقہ پر خرچ کرنے کی فضیلت زیادہ ہے لیکن اگر دکھاوا مقصود نہ ہو نام و نمود پیش نظر نہ ہو اور مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہی ہو تو لوگوں کے سامنے خرچ کرنے سے ریا کاری میں شمار نہ ہوگا، ریا کاری اپنے دل کے جذبہ اور ارادہ کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص تنہائی میں نیک عمل کرے اور مال خرچ کرے اور پھر لوگوں کو معتقد بنانے کے لئے اپنے عمل کو ظاہر کرے یا دل میں یہ تڑپ ہو کہ میرے اعمال لوگوں پر ظاہر ہوں تاکہ میری تعریف ہو تو یہ بھی ریا میں شامل ہو جائے گا بلکہ اس میں دُہرا ریا ہے کہ لوگ یوں کہیں گے کہ دیکھو کیسے مخلص ہیں تنہائیوں میں عمل کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ

جو لوگ کھاتے ہیں سود وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر جیسے کہ کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جسے شیطان لپیٹ

مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ

کر مخبوط بنا دے یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ بیع تو سود ہی کی طرح سے ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا

وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ

اور سود کو حرام قرار دیا، سو جس کے پاس آ گئی نصیحت اس کے رب کی طرف سے پھر وہ باز آ گیا تو اس کے لئے وہ ہے جو گزر چکا،

وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اور اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے، اور جو شخص پھر عود کرے سو یہ لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

سود خوروں کی مذمت

تفسیر: ان آیات میں سود خوروں کی مذمت بیان فرمائی ہے اور ان کا حال بیان فرمایا ہے جو قیامت کے دن ان کو پیش آئے گا

یعنی وہ قیامت کے دن قبروں سے اس طرح حیران اور مدہوش کھڑے ہوں گے جیسے کسی کو شیطان لپٹ چپٹ جائے اور وہ اس کی وجہ سے مخبوط ہو جائے یعنی اس کے ہوش خطا ہو جائیں' مبہوت ہو جائے۔ بہکی بہکی باتیں کرے اس کا دل اور دماغ کام نہ کر سکے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں ایسے لوگوں پر گزرا جن کے پیٹ بیوت یعنی گھروں کی طرح سے تھے اُن میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو اُن کے پیٹوں کے باہر سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے کہا' اے جبریل یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ سود کھانے والے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۴۶ بحوالہ احمد و ابن ماجہ)

جس کے سامنے ایک سانپ ہو اسکی حیرانی اور پریشانی کا تصور کرو' پھر یہ سوچو کہ اگر کسی کے پیٹ میں ایک سانپ ہو تو اُس کا کیا حال ہوگا اور اس کے بعد یہ غور کرو کہ جس کا پیٹ گھر کے برابر ہو اور اس میں سانپ ہی سانپ بھرے ہوئے ہوں اس کا کیا حال ہوگا اور کیا ہوش برقرار رہے گا۔ سود خوروں کی قیامت کے دن کی حالت بتا کر یہ بتایا کہ یہ لوگ سود کو حلال قرار دینے کیلئے یوں کہتے ہیں کہ سود میں اور بیع میں فرق کیا ہے کاروبار کرنے میں بھی زیادہ مال ملتا ہے۔ اور سود کے لین دین میں بھی زیادہ مال ملتا ہے۔ لہٰذا بیع کی طرح سود لینا بھی صحیح ہوا۔ اس بات کو سود لینے والے مختلف الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس کو نفع کے نام سے کھا جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے پیسے کا نفع ہے حالانکہ کسی چیز کا نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی اور حرام حلال نہیں ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے وہ ہمیشہ حرام ہی رہے گا' جب سے بنکوں کا نظام جاری ہوا ہے۔ لوگوں کو سود لینے کی عادت ہو گئی ہے اور جب تک سود نہ کھائیں ان کے نفس کو تسلی ہی نہیں ہوتی اور علماء کو خصوصیت کے ساتھ ہدفِ ملامت بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولویوں نے قوم کو سود لینے سے اور سودی کاروبار سے روک دیا جس کی وجہ سے قوم بہت نیچے چلی گئی اور دوسری قومیں سودی کاروبار کر کے بامِ عروج پر پہنچ گئیں۔ بھلا مولوی کی کیا مجال ہے کہ وہ اپنے پاس سے خود کچھ کہے۔ وہ تو حکم سنانے والا ہے۔ حلال چیز کو حرام قرار دینا اس کے عہدہ میں کب ہے؟ اس کا تو صرف اتنا قصور ہے کہ حق سُناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے' اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔ جن لوگوں کو حرام کا ذوق ہے وہ اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اعتراض کرتے ہیں کہ بیع اور سود میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا' کہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا اور سود کو حرام قرار دیا پھر کیسے فرق نہیں ہے؟ ایک چیز حلال ہے دوسری چیز حرام ہے یہ بہت بڑا فرق ہے اور بیع اور سود کی حقیقت میں بھی فرق ہے۔ بیع تو مال سے مال کے مبادلہ کو کہا جاتا ہے پوری قیمت کے بدلہ مال آ جاتا ہے اور سود میں یہ ہوتا ہے کہ جتنا قرض دیا وہ تو پورا وصول کر لیا جاتا ہے اور اس کے سوا الگ سے بھی زائد رقم لی جاتی ہے' فقہاء نے لکھا ہے کہ ہر وہ قرض جو ذرا سا بھی زائد کچھ لے کر آئے تو وہ سود ہے۔ (کل قرض جرّ نفعا فھو ربوا)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو کچھ قرض دے پھر قرض لینے والا کچھ ہدیہ دے یا اپنے جانور پر سوار کرے تو نہ سوار ہو نہ ہدیہ قبول کرے۔ ہاں اگر ان کے درمیان اس سے پہلے ہدیہ لینے دینے کا تعلق تھا تو وہ اور بات ہے۔ (رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان کما فی المشکوٰۃ ص ۲۴۶)

حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوا۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اُنہوں نے فرمایا کہ تم ایسی سرزمین میں رہتے ہو جہاں سود کا لین دین رواج پائے ہوئے ہے جب کسی پر کچھ قرض ہو پھر وہ تمہیں

بھوسہ کا ایک گٹھڑ یا جو کی گٹھڑی یا رسی میں بندھی ہوئی سبزی بھی دینا چاہے تو اس کو مت لینا کیونکہ وہ سود ہے۔ (رواہ البخاری)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط کا تو یہ عالم تھا کہ جب کسی قرضدار سے تقاضا کرنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے تو اسکی دیوار کے سایہ میں بھی کھڑے نہ ہوتے تھے تا کہ قرضدار کی کسی چیز سے انتفاع نہ ہو جس کو قرض دیا ہو اس سے ہدیہ لینے کی ممانعت سے اس بات کا جواب بھی نکل آیا کہ جو شخص سود دیتا ہے وہ اپنی خوشی سے دیتا ہے۔ پھر اس کے لینے پر کیوں پابندی ہے؟ ہدیہ لینے کی ممانعت سے معلوم ہوا کہ خوشی سے دینے پر بھی سود لینا حلال نہیں ہے۔ جبکہ قرضدار سے ہدیہ لینا بھی حلال نہیں ہے تو سود کے نام سے اور سود کے عنوان سے جو کچھ طے کر کے لیا جائے۔ اُس کے حلال ہونے کا ذکر ہی کیا ہے؟ باہمی رضامندی سے نہ سود حلال ہے نہ رشوت حلال ہے نہ زنا حلال ہے۔ سود کا لین دین پرانی اُمتوں میں بھی حرام تھا۔ سورۂ نساء میں فرمایا: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ (سو یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو اُنکے لئے حلال تھیں اور اس وجہ سے کہ وہ کثرت سے اللہ کے راستہ سے روکنے کا کام کرتے تھے اور ان کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ ان کو اس سے روکا گیا تھا' اور باطل طریقوں سے لوگوں کے مال کھانے کی وجہ سے' اور ہم نے اُن کے لئے جو اُن میں سے کفر پر ثابت رہے' دردناک عذاب تیار کیا ہے)۔

چونکہ سودی لین دین میں غریبوں پر ظلم ہوتا ہے۔ اور مہاجن لوگ گھر بیٹھے ہوئے عوام کا خون چوستے ہیں اس لئے سود کھانے کی وہ سزا جو عالم برزخ میں ہے رسول اللہ ﷺ کو ایک خواب میں یوں دکھائی گئی کہ ایک شخص خون کی نہر میں کھڑا ہے اور نہر کے کنارے ایک آدمی ہے جس کے سامنے پتھر ہیں جو شخص نہر میں ہے وہ نکلنا چاہتا ہے تو یہ دوسرا شخص اس کے منہ پر پتھر مار دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ اسی جگہ چلا جاتا ہے جہاں پہلے تھا جب بھی وہ شخص نکلنا چاہتا ہے تو یہ شخص اس کے منہ پر پتھر مار دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی جگہ چلا جاتا ہے' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے پوچھا جن میں ایک جبریل اور دوسرے میکائیل تھے (علیہما السلام) کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ ان دونوں نے بتایا کہ یہ شخص جو نہر کے اندر ہے سود کھانے والا ہے۔ (صحیح بخاری ص ۱۸۵ ج ۱)

کیونکہ سود کا لین دین بہت ہی بڑا گناہ ہے اس لئے سود سے متعلق ہر شخص پر لعنت کی گئی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے سود کھانے والے پر اور سود کھلانے والے پر اور اسکی لکھا پڑھی کرنے والے پر اور اُس کے گواہوں پر' اور فرمایا کہ یہ لوگ گناہ میں سب برابر ہیں۔ (رواہ مسلم ص ۲۷ ج ۲)

جو لوگ سودی کاغذات لکھتے ہیں اسکی فائلیں بنا کر رکھتے ہیں سودی لین دین کی فرموں اور کمپنیوں اور بینکوں میں کام کرتے ہیں اور جو سود لیتے ہیں اور سود دیتے ہیں وہ اپنے بارے میں غور کر لیں کہ لعنت کے کام میں مشغول ہیں۔ گناہ کی مدد بھی حرام ہے اور جس نوکری میں گناہ کرنا پڑے وہ بھی حرام ہے اور اسکی تنخواہ بھی حرام ہے۔ سود کا لین دین کرنے والوں اور زیادہ آمدنی کی خواہش رکھنے والوں کو مفتیوں کی بات ناگوار تو لگتی ہے مگر حق تو کہنا ہی پڑتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سود کا ایک درہم جو انسان کھا لے اور وہ جانتا ہو کہ یہ سود کا ہے تو یہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ (رواہ احمد والدار قطنی مشکوٰۃ ص ۲۴۶)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سود کے ستر حصے ہیں اُن میں سب سے ہلکا یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ برا کام کرے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۴۶)

بیع کی حلت اور سود کی حرمت بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ کہ جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی سو جو کچھ گزر چکا وہ اسی کے لئے ہے یعنی اب تک جو سود لیا اس پر مؤاخذہ نہ ہوگا قال النسفی فی مدارک التنزیل (ص ۱۳۸ ج ۱) فلا یؤاخذ بما مضى منه لأنه اخذ قبل نزول التحريم۔ یعنی گزشتہ عمل پر اس کا مؤاخذہ نہ ہوگا کیونکہ اس نے حرمت نازل ہونے سے پہلے لیا ہے صاحب روح المعانی (ص ۵۱ ج ۳) لکھتے ہیں کہ یہ سود واپس نہ کروایا جائے گا کیونکہ حرمت نازل ہونے سے پہلے حرمت کا قانون نافذ نہیں تھا۔ لہٰذا معاف کر دیا گیا۔

پھر فرمایا: وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ۔ کی نصیحت اور موعظت کے بعد جس نے توبہ کر لی اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اگر سچے دل سے توبہ کی ہے تو اللہ کے یہاں قبول ہوگی۔ اور جھوٹی توبہ کی ہے تو نفع نہیں دے گی' ظاہری توبہ کے بعد بندوں کو بدگمانی کا کوئی موقع نہیں۔ اور جس نے پہلی بات کی طرف عود کیا یعنی سود کو حلال بنایا اور یوں کہا کہ وہ تو بیع کی طرح سے ہے تو ایسا کہنے والے دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ تفسیر مدارک و روح المعانی کی تصریح سے معلوم ہوا کہ فَلَهٗ مَا سَلَفَ نزول تحریم سے پہلے جو سود لیا تھا اس سے متعلق ہے۔ بعد تحریم کے جو شخص سود لے گا وہ واپس ہوگا۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

اللہ مٹاتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے صدقات کو' اور اللہ دوست نہیں رکھتا کسی کفر کرنے والے' گناہ کرنے والے کو

صدقات کی برکات اور سود کی بربادی

تفسیر: سود خوروں کی مذمت بیان فرمانے کے بعد اس آیت شریفہ میں سود اور صدقات کے درمیان ایک فرق عظیم بتایا ہے اور وہ یہ کہ صدقات کو اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے اور سود کے مال کو بے برکت کر دیتا ہے اور اس کو برباد اور تلف فرما دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ سود اگر چہ بہت ہو جائے اس کا انجام کمی کی طرف ہو جائے گا۔ (رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان واحمد کما فی المشکوٰۃ ص ۲۴۶)

دنیا میں سودی مالوں کی بے برکتی تو سب کی نظروں کے سامنے ہے' سود خور ہمیشہ ایک کے دس کرنے ہی کے فکر میں رہتا ہے۔ اور پیسہ ہی اسکی زندگی بن جاتا ہے۔ خدائے پاک کی رضا کے لئے کوئی کام کرے اس سے تو اس کا ذہن فارغ ہی رہتا ہے اس میں بے رحمی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ حاجت مند کی حاجت دیکھتا ہے اور اسکی مجبوری سے مال حاصل کرنے کا راستہ نکالتا ہے اور مجبور اور بے کس کو سود پر قرض دے دیتا ہے اور خیر کے کاموں میں اس کا مال خرچ ہونے کا تو ذکر ہی کیا ہے؟ پھر سود سے جو مال جمع ہوتا ہے اس سے اسباب معیشت تو جمع ہو جاتے ہیں لیکن سکون و اطمینان سلب ہو جاتا ہے۔ اسباب راحت ہیں۔ راحت نہیں' پھر یہ سودی اموال ہلاک ہو جاتے ہیں مالوں سے بھرے ہوئے جہاز ڈوب جاتے ہیں اور بنک دیوالئے ہوتے رہتے ہیں' یہ سب باتیں نظروں کے سامنے ہیں اگر کسی سود خور کا مال دُنیا میں ہلاک اور برباد نہ ہوا تو آخرت میں تو یہ مال بالکل ہی کام نہ دیگا۔ بربادی ہوگی۔ وہاں نہ مال ہوگا نہ مال سے فائدہ۔ اور حرام مال دوزخ میں لے جانے کا ذریعہ بنے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کوئی شخص حرام

مال کما کر صدقہ کرے گا تو وہ قبول نہ ہوگا اور جو کچھ اس میں سے خرچ کرے گا تو اس میں برکت نہ ہوگی۔ اور اپنے پیچھے چھوڑ کر جائے گا تو وہ اس کے لئے دوزخ کی آگ میں لیجانے والا توشہ بنے گا۔ (رواہ احمد کمافی مشکوٰۃ ص ۲۴۲)

پھر جو حرام مال آل واولاد پر زندگی میں خرچ ہوتا ہے اور جو موت کے بعد ان کو پہنچے گا اور اُن پر خرچ ہوگا وہ ان کے لئے بھی وبال ہوگا۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو گوشت حرام سے بڑھا ہو جنت میں داخل نہ ہوگا اور جو گوشت حرام سے بڑھا دوزخ کی آگ اس کی زیادہ مستحق ہوگی (احمد ودارمی، مشکوٰۃ ص ۲۴۲) اُس مال کی کثرت کس کام کی جو صاحبِ مال کے لئے اور اسکی آل اولاد کے لئے دوزخ میں جانے کا ذریعہ بنے اور دنیا میں بے برکت ہو اور اسکی وجہ سے آرام اور چین مفقود ہو، برخلاف حلال مال کے وہ خواہ تھوڑا ہی ہو اس میں برکت ہوتی ہے۔ اس میں سے جو صدقہ کر دیا جائے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوتا ہے اور تھوڑا مال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے تو بہت زیادہ چند در چند مضاعف کر دیا جاتا ہے جس کا بے انتہا ثواب آخرت میں ملے گا۔

پھر فرمایا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ یعنی جو شخص سود کی حرمت کا قائل نہ ہو اس کو حلال سمجھے اور کفر اختیار کرے اور سود کھا کر خدائے پاک کی نافرمانی کرے اللہ تعالیٰ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے وہ شخص اللہ کا مبغوض ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی سو اُن کیلئے

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

ان کا ثواب ہے ان کے رب کے پاس نہ وہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ غمگین ہوں گے

مومنوں، نمازیوں اور زکوٰۃ دینے والوں کا اجر وثواب

تفسیر: ابھی سود کے بارے میں بعض احکام کا بیان باقی ہے۔ درمیان میں اہل ایمان کی فضیلت اور ان کا اجر وثواب بیان فرما دیا اور ان کے بعض اعمال خاصہ کا تذکرہ فرمایا یعنی نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور فرمایا کہ بروز قیامت ان لوگوں پر کوئی خوف نہ ہوگا اور رنجیدہ نہ ہوں گے برخلاف سود لینے والوں کے کہ وہ وہاں دیوانوں کی طرح کھڑے ہوں گے مخبوط الحواس ہوں گے۔ اموال دنیا میں چھوڑ چکے ہوں گے اور وہاں ان اموال کے حاصل کرنے اور خرچ کرنے کی وجہ سے عذاب میں ڈالے جائیں گے۔

اول تو مال حرام والے نیک کاموں میں پیسے خرچ کرتے ہی نہیں اور اگر خرچ کر بھی دیں تو آخرت میں ان کا کچھ اجر نہیں نمازوں اور زکوٰۃ اور صدقات والے وہاں آرام اور چین سے ہوں گے کوئی خوف ان کو لاحق نہ ہوگا اور سود خواروں کا بُرا حال ہوگا، جیسا کہ پہلی آیت میں مذکور ہوا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو،

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ

پس اگر تم نہ کرو تو جنگ کا اعلان سن لو اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے، اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لئے اصل

اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿۲۷۹﴾
مال ہیں نہ تم ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا

سودخوروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ

تفسیر: اس آیت کا سبب نزول بیان کرتے ہوئے علماء تفسیر نے نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی ثقیف کے چار آدمی جو آپس میں بھائی بھائی تھے بنی مغیرہ سے سود کا معاملہ کرتے تھے یعنی بنی مغیرہ کو سود پر قرض دیتے تھے۔ جب طائف پر رسول اللہ ﷺ کا غلبہ ہو گیا (اور طائف اسلامی علاقہ میں داخل ہو گیا) تو یہ چاروں بھائی بھی مسلمان ہو گئے انہوں نے بنی مغیرہ سے اپنا سود طلب کیا تو بنی مغیرہ نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم اسلام قبول کرنے کے بعد سود نہیں دیں گے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ختم فرما دیا ہے۔ یہ قضیہ حضرت عتاب بن اُسید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش ہوا جو مکہ معظمہ پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے عامل یعنی حاکم تھے۔ انہوں نے پورا واقعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لکھ کر بھیج دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی' سودی مال بہت زیادہ تھا۔ آیت شریفہ سن کر ان لوگوں نے اپنا سود چھوڑ دیا۔ آیت شریفہ میں باقی سود چھوڑنے کا حکم فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ تم اصلی مال لے سکتے ہو' نیز یہ بھی فرمایا کہ اگر تم سود چھوڑنے کو تیار نہیں ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو یہ بات سنکر ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں اللہ کے مقابلہ کی کہاں طاقت ہے؟ کس کے بس کی بات ہے جو اللہ سے جنگ کرے؟ ہم اپنا سود چھوڑتے ہیں۔

آیت کا سبب نزول ہم نے اس لئے ذکر کیا کہ کوئی ایسا شخص جو مسلمان ہے اور اس نے سود پر قرضے دے رکھے ہیں اور بہت سے سود وصول بھی کر رکھے ہیں وہ یہ آیت کا مطلب یہ نہ نکال لے کہ جو سود میں نے اب تک لیا ہے وہ میرے لئے حلال ہے باقی سود چھوڑ دیتا ہوں اور اصل مال لے لیتا ہوں' آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن لوگوں نے زمانہ کفر میں سود پر قرضے دیئے تھے اور بہت سا سود قرضداروں سے وصول کر چکے تھے' وہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی باقی سود وصول کرنا چاہتے تھے ان کو حکم فرمایا کہ جو سود باقی ہے اس کو چھوڑ دو۔ جو کوئی مسلمان سود پر قرضے دے کر سود وصول کر چکا ہو اس کا حکم اس میں مذکور نہیں ہے۔ اگر کسی مسلمان نے سود لیا ہے اگرچہ سود دینے والے نے خوشی سے دیا ہے تو اس کا واپس دینا واجب ہے' اگر یاد نہ رہا ہو کہ کس کس سے لیا ہے تو جتنا مال سود کا وصول کیا تھا اسکا صدقہ کر دینا واجب ہے' جن لوگوں نے سود پر قرضے دے رکھے ہیں وہ توبہ کریں کہ سود وصول نہ کریں گے اگر توبہ نہیں کرتے تو اپنا انجام سوچ لیں کیونکہ سود لینا اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنا ہے اور اسکی گرفت و عذاب سے نڈر ہو جانا ہے جو اموال سود کے طور پر لے چکے ہیں ان کو واپس کریں' جن سے سود لیا ہے البتہ اپنا اصل مال وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ سود لے کر ظلم نہ کریں' اور جن لوگوں پر قرضے ہیں وہ اصل مال روک کر قرض دینے والوں پر ظلم نہ کریں۔

بنکوں میں جو رقمیں رکھتے ہیں اور ان پر سود لیتے ہیں یہ سخت حرام ہے اگرچہ اس کا نام نفع رکھ لیں۔ توبہ کریں اور وہاں سے اپنا اصلی مال لے لیں' نام رکھنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی اور سود کا نام نفع رکھنے سے نفع نہیں ہو جاتا' جو لوگ سود کا نام نفع رکھ لیتے ہیں اور پھر سود لیتے رہتے ہیں۔ ان کا قول انہی لوگوں کے قول کے مطابق ہو جاتا ہے اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰو کہا تھا۔ اللہ پاک نے اُنکی تردید فرمائی اور اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو فرمایا' جب کسی چیز کا رواج ہو جاتا ہے وہ خواہ کیسی ہی بری چیز ہو اسکی قباحت اور شناعت دلوں سے اُٹھ جاتی ہے۔ جب سے بنکوں کا سلسلہ چلا ہے لوگ بنکوں سے سود لینے کے

خوگر ہو گئے ہیں اور اسکی قباحت دلوں سے جاتی رہی ہے اور سود کو حلال کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ صاحب بنک والے ہمارے پیسوں سے تجارت کرتے ہیں نفع کماتے ہیں ہمیں بھی اُنہوں نے اگر نفع میں شریک کرلیا تو کیا ہوا؟ یہ انکی جہالت و گمراہی کی بات ہے۔ وہ بنک تجارت تو کرتا ہے اور تمہارے پیسوں سے کرتا ہے لیکن تم نے بنک کو مال مضاربت کے اُصول پر نہیں دیا، تمہیں فی صد ایک متعین رقم مل جاتی ہے۔ شرعی اصول سے یہ سود ہے، باتوں کی ہیرا پھیری سے سود حلال نہ ہوگا۔

فائدہ: جو شخص سود نہ چھوڑے اس کے لئے اللہ پاک نے اپنی طرف سے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان جنگ فرمایا، اس طرح کا مضمون ان لوگوں کے بارے میں بھی آیا ہے جو اللہ کے دوستوں سے دشمنی کریں، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ (کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص میرے کسی دوست سے دشمنی کرے تو اسے میں جنگ کا اعلان کرتا ہوں) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ من عادی للہ ولیا فقد بارز اللہ بالمحاربۃ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۵۵ از ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان) یعنی جس نے اللہ کے کسی ولی سے دشمنی کی وہ اللہ سے جنگ کرنے کے لئے میدان میں آ گیا۔ شراح حدیث نے لکھا ہے کہ یہی دو گناہ ایسے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کا ارتکاب کرنے والوں کو اعلان جنگ کرتا ہوں اور یہ دونوں گناہ ایسے ہیں جو آجکل بہت زیادہ رواج پا گئے ہیں۔ سود کا لین دین بھی بہت ہو رہا ہے۔ اور جو اولیاء اللہ ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ عبادت و تلاوت میں لگے رہتے ہیں قرآن و حدیث کے علوم پڑھتے ہیں۔ دینی علوم و اعمال کی طرف بُلاتے ہیں دین کے لئے محنتیں کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے دشمنی کی جاتی ہے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے اُمیدوار بھی ہیں جس سے لڑائی ہے اس سے اُمید رحمت کیسی نا سمجھی کی بات ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ

اور اگر تنگ دست ہو تو مہلت دینا ہے آسودہ ہو جانے تک، اور یہ بات کہ تم صدقہ کر دو تمہارے لئے بہتر ہے اگر

كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۖ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ

تم جانتے ہو، اور ڈرو تم اس دن سے جس میں لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف، پھر ہر جان کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو کچھ

مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

اس نے کسب کیا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا

تنگ دست قرضدار کو مہلت دینا

تفسیر: اس آیت میں تنگ دست قرضدار کو مہلت دینے کی ترغیب دی ہے کہ جب تک مال میسر نہ ہو اُسکو مہلت دیدو اور یہ بھی فرمایا اگر اس پر صدقہ کر دو یعنی اپنا قرض بالکل ہی معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ سود خوروں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ اُدھار کی وجہ سے اصل مال پر زائد رقم لیتے ہیں اور جب قرضدار وقت پر ادا نہ کر سکے تو دل سے خوش ہوتے ہیں اور سود کی رقم کو اصل کے ساتھ ملا کر مزید سود لگا دیتے ہیں، اللہ جل شانہٗ نے اس کے برخلاف حکم دیا کہ اول تو اصل رقم سے زائد نہ ٹھہراؤ (غریب کی حاجت پوری کرنے کے لئے قرض دے دو) پھر جب دیکھو کہ باوجود مقررہ اجل پورا ہونے کے وہ ادائیگی پر قادر نہیں تو اس کو

مہلت دیدؤ اور اگر بالکل معاف ہی کر دو تو یہ اور زیادہ بہتر ہے۔ معاف کرنے کو صدقہ سے تعبیر فرمایا جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح صدقہ دینے سے مال بڑھتا ہے اور مال میں برکت ہے اسی طرح قرضدار کا قرضہ معاف کر دینے میں بھی وہی برکات حاصل ہوں گی جو صدقہ دینے کی برکات ہیں۔ تنگ دست قرضدار کو مہلت دے دینے اور قرضہ معاف کر دینے کی احادیث شریفہ میں بڑی فضیلت آئی ہے' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک تاجر لوگوں سے قرضوں کا لین دین کیا کرتا تھا قرضے وصول کرنے پر جو غلام اس نے مقرر کر رکھے تھے ان سے کہتا تھا کہ جب کسی تنگ دست کے پاس پہنچو تو اس سے درگزر کر دینا اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بھی درگزر فرمائے گا۔ چنانچہ موت کے بعد جب وہ بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوا تو خداوند تعالیٰ شانہ' نے اس سے درگزر فرما دیا۔ (رواہ البخاری ص ۲۷۹ ج ۱ و مسلم ص ۱۸ ج ۲)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس کو اس بات کی خوشی ہو کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی بے چینیوں سے نجات دے تو تنگدست (قرضدار) کو مہلت دیدے یا معاف کر دے۔ (رواہ مسلم ص ۱۸ ج ۲)

حضرت ابو الیسیر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جس نے کسی تنگدست کو مہلت دے دی یا قرضہ معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ اُسے (قیامت کے دن) اپنے سایہ میں رکھے گا۔ (رواہ مسلم ص ۴۱۶ ج ۲)

قرض دینا بھی ایک طرح کا صدقہ ہے اگرچہ بعد میں وصول ہو جائے اور مہلت دینا بھی صدقہ کرنے میں شامل ہے تفسیر ابن کثیر میں بحوالہ مسند احمد رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جس نے کسی تنگدست کو مہلت دیدی تو اس کو روزانہ اسی قدر صدقہ دینے کا ثواب ہوگا۔ جتنا قرض اُس نے کسی کو دیا ہے یہ ثواب ادائیگی دین کا مقررہ وقت آنے سے پہلے ملتا ہے پھر مقررہ وقت آنے کے بعد مہلت دے تو روزانہ اتنے مال کا دوگنا صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے جتنا اس نے قرض دیا ہے۔ (ص ۳۳۱ ج ۱)

آخر میں ارشاد فرمایا ہے: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ الآية سود اور قرض سے متعلقہ احکام بیان فرمانے کے بعد قیامت کے دن کی حاضری کی طرف متوجہ فرمایا اور یوم الحساب کی حاضری کا مراقبہ کرنے کا حکم دیا جس دن ہر شخص اپنے پورے پورے اعمال کی فہرست پر مطلع ہوگا اور اپنے کئے ہوئے کا بدلہ ملے گا جسے فکر آخرت ہو موت کے بعد کے حالات کا یقین ہو اور بارگاہِ خداوندی میں اعمال کا حساب دینے کا استحضار ہو وہ وہاں کی نجات اور اجر و ثواب کے لئے ہر طرح کے حرام مال کو بآسانی چھوڑ سکتا ہے اور اس کے لئے نفس کو راضی کر سکتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ

اے ایمان والو! جب تم مقررہ مدت تک اُدھار لینے دینے کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو' اور چاہئے کہ جو شخص تمہارے

بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ

درمیان لکھنے والا ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھے' اور کوئی لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اسے سکھایا ہے۔ سو چاہئے کہ لکھدیا

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْــــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ

کرے' اور جس کے اُوپر حق ہے اسے چاہئے کہ لکھوا دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے' سو اگر

الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ

وہ شخص کم سمجھ ہو جس پر حق ہے یا ضعیف ہو یا املا کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی

وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا

انصاف کے ساتھ لکھوا دے، اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا لیا کرو، پس اگر

رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا

دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں ان گواہوں میں سے جنہیں تم پسند کرتے ہو تاکہ ان دو عورتوں میں سے اگر ایک بھٹک جائے

فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ

تو ایک دوسری کو یاد دلا دے اور نہ انکار کریں گواہ جب ان کو بلایا جائے، اور قرضے کے معاملہ میں لکھنے سے مت اُکتاؤ

تَكْتُبُوْهُ صَغِیْرًا اَوْ كَبِیْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ

چھوٹا ہو یا بڑا ہو اس کی مدت مقررہ تک یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی ہے

لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا

اور اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو مگر یہ کہ کوئی تجارت ہو جس میں لینا دینا دست بدست ہو جس کا تم آپس میں معاملہ کر

بَیْنَكُمْ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَایَعْتُمْ ۪ وَلَا یُضَآرَّ

رہے ہو سو تم پر اس بات کا کوئی گناہ نہیں کہ لکھا پڑھی نہ کرو، اور گواہ بنا لیا کرو جب کہ تم آپس میں خرید و فروخت کا معاملہ کرو، اور نہ ضرر دیا جائے

كَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ ؕ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَیُعَلِّمُكُمُ

کاتب کو اور نہ گواہ کو، اور اگر تم ایسا کرو تو بلاشبہ اس میں گناہ گاری ہے تمہارے لئے، اور اللہ سے ڈرو اللہ تمہیں سکھاتا ہے۔

اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے

مداینت اور کتابت اور شہادت کے ضروری مسائل

تفسیر: یہ کلمات اور حروف کے اعتبار سے قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت ہے جو متعدد احکام پر مشتمل ہے۔

شروع آیت میں فرمایا کہ جب تم آپس میں قرض کا لین دین کرو جس کی میعاد مقرر ہو تو اُسے لکھ لیا کرو۔ اس سے ایک تو قرض کے لین دین کا جواز معلوم ہوا۔ دوسرے اس بات کا تاکیدی حکم معلوم ہوا کہ قرض کے لین دین کو لکھ لیا کرو۔ اس لکھنے میں قرض کی مقدار بھی آ جائیگی اور جس وقت اداء کرنا طے کیا ہو وہ وقت تحریری طور پر متعین ہو جائے گا۔ دونوں باتیں مفید ہوں گی۔ کیونکہ خدانخواستہ آپس میں کوئی

اختلاف ہو گیا تو تحریر سامنے ہو گی جس سے اختلاف رفع ہو جائے گا۔ لفظ اَجَل کے ساتھ جو مسمّٰی بڑھایا ہے اس میں یہ بتایا کہ ادائیگی کا وقت اس طرح مقرر کریں جسے واقعی مقررہ وقت کہا جا سکے۔ مثلاً کسی مہینہ کی تاریخ مقرر کر دیں اگر یوں کہا کہ جب میرا باغ پکے گا تو دے دوں گا یا کھیت کٹے گا تو دیدوں گا یا میرا بیٹا یا باپ سفر سے آئے گا تو ادا کر دوں گا تو یہ اجل مسمّٰی نہیں ہے۔

قرض کے لین دین کے لکھنے کا تاکیدی حکم فرمایا ہے علماء کرام نے اس کو فرض یا واجب پر محمول نہیں کیا بلکہ یہ ایک مستحب عمل ہے اور استحباب مؤکد ہے تاکہ کوئی اختلاف واقع ہو جائے یا بھول چوک ہو جائے تو تحریر کے ذریعہ رفع ہو سکے۔ جہاں دین (قرض) کی لکھا پڑھی کا حکم ہوا اسی کے ساتھ ان لوگوں کو بھی پابند کیا جو لکھنا جانتے ہیں کہ انصاف کے ساتھ لکھیں کچھ ردو بدل نہ کر دیں اور یہ بھی فرمایا کہ جو لکھنا جانتا ہو وہ اللہ کی نعمت کی قدر دانی کرے اللہ نے اسے کتابت کی نعمت دی ہے اور لکھنے کے لائق بنایا ہے تو اللہ کی مخلوق کے کام آئے اور جب اس سے لکھنے کے لئے کہا جائے تو لکھ دیا کرے۔

پھر فرمایا: وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ یعنی جس شخص کے ذمہ حق ہے وہ املا کرائے اور کاتب کو بتائے کہ یہ لکھدو اور عبارت لکھوانے میں اللہ سے ڈرے، صحیح بات لکھوائے، پورا حق لکھوائے، حق واجب میں سے ذرا سی کمی بھی نہ کرے۔ تحریر کرانے میں اس کو خطاب فرمایا جس پر حق ہے کیونکہ جس پر حق ہے اس کا لکھوانا ایک قسم کا اقرار بھی ہے اور چونکہ اسی کو ادا کرنا ہے اس لئے حق واجب سے زیادہ تو لکھوا ہی نہیں سکتا۔ البتہ صاحب حق کی غفلت یا کم سمجھی یا محاورات نہ جاننے یا کاتبوں کی اصطلاحات نہ سمجھنے کے باعث اصل حق سے کم نہ لکھوا دے۔

اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ وہ کم سمجھ اور خفیف العقل ہے یا کسی بھی اعتبار سے ضعیف ہے (جس میں کم سن نابالغ بچہ ہونا اور بہت زیادہ بوڑھا ہونا بھی شامل ہے جو کاتب تک نہیں پہنچ سکتا یا اس پر خطاء ونسیان غالب ہے) یا املاء کرانے اور لکھوانے پر قدرت نہیں رکھتا (مثلاً غیر ملکی ہے یا گونگا ہے یا بے پڑھا ہے۔ عبارت بنانے اور بولنے پر قدرت نہیں رکھتا یا جو عبارت دستاویز میں لکھی جاتی ہے وہ نہیں جانتا بات کے الٹ پلٹ ہونے کا اندیشہ ہے) تو اس کا ولی (جس کے ذمہ اس کے اعمال واموال کی دیکھ بھال ہے) انصاف کے ساتھ املا کرا دے۔ کتابت کرانے کے حکم کے ساتھ گواہ بنا لینے کا بھی حکم فرمایا اور فرمایا کہ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ جس کا مطلب ہے کہ کتابت کے ساتھ دو گواہ بھی بنالو دونوں گواہ مرد ہوں اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آ جائے کہ دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالیں، عورتیں چونکہ حافظہ کے اعتبار سے اور ادائیگی مفہوم کے اعتبار سے عموماً کمزور ہوتی ہیں اس لئے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی گواہی رکھی گئی ہے۔ اس بات کو اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى میں بیان فرمایا کہ ایک عورت بھٹک جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے گی قانون چونکہ عمومی احوال کے اعتبار سے وضع کیا جاتا ہے۔ اس لئے شاذ ونادر احوال اور افراد کو سامنے نہیں رکھا جاتا اس سے یہ اشکال رفع ہو گیا کہ بعض عورتیں بعض مردوں سے زیادہ فہیم ہوتی ہیں اور حافظہ میں بڑھی ہوئی ہوتی ہیں اور بات پیش کرنے کا سلیقہ زیادہ رکھتی ہیں، گواہ عاقل بالغ ہوں، مسلم ہوں یہ مِنْ رِّجَالِكُمْ سے مفہوم ہو رہا ہے اور مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ جو فرمایا اس سے واضح ہو رہا ہے کہ گواہ صالح عادل ہونے چاہئیں جن پر بھروسہ ہو اور جن پر دونوں فریق کا اعتماد ہو اور ان میں سے کسی کے بارے میں جانب داری اور غلط بیانی کا احتمال نہ ہو۔

پھر فرمایا: وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا کہ جن لوگوں کے سامنے معاملہ ہوا ہے ان کو معاملہ کی صحیح خبر ہے اب جب ضرورت کے وقت ان کو بلایا جائے کہ گواہی دے دو تو ان کو انکار کرنا جائز نہیں ہے وہ جا کر حاکم کے یہاں یا جہاں بلائے جائیں جا کر گواہی دیدیں، اگر کسی کا حق مارا جاتا ہو اور گواہ کی گواہی سے اس کا حق زندہ ہو سکتا ہو تو گواہوں پر واجب ہے کہ گواہی دیں حق جانتے ہوئے گواہی کو چھپائیں گے تو گناہ گار ہوں گے جس کا ذکر آئندہ آیت میں آ رہا ہے بعض مرتبہ

آپس کے اعتماد یا ہجوم اشغال کی وجہ سے کتابت کرانے میں تنگی محسوس کرتے ہیں اس کے بارے میں تنبیہ فرمائی کہ وَلَا تَسْئَمُوْا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰى اَجَلِهٖ کہ چھوٹا قرضہ ہو یا بڑا اس کے لکھنے میں بددلی اختیار نہ کرو، یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی چیز ہے اور ٹھیک طرح گواہی کی ادائیگی کے لئے بھی بہت زیادہ قائم رکھنے والی ہے اور اس میں ہر قسم کے شک وشبہ سے بچنے اور دور رہنے کا بھی فائدہ ہے البتہ ایک صورت میں کتابت کرنے کی تاکید نہیں ہے جیسے یوں بیان فرمایا اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا کہ اگر ایسی تجارت ہو جس کا لین دین نقد اسی وقت ہو رہا ہو اسکی اگر لکھا پڑھی نہ کی تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ لفظ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ سے معلوم ہوا کہ صورت مذکورہ میں نہ لکھنے کی اجازت تو ہے لیکن اگر لکھ لیا تو وہ بھی کوئی ممنوع چیز نہیں ہے جیسا کہ دورِ حاضر میں مال خریدتے وقت کیش میمو نقد کاٹ کر دے دیتے ہیں اور اس میں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جس کا نام کیش میمو میں لکھ دیا گیا ہو اس پر خود دکان دار جس سے خریدا ہے یا دوسرا شخص غصب کرنے یا چرانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا: وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (اور جب تم خرید و فروخت کا معاملہ کرو تو گواہ بنا لیا کرو) گواہ بنانے میں بہت سے فائدے ہیں آپس میں کوئی اختلاف ہو جائے گا تو گواہوں کے ذریعہ رفع ہوگا۔ مثلاً فریقین کے دل میں کوئی خیانت کا جذبہ پیدا ہو جائے یا بھول کر کسی بات کا انکار کر دیں مثلاً بیچنے والا کہنے لگے کہ مجھے قیمت وصول نہیں ہوئی (حالانکہ خریدار کا دعویٰ ہے کہ میں قیمت ادا کر چکا ہوں) یا بیچنے والا سرے سے بیع ہی کا انکار کر دے یا یوں کہہ دے کہ میں نے ہر عیب سے براءت کر لی تھی یا خریدار کہنے لگے کہ میں نے خریدا ہی نہیں' یا یوں کہہ دے کہ قیمت تو میں نے دیدی ہے لیکن سامان مجھے نہیں ملا' یا یوں کہنے لگے کہ میں نے اپنے لئے واپسی کا اختیار بھی رکھا تھا جسے بائع نے مان لیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ بیع کا معاملہ کرتے وقت اور قیمت لیتے وقت اور مال دیتے وقت گواہ بنانے کی صورت میں اس طرح کے انکار اور نزاع کا دفعیہ ہو سکے گا' گواہ ہوں گے تو صحیح بات کی گواہی دے دیں گے' بھول اور خیانت سے سب کا دفاع ہو جائے گا۔

پھر فرمایا: وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ۔ (کہ کسی کاتب کو اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے) پہلے کاتب کو حکم دیا کہ انصاف کے ساتھ کتابت کر دے اور لکھنے سے انکار نہ کرے اور اللہ کی اس نعمت کی قدر کرے کہ اس نے اسے لکھنا سکھایا ہے اور گواہوں کو حکم دیا کہ گواہی کو نہ چھپائیں (جیسا کہ آئندہ آیت میں مذکور ہے) کاتب اور گواہ دونوں کو ان سے متعلقہ کام کی تاکید کے ساتھ ان لوگوں کو ہدایت فرمائی جو کاتب سے کتابت کرائیں اور جو گواہوں کو گواہی دینے کے لئے بلائیں' کتابت کرانے والے ایسا نہ کریں کہ کاتب کو کسی طرح کوئی تکلیف یا نقصان پہنچائیں اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر کاتب کتابت کرنے پر اُجرت مانگے تو اس کو اُجرت دے دی جائے اور مفت لکھنے پر مجبور نہ کیا جائے' اسی طرح جب گواہ کو بلائیں اور اس کو آنے جانے میں زحمت ہو یا جگہ دور ہو سواری طلب کرتا ہو تو اس کے لئے سواری کا انتظام کر دینا واجب ہے اور جب وہ گواہی دے چکے تو اسکے واپس گھر پہنچانے کا بھی انتظام کر دیں ایسا نہ کریں کہ اب تو ہمارا کام نکل ہی گیا ہے اب خیر وخبر کا خیال نہ کیا تو کیا حرج ہے۔ البتہ گواہی دینا چونکہ فرض ہے اس لئے اسکی اُجرت لینا جائز نہیں ہے۔ جب سچی گواہی کی اُجرت لینا جائز نہیں تو جھوٹی گواہی کی اُجرت لینا جس کا عام رواج ہو گیا ہے کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

یوں تو ہر مسلمان کو ضرر پہنچانا حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ملعون من ضار مؤمنا او مکر بہ (رواہ الترمذی) وہ شخص ملعون ہے جو کسی مومن کو ضرر پہنچائے یا اس کے ساتھ مکر کرے۔ کاتب اور شہید کو ضرر نہ پہنچانے کی تاکید فرمائی اور مزید تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ کہ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہارے گناہ گار ہونے کی بات ہے۔

آخر میں فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (کہ اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ کا احسان مانو وہ تمہیں احکام کی تعلیم دیتا ہے

اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے) کوئی گناہ صغیرہ یا کبیرہ کرو گے تو اسے اس کا علم ہوگا' دنیا میں کسی کا حق مار لیا یا کسی کو ضرر پہنچایا یا تکلیف دیدی تو یہ نہ سمجھنا کہ یہیں ختم ہو گیا بلکہ وہ سب محفوظ ہے۔ اللہ کے علم میں ہے۔ یوم آخرت میں پیش ہونے کا یقین رکھو اور وہاں کے مؤاخذہ اور محاسبہ سے ڈرو۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ

اور اگر تم سفر میں ہو اور حال یہ ہو کہ نہ پاؤ کسی کاتب کو تو رہن کی چیزیں قبضہ میں دے دی جائیں۔ سو اگر تم میں سے ایک دوسرے پر

بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ

اطمینان کرے تو جس کو امانت دار سمجھا گیا ہے صاحب امانت کو امانت ادا کر دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور گواہی کو مت چھپاؤ'

وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

اور جو شخص گواہی کو چھپائے گا تو اُس کا دل گنہگار ہے' اور اللہ ان کاموں کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو

رہن کا حکم اور گواہی چھپانے کی مذمت

تفسیر: اس آیت کریمہ میں اول تو رہن کا قانون مشروع فرمایا' اور فرمایا کہ تم اگر کہیں سفر میں ہو اور کوئی کاتب معاملہ لکھنے والا نہ ملے تو جس کے ذمہ قرض ہو وہ دوسرے فریق کو اطمینان دلانے کے لئے بطور رہن کے کوئی چیز دیدے جس پر وہ قبضہ کر لے اور اُسے اطمینان ہو جائے کہ میرا حق واجب مارا نہیں جائے گا۔

سفر کی قید احترازی نہیں ہے جو لوگ حضر میں یعنی وطن میں ہوتے ہوئے بھی اطمینان کے لئے رہن رکھنے کا معاملہ کر لیں تو یہ بھی صحیح ہے لفظ مَقْبُوْضَةٌ سے معلوم ہوا کہ جب راہن (رہن رکھنے والا) مرتہن (جس کے پاس رہن رکھا جائے) کے قبضہ میں رہن کی چیز دیدے تب اُس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے محض زبانی بات چیت کر لینے سے رہن نہیں ہوگا۔

کوئی کاتب بھی نہیں اور گواہ بھی نہیں اور رہن رکھنے کو بھی کوئی چیز نہیں اور اس سب کے باوجود جس کا حق ہے وہ اس شخص پر بھروسہ کرتا ہے جس کے ذمہ قرض ہے اور اُدھار دے دیتا ہے تو جس پر بھروسہ کیا اُس پر لازم ہے کہ امانت کو پوری طرح صحیح طریقہ پر مُدّت مقررہ کے مطابق ادا کر دے نفس یا شیطان کے بہکانے سے حق مارنے کا ارادہ نہ کرے اور یہ نہ سوچے کہ نہ تحریر ہے نہ گواہ ہیں نہ میں نے کوئی چیز رہن رکھی ہے اگر میں مکر ہی جاؤں تو یہ کیا کرے گا؟ یوں تو سب کے حقوق مالیہ ادا کرنا فرض ہے لیکن جس نے اطمینان کیا اور بھروسہ کیا اُس کے حق کی ادائیگی کا فکر کرنا تو اور زیادہ لازم ہے' اور شرافت کا یہ ہی تقاضا ہے۔ اگر گواہ یا تحریری سند نہ ہونے کی وجہ سے دُنیا والے صاحب حق کا حق نہ دلا سکیں تو اس سے چھٹکارہ نہیں ہو سکتا۔ سامنے آخرت ہے یوم الحساب ہے اُس دن سب کے حقوق ادا کرنے ہوں گے۔ قاضی روزِ جزا جل مجدہ حساب لے گا' اور ذرّہ ذرّہ کا محاسبہ ہوگا اور اموال کی جگہ اعمال صالحہ دینے ہوں گے اعمال صالحہ نہ ہوئے تو حقوق والوں کے گناہ سر ڈالدیئے جائیں گے۔ دنیاوی حکام کچھ نہیں کر سکتے تو احکم الحاکمین کو تو سب کچھ معلوم ہے جب وہاں پیشی ہوگی تو چھٹکارے کا کوئی راستہ نہ ہوگا اسی کو ارشاد فرمایا وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ کہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ پھر فرمایا وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ۔ (یعنی گواہی کو مت چھپاؤ اور جو شخص گواہی کو چھپائے گا تو اُس کا دل گنہگار ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ گواہی کا چھپانا حرام ہے جب کسی کا کوئی حق مارا جارہا ہو اور ایک شخص کو معلوم ہے کہ واقعی اس کا حق فلاں شخص پر ہے تو اُس کے لئے یہ حرام ہے کہ گواہی کو چھپائے۔ بشرطیکہ صاحب حق اُس سے درخواست کرے کہ تم چل کر گواہی دیدو اگر وہ درخواست نہ کرے تو گواہی کے لئے جانا واجب نہیں۔ گواہی چھپانے والے کے بارے میں فرمایا

کہ اُس کا دل گنہگار ہے اس میں یہ بتایا کہ گواہی کے لئے نہ جانا صرف اعضاء ظاہرہ ہی کا گناہ نہیں دل کا گناہ بھی ہے۔

مسئلہ: شہادت پر اُجرت لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ گواہ آمد و رفت کا کرایہ لے سکتا ہے جیسا کہ پہلے مذکور ہوا۔

آخر میں فرمایا: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے حق نہ دینے والا اور گواہی کو چھپانے والا اور ہر شخص اس بات کا یقین کرے کہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اور اسکی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ

اللہ ہی کے لئے ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے نفسوں میں ہے یا اسکو پوشیدہ رکھو

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ

اللہ اس کا محاسبہ فرمائے گا۔ پھر جس کو چاہے بخشش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، اور اللہ ہر

شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ

چیز پر قادر ہے، ایمان لایا رسول اس پر جو اسکی طرف نازل کیا گیا اس کے رب کی طرف سے، اور مؤمنین بھی ایمان لائے، سب ایمان لائے

بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا

اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اسکی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر وہ کہتے ہیں کہ ہم اُس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا

کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا، ہم آپ کی بخشش کا سوال کرتے ہیں، اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے، اللہ نہیں مکلف بناتا کسی جان کو،

وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ

جس کی اُسے طاقت نہ ہو، ہر جان کے لئے وہی ہے جو اس نے کسب کیا اور اس کے اُوپر وبال ہے اُس کا جو وہ گناہ کرے، اے ہمارے رب ہمارا مؤاخذہ نہ فرمانا اگر ہم بھول جائیں

اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ

یا ہم سے چوک ہو جائے۔ اے ہمارے رب اور نہ رکھ ہم پر بھاری بوجھ جیسا کہ آپ نے ان لوگوں پر بھاری بوجھ رکھا جو ہم سے پہلے تھے

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا

اے ہمارے رب اور ہم پر ایسا بار نہ ڈالئے جس کی ہم کو طاقت نہ ہو، اور ہمیں معاف فرما دیجئے اور ہماری مغفرت فرما دیجئے اور ہم پر رحم فرمائیے آپ ہمارے مولیٰ ہیں۔

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

سو ہماری مدد فرمائیے کافر قوم کے مقابلہ میں

خطا اور نسیان کی معافی اور چند دعاؤں کی تلقین

تفسیر: اعضاء و جوارح کے افعال دو قسم کے ہیں ایک اختیاری اور دوسرے وہ جو بلا اختیار صادر ہوں بلا اختیار کی صورت ایسی ہی ہے جیسے رعشہ کی وجہ سے ہاتھ ہر وقت حرکت کرتا ہو جس کو یہ مرض ہو وہ ہاتھ کی حرکت کو روکنے پر قادر نہیں ہوتا۔ یا جیسے سوتے میں

زبان سے کچھ اُلٹی سیدھی بات نکل جائے۔ یہ بھی اختیاری نہیں ہے۔ امور غیر اختیاری پر گرفت نہیں ہے۔ جزاء سزا امور اختیار یہ سے متعلق ہے۔ کسی کا بچہ فوت ہو گیا اس کو بے اختیار رونا آ گیا تو اس پر کوئی گرفت نہیں لیکن اگر زبان سے ایسے کلمات نکال دیئے جن سے اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہوتا ہو تو ایسے کلمات کفریہ کلمات کے دائرہ میں آجاتے ہیں اور ان پر عذاب اور عتاب ہے۔

اسی طرح قلب کے اعمال بھی دو طرح کے ہوتے ہیں جو خیالات اور وسوسے غیر اختیاری طور پر آ جائیں اُن پر گرفت نہیں اور اپنے اختیار سے جو بات دل میں جمالے کفر کی بات ہو یا فسق کی تو اس پر گرفت ہے۔ کینہ، حسد، کسی گناہ کے کرنے کا پختہ عزم، کسی کو نقصان پہنچانے کا مضبوط ارادہ یہ سب گرفت کی چیزیں ہیں اور محض وسوسہ اور خیال پر کوئی مؤاخذہ نہیں، آیت بالا میں اول تو یہ فرمایا کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کی ملکیت ہے سب کچھ اسکی مخلوق بھی ہے اور مملوک بھی ہے، اُسے اپنی مخلوق کے بارے میں پورا پورا اختیار ہے، ان کے اعمال و افعال کے بارے میں تکوینی یا تشریعی طور پر جو بھی حکم فرما دے اُسے کوئی روکنے والا نہیں اُس کے بعد افعال قلبیہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ جو کچھ تمہارے نفسوں میں ہے اُسے ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو اللہ تعالیٰ اُس کا محاسبہ فرمائے گا۔ ان افعال قلبیہ میں جو لائق مواخذہ ہوں گے جس کے لئے چاہے معاف فرما دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا البتہ کفر و شرک کی کبھی بخشش نہ ہوگی جیسا کہ دوسری آیت میں اسکی تصریح ہے اخیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ سب کا حساب لے سکتا ہے بخش بھی سکتا ہے۔ اور عذاب بھی دے سکتا ہے۔

آیت میں بظاہر اختیاری اور غیر اختیاری کی تفصیل نہیں ہے۔ اس لئے مضمون آیت پر مطلع ہو کر حضرات صحابہ کرامؓ بہت پریشان ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اب تک تو ہمیں اُن اعمال کا حکم تھا جنہیں ہم کر سکتے ہیں یعنی نماز اور روزہ، جہاد اور صدقہ، اور اب یہ آیت نازل ہوئی ہے اس پر عمل کرنے کی تو ہمیں طاقت نہیں (کیونکہ بلا اختیار وسوسے آ جاتے ہیں اگر اُن پر بھی پکڑ ہوئی تو ہمارا کیا بنے گا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم بھی وہ ہی کہنا چاہتے ہو جو اہل کتاب یعنی توریت و انجیل والوں نے کہا اُن کے پاس احکام آئے تو کہنے لگے سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (کہ ہم نے سن لیا اور مانیں گے نہیں) تم یوں کہو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (ہم نے سنا اور مان لیا، اے ہمارے رب ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف جانا ہے) حضرات صحابہ دل اور زبان سے مان گئے اور بار بار ان کلمات کو دہرایا تو اللہ تعالیٰ نے اُس کے بعد والی آیتیں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ آخر سورت تک نازل فرمائیں۔ جن میں اپنے رسول ﷺ کی اور مؤمن بندوں کی تعریف فرمائی اور انہوں نے بخوشی جو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ کہا تھا قبولیت کے انداز میں نقل فرمایا اور حکم سابق کو جس میں بظاہر عموم تھا منسوخ فرما دیا اور بالتصریح فرما دیا کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (کہ اللہ تعالیٰ کسی جان کو ایسے کام کا مکلف نہیں بناتا جو اُس کے بس میں نہ ہو) (صحیح مسلم ص ۷۷ ج ۱)

بعض حضرات نے اس پر اشکال کیا ہے کہ اخبار میں نسخ نہیں ہوتا اس کو نسخ سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟ درحقیقت یہ نسخ بالمعنی الحقیقی نہیں ہے۔ بلکہ ایضاح مجمل کو نسخ سے تعبیر فرما دیا ہے، نسخ کے قول سے احتراز کرنے کے لئے بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس کا تعلق سابق آیت سے ہے جس میں کتمانِ شہادت کا ذکر ہے، مطلب یہ ہے کہ عمل ظاہری طور پر کرو گے یا پوشیدہ طور پر اللہ تعالیٰ اس کا حساب فرمالے گا۔ یعنی مؤاخذہ فرمائے گا۔ صاحب معالم التنزیل لکھتے ہیں کہ حضرت شعبی اور حضرت عکرمہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ اس قول کو لیا جائے تو نسخ لازم نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ نے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے ساتھ ہی لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ بھی فرمایا ہے پہلے جملہ میں یہ بتایا ہے افعال غیر اختیاریہ پر مؤاخذہ نہیں ہے اور دوسرے دونوں جملوں میں یہ بتایا کہ جو اچھا عمل اپنے اختیار سے کرو گے اُس پر اجر ملے گا۔ اور جو کوئی کام ایسا کرو گے جس کی ممانعت ہے تو وہ وبال جان ہوگا اور اُس پر مؤاخذہ اور محاسبہ کا قانون جاری ہوگا۔

یہ عموم افعال قلبیہ کو بھی شامل ہو گیا جیسا کہ سورۂ بقرہ میں فرمایا کہ: وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ (لیکن اللہ تمہارا مؤاخذہ فرمائے گا اُن چیزوں پر جنہیں تمہارے قلب نے کسب کیا) اور سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بے شک کان آنکھ اور دل ان سب کے بارے میں سوال کیا جائے گا) آیت کی تفسیر میں جو اعمال اختیاریہ اور غیر اختیاریہ کی تفصیل لکھی ہے اور جو صحابہ کے فکرمند ہونے پر لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے ذریعہ عموم الفاظ سے مفہوم ہونے والے مضمون کا منسوخ ہونا مذکور ہوا اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ بلا اختیار جو وسوسے آ جاتے ہیں اُن پر مؤاخذہ نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میری اُمت سے اُن چیزوں کے بارے میں درگزر فرما دیا ہے جو اُن کے نفسوں میں آ جائیں جب تک کہ اُن پر عمل نہ کریں یا زبان سے نہ کہیں۔ (صحیح مسلم ص ۷۸ ج ۱)

انسان کے دل میں بہت سے خطرات گزرتے ہیں اور وسوسے آتے ہیں۔ بُرے بُرے خیالات کا ہجوم ہوتا ہے شیطان وسوسے ڈالتا رہتا ہے چونکہ یہ چیزیں اختیاری نہیں ہیں اس لئے ان پر گرفت نہیں ہے۔ لہٰذا ان سے پریشان بھی نہ ہوں اور فکر میں بھی نہ پڑیں۔ ہاں اگر برائی کا کوئی وسوسہ آیا پھر اس پر عمل کر لیا یا اپنے اختیار سے زبان سے کوئی برا کلمہ نکال دیا تو اس پر مؤاخذہ ہوگا کیونکہ یہ چیزیں دائرہ اختیار میں آ گئیں۔ جو لوگ پکے مومن ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں ایسے وسوسوں کا آنا ہی خالص مومن ہونے کی دلیل ہے۔ صحیح مسلم (ص ۷۹ ج ۱) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم اپنے نفسوں میں ایسی بات محسوس کرتے ہیں کہ جس کو زبان پر لانا بھاری معلوم ہوتا ہے آپ نے یہ سن کر سوال فرمایا کیا واقعی تم نے ایسا محسوس کیا ہے؟ عرض کیا ہاں محسوس کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ خالص ایمان ہے۔ سنن ابوداؤد (ص ۳۴۱ ج ۲) میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اُس نے عرض کیا میں اپنے نفس میں ایک چیز محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اُسے زبان سے نکالنے کی بہ نسبت کوئلہ ہو جانا زیادہ محبوب ہے یہ سن کر آپ نے فرمایا اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، پھر فرمایا کہ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جس نے شیطان کی شرارت کو وسوسہ تک ہی رہنے دیا (اگر دل سے مؤمن نہ ہوتے تو اس بات کو برا کیوں جانتے اور زبان پر لانے کو کیوں بھاری چیز سمجھتے' یہ بھاری سمجھنا اور کوئلہ ہو جانے کو محبوب جاننا سراسر ایمان ہے)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان تمہارے پاس آئے گا پھر کہے گا کہ فلاں چیز کس نے پیدا کی' فلاں چیز کس نے پیدا کی' اس طرح کے کئی سوال کرتے ہوئے یوں کہے گا کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا سو جب تم میں سے کسی شخص کے ساتھ اس طرح کی صورت حال پیش آ جائے تو اللہ کی پناہ مانگے اور وہیں رک جائے (وسوسہ کو اور سوال و جواب کو آگے نہ بڑھائے) دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ برابر آپس میں طرح طرح کے سوال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ بھی سوال کریں گے یہ (جو کچھ موجود ہے) اللہ کی مخلوق ہے اسے اللہ نے پیدا کیا ہے تو اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ جو کوئی شخص ایسے سوالات میں سے کوئی چیز (اپنے اندر) محسوس کرے تو آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (میں اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا) کہہ دے (ایضاً)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کے وسوسے آنے پر پڑھنے کے لئے یہ بتایا اَللّٰہُ اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ اور فرمایا اس کے بعد بائیں طرف کو تین بار تھوک دے اور اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھ لے۔ (مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۹)

پھر اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اپنے بندوں کو دعا تلقین فرمائی کہ اس طرح دعا مانگا کریں، جو متعدد جملوں پر مشتمل ہے اور ان میں متعدد دعائیں ہیں پہلے یہ دعا بتائی: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا (اے ہمارے رب ہماری گرفت نہ فرما۔ اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے چوک ہو جائے) صاحب جلالین فرماتے ہیں کہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ خطا اور نسیان پر مؤاخذہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ سوال کرنا اللہ تعالیٰ شانہٗ کی اس نعمت کا اقرار کرنا ہے کہ اُس نے بھول اور خطاء پر مواخذہ نہیں رکھا، خطا اُردو کے محاورہ میں گناہ کے لئے استعمال ہوتا ہے یہاں وہ معنی مراد نہیں ہیں بلکہ خطا سے وہ عمل مراد ہے جو بلا ارادہ صادر ہو جائے۔ یاد رہے کہ مؤاخذہ ہونا نہ ہونا اور بات ہے اور خطا و نسیان سے بعض احکام کا متعلق ہونا دوسری بات ہے۔ خطا اور نسیان کے بارے میں جو بعض احکام ہیں عدم مؤاخذہ فی الآخرۃ سے اُن احکام کی نفی نہیں ہوتی مثلاً نماز میں بھول کر کوئی شخص بول پڑا تو اس سے نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر خطاً کسی مؤمن کو قتل کر دیگا تو دیت اور کفارہ واجب ہوگا۔

پھر ایک اور دعاء تلقین فرمائی اور وہ یہ ہے: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا اس میں ارشاد فرمایا ہے کہ بارگاہ خداوندی میں یوں عرض کرو کہ اے ہمارے رب ہم پر بھاری احکام کا بوجھ نہ رکھ جیسا کہ ہم سے پہلے لوگوں یعنی بنی اسرائیل پر رکھا تھا مثلاً توبہ قبول ہونے کے لئے اپنی جان کو قتل کرنا مشروط تھا اور زکوٰۃ میں چوتھائی مال نکالنا فرض تھا اور کپڑا دھو کر پاک نہیں ہو سکتا تھا اس کے لئے نجاست کی جگہ کو کاٹ دینا پڑتا تھا اور جب کوئی شخص چھپ کر رات کو گناہ کرتا تھا تو صبح کو اُس کے دروازے پر لکھا ہوا ہوتا تھا کہ اس نے فلاں گناہ کیا ہے، اور بعض طیبات اُن پر حرام کر دی گئی تھیں۔

کما قَالَ تَعَالٰی حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَقَالَ تَعَالٰی وَعَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ (الآیۃ) اور نماز پڑھنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ مسجد ہی میں نماز پڑھے اور مال غنیمت اُن لوگوں کے لئے حلال نہیں تھا اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اُمت محمدیہ کیلئے آسانی فرمائی اور مشکل احکام مشروع نہیں فرمائے جو بنی اسرائیل پر فرض تھے۔ سورۂ اعراف میں رسول اللہ ﷺ کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ (وہ پاکیزہ چیزوں کو ان کیلئے حلال فرماتے ہیں اور گندی چیزوں کو اُن پر حرام فرماتے ہیں اور اُن پر جو بوجھ اور طوق تھے اُن کو دور کرتے ہیں)۔

مزید دعا تلقین فرماتے ہوئے ارشاد ہے: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ (اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی ایسا بار نہ ڈالئے جس کی ہم کو طاقت نہ ہو) اس سے تکالیف شرعیہ بھی مراد ہو سکتی ہیں اور مصائب تکوینیہ بھی اور دونوں بھی مراد لے سکتے ہیں۔ صاحب جلالین لکھتے ہیں: من التکالیف و البلایا اِس سے دونوں کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

آخر میں مختصر الفاظ میں چار دُعائیں اکٹھی تلقین فرمائیں۔ وَاعْفُ عَنَّا (اور ہمیں معاف فرما) وَاغْفِرْ لَنَا (اور ہماری مغفرت فرما) وَارْحَمْنَا (اور ہم پر رحم فرما) اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ (تو ہمارا مولیٰ یعنی وَلی اور مددگار ہے۔ سو ہماری مدد فرما، کافر قوم کے مقابلہ میں)۔

صحیح مسلم (ص ۷۸ ج ۱) میں ہے ہر ہر دعا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب میں نَعَمْ کا جواب ملا دوسری روایت میں ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے ہر دعا کے جواب میں قَدْ فَعَلْتُ فرمایا یعنی میں نے تمہارے سوال کے مطابق کر دیا یعنی تمہاری دعائیں قبول ہو گئیں۔

صحیح مسلم (ص ۹۷ ج ۱) میں یہ بھی ہے کہ شب معراج میں رسول اللہ علیہ کو تین چیزیں عطا کی گئیں۔ (۱) پانچ نمازیں (۲) سورۃ البقرہ کا آخری حصہ (آمن الرسول سے سورۃ کے ختم تک) (۳) آپ کی اُمت میں جو لوگ مشرک نہ ہوں۔ انکے بڑے بڑے گناہوں کی بخشش کر دی گئی (گناہ کبیرہ محض اللہ کی رحمت سے یا توبہ سے یا بطور تطہیر و تمحیص عذاب بھگت کر معاف ہو جائیں گے اور اہل ایمان ایمان کی وجہ سے جنت میں چلے جائیں گے۔ فاسق کو دائمی عذاب نہیں ہے۔ کافر و مشرک کو دائمی عذاب ہوگا)۔ قال النووی فی شرح صحیح مسلم والمراد واللہ اعلم بغفرانھا انہ لا یخلد فی النار بخلاف المشرکین ولیس المراد انہ لا یعذّب اصلا الخ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف رکھتے تھے اسی اثناء میں اُوپر سے ایک آواز سُنی' انہوں نے اوپر کو سر اُٹھایا اور بتایا کہ یہ آسمان کا ایک دروازہ آج کھولا گیا ہے۔ جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا۔ اس دروازے سے ایک فرشتہ نازل ہوا تو جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ فرشتہ آج زمین پر نازل ہوا ہے آج سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا تھا۔ اس فرشتے نے آنحضرت سرور عالم علیہ کو سلام کیا اور عرض کیا کہ آپ دو نوروں کی خوشخبری سن لیں جو آپ کو عطا کئے گئے ہیں آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ اول فاتحۃ الکتاب یعنی سورۃ فاتحہ دوم سورۃ البقرۃ کی آخری آیتیں (سورۂ فاتحہ اور یہ آیات دعاؤں پر مشتمل ہیں) ان میں سے جو بھی کوئی حصہ آپ تلاوت کریں گے (جو سوال پر مشتمل ہوگا) تو اللہ تعالیٰ ضرور آپ کو سوال کے مطابق عطا فرمائیں گے۔ (صحیح مسلم ص ۲۷۱ ج ۱)

مذکورہ بالا روایات سے سورۃ البقرہ کی آخری دونوں آیات کی اہمیت اور فضیلت معلوم ہوئی کہ یہ آیات شب معراج میں عطا ہوئیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دعاؤں کو قبول فرمالیا۔ صحیح بخاری (ص ۷۵۵ ج ۲) اور صحیح مسلم (۲۷۱ ج ۱) میں ہے کہ رسول اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ الأیتان فی اٰخر سورۃ البقرۃ من قرء بھما فِی لیلۃ کفتاہ (یعنی جس نے کسی رات میں سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھ لیں تو اس کے لئے کافی ہوں گی)

حضرات شراح حدیث نے کافی ہونے کے کئی مطلب لکھے ہیں اول یہ کہ پڑھنے والے کو تمام انسان اور جنات کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے کافی ہوں گی' دوسرے یہ کہ ہر قسم کی آفات و مکروہات سے حفاظت رہے گی' تیسرے یہ کہ رات کو جو پڑھنے کی چیزیں ہیں وہ رہ گئیں تو انکی جگہ کفایت کریں گی' اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ قیام اللیل یعنی رات کو نفل نمازوں میں قیام کرنے کے قائم مقام ہو جائیں گی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

ولقد من اللہ تعالٰی با کمال تفسیر سورۃ البقرۃ علی ید ھذا العبد
الضعیف بالمدینۃ المنورۃ فی اواخر شعبان المعظم سنہ ۱۴۰۹ھ بحسن
توفیقہ و تیسیرہ وأرجوأن یوفقنی اللہ تعالٰی لإتمام تفسیر کتابہ کلہ
والحمد للہ اولا و آخرا' والصلوٰۃ والسلام علي من جاء نا بکتاب اللہ
تعالٰی وأرسل طیبا وطاھرا'
وکانت مدۃ تالیفہ من بدء سورۃ الفاتحۃ اِلٰی آخر سورۃ البقرۃ سنۃ
فصاعدا واللہ ولی التوفیق و بیدہ أزمۃ التحقیق.